http://urdutubes.com/
Digitized by Google

سسپنس ڈائجسٹ
CPNE MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد

نائب مدیر
اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07 انشائیہ / جون ایلیا
سالوں پہلے لکھے گئے لفظوں کی اہمیت، جو آج بھی پورے اترتے ہیں

08 آپ کے خط / مدیرِ اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت وقارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

14 عظیم فاتح / زویا اعجاز
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

57 خوف کا حصار / تنویر ریاض
قانون کے لمبے ہاتھوں سے خوفزدہ ایک مجرم کی دوڑ

سات گلاب / غزالہ یاسمین
غیر معمولی آنکھوں والی ساحرہ کی محبت اور رائگانی کا ماجرا

74 رنگ آسماں / اے آر راجپوت
مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی سنسنی خیزیوں کے عبرت اشاروں میں ابھرتی دلچسپ داستان

101 لاحاصل / نادیہ نور
ایک سعیِ لاحاصل کی تھکن کا عبرت اثر احوال

109 آخری محاذ / عائشہ تنویر
دل کے سب سے زیادہ نزدیک ایک جیون ساتھی کا اصل روپ

112 آسمانی فیصلہ / ملک صفدر حیات
بارش، بجلی اور مجرم کے درمیان حیرت انگیز معرکہ آرائی...... اور خوفناک انجام

149 ہرجائی / علی اختر
ایک ہرجائی فطرت عاشق کی سزا اور وفا کا انوکھا قصہ

166 محفلِ شعر و سخن / قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

169 حق بجانب / شاہ زین رضوان
بچپن کے خوابوں کو توڑ... سزا پانے والوں کا انجام

180 وقت / حسام بٹ
ایک مجرم بازی گر کی بازی گری...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

217 پگڈنڈی / ڈاکٹر شیر شاہ سید
نارسائی کے آنسوؤں میں ڈوب کر ابھرنے والی دوشیزہ کا عزم

223 حضرت عیسیٰ علیہ السلام / رضوانہ ساجد
اللہ کے ایک برگزیدہ پیغمبر کے حالاتِ زندگی

233 سانپ اور لاٹھی / ثمر عباس
انتہائی مکاری سے اپنی زندگی آسان کرنے والے ایک ڈرامے باز کا قصہ

242 آخری صدمہ / نشور ہادی
محبت سے زندگی گزارنے والی ایک قاتلہ کی بے باکی...... ایک خطاکار بیوی کی وفاداری کی داستان

http://urdutubes.com/
اردو ٹیوب
www.urdutube.net

جلد 48 • شمارہ 04 اپریل 2019 • زرِ سالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Digitized by Google

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں [illegible] بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

انشائیہ

جون ایلیا

بیگانگی

''کیا شام بہت اداس ہے۔ شام، در و بام اور درختوں اور سمتوں کا ابہام؟''

''ہاں شام بہت اداس ہے۔ شام، در و بام اور درختوں اور سمتوں کا ابہام۔''

''پر ایسا کیوں ہے، ایسا کیوں ہے کہ جب مغرب کا افق دہکتا ہے اور دامان شفق بھڑکتا ہے جیسے شعلے سے چنے ہوئے ہوں، جیسے تنور دھنے ہوئے ہوں اور جب خورشید کا بے کفن جنازہ افق میں تازہ تازہ اترتا ہے تو ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مل کے جا رہا ہو، جیسے کوئی یاد آ رہا ہو، جیسے کوئی جا کے بھول جائے، وعدہ ہو مگر کبھی نہ آئے اور جب دونوں وقت ملتے ہیں تو ہم پر کبھی کبھی ایسی حالت کیوں گزرتی ہے جیسے ہم خود اپنے آپ سے بچھڑ رہے ہوں۔ اپنے آپ سے بچھڑ گئے ہوں؟''

''تم جاننا چاہتے ہو کہ کبھی کبھی ہمیں ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے؟ ایسا یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم دن بھر کی رایگانی کے راستوں سے پلٹ کے جب اپنی تھکن کا اندازہ لگاتے ہیں تو اپنے اندر گھٹتے اور گہناتے چلے جاتے ہیں اور اپنی ذات اور اپنی تھکن کے بیچ ایک بیگانگی پاتے ہیں۔''

''بیگانگی...... اور اپنی ذات اور اپنی تھکن کے بیچ!''

''ہاں، بیگانگی اور اپنی ذات اور اپنی ہی تھکن کے بیچ اور وہ یوں کہ تمہاری دن بھر کی تھکن جو کچھ کماتی ہے اسے تمہاری ذات شام کو بیچ اور پوچ پاتی ہے۔ تم صبح کی خوش حالتی اور شام کی خود ملامتی کے بیچ جو کچھ بھی کرتے ہو، اس کا اپنے اندر لحہ لحہ تاوان بھرتے ہو۔ تم اس بیچ جو بھی کر کے دکھاتے ہو، اس پر پچھتاتے ہو۔ جب تم زبان کھولتے ہو اور بولتے ہو تو اپنے سانسوں کی ترازو میں اپنا کھاتا تولتے ہو۔ اس لیے کہ تم اپنے منہ میں اپنی زبان نہیں کسی اور کی زبان پاتے ہو، تم اپنے ہونٹوں سے اپنی آواز نہیں کسی اور کی آواز لگاتے ہو۔''

''ہاں بھائی تم نے سچ کہا اور شام کی اس اداسی میں اپنی دانست ہی کا دکھ نہیں، میرے دل کا دکھ بھی سہا۔ کوئی بیگانگی سی بیگانگی ہے [illegible] ہم اپنی اپنی ذات میں ایک [illegible] میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور ہمارے احساس کی [illegible] کی گرفت میں بیگانگی، زبان [illegible] لے کے منہ میں اور اس کی زبان میں بیگانگی، [illegible] آواز میں بیگانگی۔ پھر تو میں زبان [illegible] والا ہاں میں کچھ کر کے دکھانے والا اور اپنی کرت میں پچھتانے والا تو مارا گیا۔ ہاں، میں مارا ہی تو گیا۔''

''میرے بھائی تم ہی نہیں، ہم میں سے جو بھی ہے وہ مارا گیا، اس لیے کہ ہم میں سے جو بھی ہے وہ دوسروں کی مرضی پر وارا گیا۔ ہمارے ہاتھ تو ہمارے ہیں پر انگلیاں کسی اور کی ہیں اور وہ یوں کہ ہماری انگلیوں نے جب کبھی کچھ لکھا تو وہی کچھ لکھا جو ان سے لکھوایا گیا۔ ہماری انگلیوں میں اور ان کی لکھائی میں بیگانگی ہے۔ ہماری پڑھت میں اور ہماری بینائی میں بیگانگی ہے۔ ہم اس چارسو میں زندہ رکھے گئے ہیں جس میں ہمیں دوسروں کے لیے سانس لینے ہیں، سوائے بھائی! اس چارسو کی آرزو کر جس میں تو اپنے سینے سے خود اپنے سانس لے سکے۔ کیا میں تجھے ایک واقعہ سناؤں؟''

''ہاں میرے بھائی ضرور سنا۔''

''کل مجھے اسماعیل کتب فروش نے بتایا کہ میرا بھائی الیاس مصوری کرتا ہے۔ وہ پرسوں کبوتر کی تصویر بنا رہا تھا۔ تصویر بنانے کے بعد اس نے اس کے نیچے بائیں طرف اپنا نام لکھا اور پھر تصویر پر ایک نظر ڈالی۔ اب جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ وہ کبوتر کی نہیں، بلی کی تصویر ہے۔''

''ایں! کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کبوتر کو بلی چبا گئی، ہنرمند اور ہنر کی بیگانگی ہنر کو کھا گئی۔''

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

زندگی کی شام

آہ......! ڈائجسٹ کی دنیا کا سب سے روشن اور درخشندہ ستارہ 22 فروری 2019ء بروز جمعہ بہ وقت فجر جب اللہ کے گھر سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہورہی تھیں...... دور کہیں آسمانوں کی وسعتوں میں گم ہوگیا...... جی ہاں...... پاکستان کے صفِ اول ڈائجسٹوں کے مالک اور جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے بانی اور مدیرِ اعلیٰ جناب معراج رسول صاحب تقریباً 15 سال کی طویل علالت کے بعد اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ...... اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل کی دولت سے نوازے۔ (الٰہی آمین)

معراج رسول صاحب 5 اگست کو بھارتی شہر لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ جب پارٹیشن کے بعد آپ کے والد جناب عبدالغفار صاحب لکھنؤ سے ہجرت کرکے کراچی آئے تو معراج رسول صاحب کی اس وقت عمر 5 سال تھی۔ سنِ شعور کو پہنچے تو والد صاحب کو اس دور کے مقبول ترین رسالے "سراغ رساں اور ماہنامہ نفسیات" کی اشاعت کے کام میں مشغول دیکھا...... اور جب خود سلسلۂ روزگار سے وابستہ ہوئے تو رسالوں کی دنیا نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیا اور یوں انہیں مختلف طرز کے ڈائجسٹ نکالنے کی تحریک اپنے والد صاحب سے ہی ملی لہٰذا ستر کی دہائی میں آپ نے انتہائی منفرد انداز میں ادبی فکشن کا آغاز کرتے ہوئے 1971ء میں جاسوسی ڈائجسٹ کی بنیاد رکھی اور پھر فروری 1972ء میں سسپنس ڈائجسٹ کا اجرا کرکے اس کے ابتدائی صفحات پر تاریخی اور آخری صفحات پر معاشرتی کہانیوں کے نئے حوالے سے قارئین کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ بالخصوص سلسلے وار کہانیوں نے لاکھوں قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ جس میں سسپنس کے صفحات پر طویل ترین سلسلہ "دیوتا" قابلِ ذکر ہے جسے لکھنے کے لیے قلم تو محی الدین نواب کا چلا مگر خیالات کے تانے بانے اور نئے نئے انوکھے واقعات کے رقم کرنے میں جناب معراج رسول کی کاوشیں بھی شامل رہیں۔ دوسرے نمبر پر جناب اقلیم علیم صاحب کے قلم سے طویل سلسلہ "موت کے سوداگر" رقم ہوا جسے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب قارئین کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوگیا۔ اسی کامیابی نے آپ کے حوصلوں کو مہمیز کیا اور اپریل 1973ء میں بالخصوص خواتین کے لیے ماہنامہ پاکیزہ اور نومبر 1990ء میں انتہائی [illegible] بھی عمل میں آگئی۔ کامیابی کے اس سفر میں آپ کو بہت سی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا جب آپ نے اپنی انتھک محنت سے آسان [illegible] بنادیا اور آج ان کے ادارے کی کامیابی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اس کی بنیادیں اتنی گہری، مضبوط اور مستحکم ہیں کہ ڈائجسٹ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کو ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ معراج رسول صاحب نہ صرف اپنے اسٹاف کے لیے محسن ثابت ہوئے اور ان کی مشکلات میں بھرپور ساتھ دیا بلکہ اپنے قلم کاروں کے لیے بھی مضبوط سائبان بن گئے اور ملک کے کونے کونے سے اپنے لکھاریوں کو جمع کرکے بہترین پلیٹ فارم مہیا کیا۔ آپ نے اپنے مصنفین کا نازک آبگینوں کی طرح خیال رکھا تاکہ معاشی مسائل سے دور رہ کر ان کے اذہان نادر و یادگار تحریریں رقم کرسکیں اور معراج رسول صاحب اپنی ان کوششوں میں صد فیصد کامیاب بھی رہے۔ جاسوسی، سسپنس، پاکیزہ اور سرگزشت میں چھپنے والی کہانیاں آج بھی زندہ و جاوید ہیں۔ آپ کے مقبول لکھاریوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ جیسے اقلیم علیم، احمد اقبال، ناہید سلطانہ اختر، منظر امام، ڈاکٹر ساجد امجد، ایچ اقبال اور طاہر جاوید مغل اور کئی دوسرے جنہیں قارئین بہت پیار اور مان دیتے ہیں۔

بے شمار مصنفین نے انہی ڈائجسٹوں کی بدولت پسندیدگی اور مقبولیت کی بلندی کو چھوا۔ مثال کے طور پر احمد اقبال نے ایک جگہ کہا کہ 1981ء میں انہوں نے جاسوسی ڈائجسٹ میں پہلی کہانی لکھی اور پھر دو تین ماہ بعد معراج رسول صاحب نے نہ صرف میرا معاوضہ ڈبل کردیا بلکہ مجھے سلسلے وار کہانی لکھنے کی طرف بھی راغب کیا۔ گویا آپ کی نگاہ جوہر شناسی کے فن سے بخوبی واقف تھی اور آپ قارئین کے حوالے سے نبض شناس بھی تھے۔ ان کی پسند ناپسند کا ادراک تھا۔ یوں شکاری، مداری اور بھورے ماموں کالے خاں جیسی کہانیاں تخلیق ہوئیں۔ اسی طرح معراج رسول صاحب نے ایک پسماندہ علاقے سے دیبا کے نام سے کہانیاں لکھنے والے قلم کار محی الدین نواب کو دریافت کیا اور انہیں اپنی نگرانی میں لے آئے اور انہیں ہر معاشی فکر سے آزاد کرتے ہوئے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور یوں اردو زبان میں دنیا کا طویل ترین سلسلہ "دیوتا" تخلیق ہوا جو ساڑھے 33 سال پر مشتمل ہے۔ نہ صرف محی الدین نواب بلکہ الیاس سیتاپوری، شمیم نوید، ابوضیا اقبال، اظہر کلیم اور کاشف زبیر جیسے منجھے ہوئے قلم کاروں نے بھی معراج رسول کی جوہر شناسی کی بدولت دائمی شہرت پائی۔ کیونکہ جناب معراج رسول صاحب خود بھی محنتی تھے اور کام کے آدمی کی بہت قدر بھی کرتے تھے۔ ان کے ناز نخرے اٹھانے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔

جس دور میں ادب کا شوق اور ذوق عروج پر تھا اور کئی ادبی رسائل کی اشاعت پچاس ساٹھ ہزار سے زیادہ ہوتی تھی، ان کے درمیان رہ کر اپنے ڈائجسٹوں کو متوازن اور دلچسپ مواد کے ذریعے شہرت و پسندیدگی کی انتہا پر پہنچانا یقیناً کوئی آسان معرکہ نہیں تھا۔

جناب معراج رسول کا یہ اسکیچ آپ کے دوست اور مصور اقبال مہدی مرحوم کا یادگار تحفہ ہے

کہتے ہیں کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک باصلاحیت اور ہنرمند عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور یہ مقولہ جناب معراج رسول صاحب کی زندگی پر صد فیصد درست بیٹھتا ہے کہ آپ کی شریکِ حیات محترمہ عذرا [illegible] نے آپ کو جس قدر ایک نجی زندگی میں [illegible] ذہنی سکون اور مسرت سے نوازا، اتنی ہی کامیابیاں معراج رسول کے قدم چومتی رہیں۔ نہ صرف صحت مندی کے زمانے میں بلکہ علالت کے دوران بھی عذرا رسول صاحبہ نے ایک سچی رفیقِ حیات اور محبت کرنے والی فرماں بردار شریکِ سفر ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے معراج رسول صاحب کی جس طرح جی جان سے خدمت کی، اس کی مثال بہترین اور مثالی جوڑوں میں ہی مل سکتی ہے۔ یہ دونوں ہستیاں نہ صرف ایک دوسرے کی مزاج آشنا بلکہ ایک دوسرے کی قدردان بھی تھیں۔ معراج رسول صاحب بذاتِ خود نہ صرف بہترین شخصیت کے مالک تھے بلکہ انسانیت کی بھلائی کے حوالے سے فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور آج آپ کی وفات پر کتنے ہی لوگوں نے انکشاف کیا کہ ان کے گھروں کو انتہائی خاموشی سے چلانے اور ان کے بچوں کی تعلیم کو جاری رکھنے میں معراج رسول صاحب نے کس قدر اہم کردار ادا کیا...... اور بقول ان سب لوگوں کے "معراج رسول نے جو کچھ ہمارے لیے کیا، اب اس کے لوٹانے کا وقت آگیا ہے۔" اور یوں بے تحاشا دعاؤں اور فاتحہ خوانی کے تحائف آپ کے حصے میں آتے چلے گئے...... بے شک اللہ رب العزت اپنے پسندیدہ بندوں سے ہی اتنے بڑے کام لیتا ہے اور آخر میں اپنے ان پیارے بندوں کو بہت پیار سے اپنے پاس بلا لیتا ہے لہٰذا آپ کی زندگی کا یہ سفر بھی 22 فروری 2019ء بروز جمعہ اپنے اختتام کو پہنچا اور سب سے روشن ستارہ آسمان کی وسعتوں میں کہیں گم ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بلاشبہ دنیا، آخرت کی کھیتی ہے، رختِ سفر انسان کے اعمال ہی اس کے لیے زادِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ معراج رسول کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آخرت کے اس سفر کو آسان کردے۔ (الٰہی آمین)

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

اس افسوسناک خبر کے بعد اب ہم چلتے ہیں اپنی محفلِ خطوط کی جانب جسے اس بار انتہائی اختصار کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔

✠ ڈاکٹر شیر شاہ سید کا کراچی سے تعزیتی پیغام ”سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے محترم معراج رسول صاحب کے انتقال کی خبر مجھے دی۔ نہ جانے کیسے مجھے اس کی اطلاع نہیں مل سکی۔ مرحوم اپنی ذات میں بے شمار خوبیاں رکھتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اپنے جریدوں کے ذریعے آگہی اور شعور بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بے شک انہوں نے بھرپور اور کارآمد زندگی گزاری۔ وہ میرے والد صاحب کے بہترین شاگرد تھے۔ مہربانی کر کے میری جانب سے تمام اہلِ خانہ کو تعزیت کا پیغام پہنچادیں۔“

✠ ریاض بٹ، حسن ابدال سے محفل کی زینت بنے ہیں ”سرورق کی حسینہ آنکھیں بند کیے کسی خوبصورت خیال میں غرق ہے...... اس کو اس کے حال پر چھوڑ کے آگے بڑھے تو جون ایلیا صاحب لبِ مہران لیے کھڑے تھے۔ ایک ایک لفظ سیدھا دل میں اتر گیا...... بات وہی ہے جو کسی شاعر نے کہی ہے کہ...... اب جلا کے دل میں آئے وہ پائے روشنی، ہم نے جلا کے دل سرِعام رکھ دیا۔ اس کے بعد بڑھے اپنی محفل کی طرف۔ یہاں چلبلی ہیر کرسی صدارت سنبھالے بیٹھی ہیں۔ آپ کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ بہن آپ کا تبصرہ لاجواب ہے۔ محمد زبیر ساگر مختصر تبصرے کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔ محترم رمضان پاشا حسبِ معمول خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں کیونکہ میری عمر 63 سال ہے۔ خوش رہیں۔ عبدالجبار رومی انصاری کیسے ہو؟ اچھا اور خوبصورت تبصرہ ہے۔ کہانیوں کی طرف بڑھنے سے پہلے آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ نے محفل شعر و سخن میں مجھے پہلا نمبر دیا۔ سب سے پہلے سسپنس کلاسک کے سلسلے کی تاریخی کہانی ہنگامہ زن کی بات ہوجائے۔ الیاس سیتاپوری کی تعریف کرنا ایسے ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھایا جائے حالانکہ یہ محاورہ کافی پرانا ہے۔ لیکن چونکہ وہ کہانیاں بھی ماضی کی سناتے ہیں، اس لیے یہ محاورہ بالکل حسبِ حال ہے۔ یہ بات بھی بہت پرانی ہے کہ صاحبِ اختیار، مجبوروں اور بے اختیاروں کو سزا دیتے آئے ہیں اور یہ بات بھی سچ ہے کہ دلوں کو تلوار کے زور سے تسخیر نہیں کیا جاسکتا...... بادشاہِ وقت نے ابوجعفر [illegible] کے دل سے اس کی محبت نہ نکال سکا اور اس طرح محبت جیت گئی...... اب بات کرتے ہیں مرزا امجد بیگ صاحب کی [illegible] حسبِ معمول بیگ صاحب نے اپنے دلائل اور ہوم ورک سے [illegible] قفس کی کہانی ہے۔ میرے خیال میں کہانی سنانے والا [illegible] بالکل فٹ ہے اور کہانی بھی بہت زبردست ہے...... ابوالفرح ہمایوں کی گرفتارِ بلا ایک انتقام لینے والے [illegible] موکل کو بری کروالیا۔ ابوالفرح ہمایوں صاحب؟ خود اپنے دام میں، آصفہ ضیا احمد کی ایک لالچی اور خودغرض لوگوں کی کہانی ہے۔ جو ہی قاتل تھا۔ کیوں ابوالفرح ہمایوں صاحب؟ ویسے میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ اگر مسرت جہاں تھوڑا صبر کرلیتیں تو کتنا اچھا تھا۔ دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے، اس میں خود ہی گرتا ہے۔ یہ ایک سبق آموز کہانی ہے...... اور مسرت جہاں جیسی عورتوں کو آئینہ دکھانے کا کام کر رہی ہے...... بہت خوب۔ اس بار تنویر ریاض کی تحریر کردہ کہانی قصوروار نے کافی متاثر کیا۔ وقت بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اب کے حسام بٹ صاحب نے کہانی میں جان ڈال دی ہے۔ اب دیکھتے ہیں خوفناک گن والا کون ہے......؟ رنگِ آسمان بھی اپنا رنگ جما رہا ہے۔ اس کی سترھویں کڑی بھی خوب ہے۔ ویسے ایک بات میں آپ کو بتاؤں کہ سلسلے وار کہانیاں میں شوق سے نہیں پڑھتا تھا لیکن وقت اور رنگِ آسمان نے مجھے اس طرح اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے کہ میں ہر ماہ ان کہانیوں کا انتظار کرتا ہوں۔ باقی کہانیوں میں فہمی فردوس کی قہر، ثمر عباس کی اصل بات اور ماہ رخ کی احمق نے بھی متاثر کیا۔ آخری صفحات کی کہانی شکستِ پا کو ابھی پڑھ نہیں سکا۔ اس لیے تبصرے سے معذرت۔“

✠ رمضان پاشا، طارق روڈ، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”مارچ کا سسپنس 15 فروری کو ہی مل گیا۔ سرورق دیکھ کر آدھی نقاہت دور ہوگئی۔ نقاہت اس لیے کہ عاجز دو روز سے بیمار تھا، نزلہ زکام، بخار سردرد۔ اس بار سسپنس نے دوا کا کام کیا، آدھا بخار اتر گیا۔ بعد میں حضرت عیسیٰؑ کا قصہ پڑھا، بخار غائب۔ (گویا مرض نے پہلے اشعار کا مطالعہ کیا [illegible]) [illegible] اچھا تاثر نہ چھوڑ سکی، البتہ قصوروار کافی دلچسپ کہانی تھی۔ خود اپنے دام میں کہانی [illegible] گرفتارِ بلا [illegible] بھرپور کردار تھی۔ [illegible] مصنف نے سمندری طوفان کا ذکر ایسا کیا کہ لگتا ہے مصنف خود بھی ایسے

Digitized by Google

http://urdutubes.com/

طوفان سے گزر چکے ہوں، بہرحال لطف خوب آیا۔ یہی کیفیت وقت کی تھی، مزہ آگیا۔ اصل بات کی اصلیت چھپی نہ رہ سکی۔ احمق کی حماقت بہت پسند آئی۔ روایت، بہت خوب۔ وصلی صاحب نے اصلی کہانی لکھ دی۔ حقیقت بھی بہت دلچسپ تھی۔ آسمان سے گرا بھی کافی مزیدار تھی مگر اختتام کچھ ادھورا سا لگا۔ اس دفعہ محترمہ اسما قادری صاحبہ نے بہت رلایا۔ عنوان کے تحت جو تعارفی تحریر ہے، اسے پڑھ کر ہی اندازہ ہوگیا کہ شکستِ پا، رونے رلانے والی کہانی ہے، سو ایسا ہی ہوا...... باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ ضعیفی اور بیماری کے باعث ہاتھوں میں لرزہ آگیا ہے۔ مگر آپ کی اپنایت اور پسندیدگی میں کمی نہیں آئی۔ بہت شکریہ) اخبار میں یہ خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ محترم معراج رسول صاحب کا انتقال ہوگیا، موصوف بلند اخلاق اور نہایت مہربان صفت کے حامل تھے۔ دعاگو ہوں کہ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)“ (آپ کی جانب سے فاتحہ خوانی ہی مرحوم کے لیے بہترین تحفہ ہیں)

✠ عبدالجبار رومی انصاری، بورے والا سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ”واہ، واہ، واہ موتیوں جیسے دانت، کھل کے مسکراتے ہونٹ، گرز نما جھمکے پہنے اور آنکھیں موندے من ہی من میں جھومتی 35 سالہ حسینہ کا شرمانے کا انداز بے حد اچھا لگا اور ایک کونے میں لگا یا ہوا بے چارہ دیہاتی کہیں دور کی سوچ میں گم ہے (اوہو...... کہیں اس میں آپ کو اپنا عکس تو نظر نہیں آرہا؟) جیسے انکل ایلیا لبِ مہران کی بحرِ بیکراں ہجرت اور ہجرتِ انسانی کے پھلنے پھولنے والے رشتے کو جوڑنے میں مگن ہیں اور یہی سچ ہے جو جہاں سے بھی ہجرت کر کے آیا اور جہاں اس نے اپنا مسکن بنایا، وہیں اس نے اپنا رشتہ جوڑ لیا اور لبِ مہران بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ سدا سے ہجرت میں ہمارا سندھو بھی زمین کے چپے چپے سے ہاتھ ملاتا سمندر سے رشتہ جوڑے گھل مل رہا ہے۔ نہایت ہی افسوس کے ساتھ ایک دوست نے کال پر اطلاع دی کہ دنیائے ڈائجسٹ کے بانی مشہور و معروف میگزین جاسوسی، پاکیزہ، سسپنس اور سرگزشت کے مدیرِ اعلیٰ انکل معراج رسول صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ہم ان کے تمام سوگواران کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ معراج رسول صاحب کے اہلِ خانہ اور تمام سوگواران کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ بلاشبہ وہ ایک بڑی شخصیت تھے اور دنیائے ادب کے حوالے سے ان کی گرانقدر خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ (بے شک جناب معراج رسول صاحب کو ڈائجسٹ کی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا) شیطان مصر تھا کہ حضرت عیسیٰؑ سے خدا کا [illegible] اقرار کروائے مگر خدا نے پیدائش کے وقت انہیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھا تھا، اب بھی انہیں محفوظ رکھا۔ [illegible] جواب دے [illegible] یہودیوں نے شیطان کی پیروکاری میں حضرت یحییٰؑ کو قتل کروادیا اور حضرت زکریا کے درپے [illegible] ایمان افروز تحریر جو حقِ تعالیٰ شانہ کی وحدانیت کو نہایت عمدگی سے روشناس کر رہی ہے، بے حد اچھی لگی۔ حفصہ اور ابوجعفر کی محبت سے گندھی تحریر ہنگامہ زن زبردست تھی جو محبت کا کلس تو بھرپور طریقے سے کشید کرتے مگر شادی کا نام بھی نہ لیتے تھے۔ ان کی محبت بھی ریل کی پٹڑی تھی۔ فاصلہ رکھتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے، جہاں کانٹا بدلتا باہم مل لیتے اور پھر جدا ہوجاتے۔ جو پٹڑی ساتھ آگئی اس کا کلسِ محبت کشید کیا پھر جدا ہوگئے اور آخر کار قبر میں جا پہنچے جہاں سمندر نے ان کے بیچ فاصلہ برقرار رکھا۔ اس دفعہ سسپنس کلاسک کی تحریر بہت اچھی لگی۔ رنگِ آسمان میں رابرٹ کی مکاری کے آگے محبت زدہ سونجنا بھی بے بس ہے۔ خس کم جہاں پاک، ڈاکوؤں سے علی زمان اینڈ کمپنی کی خوں ریز لڑائی کے بعد جان چھوٹ گئی اور جزیرے پر پہنچتے ہی سی ہاک بھی حیرت انگیز طور پر سامنے آگیا...... محبت کے متوالے رینا اور شوکی کو جنرل مائیکل نے شادی کی اجازت تو دے دی ہے مگر لگتا ہے شوکی دل سے مطمئن نہیں ہے۔ بہرحال رنگِ آسمان زبردست جارہی ہے۔ وقت بھی عمدہ رفتار سے سرک رہی ہے۔ علی نے کایا کا انتقام، رابرٹ کو نمونۂ عبرت بنا کر لیا۔ علی کے نام پر دل دھڑکانے والی جیسیکا کے ساتھ علی کو انگارہ سمجھنے والی کاتیا بھی شامل ہونے جارہی ہے اور آخر میں کھوپڑی سے گن کی نال کا لگنا بھی دینارا اپارٹمنٹ کا کوئی سیکیورٹی پلان ہوسکتا ہے۔ عمدہ کہانی۔ ٹام اینڈ جیری میں عدیل نے اپنے آنے جانے کی تاریخوں کو الٹ پلٹ کر کے خود کو بیوی کا قاتل ہونے سے بچانا چاہا اور معصوم ملازمہ راشدہ کو پھنسا دیا یہ تو بھلا ہو بیگ صاحب کا جو اپنے پیشے سے زکوٰۃ نکال کر بغیر تعاون کے ایک سال میں راشدہ کو چھڑوا لائے اور عدیل اور اس کے گواہوں کو جھوٹا ثابت کر کے عدیل کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ ویلڈن بیگ صاحب۔ بے شک رب کی رضا میں راضی رہنے والے ہی خوشیاں پاتے ہیں۔ صابر و شاکر چودھری دلاور نے اپنے خاندان کو خوب سنبھالا۔ زینب نے اپنی مرضی کی، تو

اس افسوسناک خبر کے بعد اب ہم چلتے ہیں اپنی محفلِ خطوط کی جانب جسے اس بار انتہائی اختصار کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔

✠ ڈاکٹر شیر شاہ سید کا کراچی سے تعزیتی پیغام ”سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے محترم معراج رسول صاحب کے انتقال کی خبر مجھے دی۔ نہ جانے کیسے مجھے اس کی اطلاع نہیں مل سکی۔ مرحوم اپنی ذات میں بے شمار خوبیاں رکھتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اپنے جریدوں کے ذریعے آگہی اور شعور بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بے شک انہوں نے بھرپور اور کارآمد زندگی گزاری۔ وہ میرے والد صاحب کے بہترین شاگرد تھے۔ مہربانی کر کے میری جانب سے تمام اہلِ خانہ کو تعزیت کا پیغام پہنچادیں۔“

✠ ریاض بٹ، حسن ابدال سے محفل کی زینت بنے ہیں ”سرورق کی حسینہ آنکھیں بند کیے کسی خوبصورت خیال میں غرق ہے...... ہم اس کو اس کے حال پر چھوڑ کے آگے بڑھے تو جون ایلیا صاحب لبِ مہران لیے کھڑے تھے۔ ایک ایک لفظ سیدھا دل میں اتر گیا...... بات وہی ہے جو کسی شاعر نے کہی ہے کہ...... اب جلا کے دل میں آئے وہ پائے روشنی، ہم نے جلا کے دل سرِ عام رکھ دیا۔ اس کے بعد بڑھے اپنی محفل کی طرف۔ یہاں چلبلی ہیر کرسی صدارت سنبھالے بیٹھی ہیں۔ آپ کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ بہن آپ کا تبصرہ لاجواب ہے۔ محمد زبیر ساگر مختصر تبصرے کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔ محترم رمضان پاشا حسبِ معمول خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں کیونکہ میری عمر 63 سال ہے۔ خوش رہیں۔ عبدالجبار رومی انصاری کیسے ہو؟ اچھا اور خوبصورت تبصرہ ہے۔ کہانیوں کی طرف بڑھنے سے پہلے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ آپ نے محفل شعروسخن میں مجھے پہلا نمبر دیا۔ سب سے پہلے سسپنس کلاسک کے سلسلے کی تاریخی کہانی ہنگامہ زن کی بات ہو جائے۔ الیاس سیتاپوری کی تعریف کرنا ایسے ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھایا جائے حالانکہ یہ محاورہ کافی پرانا ہے۔ لیکن چونکہ وہ کہانیاں بھی ماضی کی سناتے ہیں، اس لیے یہ محاورہ بالکل حسبِ حال ہے۔ یہ بات بھی بہت پرانی ہے کہ زور آور...... صاحبِ اختیار، مجبوروں اور بے اختیاروں کو سزا دیتے آئے ہیں اور یہ بات بھی سچ ہے کہ دلوں کو تلوار کے زور پر تسخیر نہیں کیا جاسکتا...... بادشاہِ وقت نے ابوجعفر کو سولی پر تو چڑھا دیا لیکن حفصہ کے دل سے اس کی محبت نہ نکال سکا اور اس طرح محبت جیت گئی...... اب بات کرتے ہیں مرزا [illegible] بالکل فٹ ہے اور کہانی بھی بہت زبردست ہے...... [illegible] موکلہ کو بری کروالیا۔ ابوالفرح ہمایوں کی گرفتارِ بلا ایک [illegible] انتقام لینے والے شخص کی کہانی ہے۔ میرے خیال میں کہانی سنانے والا ہی قاتل تھا۔ کیوں ابوالفرح ہمایوں صاحب؟ خود اپنے دام میں، آصف ضیا احمد کی ایک لالچی اور خودغرض لوگوں کی کہانی ہے۔ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے، اس میں خود ہی گرتا ہے۔ ویسے میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ اگر مسرت جہاں تھوڑا صبر کر لیتیں تو کتنا اچھا تھا۔ یہ ایک سبق آموز کہانی ہے...... اور مسرت جہاں جیسی عورتوں کو آئینہ دکھانے کا کام کر رہی ہے...... بہت خوب۔ اس بار تنویر ریاض کی تحریر کردہ کہانی قصوروار نے کافی متاثر کیا۔ وقت بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اب کے حسام بٹ صاحب نے کہانی میں جان ڈال دی ہے۔ اب دیکھتے ہیں خوفناک گن والا کون ہے......؟ رنگ آسماں بھی اپنا رنگ جما رہا ہے۔ ان کی ستر ہویں کڑی بھی خوب ہے۔ ویسے ایک بات میں آپ کو بتاؤں کہ سلسلے وار کہانیاں میں شوق سے نہیں پڑھتا تھا لیکن وقت اور رنگِ آسمان نے مجھے اس طرح اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے کہ میں ہر ماہ ان کہانیوں کا انتظار کرتا ہوں۔ باقی کہانیوں میں بھی فردوس کی تہمد، ثمر عباس کی اصل بات اور ماہ رخ کی احمق نے بھی متاثر کیا۔ آخری صفحات کو یعنی آخری صفحات کی کہانی شکستِ پا کو ابھی پڑھ نہیں سکا۔ اس لیے تبصرے سے معذرت۔“

✠ رمضان پاشا، طارق روڈ، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”مارچ کا سسپنس 15 فروری کو ہی مل گیا۔ سرورق دیکھ کر آدھی نقاہت دور ہو گئی۔ نقاہت اس لیے کہ ما جود روز سے بیمار تھا، نزلہ زکام، بخار سر درد۔ اس بار سسپنس نے دوا کا کام کیا۔ سب سے پہلے اشعار کا مطالعہ کیا، آدھا بخار اتر گیا۔ بعد میں حضرت عیسیٰؑ کا قصہ پڑھا، بخار غائب۔ (گویا مرض نے بالکل ہی خدا حافظ کہہ ڈالا) گرفتارِ بلا کچھ اچھا تاثر نہ چھوڑ سکی، البتہ قصوروار کافی دلچسپ کہانی تھی۔ خود اپنے دام میں کہانی بہت عمدہ تھی۔ رنگِ آسماں کی یہ قسط بہت بھڑکدار تھی۔ مصنف نے سمندری طوفان کا ذکر ایسا کیا کہ لگتا ہے مصنف خود بھی ایسے

طوفان سے گزر چکے ہوں، بہرحال لطف خوب آیا۔ یہی کیفیت وقت کی تھی، مزہ آگیا۔ اصل بات کی اصلیت سمجھ نہ رہ سکی۔ احمق کی حماقت بہت پسند آئی۔ روایت، بہت خوب۔ وصلی صاحب نے اصلی کہانی لکھ دی۔ حقیقت بھی بہت دلچسپ تھی۔ آسمان سے گرا بھی کافی مزیدار تھی مگر اختتام کچھ ادھورا سا لگا۔ اس دفعہ محترمہ اسما قادری صاحبہ نے بہت رلایا۔ عنوان کے تحت جو تعارفی تحریر ہے، اسے پڑھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ شکستِ پا، رونے رلانے والی کہانی ہے، سو ایسا ہی ہوا...... باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ ضعیفی اور بیماری کے باعث ہاتھوں میں لرزہ آگیا ہے مگر آپ کی اپنایت اور پسندیدگی میں کمی نہیں آئی۔ بہت شکریہ) اخبار میں یہ خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ محترم معراج رسول صاحب کا انتقال ہو گیا، موصوف بلند اخلاق اور نہایت مہربان صفت کے حامل تھے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)“ (آپ کی جانب سے فاتحہ خوانی ہی مرحوم کے لیے بہترین تحفہ ہیں)

✠ عبدالجبار رومی انصاری، بورے والا سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ”واہ، واہ، واہ موتیوں جیسے دانت کھل کے مسکراتے ہونٹ، گرز نما جھمکے پہنے اور آنکھیں موندے من ہی من میں جھومتی 35 سالہ حسینہ کا شرمانے کا انداز بے حد اچھا لگا اور ایک کونے میں لگایا ہوا بے چارہ دیہاتی کہیں دور کی سوچ میں گم ہے (اوہو...... کہیں اس میں آپ کو اپنا عکس تو نظر نہیں آرہا؟) جیسے انکل ایلیا لبِ مہران کی بحر بیکراں ہجرت اور ہجرتِ انسانی کے پھلنے پھولنے والے رشتے کو جوڑنے میں مگن ہیں اور یہی سچ ہے جو جہاں سے بھی ہجرت کر کے آیا اور جہاں اس نے اپنا مسکن بنایا، وہیں اس نے اپنا رشتہ جوڑ لیا اور لبِ مہران بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ سدا سے ہجرت میں ہمارا سندھ ہو بھی زمین کے چپے چپے سے ہاتھ ملاتا سمندر سے رشتہ جوڑے گھل مل رہا ہے۔ نہایت ہی افسوس کے ساتھ ایک دوست نے کال پر اطلاع دی کہ دنیائے ڈائجسٹ کے بانی مشہور و معروف میگزین جاسوسی، پاکیزہ، سسپنس اور سرگزشت کے مدیرِ اعلیٰ انکل معراج رسول صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ہم ان کے تمام سوگواران کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ معراج رسول صاحب کے اہلِ خانہ اور تمام سوگواران کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ بلاشبہ وہ ایک بڑی شخصیت تھے اور دنیائے ادب کے حوالے سے ان کی گرانقدر خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ (بے شک جناب معراج رسول صاحب کو ڈائجسٹ کی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا) شیطان مصر تھا کہ حضرت عیسیٰؑ سے خدا کا [illegible] شر سے محفوظ رکھا تھا، اب بھی انہیں محفوظ رکھا۔ [illegible] نے شیطان کی پیروکاری میں حضرت یحییٰؑ کو قتل کروا دیا اور حضرت زکریاؑ کے درپے ہو گئے۔ انبیاؑ کی ایمان افروز تحریر جو حق تعالیٰ شانہ کی وحدانیت کو نہایت عمدگی سے روشناس کر رہی ہے، بے حد اچھی لگی۔ حفصہ اور ابوجعفر کی محبت سے گندھی تحریر ہنگامہ زن زبردست تھی جو محبت کا لمس تو بھرپور طریقے سے کشید کرتے مگر شادی کا نام بھی نہ لیتے تھے۔ ان کی محبت بھی ریل کی پٹری کی تھی۔ فاصلہ رکھتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے، جہاں کانٹا بدلتا باہم مل لیتے اور پھر جدا ہو جاتے۔ جو پٹڑی ساتھ آگئی اس کا لمسِ محبت کشید کیا پھر جدا ہو گئے اور آخرکار قبر میں جا پہنچے جہاں سمندر نے ان کے بیچ فاصلہ برقرار رکھا۔ اس دفعہ سسپنس کلاسک کی تحریر بہت اچھی لگی۔ رنگِ آسماں میں رابرٹ کی مکاری کے آگے محبت زدہ سوجنا بھی بے بس ہے۔ خس کم جہاں پاک ڈاکوؤں سے علی زمان اینڈ کمپنی کی خوں ریز لڑائی کے بعد جان چھوٹ گئی اور جزیرے پر پہنچتے ہی سی ہاک بھی حیرت انگیز طور پر سامنے آگیا...... محبت کے حوالے رینا اور شوکی کو جنرل مائیکل نے شادی کی اجازت تو دے دی ہے مگر لگتا ہے شوکی دل سے مطمئن نہیں ہے۔ بہرحال رنگِ آسماں زبردست جا رہی ہے۔ وقت بھی عمدہ رفتار سے سرک رہی ہے۔ علی نے کایا کا انتقام، رابرٹ کو نمونۂ عبرت بنا کر لیا۔ علی کے نام پر دل دھڑکانی جیسیکا کے ساتھ علی کو انگارہ سمجھنے والی کاتیا بھی شامل ہونے جا رہی ہے اور آخر میں کھوپڑی سے گن کی نال کا لگنا بھی دینارا اپارٹمنٹ کا کوئی سیکیورٹی پلان ہو سکتا ہے۔ عمدہ کہانی۔ ٹام اینڈ جیری میں عدیل نے اپنے آنے جانے کی تاریخوں کو الٹ پلٹ کر کے خود کو بیوی کا قاتل ہونے سے بچانا چاہا اور معصوم ملازمہ راشدہ کو پھنسا دیا یہ تو بھلا ہو بیگ صاحب کا جو اپنے پیشے سے زکوٰۃ نکال کر بغیر تعاون کے ایک سال میں راشدہ کو چھڑوا لائے اور عدیل اور اس کے گواہوں کو جھوٹا ثابت کر کے عدیل کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ ویلڈن بیگ صاحب۔ بے شک رب کی رضا میں راضی رہنے والے ہی خوشیاں پاتے ہیں۔ صابر و شاکر چودھری دلاور نے اپنے خاندان کو خوب سنبھالا۔ زینب نے اپنی مرضی کی، تو

http://urdutubes.com/

لٹ پٹ کر طلاق لے کر واپس آئی اور اپنی نشانی قاسم کی صورت چھوڑ کر راہیِ ملکِ عدم ہوئی۔ کمال احمد نے زینب کو وفاداری کی سزا دی تو آخر میں خود بھی لاچار اذیت میں بسترِ مرگ پر پہنچا۔ چودھرانی سکینہ نے بلقیس کو زہر دیا تو اس کی آنکھیں کھلیں۔ بہرحال بلقیس اور قاسم ایک ہوئے اور چودھری دلاور کا گھر بھی امن و محبت کا گہوارہ بن گیا۔ مسرت جہاں کی نوٹوں کی گڈی نے شبنم کو تنویر کی سیکنڈ دلہن بنا دیا جو بی ایم ڈبلیو سے کم جھولتی ہی نہیں تھی مگر تنویر کے دیے تحفے ٹوٹا کر دلا کو جھولنا پڑا تو اپنے گھمنڈ اور غرور سمیت ہمیشہ کے لیے جھول گئی جبکہ رانیہ محبوب شوہر کی اصل پناہ گاہ پر ہی صابر اور خوش تھی اور تبھی ایمان کی صورت اس کی گود ہری ہوئی۔ خود اپنے دام میں عمدہ کہانی بے حد پسند آئی۔ قاتل و مقتول کی رسا کشی دلچسپ رہی۔ روایت میں شیزا جیسی نازک لڑکی نے عماد کا ساتھ دے کر ناصر اور نقاش کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ انجلی کو بچانے والی سوزن نے جنسی تشدد کا انتقام لینے کے لیے سات قتل کیے، آخر پکڑی گئی، مشن اچھی رہی۔ معاشی طور پر کمزور مارشل آرٹ کے ماہر چاؤ فان نے بھی متاثر کیا۔ سیریل کلر مارتھر کو ٹھکانے لگا دیا۔ ڈکیت بننے جا رہا تھا اور چاؤ فان ہیرو بن کے لوٹا۔ زبردست۔ محفلِ شعر و سخن سے وردہ جنید، کمال انور اور زبیر خان کے شعر اچھے لگے۔ خطوط کی محفل سے دل جمعی سے کام کرنے والی پیدائشی عقلمند کو اس کا صلہ ملا تو چلبلی ہیر صدرِ محفل قرار پائیں۔ مبارکاں۔ محمد زبیر ساگر، جرار احمد، عبداللہ ترین، عابد علی اور مہتاب احمد کے تبصرے اچھے لگے اور رمضان پاشا، ریاض بٹ کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ مجھے یاد رکھنے کا بے حد شکریہ۔ سدا جیوے میرا پاکستان۔"

✻ چلبلی ہیر، جھنگ سے چلی آرہی ہیں "مارچ 2019ء کا خوبصورت ترین ٹائٹل کے ساتھ سسپنس ڈائجسٹ 16 فروری کو مل گیا۔ بک اسٹال والے روڈ پر اتنا رش تھا کہ پورے بیس منٹ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے لگے۔ آخر خود گاڑی سے نکل کر بک اسٹال والے کو متوجہ کر کے ڈائجسٹ منگوایا۔ شام کو فرصت ملنے پر سسپنس کھولا تو خوشی اور حیرت کا جھٹکا لگا۔ بہت شکریہ یمنیٰ احمد جی...... خیال آفریں شام کا مہران لبِ مہران اور جون ایلیا جی انشائیہ بہت لاجواب اور خوبصورت رہا۔ ویلڈن۔ اداریہ حالاتِ حاضرہ پر مبنی تھا۔ بہت شاندار انداز میں لکھتی ہیں ہماری مدیرہ صاحبہ (بہت شکریہ) محفل میں حاضری دی تو عابد دولت صدر سپیشان تھی، کبھی کبھی اپنا تبصرہ پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ [illegible] (تو پھر سچ بتاؤ کس سے لکھواتی ہو) رمضان پاشا صاحب کا بھی کافی عمدہ تبصرہ تھا۔ رومی انصاری صاحب [illegible] میں۔ جرار احمد جعفری اور عبداللہ ترین نیو انٹری ہیں۔ عبداللہ ترین بھیا کے مشورے پر عمل کرنے کا [illegible] کر دی۔ بابا لوگوں کی بھی کر دیتے تعریف۔ ریاض بٹ بھائی جی، مجھے اچھا لگا آپ نے بہن کے رشتے سے پکارا۔ سلامت رہے میرا بھائی۔ دوست تلاش کرتے آئے۔ سسپنس کلاسک میں تاریخی صفحات میں الیاس سیتاپوری جی ہنگامہ زن لے کر آئے۔ بہت ہی زبردست۔ ویلڈن۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی ٹام اینڈ جیری پڑھ کر پتا چلا کہ ٹام اور جیری اتنے پرانے نہیں اور عورتوں کو زیادہ غصہ بھی نہیں کرنا چاہیے ورنہ انجام برا ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے راشدہ کو بھی بری کروالیا۔ شکستِ پا اور اسما قادری صاحبہ ایسا بہترین لکھتی ہیں کہ رسالے کی قیمت ان کی ہی کہانی پر پوری ہو جاتی ہے۔ ویلڈن جی۔ قاسم اور بلقیس کو ملا ہی دیا۔ بہت اچھا لگا۔ روایت اعتزاز سلیم وصلی کی بھی سسپنس سے بھرپور اسٹوری رہی۔ عماد اور شیزا دونوں بہت ہوشیار نکلے اور کروڑوں کے مالک بن گئے۔ آسمان سے گرا بابر نعیم بھی متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ ثمر عباس صاحب بھی ہمیشہ اچھی کہانی لے کر آتے ہیں۔ اس بار اصل بات بھی کافی عمدہ رہی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوسرا حصہ بہت اثر انگیز تھا۔ رضوانہ ساجد جی ایسی باریکیوں سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ جس کا علم ہمیں پہلے نہ تھا۔ جزاکم خیراللہ۔ سلسلے وار داستانیں تو اس ڈائجسٹ کی جان ہیں رنگِ آسمان اے آر راجپوت اور وقت حسام بٹ صاحب کی تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہوگا۔ دونوں رائٹرز مبارک باد کے حق دار ہیں۔ دعا گو ہوں زورِ قلم اور زیادہ۔ اشعار کی محفل تو بور اور بوگس شعروں پر مشتمل تھی۔ ہاں کترین اے [illegible]ن اور کمال تھیں۔ بہرحال رسالہ سسپنس ڈائجسٹ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔"

✻ زرمین خان آفریدی، حیدرآباد سے تشریف لائی ہیں "2019ء ویسے بھی خوبصورتی کا سال ہے اور سسپنس ڈائجسٹ والے بھی خوبصورتی [illegible] رہے ہیں۔ [illegible] ٹائٹل اور اسٹوریز کی صورت میں...... ڈائجسٹ بروقت مل گیا۔ میں ہمیشہ انشائیہ [illegible] جون ایلیا صاحب کی خوبصورت باتیں ضرور پڑھتی ہوں۔ اس بار تو لبِ مہران پیارا مہران پر نظرِ کرم تھی۔ شاندار اشعار کی

صورت میں۔ اداریہ بھی پیار بھرے انداز میں حالاتِ حاضرہ پر تعریف و تنقید تھی۔ محفل میں دعائے خیر پڑھ کر داخل ہوئے تو خیراں بی بی...... مطلب چلبلی ہیر صاحبہ صدارت پر قبضہ شروع کر چکی تھیں۔ مبارک باد۔ تبصرے میں ڈائجسٹ کے ہر پہلو پر نظر ہوتی ہے۔ کافی صاف گوئی سے تبصرہ کرتی ہیں۔ محفل میں پرانے تبصرہ نگاروں کے ساتھ چار نئے تبصرہ نگار بھی تھے۔ ویلکم صاحبان...... کہانیوں کی ابتدا آخری صفحات شکستِ پا اسما قادری صاحبہ سے کی۔ ادارہ خوش قسمت ہے کہ اسما جی جیسی پوزیٹو تحریریں دینے والی رائٹر ملی ہوئی ہیں۔ بہت زبردست لکھتی ہیں۔ اسٹوری میں کہیں تشنگی نہیں رہتی۔ کلاسک اسپیشل میں ماضی کا آئینہ ہنگامہ زن اور الیاس سیتاپوری بہت زبردست۔ ابوجعفر، حفصہ اور ابوسعید سب اپنی اپنی زندگی میں ہنگامہ کر کے چل بسے۔ یہ ہے زندگی...... سلسلے وار کہانیاں اپنی ڈگر پر رواں دواں اور کامیاب ہیں۔ اے آر راجپوت کی رنگِ آسماں سمٹ رہی ہے، لکھنے کا انداز اچھا ہے۔ وقت میں حسام بٹ صاحب علی کو ایک وفادار دوست عظیم کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہیں دے رہے۔ حالانکہ عظیم اور کراچی والا کہانی کا حصہ بہت دلچسپ تھا۔ وقت کو دو سال بھی ہو گئے پتا ہی نہیں چلا۔ ٹام اینڈ جیری اور مرزا امجد بیگ نے آخرکار غریب راشدہ ماسی کو بے گناہ ثابت کر ہی دیا۔ گریٹ مین اینڈ گریٹ ورک، ویلڈن بیگ صاحب۔ ماہ رخ ارباب کی احمق بھی دلچسپ تحریر تھی۔ دو بہنوں کی عجیب محبت اور عجیب ضد...... بابر نعیم کی آسمان سے گرا بھی پسند آئی۔ دولت کمانے کا شارٹ کٹ ایسے ہی انجام سے دوچار کرتا ہے۔ پورا رسالہ بیسٹ رہا۔ محفل شعر و سخن اور مراسلے بھی معیاری اور دلچسپ تھے۔" (آپ کو رسالہ پسند آ گیا تو سمجھو محنت وصول ہو گئی۔ بہت شکریہ)

✻ محمد زبیر ساگر، گوجرہ سے خط لکھ رہے ہیں "کیا خوبصورت ڈائجسٹ ہے۔ اس دفعہ سسپنس ڈائجسٹ کا ٹائٹل اتنا خوبصورت اور پیارا لگا کہ ٹائٹل دیکھتے ہی دل جھوم جھوم سا گیا اور ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اتنی خوبصورت حسینہ جو ہمیں بہت ہی پیاری لگی جیسے آسمان سے اتری کوئی پری یا جنت سے اتری کوئی حور ہو۔ مارچ کے سسپنس ڈائجسٹ نے تو اپنے رنگ جما دیے۔ جون ایلیا لبِ مہربان نوجوانی اور جوانی کی کتنی ہی حسین ترین اور سنگین ترین شامیں گزاری ہیں۔ لفظوں کے موتی بکھیرتے ساگر ایلیا کیا کہنے ہیں۔ پہلا تبصرہ چلبلی ہیر جھنگ سٹی سے میری پیاری آپی، آپ کا تبصرہ بہت ہی جاندار ہوتا ہے۔ پہلی کہانی تاریخی ہنگامہ زن، بہت بڑے رائٹر الیاس سیتاپوری...... ان کی ہر کہانی زبردست ہوتی ہے۔ رنگِ آسماں اے آر راجپوت اس سلسلے وار کہانی کو بڑے اچھے انداز میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ ہر قسط زبردست ہوتی ہے اور دوسری سلسلے وار کہانی وقت، حسام بٹ صاحب [illegible] قسط میں جان [illegible] علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر، دوسرا حصہ بہت ہی [illegible] کو سکون ملتا ہے۔ [illegible] کردار، قہر، عجیب، ٹام اینڈ جیری، مشن، اصل بات، احمق، حقیقت، روایت، آسمان سے گرا اور محفل شعر و سخن ریاض بٹ، عبدالجبار رومی انصاری، چلبلی ہیر۔ ان ساتھیوں کے شعر بہت پسند آئے۔ سبھی کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ سبھی رائٹر بہت محنت سے لکھ رہے ہیں۔ اس لیے میرے پیارے محبوب سسپنس ڈائجسٹ کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ ترقی دے۔ اب آتے ہیں آخری صفحات کی آخری کہانی شکستِ پا ہماری پیاری آپی اسما قادری میری فیورٹ رائٹر ہیں اور بہت ہی بڑی رائٹر ہیں۔ جن کی ہر کہانی بہت ہی پیاری ہوتی ہے۔ اس دفعہ بھی اسما قادری صاحبہ ایک زبردست اور اچھا موضوع لے کر آئیں سبق آموز کہانی شکستِ پا۔ بہت ہی اچھی اسٹوری ہے۔ میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے کہ آپ اسما قادری صاحبہ سے بڑی سلسلے وار کہانی لکھوائیں۔ (ان شاءاللہ آپ کی یہ خواہش بھی جلد ہی پوری ہو جائے گی) آپ کی میری پیاری آپی عذرا رسول صاحبہ، اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر دے۔ صحت اور تندرستی دے۔ یہ میں دعا کرتا ہوں (آپ کی دعاؤں کا بے حد شکریہ۔ جزاک اللہ) اور میری سب بہن بھائیوں اور سسپنس کے اسٹاف سے درخواست ہے کہ سب مل کر ہر وقت ہر گھڑی دل کی گہرائیوں سے کشمیریوں کے لیے دعا مانگیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مشکل آسان کرے اور ان کو آزادی جیسی نعمت سے نوازے۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ (جس کی ہمیں دل سے قدر کرنی چاہیے) اللہ تعالیٰ ہمارے اس پیارے ملک کی ہر وقت حفاظت فرمائے اور اسے قیامت تک اسی طرح ہمیشہ آباد رکھے۔ آمین۔"

ان قارئین کے نام جن کے نامے شریکِ محفل نہ ہو سکے۔

مونا رضوان، کراچی۔ ممتاز محسن، سیالکوٹ۔ ارشد شمیم، لاہور۔ شاہانہ سلطان، کراچی۔ ملکہ خالد، دادو۔ الماس سلیم، کراچی۔ زرمین اعجاز، ملتان۔ اکرم یاسین، لاہور

اور آخر میں تمام قارئین سے مرحوم معراج رسول صاحب کے لیے فاتحہ خوانی کی درخواست ہے۔

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

وہ لمحے بے حد بوجھل اور قیامت خیز تھے... جب ان سب کے ضبط نے جواب دے دیا تھا کیونکہ اس عظیم استاد کے شاگردوں کی تڑپ میں ایک بہترین انسان سے دائمی جدائی اور علم کی پیاس تشنہ رہ جانے کا غم پنہاں تھا۔ وہاں موجود ہر شخص غم سے نڈھال تھا... لیکن... اس عظیم انسان کے اطمینان اور سکون میں کوئی فرق نہ آیا تھا... بلکہ اس نے انتہائی وقار سے کہا کہ ”انسان کا خاتمہ ایک شائستہ وقار سے ہونا ہی انسانیت کے منصب کی معراج ہے... روح کو کسی آلائش کے بجائے اس کے اصل زیورات عدل وانصاف، شجاعت، سچائی، ضبطِ نفس اور آزادی سے مزین رکھو گے تو موت سے بڑھ کر حسین کچھ بھی محسوس نہ ہوگا۔“ اور یہ کوئی عام انسان نہ تھا بلکہ ذہنوں کو تسخیر کرنے والا عظیم فاتح سقراط تھا جس نے اپنے علم اور اپنے افکار پر سودا کرنے کے بجائے زہر کا پیالہ پینے کو ترجیح دی جو اپنے شاگردوں کے لیے روایات کی اندھی تقلید، توہم پرستی، جہالت اور گھٹن زدہ ماحول میں روشنی، حکمت ودانائی، سچائی اور تازہ ہوا کا واحد روزن تھا اور جس کے چہرے پر موت کے وقت بھی جادوئی مسکراہٹ ایستادہ تھی۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

عظیم فاتح

زویا اعجاز

اس وسیع میدان میں نکھری ہوئی چمکدار دھوپ نے ہر منظر کو تازگی اور خوبصورتی بخش رکھی تھی۔ موسم بہت خوبصورت تھا لیکن وہاں موجود ہجوم فطرت کے ہر حسین نظارے سے بے نیاز تھا۔ ان کی بے تاب نظریں قدرے فاصلے پر کھڑے چند ”مغرور“ سپاہیوں کی حرکات پر گڑی تھیں...... سپاہی انہیں حقارت وتمسخر سے دیکھتے ہوئے وقتاً فوقتاً کچھ تھیلے ہوا میں لہرا رہے تھے۔

”وہ خوراک بانٹ رہے ہیں۔ یہ رزق حاصل کرنے کا بہترین موقع ہے۔“ ہجوم سے ایک ہیجانی آواز ابھری۔

”ہاں! فوراً چلو! اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہم سے بڑا بے وقوف کوئی اور نہ ہوگا۔“ دوسری صدا میں بھی ”بھوک“ کی واضح جھلک تھی۔ یہ اعلان دیگر افراد کے لیے بھی گویا دلی جذبات کی ترجمانی تھا۔ ڈیڑھ درجن سے زائد وہ لوگ لپک کر ایک جانب بڑھنے لگے۔

”رک جاؤ! اپنا مقام اور منصب پہچانو! یہ ندیدگی تمہیں زیب نہیں دیتی۔“ ایک بوڑھے شخص نے آگے بڑھتے ہوئے باوقار انداز میں کہا۔ اس کی عمر تقریباً ”ستر“ سال تھی۔ برف کے گالوں جیسے سفید بال اور داڑھی بالکل بے ترتیب تھی۔ سفید لباس بے داغ لیکن شکن آلود تھا۔ اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر بے نیاز اور اپنی ذات کی بھول بھلیوں میں گم شخص کا سا تھا۔

”خاموش رہو احمق انسان!“ اس کے قریب سے گزرتے ایک شخص نے نفرت سے اسے مخاطب کیا۔

”وہ تمہیں رزق فراہم نہیں کر رہے بلکہ تمسخر اڑا کر لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کرو میرے عزیز!“ اس نے کرب سے کہا۔ ان افراد کو اشیائے خورونوش کی طرف یوں لپکتے دیکھ کر وہ حقیقتاً بہت دکھ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بازو پھیلا کر چند افراد کو آگے بڑھنے سے روکا لیکن ہجوم کی اندھا دھند بھاگ دوڑ سے لڑکھڑا کر نیچے جا گرا۔

”اپنی کوے جیسی آواز بند کرو منحوس آدمی!“ دو افراد خشونت زدہ انداز میں اس کے پاس کھڑے ہو گئے۔

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

''مجھے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ نفرت کبھی کسی سے محسوس نہیں ہوئی۔'' دوسرے شخص نے کہا۔ ''یہ ہمارے لیے دیوتاؤں کا عذاب اور'' ایتھنز'' کا ناسور ہے۔'' اس نے بوڑھے آدمی کو ٹھوکر رسید کرنا چاہی۔

''بس! بہت ہو گیا۔ محترم سقراط کے لیے اب کوئی ایک لفظ نہیں بولے گا۔'' ایک نوجوان نے آگے بڑھتے ہوئے مخالف افراد کو سختی سے تنبیہ کی اور عزت و محبت سے اسے زمین سے اٹھنے میں مدد کرنے لگا۔

''اپنے جذبات پر قابو رکھو فیڈو! یہ لوگ اس وقت جہالت میں مبتلا ہیں۔ اجتماعی جہالت کے خاتمے کے لیے عزت نفس کی قربانی مہنگا سودا نہیں ہوتی۔'' سقراط نے زمین سے اٹھتے ہوئے رسان سے کہا۔ مشتعل افراد اب اس کے ہمراہ موجود نصف درجن کے قریب نوجوانوں کے درشت اور بھرپور جوابی کارروائی پر مائل تاثرات دیکھ کر دوبارہ ہجوم کا حصہ بن گئے۔

''آہ سقراط! یہ لوگ تم سے کسی ''پسو'' جیسا سلوک کرنے لگے ہیں۔ مجھے ان ناسمجھ لوگوں کی نادانیاں دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے۔'' دائیں جانب کھڑے ایک اور شخص نے بہت ہمدردانہ انداز میں کہا۔ سقراط اپنے لباس سے مٹی جھاڑتے ہوئے مسکرانے لگا۔ وہ اس ہمدردی کی آڑ میں پوشیدہ طنز اور حقارت سے بے خبر نہیں تھا۔

''تم یقیناً درست کہہ رہے ہو! میرا لباس [illegible] رتبہ غربت کے ہر معیار سے بدتر ہے لہٰذا مجھ سے ایسا [illegible] روا رکھنا ایتھنز کے شہریوں پر واجب ہو چکا ہے۔'' سقراط نے نرمی سے جواب دیا۔ مسکراہٹ روشنی بن کر اس کے چہرے پر بکھر رہی تھی۔

''آہ...... افسوس...... تمہاری زندگی بھی کس قدر قابلِ رحم ہے۔ ہر راہ گیر تم سے الجھ کر لعن طعن یا زدوکوب کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتا ہے اور تمہاری بے چارگی کی انتہا یہ ہے کہ تم انہیں عدالت میں گھسیٹنے کے اہل بھی نہیں ہو۔''

''خچر اور گدھے کی فطرت میں ہمیشہ دولتیاں مارنا ہی لکھا ہوتا ہے میرے عزیز! اس میں ان پر ناراضی بھلا کیسی؟ عدالتیں تو انسانوں کے لیے ہوا کرتی ہیں۔'' سقراط کا سادہ انداز اور نرم لہجہ ان کے لیے کسی تازیانے سے کم نہ تھا۔

''اگر ہم لوگ بے عقل اور کم فہم ہیں تو تمہارا اپنے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا تم جانتے ہو کہ ایتھنز کا ہر شہری تمہیں پسو، کوے اور بدصورت مینڈک سے زیادہ درجہ نہیں دیتا۔''

''مجھے تو محض ایک ہی بات کا علم ہے...... کہ میں کسی بھی حقیقت سے باعلم نہیں لیکن تمہیں تو معلوم ہوگا کہ اس کائنات میں بہترین اچھائی صرف ''علم'' اور بدترین برائی سب کچھ معلوم ہونے کا ''گمان'' ہے۔ اپنی معلومات کے متعلق اعتماد بھی اچھی بات سہی لیکن ایتھنز کے یہ رہائشی صرف ''رائے دہی'' کے مالک ہیں۔ یہ ہر بات کے متعلق بے سوچی سمجھی رائے دینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اپنے شاندار ماضی میں سانس لیتے ہوئے یہ سب اپنی سابقہ عظمت کے غرور میں حال کی کمزوریاں فراموش کر چکے ہیں۔'' سقراط نے صاف گوئی سے کہا۔

''ہم اب بھی ایک عظیم ریاست ہیں بوڑھے گدھے! تم مایوسی اور گمراہی پھیلانے والی بے سروپا باتیں نہ کرو۔'' اس آدمی نے نفرت کا عملی اظہار کرتے ہوئے ایک جانب تھوکا اور حقارت بھری نظروں سے سقراط کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''بے ضمیر بدمعاش لوگ!'' سقراط کے ساتھ کھڑے ایک شخص نے تلملا کر کہا۔ بھاری بھرکم جسم، ذہین آنکھوں کشادہ پیشانی اور مخلص و ہمدرد دل کا مالک ''کرائٹو'' اس کے بچپن کا دوست تھا۔

''غصہ کیوں کر رہے ہو میرے دوست؟'' وہ مسکرایا۔

''وہ ایک غلط اور نہایت نامناسب بات کہہ رہا ہے۔ میں بہت عرصے سے محسوس کر رہا [illegible] باوجود یہاں [illegible] لوگ تمہارے [illegible] بے حد [illegible] ہیں۔'' کرائٹو نے سنجیدگی سے کہا۔

''تمہیں ان کی رائے سے اختلاف ہے؟'' سقراط نے استفسار کیا۔

''ہاں بالکل! ہر باشعور انسان ایسی سوچ کو جھٹلائے گا۔''

''ٹھیک ہے! لیکن تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہمیں اختلاف کے باوجود ہر ایک کی رائے کا احترام کرنا چاہیے۔ اپنی ذات کے متعلق ان کے شکوک و شبہات کے باوجود میں سبھی کی رائے کا احترام کرتا ہوں۔''

''تمہیں کسی بھی مخالفت سے کوئی فرق کیوں نہیں پڑتا سقراط؟'' کرائٹو نے حیرانی سے کہا۔ ''حالات و واقعات بہت سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔''

''میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت اپنی سوچ اور نظریے سے اتفاق کی ہے میرے دوست! ایتھنز کے شہریوں میں سچائی جھٹلاتے رہنے کی عادت پختہ ہونے لگی ہے۔ میں تو صرف ان کی یہ عادت تبدیل کرنا چاہتا ہوں، جب کسی شہری

ریاست پر غیر قبضہ کر لیں تو وہ سب سے پہلے اپنی رعایا کی عزتِ نفس اور خودداری ہی کچلتے ہیں۔ اب دیکھو ناں! ماضی کی ایک عظیم الشان ریاست ایتھنز کے شہری اپنی سابقہ اتحادی اور موجودہ حاکم اسپارٹا کی سپاہ سے گداگروں کی طرح رزق وصول کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس نہیں کر رہے۔'' اس نے ہجوم کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا ہر ایک لفظ کرائٹو اور تمام شاگردوں کے دلوں پر نقش ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نوعیت کا منفرد ترین معلم تھا جو کسی مخصوص مقام، ادارے یا روایتی طریقہ کار کے برعکس انہیں چلتے پھرتے تعلیم دیا کرتا تھا۔ دوسری جانب شاگردوں کا وہ مختصر جتھا بھی انفرادیت میں اپنی مثال آپ تھا۔ وہ دیوانگی کی حد تک اپنے بوڑھے استاد کی حکمت و دانشمندی اور عظمت کے گرویدہ تھے۔ انہیں اس بات سے کبھی بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ سقراط کی بابت عوام الناس کی عمومی رائے کس حد تک متنازع اور متعصب ہے۔ وہ اس کم رو بوڑھے کی محبت میں گرفتار تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کے وجود میں روشنی و ہدایت کا ایک عظیم منبع موجود ہے۔ اس وقت بھی وہ خاموشی و احترام سے اس کے پیچھے چلتے رہے۔ انہیں منزل کا علم تو نہ تھا لیکن حکمت کے موتی پا لینے کا یقین ضرور تھا۔ سقراط گردونواح میں گشت کرتے [illegible] نظروں سے دیکھنے لگا [illegible] و [illegible] عروج و زوال کے [illegible] حقائق اجاگر ہونے لگے تھے جنہیں اپنے شاگردوں کے گوش گزار کرتا وہ متوازن قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

☆☆☆

''یہ ریاست ماضی میں اس طرح منتشر اور غیر منظم بالکل بھی نہ تھی۔'' سقراط نے متانت سے کہا۔ ''پانچویں صدی قبل مسیح کی سات دہائیوں کے سفر کے بعد وہ ایتھنز کے موجودہ مسائل، مشکلات اور ہر سرد و گرم سے مکمل آشنا ہو چکا تھا۔ ''ہمارا شہر مختلف قصبوں میں تقسیم تھا۔ ہر قصبے سے مخصوص تعداد میں منتخب شدہ لوگ اسمبلی تشکیل دیتے جو بھی ریاستی معاملات کا فیصلہ کرتی، قانون اور آئین سازی کے معاملات سنبھالتی...... ان قوانین کو تسلیم کرنا حکمران سمیت ہر خاص و عام کے لیے لازم تھا۔''

''یونان میں دیگر ریاستوں کا طرزِ حکومت کیا ہے استاد محترم؟'' ایک نوعمر شاگرد نے دریافت کیا۔

''یہاں تین اقسام کے طرزِ حکومت رائج رہے ہیں میرے بچے! پہلی آمریت و بادشاہت ہے۔ دوسری حکومت ''الخالصہ'' ہے جس میں چنیدہ امیر اور بااثر لوگ حکومت کے اہل سمجھے جاتے ہیں۔ اسپارٹا میں یہی طرزِ حکمرانی ہے۔ تیسری صورت ''جمہوریت'' ہے جس میں عورتوں اور غلاموں کے سوا تمام شہری حکومت کے اہل سمجھے جاتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ایتھنز کا طرزِ حکومت (جمہوریت) ہی بہترین رہا ہے۔'' سقراط کا ایک ذہین ترین شاگرد افلاطون پوچھنے لگا۔ اس کی عمر لگ بھگ ستائیس، اٹھائیس سال تھی۔ افلاطون کے دو بڑے بھائیوں اور ماموں کی سقراط سے عرصہ دراز سے ہم آہنگی تھی جس کی بدولت اس

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے
مرزا ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

نے بھی اس عجوبۂ روزگار ''سوفسطائی'' (معلم) سے اوائل عمری ہی سے شناسائی حاصل کرلی تھی۔ وہ بھی اٹھارہ سال کی عمر سے ہی اس کے شاگردوں کے حلقے میں شامل تھا۔ سقراط سے اس کی محبت وانس ایتھنز میں ایک مثال بن چکا تھا۔

''ہاں! میری ان کہنہ سال آنکھوں نے اس ریاست کو ہی نہیں بلکہ یونان کو ایک سنہری دور گزارتے ہوئے دیکھا ہے۔'' سقراط نے قدرے افسردگی سے انہیں بتایا۔ ''یونانی ریاستیں زبان' مذہب اور ثقافت کی یکسانیت کی بنا پر ایک وحدت کی طرح یکجا تھیں۔ یہاں فارسی بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے دوبار حملہ کیا تو تمام تر ریاستیں خانہ جنگی ترک کرکے ان حملوں کے سامنے دیوار بن گئیں۔ اس اتحاد نے دونوں بار مغرور فارسیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔ جنگ کے خاتمے پر تمام شہری ریاستوں پر مشتمل ایک اتحاد قائم ہوا جس کا مقصد عظیم یونان کی تعمیرِ نو اور مستقبل میں پیش آنے والے خطرات کا بھرپور قوت و اتحاد سے مقابلہ کرنا تھا۔ اسی مقصد کے لیے ایک فنڈ بھی قائم کیا گیا جس کے مال ودولت اور خزانے کو ہمارے مقدس شہر ''ڈیلاس'' میں رکھا گیا اور تم جانتے ہو کہ اس ''ڈیلین لیگ'' کی سربراہی بھی ہمارے ایتھنز کا مقدر ٹھہری تھی۔'' سقراط نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''تو پھر یہ اتحاد قائم کیوں نہ رہ سکا؟'' فیڈو نے پوچھا۔ وہ اپنے معلم کا یہ مزاج بہت اچھی طرح جانتا [illegible] اور اس بات سے بھی واقف تھا کہ اس کی یہ مخصوص ذ[illegible] ان تمام شاگردوں کے لیے علمی لحاظ سے بہت فائدہ مند ثابت ہوا کرتی ہے۔

''اس وقت میری عمر غالباً آٹھ' نو برس تھی۔ ایتھنز کی حکمرانی ''پیرکلیز'' کے ہاتھ میں آئی تو اس نے ڈیلاس میں موجود سارا خزانہ ''ایکروپولس'' میں منتقل کرکے شہر کی تعمیر نو شروع کردی۔ بحری راستوں کا انتظام ہوا۔ ایتھنز یونان بھر میں اپنی معاشی اور سیاسی قوت کے لحاظ سے طاقتور ہوتا چلا گیا۔ مشترکہ فنڈ کے اس بے جا استعمال اور ایتھنز کی بڑھتی ہوئی طاقت نے بقیہ ریاستوں میں حاسدانہ جذبات پیدا کردیے اور اسپارٹا ڈیلین لیگ سے الگ ہوکر ایتھنز سے ایک طویل جنگ میں الجھ بیٹھا۔'' اس نے توقف کرتے ہوئے اردگرد نظر آتے اسپارٹائی فوجیوں کو دیکھا اور سلسلۂ کلام کا دوبارہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''جنگ شروع ہونے کے دس سال بعد ایتھنز نے مزاحمت کا شاندار حق ادا کیا۔ اس کے بعد چھ سال تک عارضی صلح رہی لیکن جنگ کے شعلے ایک بار بھڑک جائیں تو انسانی درندگی اور اقتدار کی ہوس طویل عرصے تک ختم نہیں ہوپاتی۔ جنگ ایک بار پھر شروع ہوئی اور اس بار بھیانک شکست ایتھنز کا مقدر بنی۔ اپنی فوجی' سیاسی اور معاشی طاقت کے باعث یونان بھر میں ممتاز اہمیت کا حامل وہ شہر جس کی قیادت میں فارسیوں کو دہری شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا' ایک ذلت آمیز غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔'' اپنے مخصوص دھیمے اور پُرسکون انداز میں کہتا سقراط اب ساتھیوں کے ساتھ ایک بازار میں چلا آیا تھا۔

بازار میں معمول کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ لکڑی سے تعمیر شدہ کھوکھے نما دکانوں کو کاہی رنگ کی موٹی چٹائی سے ڈھانپا گیا تھا جہاں شہری نہایت اطمینان سے اشیائے خور ونوش کی خریداری میں مشغول تھے۔ سقراط کی بے نیاز اور مخصوص ذہنی رو میں کرائٹو کی آواز نے خلل پیدا کیا۔

''سقراط! تمہیں اپنے اہلِ خانہ کے کھانے پینے کے لیے کچھ خرید لینا چاہیے۔''

''اوہ ہاں تم نے خوب یاد کروایا۔ دو روز سے شہر بھر میں گھومتے ہوئے مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں دراصل گھر سے روٹی لینے کے لیے ہی آیا تھا۔ روٹی تو خیر کیا خریدتا، یہاں ہونے والے انسانی بے حرمتی کے پے در پے واقعات نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔'' وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''اب خرید لو [illegible] دوست [illegible] بچے تمہارے [illegible] منتظر [illegible]''

''یہ خریداری مجھے بہت مشکل لگتی ہے بھئی!'' وہ تنکوں سے بنی ٹوکریاں کھنگالنے لگا۔ چند لمحوں میں اس کی نظر ایک سمندری کیکڑے پر جا ٹھہری۔ ''یہ مناسب رہے گا۔ مجھے یہی تول دو۔'' اس نے دکاندار سے کہا اور لباس میں موجود ایک سکہ نکال کر بے دھیانی میں اس دکاندار کی طرف بڑھا دیا۔

عقبی جانب کھڑا کرائٹو، سقراط کے ہر ایک عمل پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کی گہری نظروں سے دکاندار کی آنکھوں اور چہرے پر پھیلنے والی جھنجلاہٹ اور غصہ پوشیدہ نہ رہ سکے۔ وہ قیمت یقینی طور پر مطلوبہ نرخ سے نہایت کم تھی۔ کرائٹو نے سرعت سے اسے اشارہ کرتے ہوئے سقراط کو کچھ بھی جتانے سے منع کردیا اور باقی ماندہ رقم کی ادائیگی خود کرنے کی یقین دہانی کرواکر ایک بار پھر اپنے بہترین دوست کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ ہمیشہ سقراط کی لاعلمی میں اس کے مسائل حل کردیا کرتا تھا۔ دوست کی مالی حالت اور ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر وہ ہر ممکن احتیاط اور

فیاضی کا مظاہرہ کیا کرتا۔ سقراط روٹی اور دیگر سامان لے کر آگے بڑھا تو ایک شاگرد نے فوری طور پر اپنے معلم کو یہ بوجھ ڈھونے کی زحمت سے بچالیا۔

''پھر ملیں گے کرائٹو! میں اب گھر چلوں گا بچو!'' اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا اور ایک پتھریلی روش پر چلتا ہوا اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ فیڈو عقیدت سے سر جھکائے اس کے پیچھے ہی موجود تھا۔ سقراط کا مکان قدرے بلندی پر واقع تھا۔ اسے دروازے کی جھری سے جھانکتی اپنی بے چین اہلیہ کی جھلک نظر آئی۔

''میں کھانے کے لیے ایک نہایت لذیذ چیز لایا ہوں زین تھیپی! تمہیں یقیناً پسند آئے گی۔'' سقراط نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ زین تھیپی سے اس کی شادی پچیس سال قبل ہوئی تھی۔ وہ سقراط سے تقریباً بیس برس چھوٹی اور بے تحاشا حسین تھی۔

''تو بالآخر دو دن کے بعد تمہیں یاد آگیا کہ گھر میں بیوی بچے بھوکے اور تنہا ہیں۔'' وہ کڑے تیوروں سے بولی۔ اس کی تندمزاجی اور جارحانہ طبیعت میں کوئی دورائے نہ تھی۔ شوہر کی بے نیاز طبیعت اور مشاغل اس کے لیے ہمیشہ ہی سے ناقابلِ برداشت تھے۔ اس کا مزاج بھانپ کر سقراط خاموشی سے گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا جہاں تینوں بیٹوں نے بہت محبت وگرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

سقراط نے بھی بھرپور جوابی محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے [illegible] ''[illegible] تمہارا [illegible]۔'' فیڈو [illegible] خاموشی [illegible] بیرونی دروازے کے پاس موجود تھا۔ وہ [illegible] شاگردوں کے ساتھ یہاں آیا کرتا تھا۔ سقراط کے ان سبھی شاگردوں کو اپنے سوفسطائی سے اس قدر عقیدت تھی کہ لمحے بھر کے لیے بھی اس سے علیحدگی ان کے لیے دوبھر ہوجاتی۔ شاگردوں کے اس حلقے میں ایتھنز کے امراء کی اولاد بھی شامل تھی۔ وہ نازونعم میں پروان چڑھے تھے لیکن اس کے باوجود ہر نعمت سے منہ موڑے علم ودانش کی تلاش میں سقراط کے اس چھوٹے سے گھر تک چلے آنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتے۔ اس بے مول سکون واطمینان کے لیے وہ زین تھیپی کی بدگوئی اور تندمزاجی بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرلیا کرتے۔ اس وقت بھی فیڈو گویا اپنے معلم سے تحمل وبردباری کا عملی مظاہرہ سیکھ رہا تھا۔

''شہر بھر میں خوف اور پریشانی کے بھوت ناچتے ہیں۔ ہر طرف اسپارٹائی فوجی دندناتے پھر رہے ہیں۔ ایتھنز کی بیرونی دیواروں اور فصیل کی اینٹ سے اینٹ بجا کر شہر کو یتیم بنادیا گیا ہے۔ خطرات میں پریشان کن حد تک اضافہ ہونے لگا ہے لیکن تمہیں کسی بھی بات کی پروا ہی نہیں ہے۔ اپنے اہل خانہ کے تحفظ اور ان کی ضروریات کی تکمیل سے زیادہ تمہیں شہر بھر میں گھوم کر بحث ومباحثوں کی پروا ہے۔'' زین تھیپی نے ایک بار پھر گرجنا شروع کردیا۔ ''تم کائنات بھر کے رازوں اور مظاہرِ فطرت پر غور کرتے ہو لیکن کبھی اپنی ذات اور اس سے وابستہ افراد پر بھی دھیان دیا کرو سقراط! شہر کے گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرکے تمہارے پاؤں خاک آلود ہوچکے ہیں۔ دو روز سے ہم گھر میں بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔ غالباً تم اپنے الفاظ سے ہی پیٹ بھرتے رہے ہو لیکن یہ طریق کار ہم آج تک نہیں سیکھ سکے۔''

''زین تھیپی! میری بات سنو!'' سقراط نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''میں تمہارے ہر عذر سے واقف ہوں بڑے میاں!'' وہ بدلحاظی سے بولی۔

''مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دو بھئی!'' مسکراہٹ اب بھی اس کے چہرے پر رقصاں تھی لیکن زین تھیپی کی سماعت تو گویا مفلوج ہوچکی تھی۔ وہ اپنے دل ودماغ پر چھائے غبار کو ہر قیمت پر خارج کردینا چاہتی تھی۔

''تمہارا ایتھنز اب اسپارٹا کا غلام بن چکا ہے سقراط! شہریوں نے غلامی کا یہ طوق بخوشی اپنے گلے میں لٹکا لیا ہے۔ [illegible] کے سائے میں آداب غلامی بھی سیکھ گئے [illegible] انہیں تمہاری تقریروں اور بے معنی باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ تم یہ حقیقت تسلیم کیوں نہیں کرلیتے؟ ان کی جہالت دور کرنے سے پہلے اپنی ذات پر توجہ کب دو گے؟'' وہ شوہر کا پُرشکن اور خاک آلود لباس جھنجوڑنے لگی۔ سقراط خاموشی ونرمی سے اسے پیچھے دھکیل کر بے ترتیب لباس درست کرنے لگا۔ زین تھیپی کی یہ ذہنی رو اور مزاج اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔

''ایتھنز ایک غلام ریاست بن چکی ہے سقراط! اجلاس میں جاکر لوگوں کے سامنے تقریریں کرنے سے کیا فائدہ ہوگا؟ اب تمہیں سنجیدگی سے اپنے خاندان کے لیے ذریعۂ معاش تلاش کرنا چاہیے۔ اگر یہ بھی نہیں کرسکتے تو شہر کے دیگر سوفسطائیوں کی طرح اپنے شاگردوں سے فیس ہی وصول کرلیا کرو۔ اپنے دوست ''ایپیا'' سے ہی کچھ سیکھ لو۔ تم سے کم صلاحیتوں کے لوگ ٹھاٹ باٹ سے زندگی گزار رہے ہیں۔ تمہارے شاگرد نامی گرامی امراء کی اولاد ہیں۔ تم سے

http://urdutubes.com/

سیکھنے اور علم حاصل کرنے کی ادائیگی سے ان کے مال و دولت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔'' اس نے ترچھی نظروں سے فیڈو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تو خود ایک لاعلم انسان ہوں زین تھپی! میں کسی کو کیا علم سکھا سکتا ہوں؟ اگر کوئی مجھ سے سیکھ ہی رہا ہے تو تعلیم برائے فروخت نہیں ہوا کرتی۔'' سقراط نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

''اگر تعلیم برائے فروخت نہیں ہے تو اپنے خاندان کا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی اور راہ تلاش کرو یا فلسفے سے پیٹ کی آگ بجھانے کا طریقہ ہمیں بھی سکھا دو۔'' وہ غصے میں باسی روٹیاں اور برتن اٹھا کر فرش پر پٹخنے لگی۔ سقراط نے گہری سانس بھرتے ہوئے اپنا سر تھام لیا۔ ''لیمپر وکلیز'' اور ''سوفرونکس'' میکانکی انداز میں فرش پر بکھری اشیاء اٹھانے لگے۔ تین سالہ ''میلیکس نس'' بھی والدہ کی گرج برس سے ہراساں دکھائی دینے لگا تھا۔ فیڈو اس اثنا میں اپنے استاد کی مدد کے خیال سے اندر لپک آیا۔ زین تھپی اب زار و قطار رونے لگی تھی۔

''دیکھو فیڈو! ہم نے آج تک یہی سنا ہے کہ گرجنے والے بادل برسا نہیں کرتے لیکن خواتین کے معاملے میں ہر کلیہ متضاد ثابت ہوا کرتا ہے۔ زین تھپی کی گرج ہمیشہ آنسوؤں کی بارش میں ڈھل جایا کرتی ہے۔'' سقراط نے اپنی مخصوص بذلہ سنجی سے کہا۔ وہ حقیقتاً اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ زین تھپی کا مزاج آشنا ہونے کے باعث اسے یہ بھی علم تھا کہ اس جھگڑے اور لعن طعن کی اصل [illegible] اشک زنی میں ہی ظاہر ہوگی۔

''میں تمہیں دیوتاؤں کا واسطہ دیتی ہوں سقراط! حقیقت سے نظریں نہ چراؤ۔''

''تم میری نصف بہتر ہو زین تھپی! تم سے بہتر یہ کون جان سکتا ہے کہ میں نے زندگی بھر حقائق کا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سامنا کیا ہے۔'' وہ محبت سے اس کے شانوں پر اپنا بازو پھیلائے چوبی دیوان پر بیٹھ گیا۔

''تو اس سچائی کو بھی قبول کر لو کہ بحیثیت قوم ہم ایک بدترین زوال کا شکار ہیں۔''

''تم نے بالکل درست کہا! یہی بات تو میں ایتھنز کے رہائشیوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ مزید نرمی سے بولا۔

''کیوں کرتے ہو؟ تم ایک معمولی سا نکتہ کیوں فراموش کر رہے ہو کہ ایتھنز کے شہری اس کبوتر کی طرح ہیں جو بلی کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی آنکھیں بند کیے رہنے پر مصر ہے۔ تم اپنی یہ سرگرمیاں ترک کر دو' احتیاط سے زندگی گزارو سقراط! تم کیوں نہیں سمجھتے کہ سالہا سال سے بنائے جانے والے دشمن کسی بھی وقت اپنی نفرت کا زہر تمہاری رگوں میں اتارنے کے درپے ہو جائیں گے۔ نظام حکومت سے لے کر عوام الناس تک تمہارے مخالف ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ تعصب اور نفرت کی یہ لہر کسی ناانصافی کو ہمارے دروازے تک نہ لے آئے۔ تمہیں دیوتاؤں کا واسطہ یہ سب کچھ ترک کر دو۔'' وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ سقراط اس کے خدشات اور تجزیے کو جھٹلا نہ پایا۔ ایتھنز کی فضائیں بے حد زہر آلود ہو چکی تھیں۔ شہریوں نے اسپارٹا کی حکمرانی اور پٹھو حکومت کا قیام قبول کر لیا تھا۔ اس لمحے سقراط کو اپنی بیوی کی فراست و محبت پر بے اختیار پیار آیا۔ زین تھپی بدمزاج اور چڑچڑی سہی لیکن شوہر پرستی اور وفاشعاری میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ اس کے مزاج کا یہ تضاد سقراط کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ لے آیا۔

ازواج کے معاملے میں وہ ہمیشہ خوش قسمت رہا تھا۔ اس کی پہلی شادی مشہور یونانی راہنما ''ارسٹڈیز'' کی پوتی ''میرٹو'' سے ہوئی تھی۔ ان دونوں کی زندگی بھی بہت خوشگوار اور مثالی رہی لیکن بدقسمتی سے ایتھنز کو طاعون کی وبا نے بہت بھیانک انداز میں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شہری آبادی کی ایک کثیر تعداد لقمۂ اجل بنی۔ میرٹو بھی اجل کی رتھ [illegible] نگینیوں [illegible] سقراط کا [illegible] سال [illegible] کافی عرصے بعد اس نے گرہستی کی [illegible] مجبور [illegible] زین تھپی سے شادی کر لی۔ اس کا تعلق اعلیٰ طبقے سے تھا لیکن تندمزاجی اور زبان کی سختی کے باعث تاحال شادی نہ ہو سکی تھی۔ اس کے والد ایک مضافاتی قصبے کے زمیندار تھے۔ انہوں نے سقراط کو خود اپنی بیٹی سے شادی کی پیشکش کی تھی۔ عیش پرستانہ زندگی گزارنے کے باعث وہ شوہر کے عبرتناک معاشی حالات سے گھبرا کر لڑائی جھگڑے پر آمادہ رہتی لیکن اس کی محبت و خلوص بھی بے مول تھے۔

''تم فکر نہ کیا کرو زین تھپی! ایتھنز کا شہزادہ ضرور واپس آئے گا۔ میں ان کے دل و دماغ کے بند کواڑوں پر دستک دیتا رہوں گا۔ سچائی اور حق گوئی سے منہ موڑنا انسانیت کی نفی ہے۔ خاموش' بے حس اور اپنی ضروریات تک محدود رہ کر تو حیوان زندگی بسر کیا کرتے ہیں۔ میں اپنی ذات اور ہم وطن افراد کے لیے حیوانیت کا درجہ قبول نہیں کر سکتا۔ تم بے فکر رہو! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے

بیوی کو بھرپور دلاسا دیا۔ اس نے اپنے ذہن میں مستقبل کی بابت حکمتِ عملی وضع کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔

☆☆☆

کرائٹو ایک بار پھر اسی بازار میں موجود تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ بازار میں خریداروں کا ہجوم اب کافی کم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے مطلوبہ کھوکھے تک آیا اور دکاندار کو سقراط کی بقیہ رقم ادا کر دی۔

''شکریہ کرائٹو! تم اس وقت مجھے ادائیگی کی یقین دہانی کا اشارہ نہ کرتے تو شاید میں اس بے پروا حرکت پر سقراط سے الجھ پڑتا۔'' ارمیتو نامی اس دکاندار نے کہا۔

''شاید نہیں' تم یقیناً اس سے الجھ جاتے۔'' کرائٹو تاسف سے مسکرایا۔ ہر قسم کی صورتِ حال میں مسکراہٹ اور ضبط کا دامن تھامے رکھنے کا فن اس نے اپنے دوست ہی سے سیکھا تھا۔ ''سقراط کے معاملے میں بے صبری' بداخلاقی اور بدگوئی ایتھنز کے شہریوں کا معمول بن گئی ہے۔ وہ باہمی تقلید کا شکار ہو کر اسے زچ کرنے اور نقصان پہنچانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔''

''نن...... نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں!'' ارمیتو کھسیا گیا۔

''تمہارا یہ رویہ اور انکار بھی میرے لیے انوکھی بات نہیں۔ سقراط ہمیشہ کہا کرتا ہے کہ ایتھنز کے لوگ اپنی فطری [illegible] سچائی سننا پسند ہی نہیں کرتے جس [illegible] منہ موڑ لیتے ہیں۔'' [illegible] کرائٹو کے لہجے [illegible] دوست کے لیے [illegible] عقیدت [illegible]

''اب تم اپنی طرف ہی دیکھ لو کیا اس نے کبھی تمہارے ساتھ کوئی برائی کی؟ تمہیں کوئی نقصان پہنچایا؟ لیکن تم پھر بھی تقلید کی رو میں بہہ کر اس کے بارے میں منفی تاثر قائم کیے بیٹھے ہو۔'' وہ ارمیتو کی فرصت اور موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ذہن سے شکوک و شبہات اور تحفظات دور کرنا چاہتا تھا۔

''تم سقراط سے بہت زیادہ محبت کرتے ہو؟'' ارمیتو نے چونک کر کہا۔

''ہاں! میں اس کے لیے اپنی زندگی بھی قربان کر سکتا ہوں۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ارمیتو اب اپنے کھوکھے کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ گیا تھا۔ ''تم کب سے ایک دوسرے سے واقف ہو؟'' وہ دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔

''اس وقت سے جب ہمیں دوستی کے مفہوم کا بھی علم نہ تھا۔ ہم نے ہمیشہ ایک ساتھ وقت گزارا۔ یہاں کا ہر ایک چپا ہماری شرارتوں کا امین ہے۔''

''کیا اس وقت بھی تم ہی سقراط کو مالی تعاون فراہم کرتے تھے؟'' ارمیتو نے طنزاً دریافت کیا۔

''ہرگز نہیں! اس کے والد سوفرونسکس ''الوپیک بستی'' کے مشہور سنگ تراش تھے۔ والدہ ''فیناریٹی'' طبقہ اشرافیہ کی دایہ تھیں۔ ان دونوں کے حلقۂ احباب میں ایتھنز کے نامور افراد شامل تھے۔ وہ مالی لحاظ سے نہایت مستحکم تھے۔''

کرائٹو کی گفتگو کے دوران چند دیگر دکاندار بھی ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ سقراط کی ذات سے وابستہ اسرار، تنازعات اور نفرت نے انہیں بھی بات چیت میں دلچسپی اور حصہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تم یہ سب اس لیے کہہ رہے ہو کہ سقراط تمہارا دوست' ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہے۔'' ہرمز نامی ایک متمول دکاندار نے بھرپور وار کیا۔

''وہ بے شک میرا دوست ہے لیکن میری گویائی میں اتنی بساط کہاں کہ وہ اس کی خوبیوں اور ایتھنز کے لیے خدمات کا احاطہ کر سکے۔'' کرائٹو نے سادگی و بے نیازی سے جواب دیا۔ اسے دلی طور پر ایک خوشی و اطمینان تھا کہ وہ سچائی سے نابلد اور گمراہی میں بھٹکتے ان شہریوں کو کچھ حقائق سے آگاہ کر دے گا۔

''ہم نے سنا ہے کہ تمہارا دوست فوج میں بھی کئی کارنامے سرانجام دے چکا ہے۔'' ارمیتو نے دریافت کیا۔

''ہاں! سقراط ''پیلوپنیس'' کی جنگ میں شریک ہوا تھا۔ سیاسی قیادت اور معاشی مفادات کی وجہ سے ایتھنز اور اسپارٹا میں ہونے والی اس طویل جنگ میں اس نے ''پوٹیڈیا'' کی مہم میں بے جگری سے حصہ لیا تھا۔ ''جنگ ڈیلیم'' کے علاوہ وہ ''ایمفی پولس'' کی جنگ میں بھی شامل تھا۔ اس کی بہادری اور بے خوفی نے ہر کماندار کو متاثر کیا تھا۔ اس جنگ میں پوٹیڈیا کے حلیفوں کو ایتھنز کی فوجوں نے شکست دی جس کے بعد باقی ماندہ فوج پوٹیڈیا کے شہر میں ہی محصور ہو گئی۔ ایتھنز کی فوجوں کا کیا گیا محاصرہ دو سال سے بھی زائد جاری رہا۔ شہر میں قحط نے ڈیرے جما لیے اور لوگ بھوک سے مجبور ہو کر لاشیں کھانے لگے۔ اس وقت انہوں نے شکست تسلیم کر لی اور صرف تن کے کپڑوں میں شہر خالی کرنے کی شرط پر ایتھنز نے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ اس جنگ میں کڑاکے کی سردی تھی لیکن سقراط عام لباس میں ملبوس برفیلی زمین پر برہنہ پاؤں چلتا رہا۔ اس نے کماندار ''ایلسی بائیڈیز'' کی جان بچائی۔ وہ زخمی

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

حالت میں گر گیا تھا لیکن سقراط ایسی حالت میں اسے پیچھے چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے ایلسی بائیڈیز اور اس کے ہتھیاروں کو محفوظ مقام تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ جنگ بندی کے بعد جرنلوں نے ایلسی بائیڈیز کو تمغہ دینا چاہا تو اس نے بانگِ دہل اعلان کیا کہ اس انعام کا اصل حقدار تو صرف سقراط ہے۔" کرائٹو اپنے جوشِ خطابت میں وہاں موجود سبھی افراد کی معنی خیز طنزیہ نظریں اور دبی دبی ہنسی محسوس ہی نہ کر سکا۔ ایلسی بائیڈیز کے نام پر ان کے تاثرات میں واضح تبدیلی پیدا ہوئی تھی لیکن وہ اپنی ہی رو میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"پوٹیڈیا کی جنگ کے پانچ سال بعد ایتھنز نے شمال میں اسپارٹا کی حلیف ریاست "بوشیا" پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا جس کے مطابق اس ریاست کے دو مختلف اطراف سے ایتھنز کی دو افواج نے حملہ کرنا تھا۔ اس کے بعد ایک اندرونی بغاوت کے ذریعے سارے علاقے پر قبضہ کرلیا جاتا۔ بدقسمتی سے یہ راز افشا ہو گیا۔ پینتالیس سالہ سقراط اس فوج میں شامل تھا جس نے اس ریاست کے شہر "ڈیلیم" کی طرف پیش قدمی کرنا تھی۔ وہ افشائے راز سے بے خبر تھے لہٰذا واپسی پر اچانک بوشیا کی افواج کے مدمقابل آ گئے۔ مخالف سپاہ نے انہیں گھیرے میں لے کر ایتھنز کے فوجیوں کا قتل عام شروع کر دیا اور شکست کا کڑوا گھونٹ ہمارے مقدر میں ٹھہرا۔ اس جنگ کا کماندار "جنرل لیکس" تھا۔ ایلسی بائیڈیز بھی اس جنگ میں شامل تھا۔ اس نے برملا اعتراف کیا کہ سقراط نے پوٹیڈیا کی نسبت وہاں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس پر جنگ کا کوئی اثر ہی نہیں تھا۔ اگر اس وقت ہر کوئی سقراط جیسی بہادری کا مظاہرہ کرتا تو ہماری فوج کبھی مغلوب ہو ہی نہ سکتی تھی۔"

"ایلسی بائیڈیز کے بارے میں تمہارا ذاتی خیال کیا ہے پیارے کرائٹو؟" ہرمز نے اسے گھیرنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایتھنز کی اس موجودہ حالت کا ذمے دار یہی شخص تو ہے جو ماضی میں تمہارے دوست کا پسندیدہ ترین شاگرد اور 'منظورِ نظر' بھی رہ چکا ہے۔ کیا یہ بات حقیقت نہیں کہ سقراط کی تعلیم ہی کی بدولت ایلسی بائیڈیز نے اسپارٹا سے وفاداری نبھائی تھی۔" اس نے کف اڑایا۔ کرائٹو کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور وہ فوری طور پر ان کی 'وجۂ نفرت' کی تہ تک پہنچ گیا۔

ایلسی بائیڈیز ماضیِ قریب میں سقراط کا بہترین شاگرد تھا۔ وہ اس کی ذہانت، معاملہ فہمی اور فراست کا بھی بے حد قائل تھا لیکن عملی میدان میں آنے کے بعد اس کی چند شخصی کمزوریوں نے عوام الناس کی نظر میں سقراط کا تاثر بھی مثبت نہ رہنے دیا۔ ان کی منفی سوچ کے پس منظر میں یونان کا ایک قدیم رواج بھی کارفرما تھا جس کے تحت لڑکوں میں بہترین ذہنی و جسمانی خوبیوں کی نشوونما اور مہذب بننے کے لیے ان کا کسی پختہ عمر شخص کے ساتھ منسلک ہونا ضروری تھا۔ عمومی عوامی رائے بھی یہی تھی کہ دیوتاؤں نے مسرت کے لیے خوبصورت لڑکے، جسمانی خواہشات کے لیے طوائفیں اور نسل بڑھانے کے لیے بیویاں پیدا کی ہیں۔

"میں تم سے بالکل اتفاق نہیں کرتا ہرمز! ہمارے حلقہ احباب میں یہ برائی موجود نہیں۔" کرائٹو نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آہا...... یہ بھلا ہم کیسے تسلیم کر لیں؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ عاشق اپنے محبوب کی خاطر ہی ایثار، قربانی اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔" اس کی یہ تاویل سن کر کرائٹو کو شدید غصہ آیا۔ وہ بخوبی سمجھ رہا تھا کہ ایتھنز کے عام شہری چونکہ لڑکوں سے ہم جنسیت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے لیکن امراء اور طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد کے ان حرکات میں ملوث ہونے کی وجہ سے ہی سقراط کو بھی بلاوجہ الزامات کی زد میں [illegible] کہا جاتا تھا۔ اس کا قصور [illegible] تھا کہ [illegible] شہر [illegible] اکثریت اعلیٰ [illegible] تسلیم کیے بنا کوئی چارہ بھی نہیں۔ سقراط صرف [illegible] کی زبان بے تکلفی سے استعمال کرتا ہے اور ایسا کرنے میں اس کا مقصد ذہن و عقل کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کی نظر انسان کی جسمانی خوبصورتی پر نہیں بلکہ عقلی خوبصورتی اور اخلاقی تعلیم ہوا کرتی ہے۔" وہ مدلل انداز میں بولا۔

"لیکن اس کے باوجود ہم سب نے دیکھا کہ اس نے کیا "کارنامے" سر انجام دیے۔" ہرمز نے ایک اور وار کیا۔ "تم ایلسی بائیڈیز کی بات کرتے ہو ہرمز! میں تو مرتے دم تک یہ نہیں بھول سکتا کہ سقراط نے مجرمانہ غفلت کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے ہمارے دلیر سپاہی بیٹوں کی موت کے ذمے دار جرنیلوں کو ہر ممکن طور پر بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ شخص ان لوگوں کے لیے ڈھال بن گیا جن کی وجہ سے ہمارے کڑیل جوان بیٹوں کو قبر بھی نصیب نہ ہو سکی۔ کرائٹو ایک ایسے شخص کی مدح سرائی کر رہا ہے جو اس ہولناک جرم کے بعد آج تک پشیمان نہیں۔ یہ بات زیوس دیوتا کے کرم ہی کی طرح اٹل ہے میرے ساتھیو کہ گزشتہ کچھ عرصے میں ایتھنز پر ٹوٹنے والے بھیانک مصائب

اور آفات کا ذمے دار سقراط ہی ہے۔" اسپارٹن نامی ایک بوڑھے دکاندار نے نفرت سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری واضح تھی۔ کرائٹو گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ یہ ایسا روگ تھا جو اہلِ ایتھنز کے دلوں میں ناسور بن چکا تھا اور وہ اس بارے میں کوئی بھی وضاحت سننے کے لیے تیار ہی نہ ہوتے تھے۔

ان افسوسناک واقعات کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب سسلی میں واقع ایتھنز کی حلیف اور 'ہم نسل آئیونی' ریاست پر اسپارٹا کی ہم نسل "ڈورین" ریاست "سائرکوز" نے حملہ کر دیا۔ نسلی وحدت کے باعث ایتھنز کو بہر صورت مدد کے لیے فوج بھیجنی تھی۔ مشاورت کے بعد ایلسی بائیڈیز کی کمان میں ایک بڑی سپاہ تیار کرلی گئی تاکہ سائرکوز پر حملے کے بعد سارے سسلی پر قبضہ کر کے وہاں سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت اور ٹیکس کی آمدن کو ایتھنز کی معاشی اور فوجی قوت میں اضافے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے کچھ دیر پہلے ہی سقراط نے سب کو تنبیہ کی کہ اس کا وجدان شکست اور بربادی کا عندیہ دے رہا ہے۔ وہ اپنی روح کی ان طاقتور صداؤں کو غیبی آواز کہتا تھا جو اکثر مواقع پر سچی پیش گوئی کیا کرتی تھیں۔ [illegible] تنبیہ پر غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا گیا۔ فوج کی روانگی [illegible] شہر [illegible] جشن منایا [illegible] شب بھر برپا [illegible] نوشی کے بعد [illegible] ہونے والے عوام کے اعصاب پر بجلی اس وقت گری جب گھروں کے باہر ایستادہ "ہرمائی" کے بتوں کو ٹوٹی پھوٹی حالت میں دیکھا گیا۔ اس المناک حادثے کے ڈانڈے سقراط اور اس کے شاگردوں سے جوڑ دیے گئے۔ الزام عائد کرنے والوں کے لیے اتنی توجیہہ ہی بہت تھی کہ ایلسی بائیڈیز اور دیگر شاگرد اپنے استاد کی ہمنوائی میں دیوتاؤں کی اندھی عقیدت پر سوال اٹھایا کرتے ہیں۔ اس سازش کا احساس ہوتے ہی کماندار نے عدالت میں پیش ہو کر اپنا مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس وقت یہ معاملہ سسلی کی مہم کے بعد دیکھے جانے کا حتمی ارادہ کرتے ہوئے اسے روانگی کا حکم دے دیا گیا۔ مہم کی تکمیل سے پہلے ہی ایتھنز کا ایک فوجی دستہ اسے واپس لے جانے اور مقدمے میں پیش کرنے کے لیے سسلی پہنچ گیا۔ ایلسی بائیڈیز کی فراست کے لیے یہ بھانپنا مشکل نہ تھا کہ اس کے لیے موت کا پھندا تیار کر دیا گیا ہے۔ وہ دستے کو چکما دے کر اسپارٹا فرار ہو گیا۔ ایتھنز میں اس کی عدم موجودگی میں مقدمہ چلا کر اسے توہینِ مذہب کے جرم میں سزائے موت سنا دی گئی۔ دوسری جانب اسپارٹا میں سیاسی پناہ کے عوض اس نے ایتھنز کے فوجی راز افشا کر دیے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سسلی کی مہم میں ذلت آمیز ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

ایلسی بائیڈیز کا یہی جرم کم نہ تھا کہ اس کے مشورے پر اسپارٹا نے ایتھنز سے صرف دس میل پر اپنی ایک قلعہ نما چوکی قائم کر کے انہیں معاشی مقاطعے میں جکڑ لیا۔ غداری کا یہ سلسلہ مزید طوالت بھی اختیار کرتا لیکن اسی اثنا میں ایلسی بائیڈیز کے رومانی تعلقات اسپارٹا کی ملکہ سے استوار ہو گئے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو ایلسی بائیڈیز کے پاس اپنی جان بچا کر فارسی گورنرز "ساتراپ" کے پاس چلے جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ وہ ایتھنز واپسی کا خواہشمند تھا تاہم سزائے موت کا اطلاق اس راہ پر ایک قدم بھی آگے بڑھنے نہ دیتا۔ اس کے شاطر دماغ نے اپنی خلاصی کا باعزت طریقہ دریافت کر ہی لیا۔ اس نے اسپارٹا کے اتحادی فارسیوں کو ایتھنز کا ساتھ دینے پر نہ صرف آمادہ کیا بلکہ ایک مختصر سی فوج کے ساتھ اسپارٹا کے خلاف کئی جنگیں جیتنے کے ساتھ خفیہ طور پر ایتھنز کی حکومت کا دھڑن تختہ کرنے کی کوششیں بھی کرتا رہا۔ اس بار قسمت نے یاوری کی۔ ایتھنز میں مسلسل شکستوں نے پہلے ہی عوام میں بددلی پیدا کر رکھی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ فوجی جرنیلوں نے جمہوری حکومت پر شب خون مارا اور چار سو لوگوں پر مشتمل اسپارٹا کی طرز پر ایک "حکومت الخالصہ" قائم کر لی۔ ایلسی بائیڈیز کے لیے عوام کی نظروں میں سرخرو ہونے کا یہ بہترین موقع تھا۔ وہ اس فوجی حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے والے جمہوری راہنماؤں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ یہ مزاحمت بالآخر کامیاب ہوئی اور نئی حکومت نے اس کی خدمات کے عوض سزا میں معافی کا اعلان کر دیا۔

اگلے سال ایتھنز کی جانب سے کمال اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ایک بہت بڑے بحری بیڑے کا کماندار بنا کر سسلی مہم پر روانہ کیا گیا۔ ایلسی بائیڈیز کی آنکھوں میں سسلی کو زیر کرنے کے بعد ایتھنز پر حکمرانی کے خواب سجے تھے لیکن ایک ماتحت جنرل کی غلطی کے باعث اسپارٹا کے کماندار "لائی سینڈرز" نے اسے شکست سے دوچار کر کے خوابوں کا یہ شیش محل بہت ہولناک انداز میں چکنا چور کر دیا۔ مایوسی و ناکامی کے یہ داغ اپنے سینے پر سجائے وہ شمال کے ایک دور افتادہ جزیرے کی طرف نکل گیا جہاں شباب پرستی سے مغلوب ہو کر مقتدر گھرانے کی کسی عورت

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

برس ہا برس سے استعمال ہو رہا ہے

خالص جڑی بوٹیوں اور نباتات کا نچوڑ

شاہی سفوف

شوگرنو

خون اور پیشاب میں شوگر کی موثر ترین دوا

NO SIDE EFFECTS

کیا آپ کو معلوم ہے کہ؟

ڈیلر ☆ خواجہ میڈیکل سٹور بالمقابل ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی ☆ عرفان قادری جڑی بوٹی 10 بابر مارکیٹ لانڈی 3 کراچی ☆ رفیق ٹریڈرز اینڈ دواخانہ رسالہ روڈ حیدر آباد ☆ خالد برادرز مدنی سٹریٹ سکھر ☆ سندھ ہربل ہومیو قدیر روڈ تھلہ سکھر ☆ کلاسک ہومیو مسجد روڈ کوئٹہ ☆ راوی دواخانہ اوگی ☆ مونگا پنسار مین بازار لیاقت آباد ☆ لاہور ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور ☆ ضیا ہومیو سٹور سکندر پورہ پشاور ☆ ناصر دواخانہ 20 صدر لائن پشاور صدر ☆ سٹی ڈرگ سٹور جی ٹی روڈ ٹینگورہ ☆ الجنت پنسار مری روڈ ایبٹ آباد ☆ خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ آباد ☆ بادشاہ دی ہٹی بوہڑ بازار راولپنڈی ☆ زمان دواخانہ روہتاس روڈ جہلم ☆ / الرحمٰن دواخانہ 2 نور باوا گوجرانوالہ ☆ قدیمی دواخانہ کچہری بازار سرگودھا ☆ شاہی طبی دواخانہ چنیوٹ بازار فیصل آباد

مشورہ V.P ڈیلر کے بارے میں معلومات کیلئے 0300-6389463

YouTube Deva Herbal Health Tip Catrain Y! Bdhdeva@yahoo.com

http://urdutubes.com/

سے تعلقات استوار کرنے کی پاداش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ایتھنز کے عوام کے ذہنوں پر ایلسی بائیڈیز کا یہ دوہرا جرم ان مٹ سیاہی سے نقش ہو گیا۔ اس کی شباب پرستی، شراب نوشی، اسپارٹا سے الحاق اور سسلی میں دوبارہ ناکامی کے بعد ایک عورت کے لیے جان گنوانے کے ان سبھی ”گناہوں“ میں سقراط کو بھی حصہ دار بنا دیا گیا۔ ایتھنز میں ایک ہی نظریہ زبان زدِ عام ہوتا چلا گیا کہ ایلسی بائیڈیز کی ان تمام تر کوتاہیوں کی وجہ سقراط کی سنگت، اس کی ذہنی تربیت اور تعلیم ہے۔ اہلِ ایتھنز کے لیے یہی خلش کم نہ تھی کہ اسی سال رونما ہونے والے ایک اور سانحے نے سقراط کی ذات کو مزید متنازع بنا دیا۔

موسم گرما میں ایتھنز اور اسپارٹا کے درمیان ایک بحری جنگ لڑی گئی جس میں ایتھنز نے فتح تو حاصل کر لی لیکن چار ہزار سپاہیوں کی موت نے ہر خوشی گرہن زدہ کر دی۔ یہ سپاہی جرنیلوں کی بے پروائی بلکہ کسی حد تک نااہلی کے باعث ڈوب کر ہلاک ہوئے تھے۔ مناسب حکمتِ عملی اور بروقت کوششوں سے انہیں بچایا جا سکتا تھا۔ یہ لڑائی جن جرنیلوں کی ماتحتی میں لڑی گئی، ان میں سے دو اپنے متوقع انجام کے خوف سے فرار ہو گئے۔ بقیہ کو ملزم ٹھہرا کر مقدمات میں گھسیٹ لیا گیا۔ ایتھنز میں مقدمات کا طریقہ کار [illegible] ماہ کسی ایک مخصوص قبیلے کے لوگوں کو نگران بنا دیا جاتا [illegible] لوگوں پر مشتمل ان افراد کے ذمے مقدمے کے اندراج اور اس کے طریق کار کو چلانے کا کام ہوتا تھا۔ سوئے اتفاق جرنیلوں کا مقدمہ سقراط کے قبیلے کو نمٹانا تھا۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ سقراط اس انتظامیہ کا حصہ بھی تھا جسے جرنیلوں کے خلاف کارروائی کرنی تھی۔ قانون کی رو سے ہر جرنیل پر علیحدہ علیحدہ مقدمہ چلایا جانا ہی مناسب تھا تاکہ صرف قصوروار کو سزا دی جا سکے لیکن عوام کے جذبات اس قدر مشتعل اور بے قابو تھے کہ وہ سبھی کو سزا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس نازک موقع پر سقراط نے حتی المقدور کوششیں کیں کہ قانون کے مطابق ہر ایک پر الگ مقدمہ دائر ہو اور انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے لیکن اکثریت نے اس کی تجویز بے رحمی سے مسترد کر دی۔ سقراط کے سوا کوئی بھی قانون کی پاسداری پر مائل نہ ہو سکا۔ نتیجتاً ان سبھی جرنیلوں کو مجرم قرار دے کر قتل کر دیا گیا۔ مقتولین میں کئی افراد ایسے بھی تھے جو ماضی میں ایتھنز کے لیے شاندار فتوحات سمیٹ چکے تھے لیکن اپنی کڑیل اولاد کی اس الم ناک موت نے عوام کی عقل و شعور سلب کر لیے تھے۔ طیش، مایوسی اور ہیجان کا الاؤ قدرے سرد ہوا تو بہترین فوجی دماغوں کے حامل بے گناہ جرنیلوں سے محرومی کا احساس ان کے دامن سے لپٹ گیا۔ اس عجلت اور خلافِ قانون فیصلے کا ہی نتیجہ تھا کہ ایک سال بعد اسپارٹا نے ایتھنز کی بحری قوت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔

اپنے قابل کمانداروں کے اس بے رحم قتل کے بعد ایتھنز کی بحری قوت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ لائی سینڈر نے ایتھنز کے بحری بیڑے کو مکمل تباہ کر کے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ایک سال بعد ایتھنز نے ہتھیار ڈال دیے۔ جمہوری حکومت کا خاتمہ ہوتے ہی شہر بھر میں ماتم کی رات برپا ہو گئی تھی۔ اس پہ مستزاد لائی سینڈر کے ایما پر تیس افراد پر مشتمل ایک حکومت قائم کر دی گئی جس کی حفاظت کے لیے اسپارٹا کی فوج کا دستہ بھی متعین کیا گیا۔ اس حکومت کو آئین سازی کے بعد ایک وسیع تر حکومت کی تشکیل کی ذمے داری سونپی گئی لیکن ان حکمرانوں نے اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ سقراط کی بدقسمتی یہاں بھی اس کا تعاقب کرتی آ پہنچی تھی۔ اس حکومت کے دو مرکزی افراد کا ماضی بھی سقراط سے وابستہ تھا۔ تیس کے ٹولے کا سربراہ ”کرائٹیاس“ نہ صرف اس کا سابق ہونہار شاگرد بلکہ ”افلاطون“ کا ماموں زاد بھی تھا۔ اس حکومت کا مشیرِ خاص ”شارمیدیس“ افلاطون کا سگا ماموں تھا۔ اہلِ ایتھنز سے [illegible] افلاطون کا عقیدت [illegible] اطاعت [illegible] کو [illegible] بھی [illegible] وہ بلا جھجک [illegible] سمجھتے۔ ان خیالات میں غلطاں [illegible] جوڑنے میں خود کو حق بجانب [illegible] کرائٹو کو اسپارٹس کا ایک اور زہریلا فقرہ حال کی تلخی میں واپس لے آیا۔

”اب خاموش کیوں ہو گئے ہو کرائٹو؟ کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ کرائٹیاس سقراط ہی کا پروردہ ہے؟“

”نہیں! میں حقائق کو جھٹلانے کا فن نہیں جانتا۔ کرائٹیاس ماضی میں سقراط ہی کا شاگرد تھا۔“ اس نے وقار سے کہا۔

”تو پھر یہ بھی تسلیم کر لو کہ ایتھنز پر ایک نیا عذاب بن کر نازل ہونے والا یہ کرائٹیاس تمہارے دوست ہی کے نظریات و عقائد پر عمل کر رہا ہے۔ اس کی کردار سازی کرنے والا سقراط ہی ہے۔“ ارمیتو کے لہجے میں اس بار قدرے جھجک تھی۔

”نہیں! تمہاری یہ سوچ اور نظریہ غلط ہے۔ وہ کرائٹیاس کا ہمنوا نہیں بلکہ وہ تو اسے......“ کرائٹو روانی سے کہتے ہوئے یکدم کسی خیال کے تحت خاموش ہو گیا۔

Digitized by Google

اپنے بہترین دوست کا لاشعوری دفاع کرتے ہوئے وہ ایک حقیقت فراموش کر گیا تھا کہ اس نئی حکومت میں جاسوسی کا نظام بے حد تیز رفتار اور مہلک حد تک غیر ذمے دار بھی ہے۔

''تم لوگ حقائق کا صرف ایک رخ دیکھ رہے ہو ساتھیو!'' کرائٹو نے سنبھل کر کہا۔ ''حقیقت کی بہت سی کڑیاں بہت جلد تم سب کے علم میں آجائیں گی۔ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں۔'' وہ متانت سے کہتے ہوئے مسکرایا۔

''شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو!'' ارمیتو نے سر کھجایا۔ کرائٹو نے چونک کر اسے دیکھا اور سرشاری سے سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اردگرد موجود لوگوں میں اسپائرس اور ارمیتو کے سوا بقیہ نصف درجن افراد کے چہروں اور آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لرزاں دکھائی دے رہی تھیں۔ کرائٹو کے لیے اتنا اطمینان کافی تھا کہ اس نے چند شہریوں کی سوچ کو ایک نئی جہت عطا کر دی ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ حقائق کی سچائی کسی خوشبو کے مانند ان کے ذہنوں میں بسے منفی نظریات کا تعفن ضرور ختم کر دے گی۔ اس مخلص، بے لوث، بے ریا اور شفاف دل کے حامل کرائٹو کو یہ علم ہی نہ تھا کہ سچائی اور حق گوئی اپنا تاوان در تاوان وصول کرنے کے لیے مکمل شدت سے اس کے حلقۂ احباب کی منتظر تھیں۔

☆☆☆

ایتھنز کے شب و روز پر وہی جمود طاری تھا۔

سقراط کے معمولات میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ ایتھنز کے گلی کوچوں میں پھرتا اپنے شاگردوں سے سوال و جواب کا سلسلہ جاری رکھتا۔ اس کی مضطرب روح میں کائنات کے اسرار کھوجنے کی تڑپ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ حکومتی نظام بھی جوں کا توں برقرار تھا۔ ایسے ہی ایک روز وہ باہمی بحث و مباحثے میں مشغول ایک وسیع میدان میں جا نکلے۔ یہاں کہیں کہیں جھاڑیاں جھلک دکھا رہی تھیں۔ ہتھیار بدست فوجی نہایت چوکس اور پُر تکبر انداز میں کھڑے تھے۔ ان کی تیز نظریں لکڑی کے ستونوں پر لٹکتے افراد پر تھیں جن کے ہاتھ اور ٹانگیں بے رحمانہ انداز میں پشت پر بندھے تھے۔ ان کے بے بس وجود مزید نیم جان کرنے کے لیے گردنیں بھی شکنجے میں جکڑی تھیں۔ ان کی زبانیں پیاس سے لٹک رہی تھیں اور بھوک عیاں کرتی پسلیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ انتہائی فاصلے سے بھی بالکل علیحدہ گنی جا سکتی تھیں۔ سقراط کا دل اپنے شہریوں کی یہ حالت دیکھ کر دکھ سے لبریز ہو گیا۔ یہ تمام افراد حکومتِ وقت کے معتوب تھے۔ 'تیس کا ٹولہ' ظلم و جبر کی تمام تر حدود پھلانگ کر حیوانیت کو بھی شرمانے لگا تھا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو تم؟'' ایک سپاہی ان پر نظر پڑتے ہی چلّایا۔ ''اس جگہ سے گزرنے کی اجازت کسی کو نہیں ہے۔ اپنا رستہ ناپو فوراً!''

''یہ تمام افراد ہماری مدد کے مستحق ہیں۔ ان کے لیے کسی کو تو آواز اٹھانی چاہیے۔ یہ کئی دنوں سے اس جان لیوا اذیت میں مبتلا ہیں اور کوئی شہری ان کی دادرسی نہیں کر پا رہا۔ یہ سب ہمارے اپنے ہی تو ہیں۔'' افلاطون نے تاسف سے کہا۔

''سیاست و حکومت میں جب جبر کی ملاوٹ ہو جائے تو ریاستی بھائی چارہ سب سے پہلے متاثر ہوا کرتا ہے۔'' سقراط نے افسردگی سے بوجھل سانس لی۔

''گزشتہ آٹھ ماہ میں اس پٹھو حکومت نے لگ بھگ ''ڈیڑھ ہزار'' افراد کو اپنے انتقام کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ شہری کسی مزاحمت کے بجائے دوسری ریاستوں میں منتقل ہونے کو ترجیح دے رہے ہیں۔'' دوسرے شاگرد سائمن کی آنکھوں میں بھی ضبط کی تپش تھی۔

''میرے لیے بدترین المیہ یہ ہے ان سب کا سرغنہ ''کرائٹیاس'' ہے۔ وہ کرائٹیاس جو کبھی ہم میں سے ہی ایک تھا۔'' افلاطون بے حد مضطرب تھا۔

''ہاں! اگر بھینسوں کی رکھوالی پر تعینات آدمی سے بھینسیں کم یا خراب ہو جائیں اور وہ [illegible] [illegible] نظریں خلاؤں میں کسی نادیدہ نکتے پر مرکوز تھیں۔

''ہم دیوتاؤں سے دعا ہی کر سکتے ہیں کہ ایلسی بائیڈیز اور کرائٹیاس کی وجہ سے ہونے والی ذلت و رسوائی کی پاداش میں ہم سے بھی قطع تعلق نہ کر لے۔'' سائمن نے ایک اور ساتھی سے سرگوشی میں کہا۔

''مجھے بھی یہی خدشہ رہتا ہے۔ دیوتا ایتھنز اور یہاں کے شہریوں پر اپنا رحم پھر سے جاری کرے!'' ساتھی نے بھی خوفزدہ سرگوشی میں جواب دیا۔

''جانے کیوں ایلسی بائیڈیز اور کرائٹیاس نے عقل و منطق سے منہ موڑ لیے ہیں؟ میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ انہوں نے اپنی الہامی صدا پر بھی دھیان کیوں نہ دیا؟ میں نے ہمیشہ تم سب کو بھی اپنی روح سے براہ راست رابطے کے نتیجے کے بعد ہی کوئی اہم فیصلہ یا کام کرنے کا درس دیا ہے۔ ان دونوں کو بھی میں نے یہی تربیت دی تھی لیکن وہ بہت جلد روح و قلب میں پوشیدہ جنون سے مغلوب ہو گئے۔'' خاموشی کے ایک قلیل وقفے کے بعد سقراط گویا ہوا۔ وہ میدان کی حدود سے قدرے باہر چلے آئے تھے۔

''یہاں سے چلو سقراط! کسی سایہ دار مقام پر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' کرائٹو نے اردگرد کے مناظر سے نظریں چرائیں۔ نیم مصلوب افراد کی اذیت دیکھ کر ہر ایک کی طبیعت مکدر ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے درختوں کے جھنڈ کی جانب چل دیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے کرائٹیاس اور تیس کے ٹولے کی بابت 'پاگل پن' کا لفظ ادا کیا تھا۔'' سائمن نے دریافت کیا۔ وہ سبھی سایہ دار زمین پر نیم دراز ہو گئے تھے۔

''کیا تمہارے پاس اس سے بہتر اصطلاح موجود ہے؟'' سقراط نے جوابی سوال کیا۔

''مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ پاگل یا بے عقل نہیں صرف اور صرف مجرم ہیں۔'' سائمن نے اپنی رائے دی۔

''یہ دونوں باتیں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔'' سقراط یہ کہہ کر خاموش ہوا اور چند لمحوں کے بعد سلسلۂ کلام کا آغاز کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تم نے وہ نغمہ تو یقیناً سنا ہوگا جس میں کہا گیا ہے کہ بنی نوع انسان کے لیے سب سے بڑا اثاثہ ''صحت'' ہے۔ خوبصورتی اور امارت کی اہمیت اس سے اگلے زینے ہیں۔''

''جی ہاں! میں نے بالکل سن رکھا ہے۔''

[illegible] وہ [illegible] جھوٹ [illegible] سقراط [illegible] شاداب [illegible] گئے۔ ''سب سے بڑی خوشی انسان کا اپنی روح کی [illegible] اچھائی پہچان کر زندگی گزارنا ہے۔ شر سے مغلوب ہو کر اپنا مقام و منصب بھول جانا پاگل پن ہی تو ہے۔''

''تو کیا اپنے لیے فائدہ اور بہتری تلاش کرنا بھی پاگل پن ہے؟'' فیڈو الجھا۔

''کیسا منافع؟ دولت یا اپنے ہم وطنوں پر اقتدار کا حصول؟ دولت تو ڈھلتی چھاؤں کی طرح ہوا کرتی ہے اور اقتدار کو بھی دوام حاصل نہیں۔ اگر یہ چھین لیا جائے تو ان کے پاس اپنے جرائم کی طویل فہرست کی خلش کے سوا کیا باقی رہ جائے گا؟'' اس نے اپنے تجربات کا نچوڑ بیان کیا۔

''تو حکومت کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہونا چاہیے سقراط؟'' کرائٹو نے استفسار کیا۔

''حکمرانی کے لیے خیر اور منصف مزاجی کا وصف ہونا لازم ہے۔ اگر حکمران ان اوصاف سے محروم ہے تو وہ شر سے مغلوب ہو کر کمزور فیصلے کرے گا اور نتیجتاً عوام میں اپنی عزت سے محروم ہوتا چلا جائے گا۔ حکمران کی بقا دہشت قائم کرنے میں نہیں بلکہ شہریوں کے دلوں میں گھر کر کے انہیں بھی اچھائی کی طرف مائل کرنے میں ہے۔ اسی صورت میں تو ایک بہترین ریاست پروان چڑھ سکتی ہے۔'' اس نے سنہری ریاستی اصول شاگردوں کے گوش گزار کیے۔ حسبِ سابق کئی دیگر شہری بھی ان کے آس پاس اکٹھے ہو چکے تھے۔ سقراط سے اختلافات کے باوجود وہ اس کی گفتگو کے سحر سے بچاؤ میں کبھی کامیاب نہ ہو پاتے تھے۔

''سقراط! زین تھپی یہاں چلی آ رہی ہے، لگتا ہے کوئی اہم معاملہ درپیش ہے۔'' کرائٹو کی نظر ایک جانب اٹھی۔

''میں دو گھنٹوں سے تمہیں ہر جگہ ڈھونڈتی پھر رہی ہوں اور تم یہاں خوبصورت لیکن کھوکھلے اور بے فائدہ جملوں کی ادائیگی میں مصروف ہو۔'' اس نے حسبِ عادت بکنا جھکنا شروع کر دیا۔

''کیا ہوا پیاری؟ اتنی پریشان اور مضطرب کیوں ہو؟ کچھ دیر انتظار کر لیا ہوتا۔ ہم گھر بیٹھ کر بات کر لیتے۔'' سقراط نے متانت و محبت سے کہا۔

''تمہیں کرائٹیاس کی جانب سے چیمبر میں طلب کیا گیا ہے۔ اس عدالتی بلاوے کی کیا وجوہات ہیں؟ اب کیا کر دیا تم نے؟'' وہ ہیجان زدہ تھی۔

''فکر نہ کرو! میں اسے بہ آسانی سنبھال لوں گا۔''

''[illegible] تو میری اصل فکر ہے کہ تم کچھ بھی سنبھالنے کے اہل نہیں ہو۔ [illegible] ہیں بے معنی گفتگو کے سوا آتا ہی کیا ہے؟'' وہ اس طلبی کی وجوہات کا سوچتے ہوئے حسبِ معمول ہلکان ہو چکی تھی۔ دیگر شاگرد بھی معاملے کی ہولناکی مکمل طور پر محسوس کر کے پریشان دکھائی دینے لگے لیکن سقراط کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ و اطمینان رقصاں تھے۔ اسے اپنی سچائی اور دلائل کی قوت پر اعتبار تھا۔

''مجھے کرائٹیاس سے ایک ملاقات تو کرنی ہی تھی۔ بہتر ہوا کہ اس نے خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا۔'' وہ پُرسکون انداز میں کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

سقراط چیمبر کے ہال میں وقار سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔

یہ عمارت خوبصورتی اور نفاست میں اپنی مثال آپ تھی۔ صاف ستھرے ہال میں زینوں اور نشستوں پر چند افراد بیٹھے تھے۔ تکبر، بے رحمی اور سفاکی ان کے بشرے سے عیاں تھی۔ سقراط کو دیکھتے ہی سنہرے بالوں والا ایک شخص

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

کروفر سے مسکراتا ہوا اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کا نام کیلیسو تھا۔

"آؤ سقراط! ہم تمہارے ہی منتظر تھے۔"

"مجھے یہاں طلب کرنے کے لیے اس بار کیا عذر ہے؟" وہ بے خوفی سے بولا۔

"ریاست میں ایک نیا قانون لاگو کیا گیا ہے جس کے تحت کسی بھی قسم کی تقریر اور آزادیِ رائے کے نام پر تنقید کی ممانعت ہے۔ تمہیں بھی ہر قیمت پر اس آئین کی پاسداری کرنی ہوگی۔"

"اس وقت ایتھنز میں مجھ سے زیادہ قانون پرست کوئی شہری نہیں لیکن پھر بھی میں تم سے وضاحت چاہوں گا کہ آج کل تمہاری لغت میں آزادیِ رائے کے نام پر تنقید کے کیا مطالب درج کیے گئے ہیں؟"

"عوامی مقامات پر وعظ و تقاریر بند کردو سقراط!" وہ درشتی سے بولا۔ اسی دوران میں سیاہ بالوں اور سلیقے سے تراشیدہ ڈاڑھی کا حامل ایک جوان العمر شخص بھی وہاں آ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری اور احساسِ برتری کا غرور واضح تھا۔

"میں انہیں مکاری یا فریب نہیں بلکہ مظاہرِ کائنات اور سچائی کی تلاش سکھاتا ہوں۔ کائنات میں پوشیدہ اسرار، اپنی ذات میں خفتہ جوہر، انفرادی و اجتماعی زندگی کے آداب پر باہمی گفتگو کسی بھی قانون میں جرم نہیں ٹھہرائی جا سکے۔ کیوں کرائٹیاس! کیا میں نے کبھی تمہیں بغاوت کے درس دیے تھے؟" وہ کیلیسو کو جواب دیتے ہوئے نووارد کی جانب متوجہ ہوگیا۔ "میں تو ہمیشہ سوال جواب کی صورت میں مکالمات کے بعد شہریوں کا ذہنی افق وسیع تر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"ہم تمہارے لیے اس حکم کو ایک بار پھر صاف لفظوں میں بیان کررہے ہیں۔ نابالغوں کے ذہنوں سے کھیلنا چھوڑ دو۔ تمہیں کسی بھی مسئلے پر نوجوانوں سے بات نہیں کرنی ہے۔" شارکلیز نامی ایک رکن آپے سے باہر ہوگیا۔

"عدل، انصاف اور پاکیزگی پر بھی نہیں؟" سقراط نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"بالکل نہیں! تمہیں سوال وجواب کا ہر سلسلہ ترک کرنا ہوگا۔ بصورتِ دیگر سنگین خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار رہو۔" کیلیسو نے مزید تیور دکھائے البتہ کرائٹیاس ہنوز سرد مہر خاموشی سے کھڑا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں اس نئے قانون کا احترام کرتا ہوں اور ہر ممکن تعمیل کی کوشش بھی کروں گا لیکن میری ایک چھوٹی سی الجھن دور کردو کیلیسو!" اس نے سر کھجایا۔ "تمہاری رائے میں تو بلوغت کی حدِ عمر کیا ہے؟"

"تیس سال سے کم عمر تمام افراد نابالغ اور ناتجربہ کار ہیں۔" کیلیسو نے سرعت سے جواب دیا۔

"اوہ......اچھا! یہ تو بڑی مشکل ہوگئی میرے لیے۔" اس نے بے چینی سے ہاتھ مسلے۔ "اگر میں غلطی سے کسی تیس سال سے کم عمر دکاندار کے پاس زیتون خریدنے چلا گیا تو اس سے قیمت پوچھنے اور بھاؤ تاؤ کرنے کا مجاز بھی نہ رہوں گا۔"

"اپنی گھٹیا حسِ مزاح خود تک محدود رکھو سقراط! ہمارا اصل مدعا تم اچھی طرح سمجھ چکے ہو۔" شارمیدس غرایا۔

"ہاں بالکل! میں جان گیا ہوں کہ تم مجھے انصاف سنہری ریاستی اصول اور بنیادی انسانی حقوق پر شہریوں میں آگاہی پیدا کرنے سے روکنے کے لیے یہ سب کررہے ہو۔"

"اگر تمہیں ریوڑ کی بھیڑوں کی حفاظت و سلامتی مقصود ہے تو رکھوالوں کی عزت اور تعمیل کرو بڑے میاں! ورنہ اس ریوڑ سے کچھ بھیڑیں مزید کم ہوجائیں گی۔" کیلیسو نے ذومعنی انداز میں کہا۔ نشستوں پر براجمان درجن بھر سے زائد افراد کے تاثرات بھی سخت تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ [illegible] لمبے بال [illegible] کرائٹیاس [illegible] دیکھتے ہی اس نے پہلی مرتبہ لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔

"تم سب لوگ "سلامیس" کے باشندے "کلیون" سے بخوبی واقف ہو۔ وہ ایتھنز کی سلامتی کے لیے شدید خطرہ بن چکا ہے۔ ہم نے اسے سزائے موت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ لہٰذا سقراط اور تم چاروں کو اپنی ریاستی وفاداری ثابت کرنے کے لیے اسے کسی بھی طریقے سے گرفتار کرکے لانا ہوگا۔"

کرائٹیاس نے دزدیدہ نظروں سے اپنے سابق معلم کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے براہِ راست بات چیت سے گریز کررہا تھا۔

"میں نے تمہیں منافقانہ روش اور جھوٹ بولنا تو نہیں سکھایا تھا کرائٹیاس!" سقراط نے کہا۔ "تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ جمہوری راہنما کلیون محض تمہاری حکومت کے لیے خطرہ ہے۔ ان سب کو بھی اپنے جرم میں ساتھ ملا کر تم ریاست میں گناہ گاروں کی تعداد میں اضافہ کرکے اپنے ذاتی مفادات کو تقویت دینا چاہتے ہو۔"

"اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے وفاداری ثابت کرنے پر توجہ دو سقراط! یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔" اس نے طلب کیے گئے افراد کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی

عجلت میں اندرونی جانب پلٹ گیا۔ وہ حتی الامکان سقراط سے گریزاں تھا۔

چیمبر کے باہر سبھی شاگرد اس کے منتظر تھے۔

"آج مجھے شدت سے شرمندگی ہورہی ہے کہ میں ماضیِ قریب میں کرائٹیاس کی ذہنی صلاحیتوں کا مداح تھا۔ افسوس! میں ایک ناکام سوفسطائی ثابت ہوا۔" اس نے تاسف سے سب کو بتایا۔

"میں اسی لیے تو ان جابرین سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ ان کے پیشِ نظر ریاستی مفاد نہیں بلکہ اپنی حکومت کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے تقویت فراہم کرنا ہے۔" عوامی ہجوم میں سے ایک عمر رسیدہ شخص نے کہا۔

"تم ایک جانب ان سے نفرت کرتے ہو جبکہ دوسری طرف ان کے احکامات کی تعمیل بھی کرتے ہو۔ جانتے ہو کیوں؟" سقراط کے استفسار پر اس نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

"کیونکہ تم ان سے خوفزدہ ہو۔ مجھے ان سے کوئی خوف نہیں لہٰذا میں ایسے کسی حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔ میں اپنے گھر جارہا ہوں۔"

"تم پاگل پن کررہے ہو سقراط!" اس کے ساتھ ہدایات وصول کرنے والے چار افراد میں سے سب سے کم عمر نے [illegible] کیا۔ وہ الجھے بالوں، منتشر ڈاڑھی اور قد [illegible] الحال [illegible] دکھائی دینے والا نوجوان "[illegible]" تھا۔ وہ مذہبی لحاظ سے خاصا شدت پسند تھا۔ ریاستی وفاداری نبھانے میں اسے کمال ملکہ حاصل تھا۔

"کبھی کبھی لذت کی تبدیلی کے لیے مختلف ذائقہ چکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا میرے دوست! اگر میری اصول پرستی تمہارے نزدیک پاگل پن ہے تو یونہی سہی۔" سقراط نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے اور اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ اسے زین تھیپی کو صورتِ حال سے آگاہ کرکے مزاج کا پارہ معتدل کرنے کا کارِ دشوار بھی درپیش تھا۔

بقیہ چاروں افراد بھی پُرخیال انداز میں ایک طرف روانہ ہوگئے۔ میلیٹس نے یکدم رک کر سقراط کی پشت کو دیکھا اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت و طیش کا ایک بحرِ موجزن دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆

چیمبر میں ریاستی معاملات پر قابو پانے کی حکمتِ عملی وضع کی جارہی تھی۔ اس جابر ٹولے کا ہر ایک رکن اپنی رائے اور دلائل دینے میں مگن تھا لیکن کرائٹیاس کے ہونٹوں پر اب بھی قفل تھا۔

"کیا بات ہے کرائٹیاس......تم اتنے خاموش کیوں ہو؟" شارمیدس نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔

"کلیون کے بارے میں ہی سوچ رہا ہوں۔" اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔

"اس کے بارے میں اب کیا سوچنا؟ اس کی موت کے پروانے پر دستخط کیے جاچکے ہیں۔ اب اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچاسکتی۔" شارمیدس نے رعونت سے کہا۔

"اس معاملے میں سقراط کو ملوث کرکے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" وہ محتاط انداز میں بولا۔

"مجھے اس شخص کی اصول پرستی کسی بھی طریقے سے پاش پاش کرنی ہے کرائٹیاس! اسے اپنی زندگی عزیز ہے تو کلیون کا قتل کرنا ہی ہوگا۔"

"اسے اپنی زندگی ہی تو عزیز نہیں ہے۔" کرائٹیاس نے ہنکارا بھرا۔ "اصول پرستی میں اسے جھکانا ایک ناممکن امر ہے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تو کیا یہ شخص یونہی ہمارے لیے دردِ سر بنا رہے گا؟" کیلیسو نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہاں! یہ جب تک زندہ رہے گا بحث و مباحثہ اور شاگردوں کو سوچ و نظریات کا نیا رخ فراہم کرنے سے کبھی پیچھے نہیں [illegible]۔ تم نے قدیم یونانی کہانیوں میں "مارسیاس" کا [illegible] سنا ہو[illegible]؟"

"وہی مارسیاس جو بانسری بجا کر لوگوں کو سحر زدہ کردیا کرتا تھا؟" کیلیسو نے تصدیق چاہی۔

"بالکل وہی! سقراط بھی اسی کی طرح ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بانسری نہیں بجاتا لیکن اس کا سحر بانسری سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ایلسی بائیڈیز بھی اکثر و بیشتر یہی کہا کرتا تھا کہ مارسیاس کو اپنا جادو جگانے کے لیے آلے کی ضرورت تھی لیکن یہ کم بخت سقراط بغیر کسی آلے کے وہی اثر محض الفاظ سے پیدا کردیا کرتا ہے۔" وہ کسی گہری تشویش کے تحت کہنے لگا۔ "میری حالت بھی تو یہی ہوا کرتی تھی۔ ہم سب لوگ دوسرے مقررین کی بہترین تقاریر پر بھی زیادہ دیر توجہ مرکوز نہیں رکھ پاتے تھے لیکن سقراط کی گفتگو کسی غیر کے متعلق بھی ہوتی تو اس کا ہر ایک لفظ ہماری روحوں پر نقش ہوجاتا۔ اردگرد موجود مرد، عورتیں اور بچے بھی اس سحر میں مبتلا ہونے لگتے۔ ہمارے جذبات کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کسی روحانی جذبے کی سی سرشاری میں مبتلا ہوکر دل تیزی سے دھڑکنے لگتے، رخساروں پر آنسو بہہ نکلتے۔ ہم نے پیری کلیز اور دوسرے بڑے مقررین کو بھی سنا لیکن اس وقت

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

روح کبھی مضطرب نہیں ہوتی تھی۔ سقراط کے سامنے ہمیں بے چارگی کا احساس رہتا۔ ہمارے دل و دماغ میں ایک ہی خیال دستک دیا کرتا کہ ہم زندگی کا حق ادا نہیں کر پا رہے۔"

"میں تمہاری بات سے متفق ہوں کراتیاس!" شارمیدیس نے پُرفکر انداز میں کہا۔ "میں نے بھی اس شخص کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس کی طبیعت میں آرام و آسائش کے بجائے جفاکشی اور سخت کوشی ہے۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب اس کی دنیا سے بے رغبتی کا اثر شاگردوں میں بھی نمایاں ہونا شروع ہو گیا تھا۔ انہی دنوں "اینٹی فون" نامی ایک سوفسطائی ایتھنز آیا تھا۔ اس نے سقراط کے شاگردوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوششیں بھی کی تھیں لیکن ناکامی پر اس سے الجھ بیٹھا۔ اس نے کہا تھا کہ فلسفیانہ تعلیم سے انسان کی خوشحالی میں اضافہ ہونا چاہیے لیکن تمہاری تعلیم برعکس نتائج پیدا کر رہی ہے۔ تمہارا طرزِ زندگی ایسا ہے کہ ایک غلام بھی آقا کو چھوڑ کر فرار ہو جائے۔ غریبانہ کھانا پینا، ہر موسم میں ایک ہی سستا جبہ، موزے اور جوتوں کا عدم استعمال، شاگردوں کو مفت تعلیم دے کر تم معاشی بدحالی کا چلتا پھرتا نمونہ دکھائی دیتے ہو۔ تم انہیں ناخوشی سکھا رہے ہو۔"

"بات تو سو فیصد سچ تھی۔" کیلیسو نے لقمہ دیا۔ "پھر سقراط نے کیا جواب دیا تھا؟"

"اس نے اینٹی فون کے ہر اعتراض کی اپنے دلائل سے دھجیاں اڑا دی تھیں۔ کہنے لگا دنیا میں کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جن کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ لوگ اس دنیا میں کھانے کے لیے زندہ ہیں لیکن میں زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہوں۔ جو لوگ زیادہ کھانا کھاتے ہیں انہیں زندگی میں نزاکت کا احساس کم ہوتا ہے۔ میں نے اپنے جسم کو جفاکشی کا عادی بنا رکھا ہے۔ کم کھانے، کم سونے اور آسائشات سے بے رغبتی کے فوائد کے لیے اطمینان و راحت بے مول ہیں۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ ایسے بے نیاز شخص کو ہم اس کی مرضی کے خلاف کیسے جھکا پائیں گے؟" کراتیاس جھنجلایا۔

"کیا تمہارے ذہن میں کوئی لائحہ عمل موجود ہے؟" شارمیدیس اس کی جھنجلاہٹ اور طیش کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"قتل کروا دو اسے! یہ انسان جب تک زندہ رہے گا ہمارے سر پر خطرے کی تلوار بن کر لٹکا رہے گا۔ اس کی موجودگی میں پائیدار اور پُرسکون حکومت ممکن ہی نہیں۔" کراتیاس نے سفاکی سے کہا۔ دیگر اراکین کے چہروں پر یکدم ابھرنے والی حیرت فوری طور پر اطمینان و مسرت میں ڈھل گئی۔ کراتیاس نے گویا ان کے دلی جذبات کو گویائی فراہم کر دی تھی۔ آن ہی آن میں سقراط کے قتل کے فیصلے کو حتمی شکل دے کر جزئیات طے کی جانے لگیں۔ کراتیاس کے مزاج پر چھائی خاموشی، اضطراب اور تشویش بھی ڈھلتی دکھائی دینے لگی۔ وہ سرشاری سے اپنے ساتھی اراکین کی گفتگو سننے لگا لیکن ارتکاز ہنوز ذہن میں چبھی پھانس کی جانب تھا۔ سقراط سے اس کے گریز، نفرت اور انتہا پسند جذبات کا تعلق حکومتی معاملات سے ہرگز نہ تھا۔ وہ درحقیقت کراتیاس کے کردار کی ایک کمزوری سے آگاہ تھا جس کی پاداش میں وہ اسے سب شاگردوں کے سامنے سخت الفاظ میں پھٹکار بھی چکا تھا۔ کراتیاس ہم جنسیت کی طرف مائل اور اخلاقی طور پر بگاڑ کا شکار رہا تھا۔ اس نے دورانِ تعلیم ایک ساتھی کو پھسلا کر رومانوی تعلقات قائم کرنے کی کئی بار کوشش کی لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہونے پر جھنجلاہٹ میں مبتلا ہونے لگا۔ اسی کوفت کے عالم میں وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا اور سقراط کی نظر میں آ گیا۔

"کراتیاس! تم اس کائنات کی بہترین مخلوق ہو۔ اپنا مقام و مرتبہ بھول کر کسی خنزیر کی طرح کیوں برتاؤ کر رہے ہو؟ یوتھائیڈیمس کو خود سے لپٹانے کے اس عمل میں تم نے مجھے پھر سے رگڑ [illegible] [illegible] خوبصورت نوجوان ہو۔ اس خوبصورتی پر برائیوں کے دبیز [illegible] نہ پڑنے دو۔"

کراتیاس کے لیے وہ ایک قیامت خیز لمحہ تھا۔ سقراط جیسے فسوں خیز معلم کے سامنے ایسی شرمندگی کے بعد وہ اس سے آنکھیں ملانے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ ساتھی شاگردوں کی ملامت زدہ نظریں اذیت سوا کر رہی تھیں۔ اس کے بعد سقراط نے کبھی یہ موضوع نہ دہرایا لیکن خلش کی پھانس کراتیاس کے دل و دماغ میں ہمیشہ موجود رہی۔ اقتدار میں آنے کے بعد تو یہ تحفظات کچھ اور بھی بڑھ گئے تھے۔ اس نے اس واقعے کے سبھی شاہدین کو کسی نہ کسی پاداش میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اب کراتیاس اور سقراط کے سوا اس کے کردار کی کمزوری سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ سقراط کے لیے موت کے احکامات جاری کروانے کے بعد وہ اعصابی طور پر نہایت پُرسکون ہونے لگا۔ اس کے اقتدار کو اب مزید کوئی خطرہ درپیش نہ رہتا۔ تیس کا وہ ٹولا اپنی حکومت کے استحکام کی حکمت عملیاں وضع کرتا اس حقیقت سے انجان تھا کہ ان کا یہ اقتدار، دبدبہ اور مقام اسپارٹا اور اس کے اتحادیوں کی "نوازشات" کے طفیل حاصل ہوا

Digitized by Google

http://urdutubes.com/

ہے۔ اپنے ظلم و جبر اور آمریت کے نشے میں چُور خوابوں کا بلند و بالا محل تعمیر کرتے ہوئے وہ بھول گئے تھے کہ اس محل کی بنیاد میں کئی رخنے موجود ہیں جن کے ذریعے ایک تند و تیز سیلابی ریلا انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے کے لیے ایتھنز کی "دہلیز" پر تیار کھڑا تھا۔

☆☆☆

تیس جابرین کے اس گروہ کے ستارے گردش میں آ گئے تھے۔ اقتدار سنبھالتے ہی انہوں نے مخالفین کو بہت تیزی سے ٹھکانے لگایا تھا۔ اس آمریت کے لیے انہیں کسی عذر کی ضرورت بھی پیش نہ آتی۔ کسی بھی شخص پر ہلکے سے شائبے کی صورت میں اس کی سانسیں چھین لی جاتیں۔ دولت مند شہری ان کا خصوصی نشانہ تھے۔ مال و زر ہتھیا کر اپنی ذاتی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے وہ بے گناہوں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کر رہے تھے۔ شہر بھر میں خوف و ہراس کا عالم تھا۔ اپنی جانیں بچانے کی غرض سے شہری جبری جلاوطنی اختیار کرنے پر بھی راضی تھے۔ وہ اہلِ خانہ کے ساتھ قریبی شہروں کے علاوہ ایتھنز کی بندرگاہ "پائرس" منتقل ہوتے گئے۔ اس ضمن میں "تھیبس" کا کردار سب سے اہم تھا۔ اس ریاست نے اسپارٹا کا اتحادی ہونے کے باوجود جلاوطن افراد کو [illegible] پناہ عنایت کی۔ اب وقت آ چکا تھا کہ [illegible] وہ [illegible] کا آغاز کرکے اسپارٹا کی حکومت کمزور کر دی جائے۔ اس مقصد کے لیے جلاوطن شہریوں سے بہتر کوئی انتخاب ہی نہ تھا۔ جبلی کشش کے تحت وہ اپنی آبائی سرزمین میں لوٹنے کے لیے بے تاب تھے۔ ایسے ہی افراد میں ایتھنز کا ایک سابق کمانڈر "تھریسی بولس" بھی شامل تھا۔ اس نے کئی اہم فوجی مہمات میں اپنی بہادری کا لوہا منوا رکھا تھا۔ جمہوریت اس کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑتی تھی۔ اپنی فطرت سے مجبور تھریسی بولس نے "ستر" افراد کو اپنا ہمنوا بنانے کے بعد ایک گروہ تشکیل دیا اور ایتھنز سے بیس میل شمال مغرب میں موجود "قلعہ فائل" پر قبضہ کر لیا۔ تیس جابرین کے ٹولے میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے فوری طور پر اپنے "تین ہزاری" خصوصی دستے کو متحرک کر دیا۔ اس دستے کا اولین مقصد قلعے کا محاصرہ تھا لیکن شدید برفباری نے ان کے منصوبے خاک میں ملا دیے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنے "آقاؤں" سے قلعے کی ناکابندی کرنے کی درخواست کی۔ تھریسی بولس ان کی سوچ اور ارادوں کو کسی کھلی کتاب کے مانند پڑھنے لگا تھا۔ اس نے سورج طلوع ہونے سے قبل ہی ایک منظم اور شاندار حملہ کر کے ان افواج کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

تھریسی بولس کی قسمت بھرپور یاوری کر رہی تھی۔ اس کے ہمنوا افراد کی تعداد اب "ایک ہزار" تک جا پہنچی تھی۔ اس موقع پر اس نے پائرس کی بندرگاہ کا رخ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے علم تھا کہ کرب و تڑپ میں جبری جلاوطنی کی زندگی گزارتے ہزاروں جمہوریت پسند افراد عسکری تعاون ملتے ہی پٹھو حکومت پر کسی قہر کے مانند ٹوٹ پڑیں گے۔ بندرگاہ تک رسائی اسپارٹا کی "عسکری حماقت" نے پہلے ہی آسان بنا دی تھی۔ ایتھنز پر قبضے کے بعد انہوں نے مقامی شہریوں کو ذہنی دباؤ اور احساسِ محرومی و محکومیت میں مبتلا کرنے کے لیے شہر کی بیرونی دیواریں ڈھا دی تھیں۔ تھریسی بولس کی یہ چال بھی کامیاب رہی۔ تیس جابرین کے حرکت میں آنے تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر ان کا جوابی حملہ بھی ناکام کر چکا تھا۔ کراتیاس اپنے شیطانی دماغ کے ساتھ موت سے ہمکنار ہو گیا۔ ایتھنز ایک بار پھر تبدیلی کی زد میں آ گیا۔ سابقہ حکومت تحلیل ہونے کے بعد مختلف قبائل سے منتخب کردہ دس افراد پر مشتمل ایک ایوان تشکیل دیا گیا۔ ان دس اراکین میں دو اشخاص انہی آمرین میں سے تھے۔ اس ٹولے کے بقیہ افراد فرار ہو کر "ایلیوسس" میں روپوش ہو گئے۔

ایتھنز کی سیاسی و عسکری صورت حال اب ایک عجیب و غریب موڑ اختیار کر گئی تھی۔ ایک جانب تھریسی بولس اور اس کے ساتھیوں نے اپنی حیثیت مستحکم کر لی تھی۔ دوسری جانب ایوانِ نو ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس منظرنامے میں دو نئے دھڑوں کی آمد نے صورتِ حال مزید الجھا دی۔ ایوانِ نو اور سابق مقتدرین نے ایک بار پھر اسپارٹا سے مدد طلب کی۔ لائی سینڈر نے اپنی سپاہ کو تقویت دینے کے لیے ایلیوسس کا رخ کیا جہاں اس نے ہنگامی بنیادوں پر کرائے کے سپاہی بھرتی کرنے کا آغاز کر دیا، دوسری سمت اس کے بھائی "لائیمیس" نے پائرس کی ناکابندی کر کے جمہوریت پسندوں کی خوراک کی ترسیل منقطع کر دی۔ ان کی معاونت کے لیے اسپارٹا کا بادشاہ "پوسینیس" بھی اپنی فوج کے ہمراہ وہاں چلا آیا۔

جنگ کے بادلوں نے پوری شدت سے پائرس کی بندرگاہ کو ڈھانپ لیا تھا۔ تاہم اسپارٹا کی نسبت فریقِ ثانی کے مسائل زیادہ ہولناک تھے۔ "ایک سواتی" افراد کی ہلاکت کے بعد ان کے لیے شکست تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

مزاحمتی جنگ کا خاتمہ ہوتے ہی جمہوریت پسندوں کو اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی لیکن "پوسینیس" نے ایک درمیانی راہ تلاش کر کے سبھی کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

در حقیقت وہ ذہنی لحاظ سے سابق ہم منصب افراد سے بہت مختلف تھا۔ اسے علم تھا کہ جنگ و جدل کے حاصل ضرب میں خاندان اور نسلیں اجڑنے کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوا کرتا۔ اس نے خفیہ طور پر ایتھنز کے جمہوریت پسند گروہ کو پیغام بھیجا کہ وہ اسپارٹا کے اہم ریاستی ستون ''ایفورس'' کے پاس ایک ایلچی روانہ کریں۔ پوسنیئس پانچ ایفورس کے گروہ میں سے دو افراد کو پہلے ہی اپنا ہم نوا بنا چکا تھا۔ دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اپنے شہر سے چند باا ثر افراد کو اعتماد میں لے کر پائریس سے جنگ بندی کی تجویز دینے پر راضی کر لیا۔ اسپارٹا اسمبلی نے تمام فریقین کے دلائل اور تجاویز سن کر پوسنیئس کے ہمراہ پندرہ رکنی دستہ ایتھنز روانہ کرنے کا حکم صادر کر دیا تا کہ دونوں شہروں کے درمیان جنگ بندی اور صلح کا مکمل معاہدہ تشکیل دیا جا سکے۔

صلح نامے کو حتمی شکل ملتے ہی جلاوطن شہری اپنے گھروں میں واپس آباد ہو گئے۔ مزاحمت و دفاع کا وہ باب سیکڑوں افراد کے لہو سے شجاعت کی ایک ان مٹ داستان رقم کیے بند ہو گیا۔

☆☆☆

ایتھنز کے شہری خوشی و جوش سے نہال تھے۔ تیس جابرین کی حکومت کا کسی خوفناک خواب کی طرح خاتمہ اور اسپارٹا کی افواج کے انخلا نے ریاست میں اطمینان کی لہر تو سرایت کر دی تھی تاہم طویل جنگ کے اثرات کہیں نہ کہیں اب بھی دل و دماغ میں کسی خلش کی طرح موجود تھے۔ اس محرومی و کسک کو دانستہ طور پر پس پشت ڈالے وہ حال کے ہر ایک لمحے سے لطف اندوز ہونے کی بھرپور کوششوں میں مگن تھے۔ اس روز بھی وہ ایک وسیع میدان میں انہی سرگرمیوں میں مشغول تھے کہ اچانک چند سپاہیوں کی آمد نے یہ خوشی اور ولولہ دوچند کر دیا۔ ان میں سے ایک سپاہی باوقار انداز میں چبوترے پر جا کھڑا ہوا۔ عوام نے مخصوص انداز میں چٹکیاں بجا کر اس کا استقبال کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سپاہی نے اپنے سر سے آہنی خود اتارا اور ہاتھ فضا میں بلند کیے مسکراتے ہوئے انہیں خاموشی اختیار کرنے کا اشارہ کرنے کے بعد گمبھیر انداز میں گویا ہوا۔

''ایتھنز کے لوگو! جبر کا سورج غروب ہو گیا ہے۔ جمہوریت کے قوانین ایک بار پھر بحال کر دیے گئے ہیں۔ وہ جمہوریت جو ہماری ریاست کی شان تھی، جس پر عمل پیرا ہو کر ہمیں یونان کی قیادت نصیب ہوئی تھی۔ اب ہم اپنی ریاست کے نگران خود ہیں۔ اب قوانین صرف اور صرف ہماری فلاح پر مبنی ہوں گے۔'' شہریوں نے اس بار مزید جوش و خروش سے چٹکیاں بجاتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا۔ ان کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔

''جمہوریت کی بحالی اور غاصبین کے خلاف شاندار مزاحمت کی خوشی میں ہم نے عام سیاسی معافی دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ تیس جابرین کی غلامی بخوشی قبول کرنے والوں کو جلاوطن کر دیا جائے گا۔ ہم کسی غدار کے خون سے اپنی سرزمین ناپاک نہیں ہونے دیں گے۔'' وہ بارعب انداز میں کہتا ہوا چبوترے سے نیچے اترنے لگا۔ اس کی پشت پر مخصوص سفید لبادہ ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ شہری اپنی عقیدت و محبت کے اظہار میں اس سے لپٹنے کے لیے بے تاب تھے۔

☆☆☆

ایتھنز میں جمہوریت کے عمل کا آغاز اپنی روایتی آب و تاب سے ہو چکا تھا۔

حکومت سازی کے عمل میں عوام الناس کی شمولیت اور انتخاب کا وقت آتے ہی جوش و خروش بھی سوا نیزے پر جا پہنچا۔ چمکتے چہرے اور آس بھری نظریں لیے شہری ایک نفیس عمارت کے وسیع و عریض کمرے میں موجود تھے۔ اس کمرے کے وسط میں [illegible] مخصوص [illegible] شہریوں کی نظریں ان پر [illegible] مختلف رنگوں کے منکوں پر مرکوز تھیں کیونکہ ان میں موجود سیاہ و سفید موتی اگلے چند لمحوں میں ان کی قسمت بدل سکتے تھے۔ مخصوص درمیانی فاصلے پر ایک کم عمر لڑکا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سفید رنگ کا کپڑا باندھا گیا تھا۔ لڑکے نے اپنے عقب میں موجود ادھیڑ عمر شخص کی ہدایت پر دائیں سمت کے مٹکے سے ایک کاغذ برآمد کر کے اسے تھما دیا۔ کمرے میں موجود سب شہریوں کے دلوں میں تلاطم برپا ہونے لگا۔ انتخاب کا یہ مرحلہ انہیں ہمیشہ اعصاب شکن محسوس ہوا کرتا تھا۔

''دراکونے!'' ادھیڑ عمر شخص نے بہ آواز بلند پکارا...... دراکونے نامی شخص کا چہرہ پل بھر میں ہی لہو چھلکانے لگا۔ بلحاظ پیشہ وہ ایک ترکھان تھا۔ اپنے ہیجان پر قابو پاتے ہوئے اس نے لڑکے کی بائیں سمت میں رکھے مٹکے سے ایک موتی نکالا۔ اس کے ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔

''آہا...... سفید موتی!'' ادھیڑ عمر شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دیوتاؤں نے تمہیں اس عظیم شہر کی خدمت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔'' دراکونے کا رواں رواں خوشی سے رقصاں تھا۔

اس کی کیفیت سے بے خبر کم عمر لڑکے نے اب

دوسرا کاغذ برآمد کر لیا تھا جس پر ایک موچی ''ایکوئے'' کا نام درج تھا۔ اس نے بھی سابقہ عمل دہرایا لیکن قسمت نے یاوری نہ کی۔ سیاہ رنگ کا موتی ہاتھ آتے ہی سپاٹ انداز میں اعلان کر دیا گیا کہ دیوتاؤں نے اس پر نظر کرم نہیں کی ہے۔

یہ طویل اور صبر آزما مرحلہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ منتخب شدہ افراد کو بے دلی سے مبارکباد دیتے مایوس شہری ایک مخصوص کونے میں جا کھڑے ہوتے۔ ان کی افسردہ نگاہیں کمرے کی کھڑکی سے باہر نیلے آسمان کی وسعتوں میں بھٹکتی دیوتاؤں سے شکوہ کناں تھیں۔ سماعت میں پڑتی دلفریب موسیقی کی گونج بھی اس اداسی کا ازالہ تو نہیں کر پا رہی تھی تاہم وقتی طور پر دل بہلا کر اعصاب کو سرور فراہم کرنے میں کامیاب ضرور تھی۔ موسیقی کا وہ ماخذ کھڑکی سے قدرے فاصلے پر چبوترے پر کھڑا شخص تھا۔ اس کا لباس عام شہریوں کی نسبت مختلف تھا۔ کھلی آستینوں والا مکمل لبادہ ہوا کے دوش پر پھڑپھڑانے لگتا تھا۔ قرمزی چادر کے سنہری پلے اس کی نفیس طبیعت کا عکاس تھے۔ سلیقے سے بنے بال اور ڈاڑھی اس کی وجاہت میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں چوبی ساز تھا جس پر تنی چاروں تاریں اس کی انگلیوں تلے تھرک رہی تھیں [illegible] چبوترے کے سامنے کھڑے [illegible] افراد کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔

''دیوتاؤں نے کائنات کی ہر شے میں دو پہلو رکھے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ذہانت دی ہے۔ ذہانت مثبت ہو تو تعمیری سرگرمیوں میں استعمال ہوتی ہے اور اگر حدود سے تجاوز کر لے تو پاگل پن کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ آسمان سے بارش بھی برستی ہے اور برفانی طوفان بھی...... پھول میں نزاکت و خوشبو بھی ہے اور انگلیوں کی پوریں زخمی کر دینے والے کانٹے بھی۔ آگ ہمیں حدت بھی دیتی ہے اور تپش سے جلا بھی دیا کرتی ہے...... اے عظیم دیوتاؤ! میں ایتھنز سے بہت محبت کرتا ہوں...... میری ریاست کو اپنے کرم کی چھاؤں تلے رکھنا...... ہمیں خیر اور قوت دیتے رہنا۔'' وہ آنکھیں بند کیے اپنی خوبصورت آواز کا جادو جگاتا رہا۔

''اس شخص کی بات میں وزن تو ہے۔ مجھے ان الفاظ نے بہت متاثر کیا ہے۔'' سقراط بھی اسی چبوترے کے پاس کرائٹو اور دیگر شاگردوں کے ساتھ موجود تھا۔

''تم جیسے خود پسند انسان کو بھی کوئی بات متاثر کیا کرتی ہے سقراط؟'' وہاں کھڑے ایک اور شخص نے ان کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔ اس کے چہرے پر درشتی اور آنکھوں میں خشونت تھی۔

''سچائی ہمیشہ دل میں گھر کیا کرتی ہے میرے عزیز! خیر و شر کا ملاپ اور توازن ہی اس کائنات کی اصل خوبصورتی ہے۔ سیاست کی بقا اور ترقی بھی اسی توازن کے مرہون منت ہے۔'' سقراط نے متانت سے کہا۔ مغنی اب بھرپور داد وصول کرتا ہوا چبوترے سے نیچے اتر آیا تھا۔ ہجوم دھیرے دھیرے منتشر ہونے لگا۔

''یہ باتیں تم جیسے لاابالی شخص کو زیب نہیں دیتیں سقراط!'' وہ دانستہ طور پر بات کو ایک مخصوص نہج پر لے جانا چاہ رہا تھا۔ ''تمہاری زبان سے یہ سب بہت مصنوعی محسوس ہوتا ہے۔''

''تو پھر مجھے کیا زیب دیتا ہے تیوپلاستو؟'' اس نے عاجزی سے دریافت کیا۔

''تمہیں ''ارستوفینیس'' تو یاد ہو گا؟'' وہ معنی خیزی سے بولا۔

''ہاں! وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔'' سقراط نے بے نیازی سے جواب دیا۔ کرائٹو اور شاگردوں کے اعصاب میں یکدم تناؤ پیدا ہو گیا۔ وہ تیوپلاستو کا مقصد بخوبی سمجھ گئے تھے۔

''خبر[illegible] پلاستو!'' کرائٹو نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ ''اس بات کو ابھی اور یہیں ختم کر دو۔''

''کیوں پیارے کرائٹو؟'' وہ معصومیت سے کہنے لگا۔ ''ارستوفینیس تو سقراط کا بہت اچھا دوست تھا اور اس نے اپنے دوست کی شان میں کیا خوب قصیدہ خوانی کر کے ہمیں اس کے اصل روپ سے روشناس کروایا ہے۔ تم لوگ سچائی کے علمبردار بنتے ہو۔ ارستوفینیس کی بیان کردہ سچائیاں کیونکر جھٹلا سکتے ہو؟'' اس کی آواز دانستہ طور پر بلند تر ہونے لگی۔ اس اثنا میں منتشر ہجوم بھی ان کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

''سقراط! چلو یہاں سے...... ورنہ یہ ہرزہ سرائی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔'' کرائٹو نے کہا۔

''انہیں لطف اندوز ہونے دو میرے دوست! ایسی معمولی باتوں پر تشویش زدہ کیوں ہو رہے ہو؟'' سقراط کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ اس نے کبھی مخالفین کے ان ہتھکنڈوں کو ذہن پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ 423 قبل مسیح میں ایک تہوار کے موقع پر ڈراموں کا مقابلہ منعقد کروایا گیا تھا جس میں دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والا ڈرامے میں در حقیقت سقراط کی کردار کشی تھی اور اب اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی عوام اسے زچ کرنے کے لیے ان مکالموں کی ادائیگی

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

http://urdutubes.com/

اور اداکاری کے مظاہروں سے باز نہیں آتے تھے۔ تیوپلاستو مکمل طور پر ستراط کے قالب میں ڈھل کر فضا میں اجرامِ فلکی پر نظریں جمائے کھڑا ہو گیا۔ تیوپلاستو ستراط کے انداز میں دیہاتی کو بتانے لگا کہ زیوس دیوتا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ آسمان سے بارش بادلوں کے باعث برستی ہے۔ وہ اس امر میں دیوتاؤں کا کمال اس وقت تسلیم کرے گا جب زیوس ایک روز کے لیے بادلوں کو چھٹی دے کر صاف آسمان سے بارش برسائے۔ ان کی اداکاری اور تمسخر ستراط کے سوا سبھی ساتھیوں کو طیش میں مبتلا کر رہے تھے جبکہ دوسری جانب خود ستراط کے چہرے پر ایسے تاثرات بکھرے ہوئے تھے، گویا کوئی باپ اپنے شریر اور نادان بچوں کی کسی حماقت آمیز شرارت سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ یہ حرکات کچھ دیر یونہی جاری رہیں۔ مجمعے کے منتشر ہوتے ہی میلیٹس ان کے پاس چلا آیا۔

''تم اپنے کردار کی اس جھلک کے متعلق کیا کہو گے ستراط؟'' اس کی آنکھوں میں نفرت پہلے سے کہیں شدید تھی۔

''ان کی اداکاری لاجواب رہی لیکن ان کے بیان کردہ ستراط سے میری ذاتی ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''تو اصل ستراط سے ہمیں بھی متعارف کروا دو۔'' تیوپلاستو نے مزید شرانگیزی کا تہیہ کر لیا تھا۔

''میں ایک عام انسان ہوں دوستو! میں وہی کام کرتا ہوں جو میری والدہ کیا کرتی تھیں۔ وہ ایک قابل دائی تھیں۔ ہم دونوں ہی کا کام انسانی وجود پر ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اندر سے ایک نئے انسانی وجود کو نکال کر دنیا میں لے آتی تھیں جبکہ میں لوگوں کے اندر سے ان کے عقلی وجود کو نکال کر ایک نئی زندگی دینے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''ایتھنز کے لوگو! یہ ہمیں نئے دیوتاؤں سے متعارف کروا رہا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ دیوتاؤں کی طرح یہ بھی انسانوں کو زندگی دیتا ہے۔ ستراط خود کو ایک نیا دیوتا ثابت کرنا چاہ رہا ہے۔'' تیوپلاستو نے واویلا کرنا شروع کر دیا۔

''تم پر دیوتاؤں کا عذاب نازل ہوگا ستراط! تم مسلسل ان کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہو۔'' ہجوم میں سے ایک شخص نے مشتعل ہو کر اس کا گریبان تھام لیا۔ کرائٹو نوجوان شاگردوں کے ساتھ ایک مختصر کشمکش کے بعد اس ہجوم کو منتشر کرنے میں بمشکل کامیاب ہو سکا۔ ستراط جیسے بے ضرر انسان کی ایسی درگت اور بے قدری ان کے دل دکھ سے معمور کر دیا کرتی تھی۔

☆☆☆

ایتھنز کے گلی کوچوں، بازاروں اور حکومتی ایوان میں معمول کی سرگرمیاں رواں ہو چکی تھیں۔

ایک تعطل کے بعد جمہوری عمل کی بحالی اور مزید افزائش نے شہریوں کو دھیرے دھیرے پُرسکون کرنا شروع کر دیا۔ شہر بھر میں ستراط کے سوا ہر ایک چین کی بنسی بجاتا لیکن اس کی بے چینی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وہ اہلِ ایتھنز کو اجتماعی کوتاہیوں کا عکس دکھاتا ناپسندیدگی کی ایک نئی بلندی چھونے لگا تھا۔ معاشی مسائل بھی ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ ان حالات میں اہلِ ایتھنز نے زین تھپی کے معاملے میں اسے ذہنی اذیت سے دوچار کرنا شروع کر دیا۔ وہ ستراط سے علیحدہ ملاقات کے بجائے شاگردوں اور عوامی محافل میں زین تھپی کی کسی نہ کسی بات اور جھگڑے کو خوب بڑھا چڑھا کر ہرزہ سرائی کیا کرتے۔ اس وقت بھی وہ ایسے ہی ایک شخص کے گلے شکوے اور پند و نصائح نمٹا کر بیٹھے تھے۔

''یہ سلسلہ طوالت ہی اختیار کرتا جا رہا ہے۔ مجھے اس طرح عوامی مقامات پر لوگوں کا زین تھپی کی کردار کشی کرنا بالکل پسند نہیں۔ تمہیں اسے سمجھانا چاہیے کہ اپنی یہ روش ترک کر دے۔'' کرائٹو نے اس شخص کے جاتے ہی ستراط سے کہا۔

''آج کل وہ اعصابی تناؤ میں [illegible] شروع [illegible] اس پر طاری [illegible] ہیجانی طغیانی ختم ہوتے ہی وہ ایک ہموار زندگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔'' ستراط کے انداز میں بیوی کے لیے محبت تھی۔

''آپ ایک ایسی عورت کے ساتھ کیسے زندگی بسر کر رہے ہیں جس کی تیز مزاجی ایتھنز میں ضرب المثل اختیار کرنے لگی ہے۔'' انیس تھینیس نامی ایک شاگرد دبے لفظوں میں کہا۔ وہ بھی کچھ روز پہلے زین تھپی کی جارحانہ کیفیت کا بدترین نشانہ بن چکا تھا۔

''جس طرح سائیس کو سدھائے ہوئے گھوڑے کے بجائے کسی سرکش گھوڑے پر سواری سے تجربہ حاصل کرنا بہتر ہوتا ہے اسی طرح اگر میں زین تھپی کو رام کر لوں تو ہر بنی نوعِ انسان کو اپنے ڈھب پر لا سکتا ہوں۔ وہ صرف معاشی حالات کی وجہ سے مردم بیزاری کا شکار ہو رہی ہے۔'' ستراط نے سادگی سے بتایا۔ اپنی مالی حیثیت پر اسے کبھی کسی محرومی کا احساس نہیں ہوا کرتا تھا۔

''آپ بہت خوش قسمت ہیں ستراط! کمتر ذرائع میں

زندگی بسر کرنا بھی ایک منفرد فن ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ میں سرتوڑ کوششوں کے باوجود اس ہنر میں تاحال کورا ہوں۔'' ایک شاگرد نے ستائشی اور حسرت زدہ انداز میں کہا۔

''دولت انسانی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر انسان کا ذاتی تشخص بے مول ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیوتاؤں کی نظرِ کرم بھی دولت مند افراد پر ہی ٹھہرا کرتی ہے۔'' دوسرے شاگرد نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

''نہیں! تم غلط سوچ رہے ہو۔'' ستراط نے ملائمت سے کہا۔ ''امیر اور بددیانت آدمی کی نسبت دیوتاؤں کی نظر میں غریب متقی کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔''

''اگر غربت لامحالہ طور پر نیکی اور خیر کا منبع ہوتی ہے تو بلاشبہ آپ اس کا عملی نمونہ ہیں لیکن چھوٹا منہ بڑی بات! آپ کو شاگردوں سے فیس لینے کی بابت اب سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔'' فیڈو نے زین تھپی کے شکووں کے پیشِ نظر تجویز دی۔

''ستراط کی مالی حالت پر فکرمند کیوں ہوتے ہو فیڈو؟ مجھے یقین ہے کہ اسے اسپارٹا کی جانب سے بھاری معاوضہ ادا کیا جاتا ہوگا۔ انہوں نے اس کی صورت میں ایتھنز کو ایک عذاب مسلسل نواز رکھا ہے۔'' ان سے چند گز کے فاصلے پر کھڑے ایک شہری نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ستراط کے علاوہ سبھی ساتھی اس نئے الزام پر دنگ رہ گئے۔ [illegible]

''ان سے الجھنا بے کار ہے کرائٹو! بس خاموشی سے نظرانداز کر دو۔ یہ لوگ تو ہومر جیسے عظیم انسان کو سنکی اور پاگل کا خطاب دے چکے ہیں تو بھلا میری کیا بساط۔ میں اپنی ریاست سے وفادار ہوں اور یہ بات میں بار بار ثابت بھی کرتا آیا ہوں۔'' اس نے پُرسکون انداز میں کہا۔

''وفاداری......'' شہری نے تمسخر و تحقیر سے کہا۔ ''کیا تم اس کے معنوں سے بھی واقف ہو؟ کیا تم بھول گئے کہ ایلسی بائیڈیز نے تمہاری ہی سکھائی گئی وفاداری کے عوض ہم پر کتنی تباہی مسلط کی تھی۔ اس نے تمہارے ہی ایما پر ہرمائی کے مجسمے تباہ کیے۔ تم ایک روایت شکن انسان ہو اور اپنے ساتھیوں کو بھی یہی کچھ سکھاتے ہو۔''

''نہیں! میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں نے زندگی کے تغیرات کو کھلے دل و دماغ سے دیکھنے اور پرکھنے کے سوا کبھی کچھ نہیں سکھایا۔''

''یعنی تم اب بھی اس کی غداری اور ہماری تباہی کو حق بجانب سمجھتے ہو؟'' میلیٹس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ گزشتہ کچھ عرصے سے وہ ہر اس مقام پر منڈلایا کرتا تھا جہاں ستراط اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود ہوا کرتا۔

''اور کرائٹیاس...... وہ بھی تو اس کی طرح یہی کہا کرتا تھا کہ دیوتا محض سیاست دانوں کی ایجاد کردہ ایک اختراع کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔'' ایک اور شہری نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''افلاطون کی مثال ہی لے لو! میں نے سنا ہے کہ وہ بھی بہت پر پرزے نکال رہا ہے اور ہر جگہ کہتا پھرتا ہے کہ فلاحی ریاست وہی ہے جس میں سربراہ ایک فلسفی یا منطق آشنا ہو۔ ایتھنز کی تعمیرِ نو کے لیے بھی کسی فلسفی ہی کی ضرورت ہے ورنہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے۔'' میلیٹس نے کچوکا دیا۔

''جب تک شہری ریاست میں فلسفیوں کو بادشاہوں جیسے اختیارات نہ مل جائیں، یا بادشاہ ہی صحیح اور متعلقہ تعلیم حاصل کر کے فلسفی نہ بن جائیں، ریاست کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ان اوصاف سے محروم حکمران اپنے شہروں سے برائی مٹا سکتا ہے، نہ ہی نسلِ انسانی سے جرائم کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ بادشاہ وہ نہیں ہوتے جن کے اقتدار کی قوت ہو۔ حکمرانی ایک پیچیدہ فن ہے جس میں طاق ہوئے بغیر مثالی ریاست قائم ہی نہیں کی جا سکتی۔''

''ایک اچھے حکمران کے مزید کیا اوصاف ہوتے ہیں ستراط؟'' سائمن نے دریافت کیا۔

''کامیاب اور مثالی حکمران وہی ہوتا ہے جو ایک اچھا شہری بھی ہو۔ جو بیت المال کی ذمے داری دیے جانے پر شہر کے مال و دولت میں اضافہ کرے۔ جنگ کی صورت میں اپنے ملک کا کامیاب دفاع کرے اور دشمن کو مغلوب کر لے۔ سفارتکاری میں دشمنوں کے بجائے دوستوں کا اضافہ کرے اور ان سب سے بڑھ کر جب اپنے عوام سے خطاب کرے تو اس سے نفرت و انتشار کے بجائے یک جہتی پیدا ہو۔''

''ہمارا ریاستی نظام بہترین ہے ستراط!'' پہلے شخص نے فخر سے کہا۔ ''ہم اپنے منصب دار خود منتخب کرنے کے اہل ہیں۔''

''اگر تمہیں کوئی سمندری سفر درپیش ہو تو تم قرعہ اندازی کے ذریعے اپنے جہاز کے کپتان کا انتخاب کرو گے؟'' ستراط نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''نہیں! ایسا کیسے ممکن ہے بھلا؟''

''تو کیا اپنے جوتوں کی سلائی' کسی مرض کے علاج میں طبیب بھی ایسے ہی منتخب کرو گے؟''

''تم بے معنی سوال پوچھ رہے ہو سقراط! ایسا ہونا ناممکن ہے۔''

''جب تم نجی زندگی میں جہازرانی' تعمیر' علاج یا کسی اور تکنیکی مسئلے کی صورت میں متعلقہ شعبے کے ماہرین سے رابطہ کرتے ہو تو ریاستی معاملات کے لیے ہر کسی کو اس کا اہل کیسے سمجھ لیتے ہو؟ ہماری اسمبلی احمقوں، کندذہنوں، موچیوں، ترکھانوں، کسانوں اور لوہاروں سے لے کر ان منافع خوروں پر مشتمل ہے جن کی سوچ صرف ایک ہی مدار میں گردش کرتی ہے کہ کوئی شے کس طریقے سے سستی خرید کر مہنگے داموں فروخت کی جائے۔ یہ لوگ عوامی مسائل پر سوچنے اور حل تلاش کرنے کی اہلیت میں بالکل کورے ہیں۔'' سقراط نے بے لاگ رائے دی۔

''تمہیں اگر سیاست کی اتنی سمجھ ہے تو تم خود عملی سیاست میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟'' شہری نے طنزاً دریافت کیا۔

''اس کیوں کا جواب تمہیں جرنیلوں پر ہونے والا مقدمہ یاد کرنے پر مل جائے گا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے جان لیا تھا کہ عملی سیاست میں آمد سے پہلے مجمعے کے سامنے ناانصافی کا دفاع کرنے کا ہنر [illegible] آنا چاہیے۔ وہاں تنہا رہ کر ٹامک ٹوئیاں مار [illegible] بہتر یہی ہے کہ میں شہریوں کو بہترین اور سنہری ریاستی اصول سمجھا کر سیاست کی یہ کجی دور کرنے کا ہنر سکھا دوں۔ میں نے آج تک یہی کیا ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہی کرتا رہوں گا۔''

''ذرا سنبھل کے بات کرو سقراط! تمہارے اندازِ گفتگو اور نظریات سے بغاوت کی سڑاند اٹھنے لگی ہے۔ تمہیں دیکھ کر ان غیرملکی فلسفیوں کی یاد آتی ہے جو روایت شکنی سکھا کر نئی نسل کو گمراہ کرنے کی پاداش میں سزا بھی پا چکے ہیں۔'' میلیٹس نے یاددہانی کروائی۔

''یہ امر بھی میرے لیے قابلِ افسوس ہے کہ ایتھنز کے عدالتی نظام میں اب فیصلے صادر کرنے کا معیار انصاف کے بجائے حسد، تعصب اور خوف ہو گیا ہے۔''

''تم ہمیشہ ریاست کے مفادات سے زیادہ انصاف کا ڈھول بجاتے رہنے پر کیوں مائل رہتے ہو؟ وطن پرستی کے جذبے کی نفی کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ اگر تمہیں ایتھنز کی بقا سے سروکار نہیں تو تمہارا وطن کیا ہے؟''

''ایتھنز ہی میرا وطن ہے اور اس سے محبت کا ثبوت میں میدانِ جنگ میں کئی بار دے چکا ہوں۔ ملک پرستی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انصاف اور سچائی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے۔ میں ایتھنز کا رہائشی ضرور ہوں لیکن سب سے پہلے ایک انسان بھی تو ہوں اور انسانیت کے اسی رشتے کے ناتے رنگ' نسل اور قوم کے فرد سے خود کو ممتاز نہیں سمجھتا بلکہ ان سے محبت کرتا ہوں۔''

''اپنی زبان سنبھال کر گفتگو کرو سقراط! جانتے بھی ہو کہ تم ہماری روایات اور دیوتاؤں کی نفی کر رہے ہو؟''

''روایات انسانوں کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ انسان روایات کے لیے نہیں بنے۔ اس امر میں کوئی دورائے نہیں کہ ہمارے عدالتی' سیاسی اور ریاستی نظام میں کجیاں موجود ہیں۔ اہلیت، کردار اور قابلیت کے بجائے محض قرعہ اندازی سے ریاست کے ناخدا منتخب کر لینا دانشمندی نہیں۔ سیاست دان کے لیے لاعلمی و جہالت اور منصف کے لیے تعصب و حسد متعلقہ نظام کی تباہی ہے۔'' سقراط کا مدلل انداز وہاں موجود ہر شخص کے ذہن میں سوچ کے نئے در وا کرنے لگا۔

☆☆☆

سقراط کی تعلیم کا چلتا پھرتا اسکول ایتھنز کے گلی کوچوں میں بلاتعطل اپنا تحرک جاری رکھے ہوئے تھا۔

اس روز وہ ریاستی و انفرادی معاملات کی باریکیوں پر غور وفکر اور بحث کرتے ہوئے [illegible] جا نکلے جہاں حیرت [illegible] ان کے سامنے ایک شخص مرغا ہاتھ میں تھامے دو پتھروں پر مشتمل چھوٹے سے چبوترے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے دائیں جانب دو جبکہ بائیں سمت میں تین افراد مؤدبانہ انداز میں زمین پر بیٹھے تھے۔ وہ عقیدت مندانہ انداز میں چبوترے کے اردگرد پانی چھڑکنے لگا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک مذبح گاہ ہے۔ خشک خون کے چھینٹے ان پتھروں کا اصل رنگ نگل چکے تھے۔ پچھلی سمت میں الاؤ پر ایک توانا شے بھی موجود تھی۔ سقراط ان تمام مناظر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ان سب کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ آدمی مرغا پتھر پر رکھ کے سیدھا کھڑا ہوا اور بہ آوازِ بلند مناجات ادا کرنے لگا۔

''ایسکلیپس دیوتا! تم ہی ہمارے مسیحا ہو۔ تم یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کرنا کہ ''تھیسڈورس'' تمہارا حقیقی اور پُرخلوص معتقد ہے۔ اس کی جانب سے اس مرغے کی بھینٹ قبول کرو۔ تھیسڈورس کو اس کے بیٹے کی صحت لوٹا دو۔ اس کے خاندان سے بیماری اور موت ہمیشہ کے لیے ٹال دو۔ اپنے رحم اور مداخلت سے زیرزمین معاملات (موت) کے دیوتا ''ہیڈس'' کی مخالفت اور دشمنی سے محفوظ رکھنا!''

Digitized by Google

یہ کہتے ہوئے اس نے مرغا اٹھا کر چبوترے پر رکھا اور ایک تیز دھار کٹار سے اس کی گردن کاٹ دی۔ لہو کی دھاریں اس کے ہاتھ' کپڑوں اور پتھروں کو رنگین کر گئیں۔ اس نے ماہرانہ انداز میں چھری تھامی اور مخصوص مقام سے گوشت کے اندر گھسا دی۔ کرائٹو کے چہرے پر افسردگی اور کبیدگی در آئی۔

''انسان کی زندگی میں ہر نعمت بلاشبہ دیوتاؤں کی ہی مرہونِ منت ہے لیکن میرے لیے حیران کن امر یہ ہے کہ آسمانوں پر رہنے والے ان دیوتاؤں کو ہمارے تحائف اور بھینٹ کی ضرورت کیونکر پیش آ سکتی ہے؟'' سقراط نے اس دوران پہلی بار لب کشائی کی۔ کرائٹو کی نظریں ہنوز اسی آدمی پر مرکوز تھیں جس کے ہاتھ میں مرغے کی خون آلود کلیجی تھی۔

''مرغا' کبوتر' دنبہ یا معمولی چیز پیش کر کے انسان دیوتاؤں کے کرم اور محبت کا طلبگار رہتا ہے۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کروانا چاہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ایک مرغے کے بدلے موت جیسی اٹل حقیقت سے بھی فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔'' سقراط نے گہری سانس لی۔

''موت یقینی طور پر بہت خوفناک اور پیدائش سے کہیں زیادہ دردناک عمل ہوگا سقراط!'' کرائٹو کا لہجہ بوجھل تھا۔

''خوب کہا...... [illegible] مشاہدہ بھی یہی کہتا ہے کہ موت [illegible] دوسری دنیا کے پار لے جاتی ہے جہاں ان بہت سے سوالوں کے جواب موجود ہیں جو آج ہمارے لیے ناقابلِ تسخیر ہیں۔ تم جانتے ہو کہ مجھے کائنات کی سچائیوں سے بغلگیر ہونے کی کس قدر تمنا رہتی ہے۔'' سقراط نے خوابناک انداز میں کہا اور پھر ایک توقف کے بعد گویا ہوا۔

''ایسکلیپس دیوتا! آج میں بھی ایک نذر مانتا ہوں۔ مجھے اپنے احباب کے درمیان خوبصورت موت سے ہمکنار کرنا۔ میں پُروقار انداز میں ابدیت کی وادی میں نئے حقائق سے روشناس ہونا چاہتا ہوں۔'' اس کے چہرے پر جادوئی مسکراہٹ نے جھلک دکھائی۔ اسے علم ہی کہاں تھا کہ کاتبِ تقدیر نے اس کی قسمت میں ایک ایسی موت لکھی ہے جو اسے رہتی دنیا تک امر بنانے والی تھی۔

☆☆☆

سقراط کا اپنے شاگردوں سے علمی بحث و مباحثہ کا معمول یونہی چلتا رہا۔

شاگردوں کی اس سے محبت ہر گزرتے دن کے ساتھ شدید سے شدیدتر ہونے لگی تھی۔ سقراط کے روپ میں انہیں ایک شفیق باپ' بہترین دوست' دانا بزرگ اور بے مثال معلم میسر تھا۔ وہ اس کی شخصی خوبیوں کے اس قدر گرویدہ تھے کہ ایک پل کی علیحدگی بھی انہیں گراں گزرنے لگتی۔ اس دوران کسی بھی ضروری کام سے غیرحاضری میں انہیں واپس لوٹنے کی بےچینی ہمہ وقت گھیرے رہتی۔ فیڈو بھی اس وقت ایسی ہی کیفیات میں مبتلا تھا۔ وہ ناگزیر مصروفیت کے باعث شاہ آرکن کے محل میں آیا تھا اور اب پر لگائے اپنے علم کی پیاس بجھانے والے ٹھنڈے' میٹھے چشمے کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ محل کی بیرونی ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے اس کی نظر وہاں آویزاں ایک نوٹس پر پڑی۔ اس لمحے فیڈو کو علم ہوا کہ بصارت ایک ہی پل میں کیسے پتھرا جاتی ہے۔ وہ بےیقینی سے کاغذ پر لکھی عبارت زیرلب دہرانے لگا۔

''پاتھیاس قصبے کے رہائشی ''میکیٹس ولد میلٹس'' کے بیانِ حلفی پر یہ شکایت ایلوپیک کے رہائشی ''سقراط ولد سوفرونسکس'' کے خلاف درج کی جا رہی ہے۔ میلیٹس نے سقراط کو اپنا ملزم قرار دیا ہے۔ وہ ریاست کے معروف خداؤں کا منکر ہے اور ان کے بجائے نئے دیوتاؤں کو متعارف کروانے لگا ہے۔ سقراط نوجوان نسل کو گمراہ کر رہا ہے۔ مدعی کا مطالبہ ہے کہ اسے سزائے موت دی جائے۔''

فیڈو کو اپنے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہو رہی [illegible] ان الزامات اور متوقع مقدمے کا تصور [illegible] ہولناک تھا۔ اسے کوئی بھی نقصان پہنچنے کا خیال ہی کسی شاگرد کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ ایتھنز کے عدالتی نظام کی خوبیاں اور خامیاں بھی اس سے پوشیدہ ... ہرگز نہ تھیں۔

ایتھنز کی اسمبلی سالانہ طور پر چند منصفین کا انتخاب کیا کرتی تھی۔ ان میں سے ایک منصف کے ذمے مذہبی نوعیت کے مقدمات کا اندراج ہوتا تھا۔ مذکورہ ''مجسٹریٹ'' کو ''بادشاہ'' کہا جاتا۔ اس کا کام ان معاملات کی نگرانی ہوتا تھا کہ مقدمہ خلافِ قانون یا خلافِ ضابطہ تو نہیں؟ استغاثہ کی جانب سے جرم کی کیا سزا تجویز کی گئی ہے؟ ملزم نے اپنی صفائی میں کیا نکات پیش کیے ہیں؟ سزائے موت کے علاوہ ملزم اپنے لیے کیا متبادل سزا چاہتا ہے؟ گواہان کے دستخط کی پڑتال کے بعد مقدمے کی ایک تاریخ مقرر کر کے جیوری کا اہتمام کیا جاتا۔ اس مقدمے کے دوران جیوری کی صدارت پر فائز ہونے کے باوجود وہ ان کے فیصلے یا کام میں کوئی مداخلت کرنے کا مجاز نہیں تھا۔

ان خیالات کے ذہن میں چکراتے ہی فیڈو کے اضطراب میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سقراط جیسے شخص پر دائر کردہ

http://urdutubes.com/

اس اہم ترین مقدمے کی جیوری کے انتخاب کا روایتی عمل کسی بھی ذی فہم انسان کے حواس مختل کردینے کے لیے کافی تھا۔

مقدمات کی سماعت کے لیے اسمبلی ہی جیوری منتخب کیا کرتی تھی۔ اس ضمن میں قانونی تعداد ''پانچ سو ایک'' افراد مقرر کی گئی تھی۔ اراکین کی عمر تیس سال سے زائد ہونا لازم تھی۔ فیڈو کے لیے سب سے تشویشناک امر یہ تھا کہ ایتھنز کی حکومت سقراط کی ''زبان درازی'' اور ''نظریات'' سے مکمل طور پر بیزار تھی۔ وہ اس مقدمے کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے سقراط نامی ''آزار'' سے نجات کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہوجاتے۔ ان سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ درون پردہ اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے وہ ایسی جیوری تشکیل کروادیں جس میں سقراط کے مخالفین کا تناسب زیادہ ہو۔

''اوہ زیوس دیوتا! یہ کیا ہوگیا؟ آفات نے تو ہر سمت سے سقراط کے گرد گھیرا ڈال دیا ہے۔'' اس نے بے چینی سے اپنی پیشانی مسلی۔ مقدمے کی دیگر تفصیلات جاننے کے بعد اس کے لیے وہاں رکنا اب ممکن ہی نہ تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے بھاگتا ہوا سقراط کے گھر کی جانب چل دیا۔ مرکزی دروازے سے داخل ہوتے ہی اس کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔

''اتنی صبح کیا افتاد آن پڑی تم پر؟'' سقراط نے حیرانی سے پوچھا۔

''میلیٹس نے آپ کے خلاف [illegible] ہے۔ آپ کو اسے فوری طور پر چل کر [illegible] چاہیے۔'' [illegible] انکشاف کا سقراط پر رتی بھر اثر نہ ہوا۔ وہ بے پروائی سے کنوئیں سے پانی نکال کر چہرے پر چھپاکے مارنے لگا۔

''چلے چلتے ہیں۔'' اطمینان اس کے ہر ایک انداز سے عیاں تھا۔ ''دیگر مدعیان کون ہیں؟''

''اینیٹس اور لائیکان۔'' فیڈو نے بتایا۔ سقراط ایک ہنکارا بھر کر خاموش ہوگیا۔ وہ لمحہ بھر میں مقدمے کی ''اصل'' نوعیت اور مدعیان کا مطمح نظر سمجھ گیا تھا۔ میلیٹس کا سائے کی طرح اس کے پیچھے رہنا اور شاگردوں سے بحث و مباحثے کے دوران اسے الجھائے رکھنے کی دانستہ کوششوں نے اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی پہلے ہی بجا رکھی تھی۔ اینیٹس کا تاثر بھی سقراط کی نظر میں مثبت نہیں تھا۔ بلحاظ پیشہ وہ چمڑا رنگنے کے کاروبار سے منسلک تھا۔ دولت اس کے گھر کی باندی تھی۔ کسی زمانے میں وہ فوج کا جنرل بھی رہ چکا تھا۔ تیس آمرین کی حکومت کے دوران جلاوطنی اختیار کرنے والے افراد میں اینیٹس بھی شامل تھا۔ تھریسی بولس کے ساتھ مزاحمت کرکے حکومت کا تختہ الٹنے میں اس کی جدوجہد بھی شامل تھی۔ سقراط سے اس کا عناد بہت پرانا تھا۔ بنیادی طور پر وہ سوفسطائیوں کا شدید مخالف تھا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی بات راسخ ہوچکی تھی کہ سوفسطائی نوجوانوں کے ذہن یرغمال بناکر سیاسی نظام سے باغی کردیتے ہیں۔ سقراط کو یاد تھا کہ ایک محفل میں اینیٹس اس سے بے طرح الجھ گیا تھا۔ اس محفل میں سقراط نے کہا تھا کہ آج تک کسی سیاسی راہنما نے اپنے بچوں میں مثبت خوبیاں پروان چڑھانے کی طرف توجہ نہیں دی۔ اینیٹس غصے سے بے قابو ہوکر اسے دھمکاتے ہوئے بولا تھا۔

''کسی کے کردار پر انگلی اٹھانا تمہارے لیے بہت آسان ہے سقراط! میری ایک نصیحت اپنے پلے سے باندھ لو کہ تم بات چیت میں احتیاط سے کام لیا کرو۔ اسے میری تنبیہ سمجھ لو یا حقیقت۔ کئی شہروں میں لوگوں کو خیر کے بجائے شر پہنچانا بالکل مشکل ثابت نہیں ہوتا۔ خصوصاً ایسی گفتگو کرنے والے بہت آسان شکار ثابت ہوا کرتے ہیں۔''

اس کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ اینیٹس کا بیٹا بھی سقراط کے شاگردوں میں شامل ہوگیا۔ وہ لڑکا بہت ہونہار تھا لیکن اینیٹس اسے آبائی کاروبار کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔ بیٹے کے بدلتے رنگ ڈھنگ، عقل و فہم کے استعمال اور فرسودہ نظام پر گاہے بگاہے تنقید نے اسے مزید خوفزدہ کر [illegible] ایتھنز میں [illegible] جمہوریتوں کا وجود [illegible] ذہن میں یہ خدشہ کلبلانے لگا کہ اگر باغیانہ خیالات کا حامل کوئی گروہ پھر سے طاقتور ہوجاتا تو جمہوریت کا وجود خطرے میں مبتلا ہوجاتا۔ اس نے اپنے بیٹے کو کسی بھی طرح سقراط کے حلقۂ احباب سے علیحدہ کردیا تھا اور اب قانون کی آڑ لیے اپنے بیان کردہ عزائم کو عملی روپ دینے چلا آیا تھا۔

مقدمے کے تیسرے اور آخری مدعی کی شہرت سے بھی سقراط بے خبر نہ تھا۔ لائیکان ایک ماہر فصیح تھا جسے یقینی طور پر تقریر میں شدت و تاثیر پیدا کرنے کے لیے اس کارروائی میں شامل کیا جاتا تھا۔

''کس سوچ میں گم ہوگئے ہیں سقراط؟'' فیڈو نے اسے متوجہ کیا۔ ''یہ معاملہ بہت گمبھیر ہے۔ آپ کو سنجیدگی سے مقدمے کی پیروی پر غور کرنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، چلو میرے ساتھ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بذاتِ خود اس معاملے کی مزید گہرائی تک پہنچنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

بازاروں میں رونق اپنے عروج پر تھی۔

ایک ذیلی کوچے سے گزرتے ہوئے سقراط کی نظر ''ایپیا'' پر پڑی۔ وہ حسبِ معمول بھڑکیلے لباس میں ملبوس اپنے خادمین کی معیت میں چلا آرہا تھا۔ دھوپ سے بچاؤ کے لیے بانس پر خوبصورت تنکوں سے آڑ بنائے اس کے تیور نہایت متکبرانہ تھے۔

''الوداع سقراط!'' وہ اسے دیکھتے ہی بے نیازی سے بولا۔ مقصد اپنی معروفیت اور مقابل کی کم مائیگی کا احساس دلوانے کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔

''آج تو صبح ہی صبح ایپیا سے ملاقات کا موقع مل گیا۔'' سقراط خوش دلی سے مسکرایا۔ اپنے ہم عصر فلسفیوں کے برعکس وہ کبھی کسی تکبر یا منفی جذبے میں مبتلا نہیں ہوتا تھا۔

''ہاں! میں کچھ عرصے سے شہر میں نہیں تھا اس لیے تمہیں نظر نہ آسکا۔'' اس کی خود پسند طبیعت مکمل جوبن پر تھی۔

''اس قدر ہتھیاروں سے لیس ہوکر کہاں جارہے ہو؟'' اس نے خادمین کو چھتری نما آڑ تھامے دیکھ کر کہا۔

''مجھے ورزش گاہ میں ''بہادروں کے نسب نامے'' پر تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا ہے۔'' اس نے گردن اکڑائی۔ ''تم بھی آجاؤ ہمارے ساتھ۔''

''بدقسمتی سے میں تمہارے ساتھ نہیں جا پاؤں گا۔ مجھے کچھ ضروری کام درپیش ہیں۔'' [illegible] تقریر [illegible] پہلے بھی کئی بار کرچکا ہوں [illegible] مجھے [illegible] اور خوبصورت قرار دے [illegible] تمہاری رائے بھی جان کر خوشی محسوس ہوئی۔'' ذاتی مدح سرائی کرتے ہوئے وہ اپنی کمزوری بھی عیاں کر بیٹھا۔

''یقیناً تمہاری تقریر ایک شاہکار ہوگی لیکن میں تو یہی نہیں جان سکا کہ خوبصورتی درحقیقت کیا ہے؟'' سقراط عاجزی سے مسکرایا۔

''میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں بھئی!'' اس نے فیاضی جتائی۔ ''خوبصورتی صنفِ مخالف کی صناعی، کشش اور بھید بھرا جال ہے۔''

''بہت خوب! یعنی تانیث کی صناعی خوبصورتی ہے۔ اس لحاظ سے تو ایک گدھی بھی حسین شمار کی جاسکتی ہے۔''

''کیوں نہیں، میرے قصبے میں ایسی کئی حسین ترین مثالیں موجود ہیں۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیا۔

''کیا ایک ''توا'' خوبصورتی کے معیار پر پورا اترتا ہے ایپیا؟''

''یہ کیسی باتیں لے بیٹھے ہو سقراط؟'' وہ کوفت زدہ ہوا۔ ''اس شاعرانہ گفتگو میں ایسی کمتر اور کم رو اشیا کا کیا ذکر؟''

''معاف کرنا میرے دوست! میں ایک اجڈ دیہاتی ہوں۔ میرا علم بہت محدود ہے۔'' سقراط مسکرایا۔ ''توا کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو، ایک حسین دوشیزہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

''کنواری لڑکی کی خوبصورتی بھی تو دیوتاؤں کے سامنے ماند پڑسکتی ہے۔ کیا ان کی نسبت وہ بدصورت کہلائی جائے گی؟'' سقراط نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ دوسری جانب فیڈو کی حسیات مکمل چوکنا تھیں۔ اسے علم تھا کہ بظاہر لاحاصل بحث کے پسِ پردہ بھی سقراط کوئی اہم مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔

''بالکل درست! دیوتاؤں سے بھلا اس کا کیا مقابلہ؟'' ایپیا نے سر ہلایا۔

''لیکن ابھی تھوڑی دیر قبل تم نے کہا تھا کہ خوبصورتی صنفِ نازک کی صناعی، کشش اور بھید بھرا جال ہے۔ کوئی بھی چیز بیک وقت خوبصورت اور بدصورت کیسے ہوسکتی ہے؟ تمہاری بات میں تضاد ہے۔ میں اب بھی نہیں سمجھ پایا کہ حسن کا اصل معیار کیا ہے؟''

''اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے سقراط! مجھے ورزش گاہ تک پہنچنے میں تاخیر ہورہی ہے۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلانے لگا۔ سقراط تاسف [illegible] اسے عقب سے دیکھتا رہا۔

''[illegible]ن سوفسطائیوں کو ایتھنز کی نسلِ نو کی ذہنی تربیت کا اختیار دے دیا گیا ہے فیڈو! مجھے تم نوجوانوں کا مستقبل بہت مخدوش نظر آنے لگا ہے۔ منطق اور فلسفے سے عاری یہ افراد ایتھنز کے شہریوں کو ذہنی الجھنوں کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتے۔'' وہ افسردگی سے سر ہلاتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھ گیا۔ فیڈو عقیدت مندی سے سر جھکائے اس کے عقب میں چلتا رہا۔

☆☆☆

شاہ آرکن کی ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی ''یوتھائفرو'' نامی ایک شخص نے سقراط کو اپنی جانب متوجہ کرلیا۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو سقراط؟ کہیں عملی سیاست میں حصہ لینے کا ارادہ تو نہیں کرلیا؟'' اس نے قدرے حیرت سے دریافت کیا۔

''میں بادشاہ نہیں بادشاہ گر بننا چاہتا ہوں یوتھائفرو!'' وہ مسکرایا۔ ''یہاں آنے کا مقصد ایک مقدمے کی تفصیل جاننا ہے۔''

http://urdutubes.com/

''تم تو کسی پر نالش کرنے والے شخص ہی نہیں...... یقیناً کسی کم عقل نے تم پر نالش دائر کردی ہوگی۔'' وہ مزید حیران ہوا۔

''ہاں! میلیٹس نامی نوجوان نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے میری حقیقت پالی ہے۔ میں دیوتاؤں کی توہین اور نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہوں۔ اس نے ہماری ریاست سے التجا کی ہے کہ نسلِ نو کو سقراط کے شر سے محفوظ رکھا جائے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دانش و حکمت میں بے مثال شخص ہوگا۔ ایک بہترین کاشتکار کی طرح اسے ان ننھی کونپلوں کی بہت فکر ہے جنہیں ہم جیسے افراد نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ بڑی شاخوں کی طرف متوجہ ہوگا۔ اس رفتار سے وہ ایک روز ملک و قوم کا بہت عظیم محسن ثابت ہوگا۔''

''میلیٹس کے استغاثہ کی بنیاد ایک ہی نکتہ ہوگا۔ تم اکثر اپنی الہامی آواز سننے کی بات کیا کرتے ہو جس سے میلیٹس جیسے لوگ تمہیں بدعتی سمجھنے لگے ہیں۔ اہلِ ایتھنز مذہب کے معاملے میں بہت حساس، توہم پرست اور انتہا پسند ہیں۔ دیوتاؤں کے بارے میں روایات سے متصادم کوئی بھی بات اپنی ذاتی توہین سمجھ کر لڑنے مرنے پر آمادہ ہونے لگتے ہیں۔ ان کے جذبات بہت آسانی سے مشتعل ہوجاتے ہیں۔ میں بھی جب کسی مجلس میں دیوتاؤں کے متعلق گفتگو یا مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی [illegible] گوئی کروں تو ایسے ہی ردِعمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے حالانکہ میری ہر پیشگوئی بعد ازاں سچ ثابت ہوا کرتی ہے۔ ہمارے شہری سچائی سننے سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ وہ سچائی کا سامنا کرنے کے بجائے حسد و بغض میں مبتلا ہوکر نقصان پہنچانے کے درپے ہوجاتے ہیں۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو۔ یہاں کسی بھی فرد کا ذاتی تشخص اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک وہ خود حکمت و دانش میں یکتا ثابت نہ ہوجائے۔ اگر متعلقہ شخص اپنی یہ حکمت کسی کو سکھانے لگے تو وہ خفا ہونے لگتے ہیں۔ یہ اخلاقی بجی ملی مفاد کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوگی۔''

''میں انہیں کبھی خفا ہونے کا موقع ہی نہیں دیتا۔'' یوتھائفرو نے کہا۔

''تمہارا طرزِ عمل نہایت محتاط رہا ہے لیکن میں نے ہمیشہ دوسروں کو سمجھانے اور سکھانے کی کوشش کی ہے۔ تم ایک کاہن ہو۔ تمہارا علم میرے مقدمے کے بارے میں کیا پیشگوئی کرتا ہے؟'' سقراط نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہم دونوں ہی اپنے مقدمات سے بہ آسانی بری ہوجائیں گے۔'' وہ پُریقین تھا۔

''کیا تمہیں بھی کسی مقدمے کا سامنا ہے میرے دوست؟'' سقراط چونکا۔ ''تم مدعی ہو یا مدعا علیہ؟''

''میں مدعی ہوں۔ میں نے اپنے والد کے خلاف مقدمہ دائر کیا ہے۔'' اس نے ایک اور انکشاف کیا اور سقراط کی بے یقینی دیکھ کر سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''انہوں نے قتلِ نفس کا ارتکاب کیا تھا۔''

''قتلِ نفس...... کیا اہلِ خانہ میں سے کسی کی جان لی انہوں نے؟ غیر رشتے دار کے خلاف تو تم انہیں عدالت میں نہیں گھسیٹ سکتے۔''

''کیوں نہیں گھسیٹ سکتا؟ مجھے تعجب ہے سقراط کہ تم جیسا شخص بھی قتل کو دو مختلف خانوں میں تقسیم کرسکتا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ رشتے دار اور غیر رشتے دار کے قتل پر مختلف جذبات محسوس کیے جائیں؟ انسانیت کا تقاضا تو یہی ہے کہ قاتل و مقتول خواہ کوئی بھی ہوں، ان کے لیے طیش و ہمدردی کا جذبہ یکساں ہو۔''

''مقتول کون تھا؟'' سقراط کو یوتھائفرو کے روپ میں ''سچائی'' کا ایک نیا سرچشمہ نظر آرہا تھا۔ وہ اس کی گفتگو میں دلچسپی لینے پر مجبور ہونے لگا۔

''وہ [illegible] کھیت [illegible] کے نشے میں اپنے ایک ساتھی [illegible] جان چلا گیا۔ میرے والد نے اس کے ہاتھ پاؤں بندھوا کر خندق میں پھینکا اور دوسرے مزدور کو اس معاملے کی قانونی باریکیاں جاننے کے لیے ایتھنز روانہ کردیا۔ انہیں اس بات کی ذرا پروا نہ تھی کہ خندق میں بندھا وہ آدمی قطرہ قطرہ زندگی سے دور ہورہا ہے۔ وہ سردی، بھوک اور بیڑیوں کی اذیت سہتا جان کی بازی ہار گیا۔ لوگ اس معاملے پر مجھے لعنت ملامت کرتے ہیں کہ والد پر مقدمہ دائر کرنا بے دینی اور فسق ہے۔ انہیں میرا یہ عمل خلافِ مذہب تو نظر آرہا ہے لیکن وہ انسانی ہمدردی تسلیم ہی نہیں کر پارہے۔''

''مجھے تمہاری سوچ اور نظریہ متاثر کرنے لگا ہے۔ تم مذہب کی حقیقت، دین داری اور بے دینی کی باتوں کے مستند عالم محسوس ہورہے ہو۔ اس لیے میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے دین داری اور بے دینی کی اصل روح سمجھاؤ۔'' اس کے وجود میں یکدم ایک پیاس امڈ آئی۔

''میرے افعال دین داری ہی کا عکس ہیں۔ ہر اس شخص کے خلاف کارروائی کرنا جو قتل، دیوتاؤں کی بے حرمتی اور جرائم کا مرتکب ہو۔ مجرم خواہ باپ، ماں یا بیٹا ہی کیوں نہ

ہو اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنا بے دینی ہے۔ لوگ زیوس دیوتا کو سب سے اچھا اور نیک سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بات بھی تسلیم کرتے ہیں کہ زیوس نے اپنے والد 'کرونوس' کو اس جرم میں قید کردیا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں کو کھا گیا تھا۔ خود اس نے بھی اپنے والد 'یورانس' کو اسی بنا پر سزا دی تھی۔ دیوتاؤں کے ان اعمال کو وہ بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن میری جانب سے کی گئی قانونی کارروائی پر لعن طعن کرنے لگے ہیں۔ کیا یہ بے اصولی نہیں کہ دیوتاؤں اور حقیقی زندگی میں ان کے معیار الگ ہیں۔''

''اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ مجھ پر عائد کردہ الزامات کی بنیاد بھی یہی سوچ ہوگی کہ میں دیوتاؤں کے متعلق ایسی کہانیوں پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بے دین ہوں۔'' سقراط نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

''میں دیوتاؤں کی تاریخ کے متعلق ایسے حقائق بھی جانتا ہوں جو تمہیں بھی دنگ کردیں گے۔'' یوتھائفرو نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''میں اس سچائی سے بھی ضرور روشناس ہونا چاہوں گا لیکن ابھی [illegible] نے میرے پہلے سوال [illegible] تفصیلی جواب نہیں [illegible] کیا [illegible] داری [illegible] دینی کا [illegible] صرف قتل کے مقدمے [illegible] ہی ہے؟'' سقراط اپنی فطرت و عادت سے مجبور ہوکر کسی بھی معاملے کے متعلق سوال در سوال کیے بغیر مطمئن ہو ہی نہیں پاتا تھا۔

''اچھا تو پھر سنو! دین داری وہ عمل ہے جو دیوتاؤں میں مقبول ہو اور بے دینی ایسا امر ہے جو ان میں ناپسندیدہ اور غیر مقبول ہو۔''

''تم نے ابھی مجھے بتایا کہ دیوتاؤں کے درمیان بھی تضادات موجود ہیں۔ وہ باہمی جھگڑے میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح اچھائی اور برائی کے متعلق بحث کرتے ہیں۔''

''بالکل! تمہارا فہم قابلِ داد ہے۔'' یوتھائفرو نے تائید کی۔

''یعنی ایک ہی بات بیک وقت ایک دیوتا کو ناراض جبکہ دوسرے کو خوش کیا کرتی ہے۔'' سقراط کے اس تجزیے پر بھی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا اپنے والد کے خلاف مقدمے میں الجھنا زیوس دیوتا کو پسند آئے گا لیکن کرونوس اور یورانس اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ ہیفیسٹس اور ہیری دیوتا بھی بالترتیب اسی طرح متضاد جذبات میں مبتلا ہوں گے۔''

''تم معاملات کو بالکل درست سمت میں سمجھ گئے ہو۔'' یوتھائفرو نے ستائشی انداز میں کہا۔

''ایسا کیسے ممکن ہے؟'' سقراط الجھا۔ ''ایک ہی بات بیک وقت متضاد کیفیات کی حامل کیسے ہوسکتی ہے؟ سچائی کی تاثیر کبھی متضاد نہیں ہوا کرتی۔ اس کے مضمرات تو ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں میرے دوست! مجھے ایک بار پھر سمجھاؤ کہ دین داری اور بے دینی کی اصل روح کیا ہے؟'' اس کے مطالبے اور بے یقینی پر یوتھائفرو جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوگیا۔ اسے علم ہوگیا تھا کہ وہ کسی عام آدمی کی طرح سقراط کو قائل نہیں کرسکتا۔

''ہم اس پُرمغز بحث کو کسی اور وقت پر مؤخر کردیتے ہیں۔ مجھے ایک ضروری کام سے کہیں پہنچنا ہے اس لیے مزید یہاں ٹھہرنا ممکن نہیں۔'' وہ الوداعی مصافحہ کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ سقراط ایک گہری سانس بھر کر خاموش رہ گیا۔ اس کے چہرے پر تاسف، افسردگی اور بے بسی... کی کیفیات درج تھیں۔

''آپ یقیناً یہی سوچ رہے ہیں کہ اس ریاست کے نوجوانوں کا [illegible] مستقبل کیا ہوگا؟'' فیڈو نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''یہاں [illegible] وسطائی' کاہن اور مذہبی راہنماؤں میں سے کسی کے بھی نظریات واضح نہیں ہیں۔ ایسے افراد الجھنیں پروان چڑھانے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتے۔''

''میں بالکل یہی سوچ رہا ہوں۔ یہ لوگ ایک باریک سا نکتہ سمجھ ہی نہیں پارہے کہ سچائی کبھی متضاد رویوں کی حامل نہیں ہوتی۔ جس فعل میں تضاد در آئے وہ یقینی طور پر باطل ہے۔ یہ سب افراد ہماری ریاست میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایسا سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی نظام میلیٹس، لائیکان اور اینیٹس جیسے مدعیان پیدا کرنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے؟'' وہ اپنے شہریوں کے لیے حقیقی دکھ محسوس کرتا ہوا خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

''میں جانتی تھی سقراط کہ تمہارا یہ جنون کسی دن ہم سب کو ایک آزار میں مبتلا کردے گا۔ تمہیں کتنا سمجھاتی تھی کہ لوگوں کو وعظ و تقریر سے سمجھانے کا یہ سلسلہ ختم کردو۔ ہماری ہر بدقسمتی تمہاری اسی ذہنی خرابی کا تحفہ ہے۔'' زین تھیپی نے واویلا شروع کردیا تھا۔ وہ سقراط اور چند شاگردوں کے ساتھ گھر کے صحن میں بیٹھی تھی۔

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

کیا۔

''آپ نے اپنے دفاع کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟'' سائمن نے دریافت کیا۔ سقراط پر دائر کیے جانے والے اس مقدمے نے ان سبھی کو بے اختیار تڑپ میں مبتلا کردیا تھا۔

''میں نے زندگی بھر ناانصافی سے گریز کر کے انصاف کا دامن تھامے رکھا ہے۔ اس سے بڑھ کر میرا دفاع کیا ہوسکتا ہے؟'' وہ متانت سے کہنے لگا۔ اس کے اعصاب ہنوز پُرسکون اور چہرے پر مخصوص مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''آپ کی بات بالکل بجا ہے لیکن ان الزامات کا جواب دائر کرتے ہوئے باقاعدہ مقابلہ کیے بنا بھی تو کوئی چارہ نہیں۔'' افلاطون نے ادب سے کہا۔ زین تھپی نے... بہ آوازِ بلند رونا شروع کردیا۔

''اس میں آنسو بہانے کی کیا بات ہے زین تھپی؟ رونے سے یہ مقدمہ نہیں لڑا جاسکتا۔'' وہ پچکار کر بولا۔

''سقراط! اس معاملے میں غیر سنجیدہ روش ترک کر دو۔ تمہیں دیوتاؤں کا واسطہ! اپنے بچوں کی طرف دیکھو۔ انہی کی خاطر کسی 'خطیب' سے رجوع کرو کہ وہ عدالت میں تمہارا دفاع کرے۔'' وہ مزید رونے لگی۔ سبھی شاگرد اس تجویز میں اس کے ہم نوا تھے۔

''ٹھیک ہے! تم سب کو اسی سے خوشی ملتی ہے تو میں یہ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''

''ہم لائیاس سے رابطہ کریں گے۔ وہ ایتھنز کا بہترین خطیب ہے۔'' کرائٹو نے کہا۔

''تم کسی بھی تاخیر کے بغیر اس کے پاس جاؤ۔ اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کر کے اس مقدمے کی پیروی کے لیے راضی کرو۔'' زین تھپی تڑپ کر بولی۔ ان سب کے روانہ ہوتے ہی اس کے ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے۔ وہ شوہر کے کندھے پر آنسو بہاتی دیوتاؤں سے اس آفت سے چھٹکارے کی دعائیں کرنے لگی۔

☆☆☆

لائیاس درمیانی عمر کا ایک خوبرو، متین اور باوقار شخص تھا۔

معاملے کی سنگینی سے آگاہی کے بعد وہ فوری طور پر سقراط کے گھر چلا آیا تھا اور اب وہ سبھی افراد صحن میں چوبی دیوان پر بیٹھے تھے۔ زین تھپی مقامی رواج کے مطابق دیوان پر تکیے سجا کر بہترین مہمان نوازی کے دیگر لوازمات بھی حتی المقدور نبھانے میں مصروف تھی۔ لائیاس نے اپنے سیاہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سلسلۂ کلام کا آغاز کیا۔

''میں معاملے کو مکمل طور پر سمجھ گیا ہوں۔ اس قسم کے مقدمات کی دفاعی تقاریر میرے لیے بالکل مشکل نہیں۔ میں سب سے پہلے تمہید باندھتے ہوئے مذہبی رسومات کی مدح سرائی کروں گا۔ پھر ایتھنز کی عظیم ریاست اور اس کے اظہارِ فخر کے بعد انہیں یونان بھر سے ہومر جیسی لازوال شخصیات کا وارث قرار دے کر ان کے جاہ وجلال کا عکس قرار دوں گا۔ انہیں یہ باور کرواؤں گا کہ ایتھنز کی عظیم روحانی قوت کو دیکھ کر باطل طاقتیں پسپا اور دشمن مغلوب ہوجاتے ہیں۔'' اس نے وضاحت سے اپنے طریقۂ کار کے متعلق بتایا۔ سقراط کسی بھی ردِعمل کے بغیر خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''اس کے بعد اظہارِ بیان کی قوت بے حد ضروری ہے۔ میں انہیں بھرپور فصاحت سے احساس دلواؤں گا کہ سقراط کے خلاف الزامات بے بنیاد ہیں۔ یہ مقدمہ محض ذاتی بغض وعناد کی بنا پر دائر کیا گیا ہے۔'' لائیاس یہ کہتے ہوئے اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ زین تھپی کے چہرے پر اس کی گفتگو سے اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

''جہاں تک نئے عقیدے اور نوجوانوں کو گمراہ کرنے [illegible] اس بارے [illegible] بیان [illegible] وضاحت سے بیان کرنے [illegible] رہے گا۔'' اس کی بات سنتے ہی سقراط کے چہرے پر مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ ''اگر کوئی گمراہ کن عقیدہ تخلیق ہوا تھا تو ایسا راتوں رات ہرگز نہیں ہوسکتا۔ مجھے ایمان کی حد تک یقین ہے کہ معزز حکومت ایسی کسی بھی بغاوت کی بو فوری طور پر سونگھ کر اس فتنے کو آغاز میں ہی کچلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایسا کیونکر ممکن ہے کہ نوجوان اس عقیدے کے پیروکار بن جائیں اور حکومتی نظام بے خبر رہیں۔ دوسری جانب انسانی ذہن پر آبائی مذہب کے اثرات اتنے ناپختہ بھی نہیں ہوتے کہ وہ فوری طور پر نیا عقیدہ قبول کرلیں۔ یہ بات منطقی طور پر درست معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد میں دفاع کا مرکزی نکتہ اٹھاؤں گا۔ میں ان سے کہوں گا کہ کیا مجھے یاددہانی کروانی ہوگی کہ ہمارے سامنے سقراط کھڑا ہے۔ وہ سقراط جو ماضی میں ایک دلیر، بے باک اور لائقِ تقلید سپاہی رہ چکا ہے۔ وہ میدانِ جنگ میں دیوتاؤں کی حرمت کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔ حیرت انگیز جفاکشی اور ضبطِ نفس اس کی نمایاں خصوصیات رہی ہیں۔ وہ ''منصف'' بھی تو رہ چکا ہے۔ ایسا سخت کوش، امن پسند انسان ریاستی اصولوں سے منحرف کیسے ہوسکتا ہے۔'' زین تھپی کا چہرہ پل پل خوشی اور سکون سے رنگ بدلنے لگا۔ وہ اب پُرسکون دکھائی دے رہی تھی۔

''پھر میں اپنے دفاع میں تمہاری سزائے موت معاف کروانے پر زور دوں گا۔ نہیں اہلِ ایتھنز...... نہیں! سقراط پر یہ الزامات جھوٹے ہیں۔ اس کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح آپ سب کے سامنے گزری ہے۔ وہ روادار، شفیق، بہادر، انصاف پسند اور قانون کا احترام کرنے والا بے ضرر شہری ہے، باغی اور مجرم ہرگز نہیں۔ اس کے بڑھاپے کا احترام کریں۔ موت تو یوں بھی اب کسی بھی لمحے اپنی ہم نوائی عطا کردے گی۔ اسے زندگی کے یہ آخری سال بھرپور انداز میں جی لینے کی اجازت دے کر بری کردیں۔ سزائے موت کے معاملے میں مدعاعلیہ اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے آیا کرتے ہیں۔ انہیں جیوری کے ارکان کے سامنے پیش کر کے رحم طلب کیا جاتا ہے۔ ہم تمہارے کم عمر بچوں کو بھی وہاں لے جاکر جیوری کے دل نرم کرسکتے ہیں۔'' لائیاس اپنا لائحہ عمل سب کے گوش گزار کر کے دادطلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

''بہت عمدہ تقریر ہے۔'' سقراط نے حقیقی توصیف کی [illegible] اس سے جیوری کو کیا فائدہ ہوگا؟''

''انہیں [illegible] نہیں پہنچانا سقراط! بلکہ تمہیں [illegible] دلوانی ہے۔'' لائیاس نے جتایا۔

''اس مقصد کے لیے تم انہیں نقصان پہنچانے کے لیے بھی تیار ہو؟'' اس نے استفسار کیا۔

''یقیناً! میں کامیاب دفاع کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''

''انہیں نقصان پہنچا کر میرا فائدہ کس طرح ہوگا یہ سوال ابھی ایک جانب رکھتے ہیں۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ کسی بھی انسان کے لیے سب سے قیمتی چیز کیا ہوتی ہے؟''

''اس کی زندگی۔'' لائیاس نے بلاتامل کہا۔

''جھوٹ سے ملاوٹ شدہ زندگی یا سچائی کی علمبردار؟''

''سچائی کی علمبردار۔'' وہ ان سوالات کا مقصد سمجھ نہ پارہا تھا۔

''تو اگر تم مجھ پر عائد جھوٹے الزامات کے جواب میں مزید جھوٹ تراش کر جیوری کو صرف خوشامد سے قائل کرو گے تو کیا مجھے ملنے والی بریت وزندگی تمہاری فصاحت کے بدلے میں ملنے والی ''خیرات'' نہ ہوگی؟'' سقراط نے سنجیدگی سے کہا۔ ''نہیں لائیاس! زندگی خوشیوں کے حصار میں ہی اچھی لگتی ہے اور انسان کے لیے واحد خوشی صرف ایک ہی ہے...... کسی بھی کج روی کے بغیر سچائی کی تلاش۔''

''تو تم انہیں کس انداز میں قائل کرنا چاہتے ہو؟''

''کیا تم نے کبھی ستارے دیکھے ہیں لائیاس؟ ہم ان کے قریب جاکر لمس کی سنسنی حاصل نہیں کرسکتے لیکن ان کی چمک دمک کسی بھی میدان یا پہاڑ کی چوٹی سے یکساں ہی دکھائی دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح سچائی بھی اپنا وجود چمک، روشنی اور خوشبو کی صورت میں تسلیم کروالیتی ہے۔''

''کیا تم سزا پانے کے خواہشمند ہو سقراط؟'' اس نے قدرے کوفت سے پوچھا۔

''اگر جمہوریت اور قانون مجھے موت سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں تو اس کے پسِ پردہ بھی کوئی منطق کارفرما ہوگی۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''پاگل بن مت دکھاؤ سقراط! یہ مقدمہ ہم بہ آسانی جیت سکتے ہیں۔ میلیٹس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ ایک غریب، لاچار اور معاشی پسماندہ شخص ہے۔ اس کے بجائے ہمیں اینیٹس پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ وہ تیسرے درجے کا بازاری راہنما ہے۔ لائیکان البتہ ماہرِ فصاحت [illegible] ہنر خطرہ ثابت ہوسکتا ہے اور سب سے زیادہ تا [illegible] حقیقت کیوں فراموش کررہے ہو کہ ایتھنز کے شہری صرف فصاحت وبلاغت کے مداح ہیں۔ انہیں صرف اسی ایک صورت میں قائل کیا جاسکتا ہے۔''

''میں اس عمر میں چاپلوسی، خوشامد اور جھوٹ کے ملغوبے پر مشتمل تقریر کے نام پر فصاحت سکھانے والے سوفسطائیوں کے پاس داخلہ نہیں لے سکتا لائیاس! میں انہیں صرف سچائی سے روشناس کرواؤں گا۔ سچ بذاتِ خود ایک سورج کی طرح ہوتا ہے جسے کوئی نابینا دیکھ نہ سکے تو اس کی حدت ضرور محسوس کرسکتا ہے۔''

''جیسے تمہیں بہتر لگے سقراط! تم اپنی زندگی کے متعلق بہتر فیصلہ کرنے کے اہل ہو۔'' لائیاس اٹھ کھڑا ہوا۔ زین تھپی اسے پکار کر روکنے لگی اور پھر غصے وشکوے سے سقراط کو دیکھنے لگی۔

''میں اپنا دفاع خود ہی کروں گا۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

''حماقت در حماقت! یہ ضد تمہیں ایک ایسی اندھی گلی میں لے جائے گی جہاں شکست اور موت کے سوا تمہیں واپسی کا کوئی رستہ نہیں دیا جائے گا۔ اپنے بچوں کے بارے

Digitized by Google
http://urdutubes.com/

میں ہی ایک بار سوچ لو سقراط!'' وہ التجائیں کرنے لگی۔
''میں اس مقدمے کی پیروی تمہاری اور بچوں کی خاطر ہی تو کر رہا ہوں۔ جیوری مجھے بری کردے گی۔''
سقراط نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما۔
''میں جانتی ہوں وہ تمہیں سزاوار قرار دینے پر تلے ہیں۔ وہ تم سے نفرت کرتے ہیں۔ ہمیں تنہا مت کرو سقراط! تمہارے بغیر میں سب کچھ کس طرح سنبھالوں گی؟'' وہ ایک بار پھر آنسو بہانے لگی۔ شاگردوں کی آنکھیں بھی شدتِ ضبط سے نم ہونے لگی تھیں۔

☆☆☆

ایتھنز کے گلی کوچوں میں رات کا سناٹا طاری تھا۔ اس تاریکی میں انسانی قدموں کی ہلچل کسی انہونی کا پتا دے رہی تھی۔ مشعل بردار لوگ ٹولیوں کی صورت میں ایک مخصوص عمارت کی طرف رواں دواں تھے۔ عمارت میں بہت سے معززین جمع تھے۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی درعونت نقش تھی۔ یہاں سقراط کے مقدمے کی جیوری تشکیل دی جارہی تھی۔ ہال کے وسط میں ایک مٹکا موجود تھا جس میں قرعہ اندازی کے مخصوص طریقہ کار کے ذریعے شہریوں کا انتخاب کیا جارہا تھا۔
''تم یہاں کیا کررہے ہو ایربیٹ؟ تم بہت کم عمر ہو۔'' ایک شہری نے اپنے پاس کھڑے لڑکے کو مخاطب کیا۔
''میں تیس سال کا ہوچکا ہوں اور دیوتاؤں کی کرپا سے رائے دہی کے عمل میں بخوبی شرکت کرسکتا ہوں۔'' وہ فخریہ مسکرایا۔
''اوہ زیوس دیوتا! وقت کا پنچھی کس قدر برق رفتاری سے پرواز کرتا ہے۔ میں تمہیں ابھی بہت کم عمر سمجھتا تھا۔'' شہری حیرانی سے کہتا ہوا انتخاب کے حتمی مرحلے کی جانب متوجہ ہوگیا۔ سفید اور سیاہ موتیوں کے ذریعے انتخاب اور مستردگی کا عمل شروع ہوچکا تھا۔
''اس مقدمے کا پس منظر معلوم ہے تمہیں؟'' منتخب ہونے والے ایک شہری نے اپنے ساتھ کھڑے شخص سے کہا۔
''میں رتی بھر بھی واقف نہیں بھئی! لیکن تشویش زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہمیں وہاں اپنی نشستیں سنبھالنے سے قبل معاملے سے آگاہ کردیا جائے گا۔'' وہ شخص قدرے عمر رسیدہ اور معاملہ فہم تھا۔
''جیوری کا حصہ بننے والے افراد کو ملنے والی علامتی چھڑی کا رنگ آج سرخ ہے۔ مجھے یہ تبدیلی بہت اچھی لگی۔''
''یہ رنگ میرے لیے بھی خوش بختی کی علامت رہا ہے۔'' عمر رسیدہ شخص مسکرایا۔
''آج ایسا لگتا ہے کہ دیوتا ہم سے ناراض ہیں۔'' مسترد ہونے والے ایک شخص نے افسردگی سے کہا۔
''اس طرح تو ہم پانچ سو ایک کا ہندسہ کبھی بھی عبور نہیں کرسکیں گے۔'' ایربیٹ فکرمند ہوا۔
''فکر نہ کرو! ایسا آج تک کبھی نہیں ہوا۔ یہ معاملہ طوالت سے سہی لیکن مطلوبہ ہندسے ضرور حاصل کرے گا۔'' پہلے شخص نے بے نیازی دکھائی۔ انہیں علم ہی نہ تھا کہ اس عمارت میں تشکیل دی جانے والی ''جماعتِ منصفین'' بہت محنت سے تشکیل دی جارہی ہے۔ منتخب شدہ افراد میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو سقراط کو پہلے ہی ناپسند کرتے تھے۔ اس کے لیے معمولی نرم گوشہ رکھنے والا فرد بھی آج مسترد ہورہا تھا۔ جمہوریت کا احترام کرنے والے اس سیاسی نظام میں جمہوری اصولوں کا بہت اہتمام سے قتل ہورہا تھا۔

☆☆☆

وہ موسم بہار کی ایک دلفریب صبح تھی۔
مقدمے کی کارروائی کا وقت آن پہنچا تھا۔ قانون کے مطابق الزام کنندہ کو جرح کے لیے بلانے کے علاوہ گواہ بھی پیش کیے جاسکتے تھے۔ ابتدائی تین گھنٹے استغاثہ کو دیے جاتے تھے تاکہ وہ اپنا مؤقف ثابت کرسکے۔ اس کے بعد [illegible] لیے تین گھنٹے [illegible] [illegible] بعد جیوری رائے [illegible] فیصلہ ملزم کے خلاف ہونے کی صورت میں اسے اپنے لیے متبادل سزا تجویز کرنے کا اختیار بھی ملتا تھا۔ اس سزا پر جیوری ایک بار پھر کثرتِ رائے سے فیصلہ کرتی۔ پانچ سو ایک افراد پر مشتمل اس جماعتِ منصفین کے علاوہ دیگر شہری بھی مقدمے کی سماعت کے لیے آمد کے مجاز تھے۔ ان کی نشست کے لیے علیحدہ انتظام کیا جاتا تھا۔ سقراط پر دائر اس مقدمے میں عام شہری بھی جوق در جوق ہزاروں کی تعداد میں شرکت کرنے آئے تھے۔
جیوری میں شامل افراد یکے بعد دیگرے اپنی مخصوص نشستوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ داخلی دروازے پر موجود ایک سپاہی ان سے علامتی چھڑی لینے کے بعد ایک جانب زمین پر پھینک دیتا اور انہیں ایک ''بلّا'' تھما دیتا۔ کارروائی کے اختتام پر وہ سبھی افراد یہ ''بلّے'' دکھا کر ''اوبول'' (قدیم یونانی سکے) کی صورت میں اپنی اجرت حاصل کرسکتے تھے۔ کچھ ہی لمحوں بعد انتظامیہ کے افراد عمارت سے برآمد ہوئے۔ سب شہری ان کی تعظیم میں

کھڑے ہوگئے۔ بادشاہ (مجسٹریٹ) سب سے بلند زینے پر براجمان ہوگیا۔ اس کے عقب میں ستون اور ڈیوڑھیاں موجود تھیں۔ تیسرے زینے پر دو مٹکے رکھے گئے تھے۔ ان کے بالائی حصوں کا رنگ زرد اور نیلگوں تھا۔ زینوں کے سامنے پتھروں کی مخصوص ترتیب پر ایک برتن دھرا تھا جس کے بائیں جانب سقراط جبکہ دائیں سمت میں تینوں مدعیان بیٹھے تھے۔ انتظامیہ کے ایک شخص نے چھوٹے سے پیالے کی مدد سے کنالی سے پانی لیا اور چند گز کے فاصلے پر موجود چبوترے کی تین سیڑھیوں کے اردگرد چھڑکاؤ کرنے لگا۔ اس عمل سے فراغت پاتے ہی اس نے پیالہ کنالی میں واپس رکھا اور باوقار انداز میں چلتا ہوا چبوترے پر آ کھڑا ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوتے ہی دیگر افراد بھی تعظیمی انداز میں کھڑے ہوگئے۔ ان سب کی نظریں پہاڑی پر ایستادہ مجسمے پر مرکوز تھیں۔ اس خاموشی کو اسی شخص کی بلند آواز نے چھناکے سے توڑا۔
''اوا ایتھنز! اتم دخترِ زیوس اور مادرِ حکمت' فنون' دانائی دختر ہو۔ زیتون اور پتوار کا استعمال سکھا کر تم نے ہی ہمیں جہان بھر میں ممتاز بنایا ہے۔ تمہاری عظمت برقرار رکھنے کے لیے ہماری پیش کردہ قربانیاں کبھی فراموش نہ کرنا۔ ہمیں اپنے احکامات کی تعمیل کے قابل رکھنا۔ اپنی ڈھال کا سایہ [illegible] ایتھنز! تم مجسم شجاعت ہو [illegible]''
مناجات کی ادائیگی کے بعد وہ تین زینے نیچے اتر کر بادشاہ کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ اس کے دائیں جانب بیٹھے شخص نے اپنے ہاتھ میں تھامے پلندے سے ایک کاغذ نکال کر اسے تھما دیا جس پر تحریر عبارت بہ آوازِ بلند پڑھ کر سنائی جانی تھی۔
''ہم سب لوگوں کی قسمت نے دیوتاؤں کی رضا سے یاوری کی ہے۔ آج تمہیں میلیٹس کی جانب سے سقراط کے خلاف دائرکردہ اس مقدمے کا منصف بنایا گیا ہے۔ سقراط پر یہ الزامات ہیں کہ وہ ہمارے دیوتاؤں کا منکر ہے۔ نئے معبود تراش کر فاسق عقائد کی تبلیغ کررہا ہے۔ وہ نوجوانوں کے اخلاق بگاڑتا پایا گیا ہے۔ مدعی میلیٹس پہلے اپنے دلائل پیش کرے گا۔''
میلیٹس فخر و غرور سے گردن اکڑائے چلتا ہوا چبوترے پر آیا اور چہرے پر حتی الامکان مدبرانہ تاثرات طاری کیے گویا ہوا۔
''مجھے معزز عدالت میں کھڑے اپنے ساتھی شہری سقراط سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے۔ میں یہاں صرف ایتھنز کی محبت کے لیے موجود ہوں۔ سقراط نے بے دینی اور فسق کا جرم سرزد کیا ہے۔ وہ ایک بدروح ہے۔ وہ روایت شکن ہے۔ اس کی فطرت تعمیری سرگرمیوں کے بجائے تخریب کاری کی طرف مائل رہتی ہے۔ ایتھنز نے دیوتاؤں کی ناراضگی کے باعث ایک طویل عرصے تک جنگ' بدامنی اور غلامی کے آزار برداشت کیے ہیں۔ آج یہ شخص پھر سے دیوتاؤں کا غضب للکار رہا ہے۔ یہ ایتھنز کی سلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔'' وہ غصے سے کف اڑانے لگا۔ ''میری روح رنجیدہ ہے اہلِ ایتھنز! اس انسان کے لیے موت کی سزا طلب کرنا میرا مذہبی فریضہ ہے۔ مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔ اگر اسے سزا نہ دی گئی تو یہ ہمارا شہر برباد کردے گا۔ ایتھنز کی بقا اب آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔'' وہ بلا تکان بولنے کے بعد سر اکڑائے نیچے اتر گیا۔ کرائٹو اور شاگردوں کے چہرے افسردگی اور رنج کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔
میلیٹس کے بعد اینیٹس کو دلائل دینے کے لیے طلب کیا گیا۔ اس کی زہرافشانی اور نفرت بھی اپنے عروج پر تھی۔
''ایتھنز کے شہریو! آپ سب مجھے ایک طویل عرصے سے جانتے ہیں۔ جس طرح ایتھنز سے میری محبت کسی سے پوشیدہ نہیں [illegible] اسی طرح سقراط کے سابقہ گناہ بھی آپ [illegible] عیاں ہیں۔ اس شخص کی وجہ سے ہم سب [illegible] [illegible]شت نہیں کیا۔ کرائٹیاس اور ایلسی بائیڈیز نامی عذاب اسی نے ہم پر مسلط کیے تھے لیکن چونکہ نئے قانون کے احترام میں سابقہ جرائم کا حوالہ نہیں دیا جاسکتا اس لیے میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ سقراط ہماری نئی نسل کے اخلاق' کردار اور ذہنی تربیت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اس شخص کے لیے سزائے موت بھی بہت معمولی سزا ہے۔ اگر اسے آزاد کردیا گیا تو آپ سب کی اولاد گمراہی اور تباہی کے گڑھے میں جا گرے گی۔''
اینیٹس کے بعد لائیکان نے زورِ خطابت آزمانا شروع کردیا۔
''عظیم ایتھنز کے باسیو! آپ کا ضابطۂ اخلاق صدیوں سے طے شدہ ہے۔ اسے کسی شرپسند کے ہتھے چڑھ کر تباہی میں مبتلا نہ ہونے دیں۔ الزامات اور حقائق آپ کے سامنے ہیں۔ مجھے آپ کی دانائی' حکمت اور فراست پر اتنا ہی یقین ہے جتنا زیوس دیوتا پر۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔'' اس کے طویل بیان

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

کے اختتام پر شہریوں کا ہجوم خوشی سے چٹکیاں بجا کر بھرپور داد دینے لگا۔ سقراط خاموشی سے قرب و جوار کا جائزہ لینے میں مگن تھا۔ تینوں مدعیان کے بعد اسے اپنا موقف پیش کرنے کے لیے طلب کرلیا گیا۔

''ایتھنز کے شہریو! میں ان حضرات کی طرح لفاظی سے مرتع' شاندار جملوں اور خوبصورت پیرائے میں ملبوس تقریر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ میں صاف' سیدھی اور سچی بات کے سوا کسی اندازِ بیاں کو نہیں جانتا۔ ممکن ہے میرا اندازِ تقریر آپ کو گراں گزرے لیکن انصاف اور فنِ مقرر کی اصل روح یہی ہے کہ سچ کے سوا کچھ بھی نہ کہا جائے۔ آج میری یہی کوشش ہوگی کہ آپ کے دلوں میں سالہا سال سے موجود تعصب اس مختصر وقت میں دور کر کے اپنا کامیاب دفاع کرسکوں۔ حضرات! میلیٹس کے عائد کردہ الزامات کے تحت تو میں قطعاً مجرم نہیں ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے صفائی پیش کرنے کی زیادہ ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ اگر کوئی چیز مجھے مجرم قرار دے گی تو وہ میلیٹس یا اینیٹس کے الزامات نہیں بلکہ نفرت وعداوت ہوگی۔ اسی نفرت نے ماضی میں مجھ سے پہلے بھی کئی حق گو افراد کو مجرم ٹھہرایا ہے۔ شاید تاریخ آج ایک بار پھر خود کو دہرانے پر آمادہ ہے۔ آپ میں سے اکثر لوگ یہی سوچ رہے ہوں [illegible] کہ سقراط نے ایک ایسا باعثِ شرم طرزِ عمل کیوں اختیار [illegible] میں آج موت کی تلوار سر پر رقصاں [illegible] بدلے میں صرف یہی کہوں گا کہ اچھائی و برائی کی تمیز رکھنے والے شخص کے لیے کوئی بھی عمل زندگی یا موت کے پیمانے پر نہیں بلکہ صحیح و غلط' صالح و شر کی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں۔

''حضرات! اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان جب بھی انفرادی یا اجتماعی حیثیت میں کسی اہم محاذ پر متعین ہو تو اس مقام سے قدم پیچھے ہٹانا پسپائی کی ذلت سے بھی بدتر ہے۔ انسانیت کی معراج اسی میں ہے کہ خطرات کی پروا کیے بغیر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے فرائض سرانجام دیے جاتے رہیں۔''

اس کے بعد سقراط نے میلیٹس کو جرح کے لیے چبوترے پر بلوانے کی اجازت طلب کی۔ وہ اس مدعی کے ذہنی معیار اور سوچ کی قلعی اتار کر شہریوں کو اصل حقائق سے آشنا کرنا چاہتا تھا۔ اس طلبی اور سقراط سے دوبدو بات چیت کے تصور نے ہی میلیٹس کا رنگ فق کردیا۔ وہ مریل قدموں سے چلتا ہوا چبوترے پر چلا آیا۔

''اب میں معزز عدالت کے سامنے یہ بات ثابت کروں گا کہ میرا مدعی بذاتِ خود ''لاعلم'' شخص ہے۔ اس نے مجھے ایسے الزامات کے تحت عدالت میں گھسیٹا ہے جن کے حقائق سے وہ خود بھی ناواقف ہے۔'' سقراط جیوری اور شہریوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا اور پھر میلیٹس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''غالباً تم نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے قائل نہیں ہو۔''

''میں اسے بے حد اہم سمجھتا ہوں۔'' اس نے بے تابی سے جواب دیا۔

''تمہارے نقطۂ نظر سے میں نوجوان نسل کو گمراہ کرتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ تم گمراہی اور بگاڑ کے وسیع تر مفہوم سے خوب واقف ہو۔ پھر تو تمہیں یہ بھی علم ہوگا کہ نوجوانوں کی تعلیم و اخلاق کو کس طرح بہتر بنایا جاسکتا ہے؟ ان کی اصلاح کیسے ممکن بنائی جانی چاہیے؟'' سقراط کا لہجہ ٹھنڈا اور پُرسکون تھا۔

''یہ سب ریاستی قوانین پر عمل درآمد سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔'' میلیٹس نے خوفزدہ انداز میں بادشاہ کی طرف دیکھا۔

''اور ان قوانین کا علم کس کے پاس ہے؟''

''اپنے اردگرد دیکھو سقراط! تمہارے ''منصفین'' ایسے قوانین کے بہترین عالم ہیں۔'' وہ بلا تامل بولا۔

''سب منصفین؟ یا صرف چند ایک؟''

''میرا اشارہ سب کی طرف ہے۔'' وہ [illegible]

''زیں دیوتا [illegible]

ہے۔ اب یہ بھی بتا [illegible]

اثر رسوخ بھی ہے یا نہیں؟'' سقراط نے تمام تر مجمعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بلاشک وشبہ!'' میلیٹس سوچے سمجھے بغیر بولا۔

''کیا اسمبلی کے ارکان بھی اس اثر رسوخ میں شامل ہیں؟'' اس نے جرح کا دائرہ مزید تنگ کیا۔

''ہاں! ان کا بھی۔''

''مختصراً تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ نوجوان تمام تر ایتھنز کے زیرِ اثر ہیں لیکن انہیں گمراہ صرف سقراط کرتا ہے؟'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہنے لگا۔

''میں جسم و جاں کی پوری شدت سے اس بات کی تائید کرتا ہوں۔''

''آہ بے چارہ سقراط! کیا ہولناک تقدیر پائی ہے اس نے......'' وہ اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے نیم مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''اسے ملنے والا یہ اعزاز کس قدر شاندار ہے کہ شہر بھر کے زیرِ تسلط نوجوان نسل کے ذہن اس کے

اشارے پر اپنی قوتِ پرواز بھول جاتے ہیں۔ پیارے میلیٹس! اب معزز عدالت یہ بھی جاننا چاہے گی کہ کیا بدکار لوگوں کے اعمال سیاہ اور نیکوکار افراد کے اعمال صالح ہوتے ہیں؟''

''بالکل ہوتے ہیں! برا شخص خود سے وابستہ لوگوں سے برائی ہی کرے گا جبکہ نیک انسان نیکی کی خوشبو پھیلائے گا۔'' وہ متانت سے کہنے کی کوشش میں ہونق دکھائی دینے لگا تھا۔

''کیا تم کسی ایسے شخص سے واقف ہو جو میری وجہ سے اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہوا ہو اور اس وقت معزز عدالت کے سامنے تمہارے دعوے کی تصدیق کرسکے؟'' سقراط نے بے خوفی سے کہا۔ اس کے حلقۂ احباب اور ہجوم میں موجود... ہم نوا افراد کے چہروں پر بے ساختہ مسکراہٹ اور توصیف جھلکنے لگی۔ انہوں نے مخصوص انداز میں چٹکیاں بجاتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کرنے کا آغاز کردیا۔

''حقیقت کچھ اس طرح ہے عزیز میلیٹس کہ امیر گھرانوں کے چشم و چراغ جن کے پاس فرصت وافر مقدار میں ہو اپنی ذاتی خوشی و رضا سے میرے حلقۂ احباب میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ مجھے ''باعلم'' افراد سے سوالات کرتے دیکھ کر بہت سرشاری محسوس کرتے ہیں اور پھر خود بھی اسی طریقۂ کار کے مطابق دوسروں کو تیکھے سوالات سے پرکھنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ سوئے اتفاق انہیں ایسے افراد کا [illegible] سے مل جایا کرتے ہیں جو علم و حکمت میں یکتائی کا [illegible] حقیقت میں وہ [illegible]

[illegible] لوگ ہوتے ہیں [illegible]

خالی ہوتے ہیں [illegible]

نوجوانوں سے مات ہونے پر خود احتسابی کے بجائے مجھ سے خفا ہونے لگتے ہیں۔ اپنی شکست کی جھنجلاہٹ میں وہ ہر ایک کو کہنے لگتے ہیں کہ سقراط روئے ارض میں سب سے نقصان دہ شخص ہے۔ وہ نوجوانوں کو خراب کر رہا ہے لیکن جب ان سے یہ دریافت کیا جائے کہ یہ خرابی کس انداز میں اور کیا سکھا کر پیدا کی جارہی ہے تو ان کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا۔'' اس کے مدلل اور دوٹوک انداز پر میلیٹس کا چہرہ خوف کی آماجگاہ بنا دکھائی دینے لگا۔ اس کی کیفیات کو گہری نظروں سے دیکھتا سقراط اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میں یہاں موجود سب افراد کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ یہاں آکر میلیٹس کے حق میں گواہی دے سکتے ہیں۔ اگر وہ نہیں آنا چاہتے تو ان کے والد' بھائی یا کوئی بھی اور رشتے دار اس کا ثبوت فراہم کردے۔ مجھے یہاں پر یتوکلو کے والد کرائٹو' افلاطون کے والد ایدیمانتے اور اینفستانے کے باپ پوزانیا کے علاوہ بھی بہت سے افراد دکھائی دے رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی مجھے عدالت میں کیوں نہ گھسیٹا؟ تم اپنی سچائی کو مزید تقویت دینے کے لیے ان میں سے کسی ایک کو ہی یہاں بلوالو میلیٹس!'' سقراط کے ٹھنڈے اور پُرسکون انداز نے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ وہ لاجواب ہو کر سر جھکائے کھڑا رہا۔

''اب میں دوسرے الزام کی طرف آتا ہوں۔ تم نے دعویٰ کیا ہے کہ میں ریاست کے معروف خداؤں پر یقین نہیں کرتا۔ معزز عدالت پہلے یہ جاننا چاہے گی کہ میں صرف ریاست ایتھنز کے کسی خدا کو نہیں مانتا یا مجموعی طور پر کسی بھی خدا کا پیروکار نہیں ہوں؟''

شناختی علامت

ایک پریشان حال شخص ایک آدمی کے پاس اپنا شناختی کارڈ بنوانے کا فارم پُر کروانے کے لیے گیا۔ فارم پُر کرنے والے آدمی نے پوچھا۔

''تمہارا نام......؟''

''جی اسلم خان۔''

''باپ کا نام؟''

''اکرم خان۔''

''شناختی علامت......؟''

''لکھ دیں، چہرے پر پریشانی کے آثار۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

تختِ طاؤس

تختِ طاؤس مغل بادشاہ شاہ جہاں نے چھ کروڑ روپے میں اپنے عہدِ حکومت میں بنوایا تھا۔ تخت طاؤس کے اوپر ایک خوبصورت مرقع پرندہ (مور) پر پھیلائے کھڑا ہے۔ 1152 ہجری میں نادر شاہ لوٹ مار کے بعد یہ تخت ایران لے گیا تھا۔

اسکول یا اسپتال

ننھے میاں بیمار ہوگئے۔ ابا نے بڑی مشکل سے ڈاکٹر کے پاس چلنے پر آمادہ کیا۔

ڈاکٹر نے معائنہ شروع کیا۔ سینے پر آلہ لگایا اور ننھے میاں کا دھیان بٹانے کے لیے کہا۔

''ذرا دس تک گنتی تو گنو۔''

ننھے میاں فوراً بول اٹھے۔ ''ابا جان! آپ تو کہہ رہے تھے کہ اسپتال جارہے ہیں لیکن یہ تو اسکول ہے۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

"میں تصدیق کرتا ہوں سقراط کہ تم دہریے ہو۔ تم کسی بھی خدا کا وجود تسلیم نہیں کرتے۔" میلیٹس نے جوش سے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے شہریوں کی طرح میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ چاند اور سورج بھی دیوتا ہیں۔"

"زیوس دیوتا کی قسم میرے ساتھیو! یہ دہریہ علی الاعلان کہتا ہے کہ سورج ایک چٹان اور چاند محض زمین کے مشابہ ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔

"میرے بے چارے بچے! بدقسمتی سے تم میرے اور "انیکسا غورث" کے نظریات باہم الجھا رہے ہو اور یہ الجھاؤ عدالت کو متاثر نہیں کر پائے گا کیونکہ وہ سب حقائق سے کہیں بہتر طور پر آشنا ہیں۔ یہاں موجود ہر کوئی جانتا ہے کہ انیکسا غورث نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ سورج، چاند اور سب ستارے آگ سے بھرے ہوئے پتھر ہیں۔ سورج اپنے حجم میں پیلوپونیس سے بڑا ہے۔ چاند خود روشن نہیں ہے بلکہ سورج سے روشنی مستعار لیتا ہے۔ میں ان نظریات کی ترویج کیسے کرسکتا ہوں جن کا خالق میں نہیں ہوں۔" سقراط اسے ہر مقام پر چت کرتا جا رہا تھا۔ "بہرحال میں اپنے سوال کی جانب واپس آتا ہوں۔ کیا تم اس بات کو صحیح سمجھتے ہو کہ میں کسی بھی خدا پر یقین نہیں رکھتا۔"

"ہاں! یہی سچ ہے۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

"میلیٹس! کیا ایسا ممکن ہے کہ انسانی اعمال پر تو یقین کیا جائے لیکن انسان کے وجود کا انکار کردیا جائے [illegible] ایسا دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ گھڑسواری پر تو یقین کرتا ہے لیکن گھوڑوں کا وجود تسلیم نہیں کرتا؟"

"ایسا ناممکن ہے!" وہ جھنجلایا۔

"کیا کوئی شخص روحانیت اور خداؤں سے متعلق اشیا پر ایمان رکھتے ہوئے خدائی ہستیوں اور خداؤں کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرسکتا ہے؟" سقراط نے اگلا سوال داغا۔

"نہیں! ایسا کیسے ہوسکتا ہے بھلا؟" میلیٹس اپنے بال نوچنے پر مجبور ہو چلا تھا۔

"بہت خوب! بالآخر تم نے درست جواب دے ہی دیا۔ تو اب تم یہ مان گئے ہو کہ میں قادرِ مطلق کی ذات پر یقین کرتا ہوں۔" اس کے بھرپور وار پر ہجوم کے مخصوص حصے میں ایک بار پھر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میلیٹس اس دوران خاموشی سے زینے اتر گیا۔

"میرے ساتھیو! آپ نے دیکھ لیا کہ استغاثہ کے الزامات بے بنیاد ہیں۔ اس مقدمے کی عمارت نفرت، تعصب اور کینہ پروری پر قائم ہے۔ یہ نفرت مجھے موت کی وادی میں بھی دھکیل سکتی ہے لیکن میں بزدلوں کی طرح اپنی زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔

"ایتھنز کے شہریو! کیا یہ امر عجیب نہ ہوگا کہ میں جنگی کمانداروں کے حکم کی تعمیل میں پوٹیڈیا، ڈیلیم اور ایمفی پولس کے محاذوں پر اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا رہا لیکن خدا کے متعین کردہ منصب پر خطرے اور موت کو سامنے پا کر پسپائی اختیار کرلوں۔ جی ہاں! میرا اعتقاد ہے کہ قدرت نے مجھے اپنی زندگی تلاشِ حق میں صرف کرنے کا فریضہ سونپا ہے۔ موت کا خوف اسے ہوتا ہے جو زندگی کی چاہت میں مبتلا ہو۔ یہ زندگی تو ایک دھوکا اور موت سب سے بڑی سچائی ہے۔ سچائی سے بغلگیر ہونے کی تمنا میں میرے لیے ایک نہیں بلکہ ہزاروں زندگیاں قربان کرنا بھی مشکل امر نہیں ہے۔

"ابھی معزز اینیٹس نے اپنی رائے دیتے ہوئے میرے لیے یقینی موت طلب کی تھی۔ اس مطالبے کے جواب میں اگر جیوری کی جانب سے مجھے یہ کہا جائے کہ مجھے اس شرط پر رہا کیا جاسکتا ہے کہ فلسفے سے منہ موڑ لوں تو میرا جواب یہی ہے کہ میں اپنے جسم میں موجود آخری سانس تک تلاشِ حق سے باز نہیں آؤں گا۔ میں ہر شہری سے ملاقات کے وقت اسے یاددہانی کرواؤں گا کہ وہ ایک ایسے عظیم شہر کا رہائشی ہے جو اپنی قوت و دانش کے لیے مشہور ہے [illegible] کرواؤں [illegible] بلند تر [illegible] لیکن [illegible] کی دانش، سچائی اور اپنے نفس کو خوب سے خوب تر کرنے کی کوشش اور محنت کیوں نہیں کرتے۔ اس کے بعد اگر کوئی شہری مجھ سے بحث کرکے قائل کرنے کی کوشش کرے کہ وہ ان معاملات میں بہتری کی جانب گامزن ہے تو میں اس سے سوال در سوال کروں گا۔ اگر مجھے اس کی لاعلمی اور منافقت کا یقین ہوجائے تو اسے احساس دلاؤں گا کہ اس نے قیمتی اشیا کے لیے کس قدر کم تگ و دو اور معمولی ترین مقام کے لیے زبردست کوششوں سے اپنا مرتبہ کس حد تک گرا لیا ہے۔ میں دعوت و ترغیب بھی اسی طرح دیتا رہوں گا۔ میں تلوار کی نوک پر بھی یہی کہتا رہوں گا کہ خیر اور نیکی مال و دولت سے نہیں ملتی لیکن اس خیر و نیکی سے مال و اسباب ضرور حاصل ہوجایا کرتے ہیں۔ میں روح و نفس کی پاکیزگی کا درس دینا کبھی ترک نہیں کروں گا۔ اگر یہ سب کچھ سکھا کر میں نوجوانوں کو گمراہ کر رہا ہوں تو میرے نظریات حقیقتاً خطرناک ہیں۔ آپ مدعیان کی بات تسلیم کریں یا نہ کریں، مجھے بریت عطا کریں یا نہ کریں، ایک بات

بالکل واضح طور پر سمجھ لیں کہ میں اپنی طرزِ زندگی سے انحراف کبھی نہیں کروں گا۔ اس کے بدلے میں مجھے ہزاروں اموات بھی قبول ہیں۔" سقراط کے بے باک لہجے پر ہجوم نے چٹکیاں بجاتے ہوئے آسمان سر پر اٹھالیا۔

"حضرات! شور کیے بنا میری بات غور سے سنیے۔" اس نے سلسلۂ کلام کا دوبارہ آغاز کیا۔ "ریاست کی مثال ایک ایسے موٹے تازے گھوڑے جیسی ہے جو اپنے وزن اور بے ہنگم وجود کے باعث سست روی کا شکار ہوگیا ہو۔ اسے ایک کاٹنے والی مکھی کی ضرورت رہتی ہے جو اسے نیند سے بیدار رکھ کر چوکس کرتی رہے۔ میں بھی ایسی ہی ایک مکھی ہوں جسے قدرت نے اس ریاست سے نتھی کردیا ہے تاکہ میں ہر ایک کے پاس جا کر خوابِ غفلت سے بیدار کرتا رہوں۔ اس ذمے داری کو نبھانے کے لیے میں نے اپنے ذاتی معاملات پس پشت ڈال رکھے ہیں۔ میرے لیے شہری ذمے داریاں نبھانا افضل ہے۔ میں ہر ایک کے پاس یونہی جاتا ہوں جیسے کوئی بڑا بھائی یا باپ نادان اولاد کی خیر و بھلائی چاہتے ہوئے انہیں سمجھانے کی بساط بھر کوشش کرتے ہیں۔ میں نے کبھی کسی سے فیس لی، نہ ہی ایسا کوئی مطالبہ کیا۔ میری غربت و افلاس اس خلوص کی واضح شہادت ہے۔" سقراط کا ادا کردہ ہر ایک لفظ وہاں موجود افراد کو دنگ کر رہا تھا۔ انہوں نے آج تک معمولی جرائم میں نامزد ملزمان کو اپنے [illegible] دیکھا تھا۔ [illegible] کے لیے بالکل منفرد [illegible] اس موقع پر سقراط نے دفاع کے لیے ایک شہادت بھی پیش کردی۔ اس کا گواہ بچپن کے دوست کلیر و فونٹے کا بھائی تھا۔ کلیر د جمہوریت پسند گروہ کا فعال رکن تھا۔ آمرین کی حکومت سے بغاوت کے بعد جلاوطنی میں مزاحمت کا حق ادا کرنے والا یہ عزیز دوست کچھ عرصے قبل وفات پا چکا تھا۔ اسے ایک کاہنہ نے نوید دے رکھی تھی کہ یونان بھر میں سقراط سے زیادہ دانشمند اور کوئی فرد نہیں ہے۔ اس شہادت سے مدعیان کے چہرے متغیر ہوتے دکھائی دینے لگے۔ سقراط نے نہایت سادگی سے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس بشارت کے بعد اس نے اپنی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لیے ہر شعبے سے منسلک افراد کے ساتھ بحث و مباحثے میں شرکت کی۔ ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کیا لیکن کبھی اطمینان بخش جوابات نہ پا سکا۔ مقابل کے نظریات میں "تضاد" ہوتا تھا جبکہ یہ امر تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سچائی ہمیشہ واضح اور دوٹوک ہوتی ہے۔ اس میں کبھی متضاد پہلو سامنے نہیں آیا کرتے۔ ان افراد کی ذہنی کجیوں کے باوجود اس نے کبھی اپنی ذات کو بلند تر خیال نہیں کیا۔ وہ آج بھی خود کو لاعلم اور مزید حکمت و دانش کے حصول کی پیاس میں مبتلا پا کر بے بس و عاجز ہے۔

سقراط کے دلائل ختم ہوتے ہی رائے شماری کا عمل شروع کردیا گیا۔ جیوری کے ارکان زرد اور نیلگوں سروں والے مرتبان میں اپنے ووٹ ڈالنے لگے۔ سقراط پُرسکون انداز میں انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا خوف یا پریشانی نہ تھی۔

"مجھے امید ہو چلی ہے کہ سقراط کو بری کردیا جائے گا۔ میلیٹس کے دلائل کے پرخچے اڑنے کے بعد انہیں سزا دینے کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔" سائمن نے پُرامید نظروں سے کرائٹو کی جانب دیکھ کر کہا۔

"لیکن مجھے زمینی حقائق کچھ اور ہی نظر آرہے ہیں۔" دوسرا شاگرد تشویش زدہ تھا۔ "اسے اتفاق کہیں یا بدقسمتی...... جیوری کے ارکان کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو سقراط کو دشمنی و نفرت کی حد تک ناپسند کرتے ہیں۔"

"سزا کی صورت میں بھی اس کے پاس جرمانے کا انتخاب بہرحال موجود رہے گا۔" کرائٹو نے امید کا ایک اور جگنو تھمایا۔ آس و ناامیدی کے ہنڈولے میں چکراتا وقت [illegible] سست روی سے گزر رہا تھا۔ ان کی حسیات رائے دہی کے قاعدہ اعلان کی جانب متوجہ ہوگئیں۔ وجود سراپا سماعت تھا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر انہیں کئی روز سے بے کل کیے ہوئے تھا۔ خدشات، وسوسے اور خوف مجسم روپ اختیار کرگئے۔ سقراط کے حق میں 220 اور مخالفت میں 281 ووٹ سامنے آئے۔ اکسٹھ ووٹوں کی اکثریت کے ساتھ وہ سرکاری طور پر "مجرم" قرار دے دیا گیا۔ اب اسے متبادل سزا تجویز کرنے کے لیے ایک بار پھر "جماعتِ منصفین" سے خطاب کرنا تھا۔ وہ باوقار انداز میں مسکراتے ہوئے چبوترے پر آکھڑا ہوا۔

"ایتھنز کے شہریو! آپ کا سنایا گیا یہ فیصلہ میرے لیے خلافِ توقع یا قابلِ افسوس بالکل نہیں ہے۔ ہاں البتہ مجھے صرف اکسٹھ ووٹوں کے فرق نے ضرور حیران کیا ہے کیونکہ مجھے اس سے کہیں زیادہ تعداد کی امید تھی۔ انصاف کی بات کہوں تو اگر اس معاملے میں میلیٹس دیگر دو ساتھیوں کو ملوث نہ کرتا تو اسے کل ووٹوں کا پانچواں حصہ بھی نہ ملتا اور "ہزار ڈرا کم" کا جرمانہ الگ ادا کرنا پڑتا۔ اس شخص نے

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

میرے لیے سزائے موت تجویز کر رکھی ہے۔ اب میں اپنے لیے کیا سزا منتخب کروں؟ ایک بات تو بہرحال واضح ہے کہ مجھے ملنے والی یہ سزا مناسب ترین ہونی چاہیے لیکن آخر کیا؟'' وہ اس قدر اطمینان سے گویا تھا جیسے کسی علمی بحث میں مشغول ہو۔ ''میں نے عمر بھر آرام و سکون سے بیٹھنا پسند نہیں کیا۔ میرا طرزِ زندگی عام انسان سے قطعی مختلف رہا ہے۔ میں نے ان کے برعکس مال بنانے، گھر اور خاندان سنوارنے، فوجی و ریاستی عہدوں، زمین جائداد اور عوامی خطابت کے عوض معاوضے کو رتی بھر اہمیت نہیں دی۔ مجھے آگہی کا روگ لاحق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان آسائشوں کے ساتھ آلائشیں بھی منتج ہوتی ہیں۔ میں نے ہر ممکن خیر و نیکی کی ترغیب دی۔ ذاتی مفادات کو ریاستی مفاد پر قربان کرنا سکھایا۔ ایسے شخص کے لیے کیسی سزا منتخب ہونی چاہیے؟ کوئی اچھی چیز ہی مناسب رہے گی لیکن مجھ جیسے غریب کے لیے ایسا کیا بہتر رہے گا جو آپ کے لیے بھی فائدہ مند ہو۔ اہلِ شہر! ایسے شخص کے لیے اس سے بہتر کوئی اور انتخاب نہیں کہ اسے ریاست کے خرچ پر ٹاؤن ہال میں مفت قیام و طعام فراہم کیا جائے۔ وہ اس سہولت کا اولمپیا میں گھڑسواری یا بگھی دوڑ کے فاتحین سے کہیں زیادہ اہل ہے۔ ایسے لوازمات آپ کو ایک سطحی خوشی دیتے ہیں جبکہ میں حقیقی مسرت فراہم کیا کرتا ہوں۔ انہیں مفت [illegible] ضرورت نہیں بلکہ مجھ جیسے مفلس کو ہے۔ ایتھنز کے لیے بہترین دماغوں کے حامل نوجوانوں کو کندن بنانے کی اپنی تمام تر کوششوں کے عوض میں صرف ایک ہی سزا کا حقدار ہوں...... ٹاؤن ہال میں مفت قیام و طعام۔

''حضرات! میری یہ تجویز یقیناً آپ لوگوں کو توہین آمیز محسوس ہو رہی ہو گی لیکن ٹھنڈے دل و دماغ سے میری باتوں پر غور کریں گے تو ایک آفاقی نکتہ سمجھ لیں گے کہ سچائی آغاز میں بے حد کڑوی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کی تاثیر نہایت شیریں ہوا کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا۔ اس لیے اپنے خلاف کسی بری چیز کا تعین بھی نہیں کروں گا۔ کیا اپنے لیے جیل میں قید کی سزا تجویز کروں؟ باقی ماندہ زندگی وہاں موجود گیارہ افسران کی غلامی کروں...... لیکن کیوں؟ کیا میں یہ انتخاب آپ کے سامنے پیش کروں کہ میں اپنی بریت کے لیے جرمانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں اور جب تک مطلوبہ رقم جمع نہیں کرا لیتا مجھے جیل میں قید رکھ کے بیگار لی جاتی رہے۔ آخری حل یہی ہے کہ میں آپ سب کو اپنے بڑھاپے اور اہلِ خانہ کے متوقع مصائب کا واسطہ دیتے ہوئے ملک بدری پر قائل کروں۔ زندگی سے پیار کرنے والا ہر شخص اپنے لیے لامحالہ طور پر یہی رستہ اختیار کرے گا لیکن میں اس قدر گیا گزرا انسان تو نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے ہم وطن مجھے برداشت نہیں کر سکے تو اغیار کس طرح تکلیف دہ اور کڑوی سچائی کو سہہ سکیں گے؟ وہ سچائی کو شیرینی میں ڈھلنے کی لذت تک مجھے کیونکر برداشت کریں گے؟ میں اس عمر میں نگر نگر بھاگنے کی اذیت برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جاؤں، وہاں نوجوان میری باتیں اسی طرح سن کر عمل پیرا ہوں گے جیسے یہاں ہوتے ہیں اور ایک بار پھر نفرت، تعصب، مقدمات و سزا کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

''عظیم ایتھنز کے شہریو! آپ یہ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں ملک بدر ہو کر خاموشی سے زندگی گزارنے کی بات کیوں نہیں کر رہا؟ اس منطق کو سمجھنا آپ کے لیے مشکل ترین امر ہے۔ خاموش، بے حس اور لاتعلق ہو کر زندگی بسر کرنا انسانیت کی ہی نہیں بلکہ خالق کائنات کی بھی توہین ہے۔ کسی بھی انسان کے لیے دوسروں کو نیکی اور غور و فکر کی طرف راغب کرنا عظیم ترین منصب ہے۔

''بہرحال میری محدود سمجھ میں تو اپنے لیے کوئی سزا نہیں سما رہی۔ اگر میرے پاس رقم ہوتی تو میں حسبِ استطاعت جرمانہ [illegible] لیکن افسوس! ایک [illegible] قابل [illegible] میں آپ کی جانب [illegible] کا اہل ہوں۔ ہاں البتہ یہاں پر موجود افلاطون، کرائٹو، اسٹروبولس اور اپالوڈورس نے مجھے تاکید کر رکھی ہے کہ میں جرمانے کی یہ رقم تیس منہا قرار دوں۔ وہ اس کی ادائیگی کے ضامن ہوں گے۔ میری جانب سے اپنے لیے یہی سزا سمجھ لیجیے۔''

اس وفائی تقریر کے بعد ایک بار پھر سزائے موت اور جرمانے کی تجاویز میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کے لیے رائے شماری ہوئی۔ اس بار بھی نتیجہ حسبِ سابق برآمد ہوا۔ مجسٹریٹ نے سپاٹ انداز میں عوام کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا۔

''ملزم سقراط کی تجویز پر قانون کے مطابق رائے دہی مکمل کر لی گئی ہے۔ ایک سو چالیس ووٹوں کی اکثریت سے جیوری نے سزائے موت برقرار رکھنے کا فیصلہ صادر کیا ہے۔ عمومی حالات میں ایسے کسی بھی فیصلے پر چوبیس گھنٹوں کے اندر عمل درآمد کر لیا جاتا ہے لیکن چونکہ مذہبی روایت کے مطابق ایتھنز کی جانب سے تحائف بردار ایک جہاز ''ڈیلس'' کے لیے

روانہ ہو چکا ہے اور اس کی واپسی سے قبل موت کی کسی بھی سزا پر عمل نہیں ہو سکتا لہٰذا مجرم سقراط کو یہ عرصہ جیل میں بسر کرنا ہو گا۔ اب قانونی تقاضے مکمل کرنے کے لیے سقراط اپنی آخری خواہش و وصیت کا اعلان کر سکتا ہے۔''

اس باضابطہ اعلان پر بھی سقراط کی مسکراہٹ، متانت اور وقار میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ کسی جنگجو کی سی شان سے چلتا ہوا آخری خطاب کے لیے چبوترے پر چلا آیا۔

''ایتھنز کے شہریو! آپ کو زیادہ عرصہ انتظار کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ کچھ ہی عرصے میں آپ پر ایک الزام دھر دیا جائے گا کہ اہلِ ایتھنز نے دانشمند ترین شخص کو موت کی وادی میں دھکیل دیا۔ ہمارے شہر کی عظمت پر ہمیشہ سوال اٹھاتے رہنے والے افراد کی جانب سے اس ہرزہ سرائی اور تنقید کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار کر لیجیے۔ اگر آپ تھوڑے سے صبر کا مظاہرہ کر لیتے تو مجھ سے نجات کی خواہش خود بخود پوری ہو جاتی۔ میں عمر کی سات دہائیوں کا سفر طے کر چکا ہوں۔ موت کے فرشتے نے اپنی خوبصورت رتھ تو یوں بھی میرے لیے جوت لی ہو گی۔ یہ بات میں صرف ان لوگوں سے کہہ رہا ہوں جنہوں نے میری موت کی خواہش کرتے ہوئے اس حق میں ووٹ دیا ہے۔

''آج میں نے ایک شاندار تجربہ کیا ہے۔ مجھے ہمیشہ ایک مانوس الہامی آواز سنائی دیا کرتی تھی جو کسی معمولی غلطی [illegible] قبل [illegible] لیکن آج جب ہر جانب سے [illegible] پر نازل ہوئی [illegible] الہامی آواز نے ایک بار بھی گھر سے عدالت تک کے سفر اور مقدمے کی کارروائی و دلائل کے دوران مجھے نہیں ٹوکا۔ میں اس کی یہ منطق سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ معاملہ میرے لیے برائی نہیں بلکہ بہتری اور بھلائی ثابت ہو گا۔

''آپ جج حضرات کو موت کے بارے میں اچھی توقعات قائم رکھنی چاہئیں۔ اس حقیقت پر ایمان کی حد تک یقین رکھیں کہ کسی نیک نیت انسان کے لیے کوئی برائی ہرگز نقصان دہ ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے فانی دنیا کے علاوہ نادیدہ دنیا کے معاملات نظرانداز نہیں کرنے چاہئیں۔ میرا یہ انجام یونہی طے تھا۔ اب میں بھی کامل یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے لیے موت اور دنیاوی تکالیف سے نجات ہی بہتر ہے، بصورتِ دیگر میری الہامی آواز مجھے ضرور ٹوکتی۔ میں خود کو ملزم نامزد کرنے والوں سے لے کر مجرم قرار دینے والوں میں سے کسی سے بھی خفا نہیں۔ میں موت سے قبل ان کے ذمے ایک کام لگانا چاہتا ہوں۔ اگر میرے بیٹے سنِ بلوغت تک پہنچنے کے بعد نیکی کے مقابلے میں مال و دولت کو ترجیح دینے لگیں تو آپ لوگوں کو پورا حق حاصل ہے کہ انہیں ایسے ہی ٹوکنا جیسے میں آپ سب کو تنگ کیا کرتا تھا۔ اگر وہ خود کو اہم و قابل ترین شخصیت گمان کرنے لگیں تو ان کا محاسبہ کرنے میں ذرا بھی متامل نہ ہونا۔ انصاف اور حق گوئی کا تقاضا یہی ہے کہ غلط کو برملا غلط کہا جاتا رہے۔

''عزیز ساتھیو! اب الوداعی لمحات آن پہنچے ہیں۔ آج سے ہمارے رستے الگ ہو جائیں گے۔ میں ابدیت کی طرف اور آپ زندگی کی راہ اختیار کریں گے۔ ان میں کون سا راستہ بہتر ہے، یہ حقیقت تاحال پردہ نشین ہے۔'' وہ اپنی جادوئی مسکراہٹ سے حاضرین کے دل و دماغ کو خیرہ کرتا مضبوط قدموں سے چلتا ہوا کسی فاتح کے مانند چبوترے سے اتر آیا۔

☆☆☆

سقراط کا حلقۂ احباب صدمے و افسردگی سے چُور تھا۔ عدالت میں سرِعام کیے جانے والے ''انصاف'' کے قتل نے انہیں ایک نئے سرے سے ریاستی نظام کی خامیوں پر تنقید کرنے کا جواز فراہم کر دیا تھا۔ سقراط کو حسبِ قانون جیل منتقل کر دیا گیا۔ کرائٹو نے ڈیلس سے جہاز کی آمد تک اپنے دوست کو جیل کی سختی سے محفوظ رکھنے کے لیے شخصی ضمانت بھی فراہم کی تھی لیکن حکومتی انتظامیہ کو شدید تحفظات لاحق تھے کہ سقراط فرار ہو کر ان کے سر پر خطرے کی تلوار بنا لٹکتا رہے گا۔ وہ [illegible] قیمت پر [illegible] کی زبان خاموش کروا دینا چاہتے تھے لہٰذا کرائٹو کی پیشکش [illegible] تر د کر دی گئی۔

دورانِ قید رات کے اوقات میں سقراط کو زنجیروں سے جکڑ کر صبح آزاد کر دیا جاتا۔ اس سے ملاقات پر بہرحال کوئی پابندی نہ تھی۔ رشتے دار، دوست احباب اور شاگرد بلاناغہ ملاقات کے لیے جایا کرتے اور صبح سے شام تک کسی ایک لمحے کے لیے بھی اس سے علیحدہ ہونے پر تیار نہ ہوتے۔ ان سب کو یہ احساس بری طرح کھائے جا رہا تھا کہ سقراط کو ناانصافی اور نفرت کی بھینٹ چڑھایا گیا ہے۔ کچھ وقت مزید گزرا تو ایک اور خیال پوری قوت سے سر اٹھانے لگا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے رکھنے کے بجائے انہیں اس عزیز از جان ہستی کی رہائی کسی بھی صورت میں ممکن بنانی ہو گی۔ اس موقع پر سمیاس اور سیبیس نامی دو شاگرد اپنی تمام تر جمع پونجی لیے تھیبس سے ایتھنز چلے آئے۔ ایک روز سبھی شاگرد طے شدہ منصوبے کے مطابق کرائٹو کے پاس جا پہنچے۔

''ہمیں اپنے منصوبے پر جلد از جلد عمل کر لینا چاہیے۔ مزید انتظار کہیں معاملے میں بگاڑ پیدا نہ کر

http://urdutubes.com/

دے۔'' سمیاس نے کہا۔
''سب معاملات طے پا چکے ہیں۔ جیل کے نگرانوں کو بھی معاوضہ دے دیا گیا ہے۔'' کرائٹو نے بتایا۔
''ہماری خوش قسمتی سمجھو کہ وہ نگران سقراط کے معتقد بھی ہیں۔'' فیڈو نے لقمہ دیا۔
''عوام الناس میں بھی سقراط کے لیے ہمدردی پائی جاتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میلیٹس کا مقدمہ جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔'' سائمن نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔
''موسم کی خرابی کے باعث جہاز کی آمد میں تاخیر سے ایک ماہ کا عرصہ بیت گیا ہے۔ ہمارے پاس اب زیادہ وقت نہیں رہا۔ اس منصوبے پر جلد از جلد عمل ضروری ہو چکا ہے۔'' سمیاس نے ایک بار پھر اپنی بات پر زور دیا۔
''لیکن اگر سقراط نے انکار کر دیا تو؟'' سیبیس نے خدشہ ظاہر کیا۔
''یہ ناممکن ہے۔ انہیں یہ بات تسلیم کرنا ہی ہوگی۔'' سائمن مچلا۔
''سقراط سے کچھ بعید بھی تو نہیں ہے۔'' ایفیکون افسردگی سے مسکرایا۔
''ایفیکون ٹھیک کہہ رہا ہے۔ افلاطون ہی انہیں بہتر انداز میں ہمارا نقطۂ نظر سمجھا سکتا ہے۔'' فیڈو نے کہا۔ وہ سقراط کی زندگی میں افلاطون کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔
''لیکن افلاطون تو سخت علیل [illegible]'' سیبیس [illegible] اور رکاوٹ بیان کی۔
''اس صورت میں کرائٹو کے سوا کوئی اور شخص یہ پہاڑ سر نہیں کر سکتا۔'' فیڈو نے رائے دی۔ ''آپ کل علی الصباح ہی جیل جائیے کرائٹو! اور سقراط کو کسی بھی قیمت پر راضی کیجیے تاکہ ہم اپنے منصوبے کا عملی طور پر آغاز کر سکیں۔''
''میں سرتوڑ کوشش کروں گا میرے بچو! تم بھی دیوتاؤں سے دعاگو رہنا کہ وہ اپنی ضد چھوڑ دے۔'' کرائٹو نے رضامندی ظاہر کی۔ تمام شاگرد اپنے منصوبے کی جزئیات طے کرنے لگے۔

☆☆☆

قیدخانے کے قرب و جوار میں ٹھہرا ہوا سا سناٹا طاری تھا۔ درختوں سے سرسراتی ہوا کے سوا کہیں کوئی آہٹ یا صدا نہ تھی۔ جیل کے نگران الاؤ جلا کر بیٹھے کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ وہ چاروں گھٹنوں سے قدرے بلند...... سفید پوشاک میں ملبوس تھے۔ سیاہ چمڑے سے بندھی ڈھال، کمر پر پٹکے اور ہاتھوں میں نیزہ تھامے وہ چوکس اور محتاط دکھائی دے رہے تھے۔ کندھوں پر لہراتا بھورا جبہ، مضبوط ٹانگیں اور ورزشی جسم ان کے شخصی وقار میں اضافے کا باعث تھے۔ کرائٹو کو اپنے پاس موجود پا کر وہ بجا طور پر حیرانی میں مبتلا ہوئے۔
''اتنی جلدی کیسے چلے آئے؟ ابھی تو طلوعِ آفتاب میں کافی دیر ہے۔'' ایک نگران نے کہا۔
''میں سقراط کے ساتھ کچھ وقت تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ دن بھر ملاقاتیوں کے ہجوم میں یہ موقع میسر نہیں آ سکے گا۔'' کرائٹو کی توجیہہ پر دوسرے نگران نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور اسے لیے اندر چلا گیا۔ قید خانہ نیم تاریک تھا۔ سقراط ایک چارپائی پر محوِ نیند تھا۔ چارپائی کے پاس ایک چوبی میز، پانی کا مٹکا اور پیالہ موجود تھا۔ آگ کا جلتا الاؤ کسی بھی لمحے سرد ہو سکتا تھا۔ کرائٹو خوابیدہ سقراط کے چہرے پر سکون، اطمینان اور بے نیازی دیکھ کر دنگ تھا۔ وہ کتنی ہی دیر محبت، عقیدت اور افسردہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ لمحوں بعد سقراط کی آنکھ کھل گئی۔
''اتنی صبح صبح یہاں کیا کر رہے ہو کرائٹو؟ نگران سپاہیوں نے تمہیں اندر کیسے آنے دیا؟'' وہ چارپائی سے ٹانگیں لٹکائے بیٹھ گیا۔
''میرے ان سے خاصے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔'' کرائٹو بھی اس کے پاس ہی آ بیٹھا۔ ''میں تمہیں یہ بتانے آیا [illegible] دوست کہ جہاز [illegible] ایتھنز سے کچھ [illegible] وقت یہاں پہنچ جائے گا۔''
''نہیں! ابھی دو دن تک اس کی آمد کے کوئی آثار نہیں۔'' سقراط نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اس اندازے کی کوئی خاص وجہ؟'' کرائٹو حیران ہوا۔
''میں نے رات خواب میں سفید کپڑوں میں ملبوس ایک عورت دیکھی۔ وہ مجھے کہنے لگی کہ سقراط! آج سے تیسرے روز تم سرسبز و شاداب ''پاتھیا'' (یونانی زبان میں دوسری دنیا کی سرزمین کے لیے استعمال ہونے والا لفظ) پہنچ جاؤ گے۔ اس کا مطلب ہے کہ جہاز آج کے بجائے کل آئے گا اور پرسوں مجھے زہریلی شیکران پینے کے لیے دی جائے گی۔''
''سقراط! ابھی وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ میری بات مان لو۔ ہم نے تمہارے فرار کے تمام انتظامات مکمل کر دیے ہیں۔ قیدخانے کے بھی نگران ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔''
''فرار ہونے کے بعد مجھے کہاں بھیجنے کا منصوبہ بنایا ہے تم نے؟'' سقراط نے سنجیدگی سے کہا۔
''تھیسلی...... میرے کچھ دوست شدت سے وہاں

تمہارے منتظر ہیں۔''
''کیا تھیسلی کی سرزمین مجھے موت سے دائمی طور پر مبرا ٹھہرا دے گی؟''
''اپنی ضد چھوڑ دو سقراط! زندگی بچانے کا یہی بہترین موقع ہے۔ اگر تم مر گئے تو میں ایک بہترین دوست سے محروم ہو جاؤں گا۔ یہی نقصان کیا کم ہوگا کہ لوگ کہنے لگیں گے کہ میں استطاعت و اہلیت کے باوجود تمہیں بچانے میں ناکام رہا۔ وہ یہ تصور کریں گے کہ میں نے دولت کو اپنے دوست کی زندگی پر ترجیح دے کر اس رشتے کو خود غرضی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ میں انہیں کیسے قائل کروں گا کہ میری ہر ممکن کوشش کے باوجود تم قائل ہونے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔''
''میرے عزیز کرائٹو! مجھے ہمیشہ ہی سے تمہاری دوستی پر فخر رہا ہے۔ لیکن عام لوگوں کی باتوں کو اس قدر اہمیت دینے کا جواز ہی کیا بنتا ہے؟''
''ہمیں عوام الناس کی آراء کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے سقراط! اب تک ہونے والے واقعات سے بالکل عیاں ہے کہ اگر عام افراد کسی فردِ واحد کے متعلق متعصب ہو جائیں تو اسے شدید نقصان پہنچا سکتے ہیں۔'' کرائٹو کے مزاج پر افسردگی غالب آنے لگی تھی۔
''عام لوگوں میں اگر کسی کو نقصان پہنچانے کی قدرت ہوتی تو ان کے پاس وسیع تر فوائد بہم پہنچانے کی قوت بھی [illegible] دونوں ہی امر انسانی بساط میں نہیں [illegible] کرائٹو! [illegible] کے مطابق کسی کو نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' سقراط نے اپنے پاؤں کی زنجیر سہلائی۔
''لیکن ہم تمہیں ہر قیمت پر زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔'' وہ زور دیتے ہوئے بولا۔
''چاہے وہ قیمت ''ناانصافی'' اور ''قانون شکنی'' ہی کیوں نہ ہو؟'' سقراط نے دریافت کیا۔ ''فرض کرو کہ میں تمہاری تجویز تسلیم کرتے ہوئے قیدخانے سے فرار ہو جاتا ہوں۔ جانتے ہو اس کے بعد کیا ہوگا؟ ایتھنز کے قوانین میرے سامنے آ کھڑے ہوں گے اور کڑے تیوروں سے پوچھنے لگیں گے کہ سقراط! تم کہاں چل دیے؟ کیا تم ہمیں تباہ کر کے خوش و مطمئن رہ لو گے؟ کیا کوئی ریاست اس صورت میں اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے کہ وہاں اعلان کردہ سزا پر عمل درآمد ہی نہ ہو سکے؟ آج تک تم نے ہمارا احترام کیا۔ ہم سے غیر مشروط محبت کرتے رہے لیکن زندگی خطرے میں پاتے ہی محبت و احترام کا رشتہ فراموش کر بیٹھے۔ تم یہاں پیدا ہوئے، پروان چڑھے، لوگوں کی رائے کے خلاف ہمارا ساتھ دیا لیکن آج زندگی کی چاہ میں وہ سب رشتے بھلانے پر آمادہ ہو گئے ہو۔'' سقراط کی مسکراہٹ میں ایک مخصوص چمک تھی۔
''میں تمہاری ہر بات سے متفق ہوں میرے دوست!'' کرائٹو نے اسے دوسرے انداز سے قائل کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔
''یہاں سے فرار ہو کر میں کہاں جاؤں گا؟ تھیبس، میگارا یا کسی اور ریاست کا بن بلایا مہمان بن کر اپنی عزتِ نفس اور خودداری سے محروم ہو جاؤں گا۔ وہ کسی دشمن کی طرح میرا استقبال کریں گے۔ طنزیہ نظروں اور زہریلی سرگوشیوں کے بعد علی الاعلان یہ بات کہی جانے لگے گی کہ ایتھنز کی عدالت مجھے سزا دینے میں بالکل حق بجانب تھی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر میں اپنے بیٹوں کو اغیار کی سرزمین میں دربدر بھٹکا کر ان کا ذاتی تشخص، ملی شناخت اور قومی غیرت کا خاتمہ کس طرح کر دوں؟''
''اگر تم تینوں بچوں کو ایتھنز میں ہی رہنے دو تو میں ان کی پرورش کا ذمہ مکمل دیانتداری سے نبھاؤں گا۔'' کرائٹو نے زور دیا۔
''کیا میری موت کی صورت میں تم یہ ذمے داری نہیں اٹھاؤ گے؟'' سقراط نے دریافت کیا۔ ''نہیں میرے دوست! اگر میں زہر کا پیالہ نوش کر لوں تو یہ قانون کی نہیں بلکہ متعلقہ افراد کی پیشہ ورانہ نااہلی ہوگی۔ لیکن اگر میں ناانصافی اور [illegible] کا جواب انہی سکوں میں ادا کروں تو میں انفرادی و اجتماعی [illegible] شخص کی بے حرمتی کا مرتکب ٹھہروں گا۔ میرے عزیز! میری الہامی آواز کا شور سماعت میں بانسری کے مدھر گیت کی طرح شدت سے گونجنے لگا ہے۔ یہ گونج اس قدر بلند ہے کہ حسیات کسی اور طرف مائل ہونے پر تیار ہی نہیں ہوتیں۔ تم اپنی تجاویز کے علاوہ بہتر انتخاب بھی میرے سامنے رکھ دو گے تو میرا فیصلہ اٹل رہے گا۔ تاہم پھر بھی کچھ کہنا چاہو تو میں منتظر ہوں۔''
''اب کہنے سننے کے لیے کچھ باقی رہا ہی نہیں سقراط!''
''اپنی زندگی کو کبھی بے حرمت نہ کرنا کرائٹو! ہمارے دوست باہر تمہارے منتظر ہوں گے۔ انہیں بھی کسی نادان خواہش میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھنا۔ یہ حقیقت بھی تسلیم کر لو کہ میں قدرت کی منتخب کردہ اس راہ کا مسافر بن چکا ہوں۔ میری منزل اب زیادہ دور نہیں۔'' وہ اپنے بچپن کے دوست سے بغلگیر ہوا۔ کرائٹو بے دلی سے باہر چلا آیا جہاں حسبِ توقع ہجوم بڑھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کی صورت میں درج ناکامی نے بھی افراد کا دل مٹھی میں بھینچ لیا۔ گیارہ افسران

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

کالولا سقراط کی زنجیریں کھولنے کے لیے آچکا تھا۔
وہ بوجھل دلوں اور شکوہ کناں نظروں سے آسمان کی جانب دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

بحری جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہو چکا تھا۔
شاگردوں کی جماعت طے شدہ منصوبے کے مطابق علی الصباح ہی قید خانے کے باہر اکٹھی ہو گئی۔ وہ سقراط کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت بسر کرنا چاہتے تھے۔ کرائٹو کے ہمراہ فیڈو' ہرموجین' سمیاس اور دوسرے اندر داخل ہوئے تو زین تھیپی بچوں کے ہمراہ پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ اس کے چہرے پر بھی دکھ اور کرب کا ایک سمندر موجزن تھا۔ سقراط کی پنڈلیوں پر زنجیروں کے نشان دیکھتے ہی وہ محبت اور جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی ٹانگیں تھامے با آواز بلند رونے لگی۔
"تم اس طرح بچوں کو خوفزدہ کر رہی ہو زین تھیپی! خود کو سنبھالو۔ آج تمہاری بہادری اور اعتماد کہاں ہوا ہو گیا؟" سقراط نے نرمی سے اسے الگ کیا۔
"میری بہادری اور اعتماد تمہارے ہی دم سے تھا سقراط! مجھ سے یہ حقیقت برداشت ہی نہیں ہو پا رہی کہ آج ہم آخری بار تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ آج کے بعد ہم تمہاری آواز بھی نہیں سن پائیں گے۔"
"زین تھیپی! خود کو سنبھالو۔" [illegible] اس کے کندھوں پر تھپکی دی۔
"کرائٹو! کسی سے کہو کہ انہیں گھر چھوڑ آئے۔" سقراط نے دھیرے سے کہا اور بچوں سے بغلگیر ہو کر انہیں بڑی محبت سے رخصت کر دیا۔
زین تھیپی کی روانگی کے بعد قید خانے میں دبیز سناٹا طاری ہو گیا۔ وہ بھی افراد ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے' مبادا آنکھوں میں بار بار امڈ آنے والی نمی پر کسی کی نظر پڑ جائے۔ سقراط بے نیازی سے اپنے بستر پر بیٹھا اور ٹانگ موڑتے ہوئے زنجیروں سے بننے والے زخم ہاتھ سے سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔
"راحت بھی کس قدر عجیب شے ہے دوستو! اور تکلیف سے اس کا رشتہ عجیب تر ہے۔ یہ دونوں کسی بھی شخص کے پاس بیک وقت نہیں آسکتیں۔ انسان اپنی ان تھک جستجو سے ان میں سے ایک کو پالے تو مقررہ وقت کے بعد دوسری بھی لازماً اسے ملنے چلی آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں کسی ایک ہی دھاگے کے دوسروں سے بندھی ہیں۔ میں کئی روز سے یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر "ایسوف" کو ایسا کوئی تجربہ ہوتا تو وہ اس امر پر بھی کوئی حکایت تخلیق کر دیتا۔ وہ لوگوں کو اپنے مخصوص انداز میں بتاتا کہ یہ دونوں بہنیں ہمہ وقت باہمی جھگڑوں میں الجھی رہتی تھیں۔ دیوتاؤں کی خواہش تھی کہ ان میں امن و سکون قائم ہو جائے لیکن انہوں نے اپنی روش ترک نہ کی جس کی پاداش میں دیوتاؤں نے دونوں کے سر ایک ہی دھاگے سے باندھ دیے۔ یہی سبب ہے کہ انسان کو اذیت ملنے کے بعد خودکار انداز میں خوشی و راحت بھی ضرور ملتی ہے۔ پہلے زنجیروں کی وجہ سے میری ٹانگ میں تکلیف تھی لیکن اب سکون و راحت محسوس ہو رہے ہیں۔"
"تم اس قدر پرسکون کیسے ہو سقراط؟" کرائٹو نے رنجیدگی سے کہا۔ "موت تمہارے سر پر کھڑی ہے۔ کیا تمہیں ہم سب سے جدا ہونے کا ذرا بھی ملال نہیں؟"
"کیونکہ میں نے ہمیشہ سچائی تسلیم کی ہے۔ حقیقت کا سامنا کرنا سیکھو میرے دوستو! موت سے کسی نہ کسی لمحہ تو سامنا ہونا ہی ہے۔ ہماری روح نے بالآخر جسم کی قید سے آزاد ہو جانا ہے۔ اس آفاقی سچائی پر خوفزدگی' ملال یا دکھ کیسا؟" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور عقبی سمت میں کھڑے شاگردوں کی جانب متوجہ ہو گیا جو سرگوشیوں میں گفتگو کرتے دکھائی دے رہے تھے۔
"تم لوگوں کو کیا پریشانی لاحق ہے بھئی؟ اپنے خیالات [illegible]
[illegible]
ہے۔ ایسے میں ہم اپنے مسائل بیان کر کے آپ کو مزید پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے۔" انہوں نے افسردگی سے جواب دیا۔
"تم لوگوں کو قائل کرنا بہت دشوار ہے کہ مجھے موت سے بغلگیر ہونے میں کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا۔ موت مجھے ایک ایسے جہان میں لے کر جائے گی جہاں بہت سی سچائیوں کی تسخیر میری منتظر ہو گی۔ کامیاب انسان وہی ہے جس نے زندگی بھر خود کو جسمانی مسرتوں اور آسائشات سے محفوظ رکھا۔ ان لذتوں میں فائدے کے بجائے نقصانات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ روح کو کسی آلائش کے بجائے اس کے اصل زیورات عدل و انصاف، شجاعت، سچائی، ضبطِ نفس اور آزادی سے مزین رکھو گے تو موت سے بڑھ کر تسکین کچھ بھی محسوس نہ ہو گا۔" سقراط ہر ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔
"اتنی گفتگو تمہارے لیے بہتر نہیں میرے دوست! اس طرح خون کے چڑھاؤ سے تمہارے جسم میں حدت پیدا ہو جائے گی اور زہر کا اثر سست ہو کر تمہیں مزید تکلیف میں مبتلا کر دے گا۔" کرائٹو نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ہر تکلیف کے بعد راحت ہے میرے دوست!" وہ مسکرایا۔ "میں غسل کر کے آتا ہوں ساتھیو! تاکہ زین تھیپی اور دیگر عورتوں کو میری میت نہلانے کی زحمت نہ ہو۔"
"اپنے بچوں یا کسی بھی ذاتی معاملے میں وصیت کرنا چاہو گے سقراط؟ ہم تمہاری سونپی گئی ہر ذمے داری مکمل دیانت و خلوص سے نبھائیں گے۔" کرائٹو کا لہجہ نم تھا۔
"کوئی خاص بات نہیں، صرف اتنا کہوں گا کہ تم سب اپنے نفس کی حفاظت کرنا۔ اسی عمل سے تم مجھے' میرے لواحقین اور اپنے آپ کو بھی فائدہ پہنچا سکو گے۔"
"ہم اس کے لیے بھرپور سعی کریں گے۔" اس نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔ "اپنی تدفین کے متعلق کوئی وصیت نہیں کرو گے؟"
"جیسے تم مناسب سمجھو بھئی! بشرطیکہ میں تمہارے ہاتھوں سے نکل کر فرار نہ ہو جاؤں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میرے بچپن کے اس دوست کو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں وہ سقراط نہیں جو کئی دہائیوں سے اس کے ساتھ زندگی بسر کر چکا ہے۔ بلکہ میں وہ سقراط ہوں جسے چند لمحوں بعد میت میں تبدیل ہو جانا ہے۔ اسی لیے تو پوچھ رہا ہے کہ میں کیسی تدفین پسند کروں گا۔ اس کی محبت ایک عالمگیر سچائی تسلیم ہی نہیں کر پا رہی ہے۔ میرے ساتھیو! میں چاہتا ہوں کہ جس طرح کرائٹو نے منصفین کے سامنے ضامن بنتے ہوئے یہ یقین دہانی کروائی تھی [illegible] موجود رہوں گا۔ اسی طرح تم سب اسے [illegible] موجود نہیں رہوں گا [illegible] کا وقت آچکا ہے۔ شاید اسی طرح وہ یہ سچائی قبول کر لے اور میری میت کو جلتے یا دفنائے جاتے دیکھ کر مزید پریشانی میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اس نے میری خاطر بہت سی تکالیف برداشت کی ہیں۔ اب میں نہیں چاہتا کہ وہ جنازے پر ایسے الفاظ ادا کرے کہ ہم سقراط کو لٹا رہے ہیں' اسے لے کر جا رہے ہیں' اس کے لیے قبر کھود رہے ہیں۔ ایسے الفاظ خلاف دانش ہیں۔" اس نے ایک توقف کیا اور کرائٹو کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔ "میرے عزیز دوست! تم مطمئن رہنا اور صرف یہ کہنا کہ میرے جسم کو دفنا رہے ہو۔ اس میت کے ساتھ رواج کے مطابق سلوک کرنا۔" سقراط تسلی دیتے ہوئے دوسرے کمرے میں چل دیا۔ اس کی روانگی کے بعد شاگرد رنجیدگی سے موت' روح اور ابدی زندگی کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ وہ بھرپور کوشش کے باوجود اپنے جذبات پر ضبط نہیں کر پا رہے تھے۔ یتیمی' سائبان سے محرومی اور اپنی محبوب شخصیت سے محرومی کا احساس رگیں چیرنے لگا تھا۔ روایات کی اندھی تقلید' توہم پرستی' جہالت اور گھٹن زدہ ماحول میں ان کے لیے سقراط ہی روشنی' علم' حکمت' سچائی اور تازہ ہوا کا واحد روزن تھا۔ اس کی ابدی جدائی ایک ایسی حقیقت تھی جسے قبول کرنے کا یارا ہی نہ پیدا ہو پا رہا تھا۔ غسل کے بعد سقراط ایک بار پھر ان کے ساتھ آ بیٹھا۔ اس دوران خاندان کی دیگر خواتین اور بڑے دونوں بیٹے اس سے الوداعی ملاقات کے لیے چلے آئے۔ وہ کرائٹو کی موجودگی میں بچوں کو ہدایات دیتا رہا گویا دوست کو ان کا سرپرست مقرر کر دیا ہو۔
غروب آفتاب کا وقت ہوتے ہی قید خانے کا داروغہ اندر آ گیا۔ وہ گیارہ افسران کا ذاتی خادم تھا۔ اس کے چہرے پر گمبھیر تاثرات تھے۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں سقراط سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔
"اس قید خانے میں سیکڑوں قیدی موت کی وادی کے مسافر بن کر عارضی پڑاؤ کے لیے آئے ہیں لیکن میں نے تم جیسا ظرف اور تحمل کبھی کسی میں نہیں دیکھا۔ مجھے کبھی تم سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ دیگر افراد بوقتِ موت اپنا ظرف اور برداشت کھو بیٹھتے ہیں۔ میں جب انہیں زہر پینے کا کہتا ہوں تو وہ مجھے برا بھلا کہتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔ تمہیں اپنے ساتھ ہونے والے اس سانحے کے اصل ذمے داران کا علم ہے لہٰذا تمہاری ناراضگی انہی سے وابستہ رہنی چاہیے۔ الوداع اے بہترین انسان! جو الجھن و مسئلہ [illegible] اسے ہر ممکن طریقے سے برداشت کر لینا ہی بہتر [illegible] ہے۔" داروغہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔
"میں تمہاری ہدایات پر من و عن عمل کروں گا۔" سقراط نے نرمی سے کہا۔ اس کی جادوئی مسکراہٹ سے نظریں چراتے ہوئے داروغہ واپس مڑ کر باہر نکل گیا۔
"میں نے دورانِ قید اسے بہت اچھا انسان پایا ہے۔ یہ ہر روز کئی گھنٹے میرے ساتھ بات چیت میں مشغول رہا کرتا تھا۔" اس نے ساتھیوں کو بتایا۔
"سورج ابھی پہاڑیوں کے اوپر ہے سقراط! غروب آفتاب میں تھوڑا وقت باقی ہے۔ میرے علم میں کئی ایسے افراد ہیں جو زہر پینے میں دانستہ طور پر تاخیر کرتے رہے۔ بہترین کھانے کی فرمائش مکمل کروا کے صنفِ مخالف کی رفاقت سے محظوظ ہوئے۔ تم بھی تھوڑی دیر انتظار کر لو۔" کرائٹو اسے کسی بھی طریقے سے موت کی آغوش میں جانے سے روکے رکھنا چاہتا تھا۔
"جن لوگوں کی تم بات کر رہے ہو وہ اس عمل میں اپنی ذات کے لیے کوئی بہتری تصور کرتے ہوں گے۔ میرا نقطہ نظر

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

بہر حال مختلف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خالی جام سے مزید مشروب حاصل کرنے کی خواہش حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ میں اپنی موت کا استقبال باوقار انداز میں کرنا چاہتا ہوں۔ زہر اگر پیسا جا چکا ہے تو کوئی اسے لے آئے ورنہ داروغہ کا ہی انتظار کیے لیتا ہوں۔'' اس کے دوٹوک ایما پر کرائٹو نے ایک شاگرد کو اشارہ کیا۔ وہ بوجھل قدموں سے باہر گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک اور آدمی کے ساتھ واپس چلا آیا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں ایک پیالہ تھا جس میں پسا ہوا زہر مکمل تیار شدہ حالت میں موجود تھا۔

''زہر نوشی سے دی جانے والی سزا کی قانونی باریکیاں کیا ہیں میرے عزیز؟'' سقراط نے اس آدمی کو ملائمت سے مخاطب کیا۔

''اس پیالے میں موجود سیال پی لینے کے بعد تمہیں بیٹھنے یا لیٹنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس قید خانے میں تمہاری چہل قدمی ٹانگیں بھاری ہو جانے تک جاری رہنی چاہیے۔ اس کے بعد بستر پر لیٹ جانا۔ یہ دوا خودکار انداز میں اثر کرنے لگے گی۔'' اس نے پیالہ سقراط کی طرف بڑھاتے ہوئے تفصیل سے آگاہ کیا۔

سقراط نے اپنی موت کا وہ ہرکارہ نہایت اطمینان سے تھام لیا۔ اس کے ہاتھوں میں رتی بھر بھی لرزش نہیں تھی۔ اس کے برعکس سالخوردہ چہرے پر ایک انوکھی چمک [illegible] لگی۔ برف سی سفید بھوؤں تلے آنکھوں میں [illegible] اعتماد اور سکون موجزن تھا۔ تمام ترہدایات پر من و عن عمل کرتے ہوئے اس نے پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور نہایت وقار، سکون اور اطمینان سے سیال حلق سے نیچے اتار لیا۔ وہ لمحے بے حد بوجھل اور قیامت خیز تھے۔ قید خانے میں موجود شاگردوں کی اکثریت نے بدقت تمام اپنے آنسوؤں پر بند باندھ رکھا تھا لیکن پیالہ خالی ہوتے ہی ضبط کے تمام بندھن ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ گئے۔ فیڈو کا تو یہ عالم تھا کہ وہ اپنا چہرہ ڈھانپے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اس کی تڑپ میں ایک بہترین انسان سے دائمی محرومی اور اپنے علم کی پیاس تشنہ رہ جانے کا غم پنہاں تھا۔ کرائٹو کا حال بدترین تھا۔ وہ اپنے آنسو چھپانے کی غرض سے ایک جانب منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اپالوڈورس کے خاموش اشک یکدم ہی بلند سسکیوں اور کراہوں میں تبدیل ہو گئے۔ وہاں موجود ہر ایک شخص غم سے نڈھال تھا لیکن سقراط کے اطمینان اور سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔

''یہ تماشا یہیں ختم کر دو!'' اس نے سختی سے تنبیہ کی۔ ''میں نے صرف اسی لیے عورتوں کو یہاں سے روانہ کر دیا تھا کہ چیخ و پکار نہ کریں۔ انسان کا خاتمہ ایک شائستہ وقار سے ہونا ہی انسانیت کے منصب کی معراج ہے۔ تم لوگ بھی خاموشی اور صبر کا مظاہرہ کرو۔''

اس کی بات پر وہ چار و ناچار خاموش ہو گئے۔ سقراط نے ہدایات کے مطابق چہل قدمی کا آغاز کر دیا۔ اس کا چہرہ اب بھی کسی تاثر سے عاری تھا۔ وقت کچھ مزید آگے سرکا تو اس کی ٹانگوں میں بوجھل کیفیت پیدا ہونے لگی۔ وہ پشت کے بل بستر پر لیٹ گیا۔ زہر دینے والا شخص اس تمام عرصے میں وہیں موجود رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سقراط کے پاؤں اور ٹانگوں کا معائنہ شروع کر دیا۔

''کیا تمہیں کچھ محسوس ہو رہا ہے؟'' وہ ایک پاؤں کو زور سے دباتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔'' سقراط نے مختصراً جواب دیا۔ داروغہ خصوصی نے ایک بار پھر پنڈلیوں کو دبایا اور بتدریج باقی جسم کو بھی ٹٹول کر تصدیق کر لی کہ وہ سرد اور ٹھوس شکل اختیار کرنے لگا ہے۔

''زہر کی تاثیر دل تک پہنچتے ہی یہ ختم ہو جائے گا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ سقراط نے ایک چادر سے اپنا وجود ڈھانپ لیا تھا۔ ٹھنڈک [illegible] پیٹ تک آ پہنچی تو اس [illegible] بہترین دوست کی جانب متوجہ ہو کر [illegible] لگا۔

''کرائٹو! اسکلیپس کے حضور ایک مرغ کی قربانی واجب رہ گئی ہے۔ کیا تم یہ قرض ادا کر دو گے؟''

''بالکل کروں گا میرے ہمدم! کیا کوئی اور ذمے داری بھی مجھے تفویض کرنا چاہو گے؟'' کرائٹو نے آنسوؤں سے نم آواز میں پوچھا، تاہم سقراط چہرہ دوبارہ ڈھانپ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے وجود نے ایک جھٹکا لیا۔ داروغہ خصوصی نے فوراً آگے بڑھ کر چادر ہٹا دی۔ سقراط کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔ کرائٹو نے لرزاں ہاتھوں سے اس کا منہ اور آنکھیں بند کر دیں۔

سیاست، عداوت، نفرت، تعصب، بغض، کینہ، سازشوں اور تنازعات نے سچائی کی مشعل گل کر کے تاریکیوں کو ہم نوا بنا کر ایک نئے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔

ماخذات:
مکالماتِ افلاطون۔ سقراط۔ از۔ کورا میسن۔ سقراط از ڈاکٹر منصور الحمید۔ تاریخ یونان۔ تاریخ ایتھنز

قانون کے لمبے ہاتھوں سے خوفزدہ ایک مجرم کی دوڑ

کہتے ہیں کہ جرم کے لیے بھی حوصلہ چاہیے مگر... مجرم چاہے جتنے بڑے دل کا مظاہرہ کرلے بالآخر اس کے سینے میں چوہے جتنا دل ہی خوف سے لرز رہا ہوتا ہے اور یہی خوف اسے دھیرے دھیرے قانون کے دائرے میں قید کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہی حال اس کا بھی تھا جس نے بڑی بے جگری سے جرائم کی دنیا میں قدم تو رکھا مگر آگے اٹھنے والا ہر قدم اس کی چال کو لڑکھڑا دینے کا سبب بنتا رہا۔

خوف کا حصار

تنویر ریاض

جم بہت کم اپنی بیوی پیٹرشیا اور اس کی بہترین دوست جولین کی باتوں پر توجہ دیتا تھا جس کی آواز اسے ان طوطوں کی یاد دلاتی تھی جو ہر روز سہ پہر میں ان کے آلو بخارے کے درختوں پر بیٹھ جاتے تھے لیکن اس روز وہ کسی قتل اور ڈی این اے اسکریننگ کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

وہ تینوں لیونگ روم میں ایک گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ عقبی صحن کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس راستے سمندر کی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ جولین ہر جمعرات کو ان کے یہاں ڈرنک کرنے آیا کرتی جسے وہ مل بیٹھنے کا بہانہ کہا کرتی تھی۔

اس نے پنیر کا پیکٹ کھولتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے

ڈامیگنٹ، میں شائع ہونے والی خبر پڑھی؟"
"ہاں، کیا تم اس پر یقین کرسکتی ہو کہ ہر مرد کا ڈی این اے ہوگا۔" پیٹرشیا نے کہا۔
"اور لڑکوں کا بھی۔" جولین بولی۔
پیٹرشیا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "ہاں چودہ سال سے زیادہ عمر کے لڑکے یا غالباً سولہ سال لکھا تھا۔ ذرا سوچو...... کیا کوئی بچہ یہ حرکت کرسکتا ہے؟ اس کا تو تصور ہی بڑا وحشت ناک ہے۔"
اس نے جولین کے سامنے مشروب کا گلاس رکھا اور جم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "تم کیا لوگے؟"
جم باہر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں سمندر پر چکر لگاتے ہوئے ایک سفید نقطے پر مرکوز تھیں۔ شاید وہ کوئی سفید سمندری عقاب تھا لیکن دوربین لگائے بغیر وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ پیٹرشیا کو بتا دے کہ وہ کیا کرچکا ہے۔
"ہیلو۔" پیٹرشیا نے جم کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا پھر جولین سے بولی۔ "صبح سے ہی اس کی یہ کیفیت ہے، سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے کیا ہوگیا ہے۔"
جم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوہ ہاں...... بیئر۔ شکریہ لیکن میں خود لے لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ فریج تک گیا اور اپنے لیے ایک بیئر کی بوتل نکال [illegible]
"اوہ۔" جولین نے کہا۔ "تم یقین [illegible] اسٹینلے گزشتہ رات کلب میں آیا تھا۔ تم جانتی ہو کہ وہ کتنا چیچ اور کمینہ شخص ہے۔ ہمیشہ کی طرح وہ نشے میں دھت تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ کوئی اس کا ڈی این اے نہیں لے سکتا جبکہ میں سمجھتی ہوں کہ شاید اسے ڈی این اے کے معنی بھی معلوم نہیں ہوں گے۔"
"جہاں تک میں سمجھتی ہوں کہ اگر آپ نے کچھ نہیں کیا تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ٹیسٹ تو مجرموں یا نامعلوم افراد کی شناخت کے لیے کیا جاتا ہے۔" پیٹرشیا نے کہا۔
"میں بھی یہی کہہ رہی ہوں۔" جولین نے تائید کرتے ہوئے کہا۔
"بے چاری لڑکی۔" پیٹرشیا خود کلامی کے انداز میں بولی۔ "صرف سترہ سال کی تھی۔"
جم دوبارہ ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے بیئر کا ایک گھونٹ لیا اور سوچنے لگا کہ کیا اس کے پاس پریشان ہونے کی کوئی وجہ ہے؟ اس بارے میں وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اچانک ہی اس نے محسوس کیا کہ اس کی دائیں ٹانگ ہلکے ہلکے جھٹکے لے رہی ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ گھٹنے پر رکھ دیا۔
اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو مشروب کا گلاس خالی ہونے کے بعد خاصی پُرجوش نظر آرہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اسے بتا دے تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ صدمہ، ناقابلِ یقین یا غصہ لیکن ان میں سے اسے کوئی بھی مناسب نظر نہیں آیا، البتہ اسے مایوسی ضرور ہوگی اور وہ اسے برداشت نہیں کرسکتا تھا۔
"گوکہ میں ابھی تک اس کی منطق نہیں سمجھ سکی۔" پیٹرشیا نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ جس کسی نے بھی یہ ناگوار حرکت کی ہے وہ وہاں سے گزرنے والا سیاح یا اجنبی بھی ہوسکتا ہے جس کا تعلق اس علاقے سے نہ ہو۔"
"بہرحال اب سڈنی سے پولیس آگئی ہے۔ شاید وہ اس سلسلے میں کچھ پیش رفت کریں۔"
"میں نہیں سمجھتی کہ بوب اپنے طور پر اس طرح کا کیس حل کرسکتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ایک اچھا پولیس آفیسر ضرور ہے لیکن قتل کا کیس اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ یہ مشکل چوری کی واردات کا معما حل کرسکتا ہے۔" پیٹرشیا بولی۔
"اوہ۔ اس بے چارے بوب کا پیچھا چھوڑ دو۔" جولین نے پیٹرشیا کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ [illegible] موسم گرم [illegible]
[illegible] معاملہ بالکل مختلف ہے۔"
اس کے بعد پیٹرشیا نے نہ جانے ایسی کیا بات کہہ دی کہ دونوں قہقہے لگانے لگیں۔ جب ان کی ہنسی رکی تو جولین نے جم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"تم بالکل خاموش ہو۔ کیا تمہیں بھی اسکریننگ سے گھبراہٹ ہورہی ہے۔ کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے؟"
"ایسا مذاق مت کرو۔" پیٹرشیا بولی۔ "یہ ایک افسوسناک حادثہ ہے۔ اس کے علاوہ جم اس ویک اینڈ پر یہاں نہیں تھا۔ جان! تم بتاؤ، کہاں گئے ہوئے تھے؟"
"نہیں۔ میں جھیل ونڈیم میں کشتی رانی کررہا تھا۔" جم نے کہا۔ "بلکہ بوب بھی میرے ساتھ ہی تھا۔"
"دیکھا تم نے؟" پیٹرشیا بولی۔ "جم نے اپنی غیر موجودگی ثابت کردی۔"
اور یہ سچ تھا۔ جب یہ قتل ہوا تو جم، ایڈن سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود جب سے اس نے گزشتہ روز کے اخبار میں ڈی این اے اسکریننگ کے بارے میں پڑھا

تھا، کوئی بات اسے مسلسل پریشان کررہی تھی۔ اس نے چاقو سے پنیر کا ایک ٹکڑا کاٹا اور اسے ہاتھ پر رکھ کر دیکھتا رہا پھر اس نے وہ ٹکڑا واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔
"میں چہل قدمی کے لیے جارہا ہوں۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔
"اوہ۔ غصے میں آنے کی ضرورت نہیں۔" جولین بولی۔ "میں تو یونہی مذاق کررہی تھی۔"
"تم ٹھیک کہہ رہی ہو جولین۔ میں غصے میں اٹھ کر نہیں جارہا بلکہ یہ میری چہل قدمی کا وقت ہے۔" وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔
پیٹرشیا اپنی دوست کی طرف جھکی اور آہستہ سے بولی۔ "ڈاکٹر نے اسے وزن کم کرنے کے لیے کہا ہے۔ بہرحال تم اسے جانتی ہو۔ وہ ہمیشہ سے کم گو واقع ہوا ہے اور میں بھی اس کی یہ عادت تبدیل نہیں کرسکی۔"
جم مسکرایا اور بیوی کو بوسہ دینے کے لیے جھکا اور جب اس نے اپنے گال پر اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا تو یوں لگا جیسے وہ رو دے گا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔
"میں رات کے کھانے تک واپس آجاؤں گا۔" اس نے جاتے جاتے کہا۔
جم نے گوورا بیچ جانے والی سیڑھیاں اترنا شروع کردیں۔ نیچے پہنچ کر اس نے ایک چھوٹے سے کھیل کے [illegible]
[illegible]
[illegible] آنکھیں بند کرکے گہری سانس لی۔ فضا میں نمک کے پانی اور گھاس کی بو بسی ہوئی تھی۔
یہ ساحل ہفتے کے دنوں میں عام طور پر سنسان رہتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی تن باتھ لینے والے یا اکا دکا مچھیرے وہاں نظر آجاتے۔ جم وہاں سکون حاصل کرنے کے لیے سہ پہر میں جاتا تھا حالانکہ اس جیسے سادہ اور ٹھنڈے مزاج کا ذہن کبھی کوئی دباؤ قبول نہیں کرتا تھا لیکن آج کا دن بہرحال مختلف تھا۔
قصبے کے دوسرے لوگوں کی طرح اسے بھی ایبی ولسن کے قتل پر صدمہ ہوا تھا جو ایلسنگ بیچ کی چٹانوں پر مردہ پائی گئی تھی اور اس کی لاش ایک شوقیہ مچھلی پکڑنے والے نے بارہ روز قبل دریافت کی تھی۔
جم کی ولسن خاندان سے زیادہ واقفیت نہیں تھی تاہم وہ ان لوگوں کو جانتا تھا۔ جان ولسن ایک تاجر تھا اور اس کی بیوی رونڈا، پام بولا اسپتال میں نرس تھی۔ ایبی، خود بھی جم کی بیٹی تانیا کے ساتھ ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھی لیکن دونوں کی عمروں میں دو تین سال کا فرق تھا۔
اس کی موت کی تفصیلات سرکاری طور پر ظاہر نہیں کی گئیں اور انہیں خفیہ رکھا جارہا تھا لیکن گزشتہ چند روز سے جو افواہیں سننے میں آئیں انہوں نے لوگوں کو جھرجھری لینے پر مجبور کردیا اور وہ صدمے سے گنگ رہ گئے۔ ان افواہوں کے مطابق اس کے ساتھ کئی مرتبہ زیادتی کی گئی۔ یہاں تک کہ وہ لہولہان ہوگئی تھی۔ اس کے بعد اسے اس بری طرح دھکا دیا گیا کہ اس کا سر چٹان سے جا ٹکرایا اور وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔
جم نے قصبے کے لوگوں کو اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس واقعے پر حیران و ششدر تھے۔ ایڈن جیسے پُرسکون قصبے میں ایسا اندوہناک سانحہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا لیکن جم کی یادداشت میں ایسا ہی ایک اور واقعہ آج تک محفوظ تھا جسے یہاں کے لوگوں کی اکثریت بھلا چکی تھی۔
وہ ریت کے فرش پر ساحل کے آخری سرے تک چلا گیا جہاں ایک سطحی چٹان نے قدرتی سائبان بنا رکھا تھا۔ ایک چھوٹی سی سفید کشتی پانی میں لنگر انداز تھی۔ وہ اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا اور چٹان پر جا کر بیٹھ گیا پھر اس نے اپنے پرس سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا۔ یہ گزشتہ روز اخبار کے پہلے صفحے پر شائع ہونے والی خبر کا تراشہ تھا جو اس نے اخبار [illegible] کرلیا تھا۔ اس وقت اس کے پاس نظر [illegible] اس نے اسے چہرے سے دور کیا اور [illegible] نظروں سے دیکھنے لگا۔ خبر میں لکھا تھا۔
"حکام نے فیصلہ کیا ہے کہ ایڈن میں رہنے والے تمام 1476 مردوں کا ڈی این اے ٹیسٹ کروایا جائے تاکہ سترہ سالہ ایبی ولسن کے قاتلوں تک پہنچنے میں آسانی ہو جو بروز ہفتہ 15 اکتوبر کی صبح ایلسنگ کے ساحل پر مردہ حالت میں ملی تھی۔
"نیو ساؤتھ ویلز پولیس کے ترجمان سراغ رساں لی گورونر نے کہا ہے کہ سولہ سال سے زیادہ عمر کے تمام مقامی مرد بدھ 9 نومبر کی شام پانچ بجے تک ایڈن پولیس اسٹیشن میں یہ ٹیسٹ کروالیں۔ آسٹریلیا کی تاریخ میں یہ چوتھا موقع ہے جب اتنے بڑے پیمانے پر ڈی این اے اسکریننگ کی جارہی ہے۔
"سراغ رساں گوردنر نے تسلیم کیا کہ یہ ایک غیر معمولی معاملہ ہے لیکن چشم دید گواہوں اور دیگر سراغ نہ ملنے کی وجہ سے اس کیس کی تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے

http://urdutubes.com/

یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ اس نے مزید کہا کہ لوگوں کو اس ڈی این اے ٹیسٹ میں شرکت کرنے سے انکار کا حق حاصل ہے لیکن اس کے لیے انہیں مقامی عدالت سے رجوع کرنا ہوگا جو اس بارے میں حتمی فیصلہ دے گی۔

”اس نے کہا کہ ڈی این اے سیمپل کے نتائج سردخانے میں پڑے ہوئے دیگر مقامی کیسوں کو حل کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوں گے۔“

خبر کے اختتام پر جم نے ایک وقفہ لیا اور اس نے آخری جملہ دوبارہ پڑھا پھر اس کاغذ کو تہ کر کے دوبارہ پرس میں رکھ لیا۔ اس خبر میں جس پرانے کیس کی جانب اشارہ کیا گیا تھا...... کیا وہ جینی کا تھا۔ اس نے ساری زندگی ایڈن میں گزاری اور وہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے علاوہ وہاں کسی اور نوعیت کا واقعہ پیش آیا ہو۔ چند برس قبل ایک ٹریفک حادثے میں جونز نامی لڑکا ہلاک ہو گیا تھا لیکن اس کا ذمے دار شرابی ڈرائیور پکڑا گیا تھا۔ اس کے علاوہ قصبے میں چھوٹے موٹے جرائم ہوتے رہتے تھے جیسے غیر قانونی طور پر مچھلیاں پکڑنا، مورتیوں کی اسمگلنگ یا کبھی کبھی منشیات فروشی کا کوئی واقعہ لیکن قتل جیسا سنگین جرم صرف ایک ہی ہوا تھا اور خبر میں اسی جانب اشارہ کیا گیا تھا۔ یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھ گئی۔

جم نے جھیل کے پار بین بوائنڈ [illegible] دیکھا جہاں انہوں نے کئی برس پہلے اس [illegible] حیران تھا کہ اتنے سالوں کے دوران اس نے جینی کے بارے میں کیوں نہیں سوچا اور اچانک ہی اس کے سامنے وہ منظر آ گیا جب وہ اس کے بھائی پیٹر کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کر رہی تھی جبکہ اس کے ساتھی شین ہاکنز اور ڈیرن رسل پاس کھڑے جینی کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ جم کو یاد آ گیا کہ کس طرح جینی نے اس کی طرف سر گھما کر دیکھا اور مدد کے لیے چلائی تھی۔

’میں کیوں اس کے لیے کچھ نہ کر سکا؟‘ جم نے سوچا۔ ’جب میرے پاس موقع بھی تھا۔‘

اس نے محسوس کیا کہ اس کے اندر تاریکی واپس آ رہی ہے۔ وہی سنسنی جو اخبار کی خبر پڑھنے کے بعد اس کے اندر اور باہر تیر رہی تھی۔

اس کی زندگی میں صرف چند بار ہی ایسا ہوا تھا جب جم نے اتنی شدت سے جذبات کو محسوس کیا ہو۔ جب وہ سولہ سال کا تھا تو اس کی ماں مر گئی۔ یہ صدمہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ رات کو جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو اسے یوں لگا کہ اس کی پسلیوں پر کوئی لمبا پتلا مستطیل نما باکس رکھ دیا گیا ہے۔ کبھی کبھی چھونے پر یوں محسوس [illegible] کہ واقعی اس کا کوئی وجود ہے اور کوئی سرجن ہی اسے [illegible] سکے گا۔ وہ میڈیکل سینٹر کے سامنے سے گزرتے ہوئے رک جاتا اور سوچتا کہ اگر وہ اندر جا کر التجا کرے تو شاید کوئی ڈاکٹر آپریشن کر کے اسے نکال دے اور وہ دوبارہ اپنے آپ کو نارمل محسوس کرنے لگے۔

جینی کے مرنے کے دو سال بعد اس نے اپنے جسم میں ایک اور چیز شدت سے محسوس کی۔ اس بار یہ مختلف طریقے سے ظاہر ہوئی تھی۔ یہ دکھ اس کے سینے میں احساس جرم و ندامت کی طرح چپک گیا تھا اور اس نے جسم کے حصے کو عفونت زدہ کر دیا۔ یہ اس کے خون، بلغم اور نسوں میں سرایت کر گیا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے اور معدے میں اینٹھن ہونے لگی۔ یہ بالکل ایک سیاہ سیال مادے کے مانند تھا جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔

اب وہ مادہ اس کے جسم کے اندر سینے کی طرف بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا جس نے اس کے دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اسے یوں لگا کہ ایک لمحے کے لیے ہر چیز ساکت ہو گئی ہو۔

دہشت زدہ ہو کر اس نے سانس لینے کی کوشش کی [illegible] سیدھے کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھا لیکن بادل بڑی تیزی سے گزر رہے تھے اور زمین ایک طرف کو جھکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

اس کی نظروں کے سامنے ایک ایک کر کے مختلف چہرے آنے لگے۔ جیسے وہ کوئی فلم دیکھ رہا ہو۔ پیٹریشیا، تانیا اور بوب پھر اسے ان سراغ رسانوں کی جھلک نظر آئی جن سے وہ ابھی تک نہیں ملا تھا اور رپورٹر جو بلاشبہ اس کا دروازہ کھٹکھٹانے والے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ ان سے کیا کہے گا کیونکہ اس کا سچ بھی ایک جھوٹ کی طرح نظر آئے گا۔

پیٹر مر چکا تھا۔ شین جیل میں اور ڈیرن کو آخری بار کنگ کراس کی سڑکوں پر سوتا دیکھا گیا۔ پھر کون باقی رہ گیا تھا؟ ڈی این اے ٹیسٹ اسے بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اس کے بعد پیٹریشیا اور تانیا کی نظروں میں اس کی کیا وقعت رہ جائے گی؟ وہ شاید اس سے کبھی بات نہ کریں۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

1980ء کے موسم بہار میں جم کو ایک فیکٹری میں ملازمت مل گئی جہاں مچھلیوں کو ڈبوں میں محفوظ کیا جاتا تھا۔

Digitized by Google

تھوڑے ہی عرصے میں اس نے اتنے پیسے جمع کر لیے کہ وہ ایک پرانی کار خرید سکے۔ اس طرح اسے نہ صرف آزادی کا احساس ہوا بلکہ وہ پیٹر کا بھی محتاج نہ رہا کیونکہ اکثر اسے کہیں آنے جانے کے لیے اس کی خوشامد کرنا پڑتی تھی۔

ایک مرتبہ وہ ہفتے کے اختتام پر سڈنی گیا۔ اس سے پہلے وہ کبھی اپنے گھر سے اتنی دور نہیں گیا تھا۔ واپسی میں اس نے پرنس ہائی وے کے کنارے ایک مقامی لڑکی کو دیکھا یا وہ قدیم آسٹریلوی باشندوں کی نسل سے تعلق رکھتی تھی اور ہاتھ کے اشارے سے ہر گزرنے والی کار کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بارش ہونے کے باوجود کوئی بھی اس کے لیے نہیں رکا۔ جم کو خود بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے اپنی کار روک سکے گا پھر اچانک ہی ان کی نظریں ملیں۔ وہ مسکرائی اور جم نے محسوس کیا کہ اس کی کار کی رفتار آہستہ ہو رہی ہے۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ اس نے چلا کر پوچھا۔

وہ کار کی طرف دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے بارش سے بچنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔

”میلبورن۔“ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

جم نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں ایڈن تک لے جا سکتا ہوں۔“

لڑکی کو یقین نہیں آیا۔ وہ دبلی پتلی لیکن پُرکشش [illegible] چہرے کی [illegible] نے پوچھا [illegible] واقعی؟“

”بالکل...... کیوں نہیں۔“

لڑکی نے کار کا دروازہ کھولا اور اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گئی۔ وہ بری طرح بھیگ چکی تھی۔ جم نے نیچے دیکھا، اس کا اسکرٹ گیلا ہو کر ٹانگوں سے چپک گیا تھا۔ اسے بڑا عجیب سا محسوس ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ ویسے بھی وہ اس معاملے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ریڈیو آن کیا اور اس کی سوئی گھمانے لگا پھر اس کی آواز تیز کر دی۔ شاید اس طرح اس کا دھیان بٹ جاتا اور اسے بے مقصد گفتگو نہ کرنا پڑتی۔ اس کے باوجود وہ لڑکی بولنے سے باز نہ آئی۔

اس کا نام جینی تھا۔ عمر اٹھارہ سال اور وہ لزمور کی رہنے والی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ کام کی تلاش میں میلبورن جا رہی ہے۔ وہ گزشتہ چند ہفتوں سے سڈنی میں تھی لیکن یہ شہر اسے پسند نہیں آیا۔ وہاں کی زندگی بہت تیز اور مصروف تھی اور ہر شخص دوڑتا بھاگتا نظر آتا تھا۔ کسی کے پاس رک کر ہیلو کہنے کا وقت نہیں تھا چنانچہ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بس پکڑ کر نوودا جائے اور وہاں سے جنوب کی طرف اپنا سفر شروع کرے۔

اس کے برابر میں بیٹھا ہوا جم خود کو اس سانولی حسینہ کے سحر سے آزاد نہ رکھ سکا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ وہ بہت تیز تیز بول رہی تھی اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے بازوؤں کو حرکت دے رہی تھی جیسے کوئی لڑاکا عورت ہاتھ نچا نچا کر بات کر رہی ہو اور جب اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو وہ جم سے سوالات شروع کر دیتی...... مثلاً یہ کہ کیا ایڈن واقعی بائبل کے باغات جیسا ہے؟ کیا آدم خور وہیل مچھلیاں واقعی لوگوں کو مار دیتی ہیں؟ فیکٹری میں کام کرنا کیسا ہے اور وہ کس طرح ٹونا مچھلی کو ڈبوں میں بند کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ گوکہ جم نے اس سے مذاق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود وہ اس کی کہی ہوئی باتوں پر قہقہے لگاتی رہی اور تھوڑی دیر بعد جم نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی اس کے ساتھ قہقہوں میں شامل ہو گیا ہے۔

جب وہ ایڈن پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا البتہ سڑکوں کی لائٹس روشن تھیں۔ ”تم کہاں ٹھہرو گی؟“ جم نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ معصومیت سے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ رات کہیں باہر گزارنا پڑے گی۔“

”یہاں ایک پارک ہے۔“ جم نے کہا۔ ”یا......“

جینی اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میرا بھائی ٹرالر پر مچھلیاں پکڑنے گیا ہوا ہے اور اس کی واپسی اس ماہ کے آخر تک ہوگی۔ تم اگر چاہو تو میرے گھر میں رہ سکتی ہو۔“

جینی دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے بولی۔ ”شکریہ۔ میں صرف ایک رات تمہارے گھر رکوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

لیکن ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود وہ وہیں ٹھہری رہی تاہم جم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ہر روز کام سے آ کر اسے دیکھتا تو ایک عجیب طرح کی خوشی محسوس ہوتی۔ اسے لگتا جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہی ہو۔

وہ صبح کی شفٹ میں کام کرتا تھا اور اس لیے اسے صبح سویرے گھر سے نکلنا پڑتا۔ سہ پہر کو واپس آنے کے بعد وہ اسے مختلف قابلِ ذکر مقامات دکھانے لے جاتا۔ سالٹ واٹر کریک، بین بوائنڈ ٹاور اور بیئن بے ایسی سنسان جگہیں تھیں جہاں کوئی بھی انہیں ایک ساتھ گھومتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس بارے میں کچھ کہے۔

کبھی کبھی وہ تیراکی کے لیے ساحل پر چلے جاتے۔

http://urdutubes.com/

تیراکی کے لباس میں اس کا خوبصورت جسم دیکھ کر جم کو اپنا دل سنبھالنا مشکل ہوجاتا۔ لیکن وہ ٹھنڈا کر کے کھانے کا قائل تھا اور کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے جینی اس سے بدظن ہوجائے۔ وہ اس وقت کا انتظار کررہا تھا جب جینی کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آکر خود اپنے آپ کو اس کے سپرد کردے۔

جینی اس کے لیے رات کا کھانا بناتی اور وہ رات دیر تک باتیں کرتے اور بیئر پیتے رہتے تھے۔ وہ جب بھی اس کی طرف دیکھتا تو یہی سوچتا کہ جینی کا چہرہ کتنا خوبصورت اور نازک ہے۔ اسے چھونے اور دونوں ہاتھوں میں پیالے کی طرح لینے کے لیے بڑی احتیاط سے کام لیتا ہوگا۔

"مجھے جلد ہی یہاں سے جانے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔" ایک روز جینی نے اس سے کہا۔ "میں نہیں چاہتی کہ میرا مزید رکنا تمہیں ناگوار گزرنے لگے۔"

وہ ایک گرم رات تھی۔ جم اور وہ پورچ کے کنارے ٹانگیں لٹکائے ہوئے بیٹھے تھے۔

"تم چاہو تو یہیں رک سکتی ہو۔" جم نے کہا۔ "ہماری فیکٹری میں آئے دن جگہ نکلتی رہتی ہے۔ تمہیں وہاں ملازمت مل سکتی ہے۔"

جینی نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں ایک دفعہ میلبورن جانا چاہتی ہوں۔ میں نے وہاں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ وہ بڑا شہر ہے، وہاں مجھے بہتر مواقع مل سکتے ہیں۔"

جم نے بیئر کا گھونٹ لیا اور چاند کی روشنی میں اس کے چمکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس لمحے اسے شدت سے یہ خواہش ہوئی کہ وہ اس کے گلے میں بازو ڈال کر اپنے قریب کرے اور اسے بتا دے کہ وہ اس کے بارے میں کیا محسوس کرتا ہے لیکن اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔

جینی مسکرائی اور اپنے گھٹنے سے اس کی ران دباتے ہوئے بولی۔ "کیا تم نے کبھی یہاں سے جانے کے بارے میں سوچا ہے؟"

"میں؟" وہ اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "نہیں...... میں کہیں نہیں جاسکتا۔"

"یقیناً تم جاسکتے ہو۔" وہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔ "تم میرے ساتھ میلبورن جاسکتے ہو۔"

جم اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما اور جھک کر اس کا بوسہ لے لیا۔ اس رات جینی اس کے پہلو میں سوئی اور وہ سوچتا رہا کہ اگر وہ اس کے ساتھ چلا گیا اور واپس نہ آیا تو کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر ہی وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگا اور اسے اپنی ماں سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم اس سے چھوٹے ہو۔" اس کی ماں نے کہا تھا۔ وہ کینسر کی مریضہ تھی اور زندگی کے آخری ایام گن رہی تھی۔ "لیکن اب تمہیں ہی پیٹر کا خیال رکھنا ہے اور اس کی ہر مشکل دور کرنی ہے۔"

وہ گزشتہ دو سال سے اپنے وعدے پر عمل کرنے کی پوری کوشش کررہا تھا لیکن اپنے بھائی کو غلط راستوں پر جانے سے نہ روک سکا۔ پیٹر اپنی مرضی کا مالک تھا۔ جب کبھی جم اسے روکنے ٹوکنے کی کوشش کرتا تو وہ آپے سے باہر ہوجاتا اور غصے میں آکر دیوار پر مکے برسانے لگتا۔ ایک دو مرتبہ تو اس نے جم پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ وہ جسمانی طور پر مضبوط تھا اور جم میں اس کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ تھی۔ جب وہ شراب کے نشے میں ہوتا تو معاملہ اور بگڑ جاتا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ نشے کے دوران کیا کر گزرے۔

جم اور جینی پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے ٹین کی چھت پر بارش کے قطروں کے گرنے کی آواز سن رہے تھے۔ اچانک بادل زور سے گرجے، بجلی کڑکی اور جینی سہم کر جم سے لپٹ گئی۔ [illegible]

[illegible] ارادے یا نیت کو کوئی دخل نہیں تھا لیکن جینی کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ تھی۔ وہ ایک بار پھر اس سے لپٹ کر سوگئی۔ جم نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ وہ جینی کے ساتھ ضرور جائے گا۔ اب وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اسے سوئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ شور کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی کار ڈرائیو وے میں آکر رکی تھی پھر نشے میں ڈوبی ہوئی شور و غل کرتی آوازیں آئیں اور تب اس نے محسوس کیا کہ پچھلے چند روز سے کیا بات اسے پریشان کررہی تھی۔ پیٹر اپنے بدمعاش دوستوں کے ساتھ واپس آ گیا تھا۔

☆☆☆

جب وہ ساحل سے واپس آیا تو گیراج کے پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہوا۔ اوپر سے اسے برتن رکھنے، نل کھلنے، بند ہونے، اوون کا دروازہ کھلنے اور فریج کے بند ہونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ عام حالات میں اسے اوپر جا کر میز لگانے میں پیٹرشیا کی مدد کرنی چاہیے تھی لیکن اس وقت وہ کچھ سوچنا چاہ رہا تھا۔

وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ باہر کے ٹھنڈے ماحول میں وہ اس مسئلے پر آسانی سے توجہ دے سکتا ہے۔ بہرحال اسے دوسرے لوگوں کی طرح ڈی این اے ٹیسٹ تو دینا ہی تھا۔ اس پر ہنگامہ یا اعتراض کرنا کچھ عجیب سا لگتا۔ یہ تو طے تھا کہ اس کا ڈی این اے اس سے میچ کر جاتا لیکن وہ اسے کب تک ٹال سکتا تھا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ آخری دن ٹیسٹ دینے جائے۔ اس طرح اسے معاملات کو سمیٹنے کے لیے کافی وقت مل سکتا تھا۔ وہ بینک کو فون کر کے اپنے اکاؤنٹ کے بارے میں کچھ ہدایات دیتا۔ گھر کے کچھ کام نمٹاتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پیٹرشیا کو اصل حقیقت سے آگاہ کردیتا۔

"اوہ میرے خدا!" وہ آگے کی طرف جھکا اور اپنی کنپٹیاں سہلانے لگا۔ اس کے سر میں شدید درد ہورہا تھا۔

"وہ میں نہیں تھا۔" اس نے اپنے آپ سے آہستہ سے کہا۔

اس عمر میں وہ جیل جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جیل میں ایک دن گزارنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے ایڈن سے چلا جائے لیکن اس کے لیے کوئی بہانہ چاہیے۔ اسے دو ہفتے کے لیے گھر سے دور رہنے کی کوئی وجہ بتانا ہوگی۔ وہ اپنے دماغ میں [illegible] میں رہتا تھا اور اس کی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اس کی عیادت کے بہانے وہاں جاسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ جب وہ واپس آئے۔ تو اس وقت تک ایلیسن کے قاتل کا پتا چل گیا ہو اور اسے ڈی این اے ٹیسٹ کرانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اس نے سوچا یہی ٹھیک رہے گا۔ وہ کل ہی مارجوری کو فون کر کے اپنے آنے کے بارے میں مطلع کردے گا۔

جم کھڑا ہو گیا اور زور زور سے سانس لینے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اچانک ہی اس کے سامنے کوئی دروازہ کھل گیا ہو۔ وہ گیراج کے کونے تک گیا اور وہاں سے اپنا اوزاروں کا بکس اٹھا کر اوپر چلا گیا۔ اس کے دل میں امید کی کرن پیدا ہوئی تھی اور اسے یقین تھا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔

وہ کچن کے پاس سے گزرا تو اس کے کانوں میں پیٹرشیا کے گنگنانے کی آواز آئی۔ وہ اپنی بے سری آواز میں کوئی پرانا گانا گا رہی تھی جسے سن کر وہ مسکرا دیا۔ وہ سوچنے لگا

سزا

اگر آپ کو کوئی کھانا بے حد مرغوب ہے جو چھڑائے نہیں چھوٹتا تو تازہ واردانِ بساطِ مطبخ اس مشکل کو فوراً آسان کردیں گے۔ اشیائے خوردنی اور انسانی معدے کے ساتھ بھرپور تجربے کرنے کی جو آزادی باورچیوں کو حاصل ہے، وہ نت نئی کیمیاوی ایجادات کی ضامن ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں بھنڈی بہت پسند ہے لیکن دس گھنٹے قبل یہ منکشف ہوا کہ اس نباتِ تازہ کو ایک خاص درجۂ حرارت پر پانی کی مقررہ مقدار میں (جس کا علم صرف ہمارے خانساماں کو ہے) میٹھی آنچ پر پکایا جائے تو اس مرکب سے دفتروں میں لفافے اور بدلگام افسروں کے منہ ہمیشہ کے لیے بند کیے جاسکتے ہیں۔

انہی حضرت نے گزشتہ جمعرات کو سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے بچی کو بھیجا کہ اس سے کہو کہ مہمان بیٹھے ہیں۔ اس وقت سل کھوٹنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے کہلا بھیجا کہ ہم ان ہی مہمانوں کی تواضع کے لیے سل پر کبابوں کا قیمہ پیس رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کباب منہ میں رکھا تو محسوس ہوا گویا چٹ پٹا ریگ مال کھا رہے ہیں اور ہمیں رہ رہ کر میر صاحب پر رشک آنے لگا کہ وہ مصنوعی بتیسی لگائے بے خبر بیٹھے کھا رہے تھے اور ہماری طرح کرکرا محسوس کر کے لال پیلے نہیں ہوئے۔ صبح تک سب کو پیچش ہوگئی۔ صرف ہمیں نہیں ہوئی اور ہمیں اس لیے نہیں ہوئی کہ ہم پہلے ہی اس میں مبتلا تھے۔

[illegible] کا ذکر چل نکلا تو اس قوی ہیکل خانساماں کا قصہ بھی [illegible] جسے ہم سب آغا کہا کرتے تھے (آغا اس لیے کہا کرتے تھے کہ وہ سچ مچ آغا تھے) ان کا خیال آتے ہی معدے میں مہتابیاں سی جل اٹھتی ہیں۔ تادمِ وداع ان کے کھانا پکانے اور کھلانے کا انداز وہی رہا جو ملازمت سے پہلے دنگل جیتنے کا ہوتا تھا...... یعنی ڈرا دھما کر اس کی خوبیاں منوا لیتے تھے۔ بالعموم صبح ناشتے کے بعد سو کر اٹھتے تھے۔ کچھ دن ہم نے صبح تڑکے جگانے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے نیند کی آڑ میں ہاتھا پائی کرنے کی کوشش کی تو ہم نے بھی ان کی اصلاح کا خیال ترک کردیا۔ اس سے قطع نظر، وہ کافی تابعدار تھے۔ تابعدار سے ہماری مراد یہ ہے کہ کبھی وہ پوچھتے کہ "چائے لاؤں؟" اور ہم تکلفاً کہتے کہ "جی چاہے تو لے آؤ ورنہ نہیں۔" تو کبھی واقعی لے آتے اور کبھی نہیں لاتے تھے۔ جس دن سے انہوں نے باورچی خانہ سنبھالا، گھر میں حکیم ڈاکٹروں کی ریل پیل ہونے لگی۔ ان کو نوکر رکھنا ایسا ہی ثابت ہوا جیسے کوئی شیر ببر پر سوار تو ہوجائے لیکن اترنے کی ہمت نہ رکھتا ہو۔"

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "چراغ تلے" سے اقتباس

مرسلہ: یاسمین خان، کوئٹہ

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

کہ اس سے پہلے کتنی مرتبہ ایسا ہوا ہوگا جب وہ اس کی تعریف کیے بغیر آگے بڑھ گیا ہوگا۔ اس نے اسی وقت یہ فیصلہ کرلیا کہ جیسے ہی یہ معاملہ ختم ہوا تو وہ پیٹرشیا کے ساتھ تعطیلات منانے چلا جائے گا۔

اس نے عقبی صحن کی لائٹس جلائیں اور باہر چلا گیا۔ اس نے اوزاروں کا بکس باربی کیو کے سامان کے ساتھ رکھا اور چلتا ہوا ایک بڑے سفید کارٹن تک گیا جو دیوار کے آخری سرے پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور گھسیٹ کر صحن کے وسط تک لانے لگا۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو؟''

اس نے نظریں اٹھائیں۔ پیٹرشیا لیونگ روم میں کھڑی دروازے سے جھانک رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں کٹلری اور دوسرے میں کچھ میٹ پکڑے ہوئے تھے۔

''کیا تم شیڈ پر کپڑا ڈال رہے ہو؟'' اس نے کہا۔

''ہاں، کئی مہینوں سے سوچ رہا تھا۔ آج موقع ملا ہے۔''

''لیکن کھانا تقریباً تیار ہے۔''

جم نے اوزاروں کا بکس کھولا اور اس میں سے ناپنے والا فیتہ نکالتے ہوئے بولا۔ ''جانتا ہوں میری جان لیکن میں نے بہت پہلے تم سے وعدہ کیا تھا اور میں اسے بھولا نہیں ہوں۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ بوب کسی وقت بھی یہاں آسکتا ہے۔''

''بوب؟'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔

''تم نے ہی تو اسے ڈنر پر بلایا تھا۔ بھول گئے؟''

جم کو اچانک یاد آگیا کہ وہ پیر کی شب بوب سے ملا تھا۔ اسے اپنے سینے میں گھٹن محسوس ہونے لگی۔

''کیا مسئلہ ہے؟ کیا تم دونوں میں کوئی جھگڑا ہوگیا ہے یا کوئی اور بات ہے؟''

''نہیں، کچھ نہیں......'' جم نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور سوچنے لگا کہ اسے کیا کہنا چاہیے لیکن اب اس کی اہمیت نہیں تھی کیونکہ اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔

پیٹرشیا نے گہری سانس لی اور سامان میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں دیکھتی ہوں۔''

پیٹرشیا نے بوب کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ تم اپنے کاموں سے وقت نکال سکو گے...... اندر آجاؤ۔''

جم نے تعظیماً جھک کر بوب سے مصافحہ کیا اور دونوں کھانے کی میز پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پہلے موسم پر گفتگو ہوئی پھر آسٹریلیا اور جنوبی افریقا کے درمیان ہونے والے کرکٹ میچ کا ذکر چھڑ گیا۔ عام طور پر وہ بوب کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتا تھا لیکن اس روز وہ شعوری طور پر بہت محتاط تھا کہ کہیں اس کی زبان سے کوئی غیر ضروری جملہ ادا نہ ہوجائے۔ پیٹرشیا نے میز پر کٹلری رکھی۔ گلاسوں میں مشروب ڈالا اور ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

''بوب! یہ بتاؤ کہ اس قتل کے کیس میں کیا پیش رفت ہوئی؟''

جم نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''پیٹرشیا! وہ اس کیس کے بارے میں بات نہیں کرسکتا۔''

''میں یہ نہیں کہہ رہی کہ کوئی خفیہ بات ظاہر کردو۔'' وہ بوب کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ ''جولین اور میں کچھ دیر پہلے ڈی این اے ٹیسٹ کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کیا یہ ایک بڑی خبر نہیں ہے؟''

''یہ تم مجھے بتا رہی ہو؟'' بوب نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''گو کہ مجھے یقین نہیں کہ اس کا کوئی فائدہ ہوگا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ میرے خیال میں یہ بہت ہی اچھا آئیڈیا ہے۔'' پیٹرشیا نے کہا۔

''تم مجھے غلط مت سمجھو۔ تھیوری کی حد تک میں اس سے متفق ہوں۔'' بوب نے کہا۔ ''لیکن آدھا قصبہ اس کے بارے میں تذبذب کا شکار ہے اور اب کچھ وکیلوں نے بھی اس پر احتجاج شروع کردیا ہے۔ وہ اسے [illegible] آزادی کے خلاف سمجھتے ہیں۔''

''[illegible] شہری آزادی؟'' پیٹرشیا نے کہا۔ ''یہ قتل کا معاملہ ہے۔ اس میں انہیں پولیس کی مدد کرنا چاہیے۔''

جم نے کچھ کہنے کے لیے گلا صاف کیا لیکن فوراً ہی رک گیا مگر جب اس نے دیکھا کہ بوب اور پیٹرشیا دونوں اس کی طرف دیکھ رہے ہیں تو وہ ہمت کر کے بولا۔ ''میں اس پرانے کیس کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی جانب خبر میں اشارہ کیا گیا ہے۔''

''دراصل سڈنی سے آئے ہوئے سراغ رساں مجھے پوری بات نہیں بتا رہے۔'' بوب نے کہا۔ ''لیکن اس کا تعلق اسّی کی دہائی میں ہونے والے قتل سے ہوسکتا ہے۔''

''کیا......؟ وہ قتل یہاں ایڈن میں ہوا تھا؟'' پیٹرشیا چونکتے ہوئے بولی۔

''ہاں، وہ مقامی نسل کی نوجوان لڑکی تھی۔ اس کی لاش بین بوائڈ نیشنل پارک سے ملی تھی۔''

''اور پولیس اس کے قاتلوں کو نہیں پکڑ سکی؟'' پیٹرشیا نے کہا۔

''نہیں۔ میں نے جو پڑھا ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ پولیس نے اس کیس پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیوں ایسا ہوا۔ شاید اگر وہ کوئی گوری لڑکی ہوتی تو کہانی مختلف ہوسکتی تھی لیکن تم جانتی ہو کہ اس زمانے میں کیا حالات تھے۔''

وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''جم! تم نے ساری زندگی یہاں گزار دی۔ تمہیں تو یقیناً وہ واقعہ یاد ہوگا؟''

جم کو یوں لگا جیسے اس کا دل ساری دیواریں توڑ کر باہر آجائے گا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی اور اسے کمرے میں غیر معمولی طور پر گرمی لگ رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ کیا اسے کھڑکی کھول دینی چاہیے؟

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور اس نے بہ مشکل یہ لفظ ادا کیا تھا پھر اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور دوبارہ بلند آواز میں کہا۔ ''نہیں۔''

''اوہ اچھا۔'' بوب نے کہا۔ ''بہرحال، اگلے دو ہفتے تک ہم یہ ناخوشگوار فرض انجام دینے پر مجبور ہوں گے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میرا کام اس قتل کی تحقیقات تک محدود رہے گا لیکن اب مجھے قصبے کے ہر مرد کو کہنا پڑے گا کہ وہ پولیس اسٹیشن آکر اپنا ڈی این اے کروائے۔''

اس نے جم کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''کیا [illegible] کہ کل صبح تم سب سے پہلے پولیس اسٹیشن [illegible] کر ڈی این اے ٹیسٹ کرالو۔ اس طرح ایک مثال قائم ہوجائے گی۔''

''کیا؟'' جم نے پیٹرشیا کی طرف دیکھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا اور پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے تھے۔

''ہم اس کے لیے محفوظ طریقہ اختیار کریں گے۔''

''میں نہیں آسکتا......''

''کیا...... لگتا ہے کہ تم ریٹائرمنٹ کے بعد بہت مصروف ہوگئے ہو؟'' بوب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں سنجیدہ ہوں۔ اس کے بعد یہاں کے لوگ تمہاری تقلید کریں گے اور اس طرح تم میرا کام آسان کردو گے۔''

''نہیں۔ میں دراصل یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے مارجوری کو دیکھنے کوئنز لینڈ جانا ہے۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''مارجوری؟ تم کس کی بات کررہے ہو؟ تم بعد میں بھی اس سے ملنے جاسکتے ہو۔'' پیٹرشیا نے بوب کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم فکر نہ کرو۔ یہ تمہارے پاس کل سہ پہر میں آجائے گا۔''

بوب جھجکتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم پولیس اسٹیشن پر آجاؤ تو سارے مرد ڈی این اے کروانے کے لیے وہاں قطار لگائے کھڑے ہوں گے۔''

جم کھڑے ہوکر ایک طرف کو جھولنے لگا۔ پیٹرشیا اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے جان؟ تمہیں پسینا کیوں آرہا ہے؟''

جم نے ایک بازو پھیلا کر اشارہ کیا کہ وہ ٹھیک ہے۔ ''کوئی بات نہیں، میں ابھی آرہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کیا اور سنک پر جھک گیا لیکن لعاب کی بہت تھوڑی مقدار ہی باہر آسکی۔ اس نے اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور ٹوائلٹ کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ اس رات کے بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا اور جینی کا چہرہ بار بار اس کی نظروں کے سامنے آرہا تھا پھر اچانک ہی اسے پیٹر کی جھلک دکھائی دی۔ وہ نشے میں چُور اس کے بیڈروم کا دروازہ کھول رہا تھا۔

''ہم اس سے ملنے آئے ہیں۔ وہ تمہاری پیاری سی دوست کون ہے؟''

''چلے جاؤ۔'' وہ زور سے چلایا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے پردے پر پوری فلم چلنے لگی۔ اسے سب کچھ یاد آگیا تھا۔ جینی بستر پر بیٹھی وحشت ناک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پیٹر نے اسے دھکا دے کر دوبارہ لٹا دیا۔ شین اور ڈیرن بھوکے کتوں کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔ جم نے پیٹر کو ہٹانے کی کوشش کی تو اس نے اسے بھی پرے دھکیل دیا۔ وہ دوبارہ جینی کو اس کے چنگل سے چھڑانے کے لیے پلٹا لیکن شین اور ڈیرن نے اسے پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ جینی کی چیخیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔

وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھا تاکہ پولیس کو اطلاع دے لیکن بہت دیر ہوچکی تھی۔ پولیس کے آنے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ باہر جا کر بیٹھ گیا اور اس نے پوری رات پورچ میں گزار دی۔ صبح کا سورج طلوع ہوا تو جینی کی چیخیں بھی رک گئیں۔ اس نے سوچا کہ اب وہ شیطان اس کی جان چھوڑ دیں گے لیکن پھر اس نے اندر سے پیٹر کی ناشائستہ اور غصے میں بھری ہوئی آواز سنی جیسے وہ کسی کو چپ کرا رہا ہو۔ ضرور کوئی گڑبڑ تھی۔ وہ یہ سوچتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھا کہ وہ جینی کے لیے کیا کرسکتا ہے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اس کا بھائی اپنے دونوں ہاتھ بھینچے ہوئے

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

دائرے کی شکل میں چکر لگا رہا تھا۔ شین اور ڈیرن فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں سے بھی پریشانی عیاں تھی۔ اس نے بستر کی طرف نظر دوڑائی۔ وہاں جینی برہنہ...... زخموں سے چور ساکت پڑی ہوئی تھی اور اس کے گرد لپٹی ہوئی چادر پر خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ وہ سو رہی ہے لیکن جب اس نے کوئی حرکت نہیں کی تو وہ پیٹر کی طرف پلٹا۔

''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' وہ چلّایا۔ ''بتاؤ تم نے کیا کیا ہے؟''

پیٹر کچھ کہہ رہا تھا لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اب فوری طور پر لاش کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ تھا ورنہ پیٹر کے ساتھ وہ بھی پھنس جاتا۔ اس نے دونوں آدمیوں کو باہر جانے کے لیے کہا اور جینی کی لاش کو ایک کمبل میں لپیٹ کر کار کی ڈکی میں رکھ دیا پھر وہ اور پیٹر کار چلاتے ہوئے بین بوائڈ نیشنل پارک گئے اور اس کی لاش جھاڑیوں میں پھینک دی۔ اسے یقین تھا کہ تھوڑی دیر بعد کوئی راہ گیر وہاں سے گزرے گا اور پولیس کو اطلاع ہو جائے گی۔ وہ خود اسے دفنانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

کئی سالوں تک جم اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دیتا رہا کہ وہ اس جرم میں شریک نہیں تھا۔ اس نے جینی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی نہ ہی اسے قتل کیا۔ البتہ وہ بزدل اور کمزور تھا۔ وہ اپنے بھائی کا ہاتھ [illegible] روک سکا [illegible] جینی کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا آیا پھر اس نے ڈر کے مارے جینی کی لاش کو جھاڑیوں میں چھوڑ دیا لیکن اب وہ ایسا نہیں کرے گا۔ وہ اگلے روز ڈی این اے ٹیسٹ ضرور دے گا۔ اس کے بعد جو ہوگا، اسے اپنے جرم کی سزا یا تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلے گا۔

رات کے بقیہ حصے میں اس نے اپنے آپ کو حیرت انگیز طور پر پُرسکون محسوس کیا۔ اگلے روز جب وہ پولیس اسٹیشن پہنچا تو اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ بوب جو عام طور پر ہنستا مسکراتا رہتا تھا، اس وقت کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔

''یعنی تم اعتراف کرنے آہی گئے؟''

یہ جملہ تیر کی طرح اس کے دل میں جا کر لگا۔ جم کو یہ توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی یہ سب کچھ سامنے آجائے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی اس کے پاس چند دن اور ہیں۔ وہ سیاہ سیال مادہ اس کی رگوں میں تیزی سے گردش کرنے لگا۔ ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا پورا جسم مفلوج ہو گیا ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ کاؤنٹر پر رکھا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

بوب کاؤنٹر سے باہر آیا اور اس کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''دوست! میں تو مذاق کر رہا تھا لیکن تمہارے چہرے کا رنگ کیوں اڑ گیا ہے؟''

پھر وہ اسے برابر والے کمرے میں لے گیا اور کہنے لگا۔ ''کل تم نے اس پرانے کیس کی بات کی تھی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ یہ پبلک افیئر یونٹ کی غلطی تھی۔ ہمیں صرف نئے کیس کے لیے خون کے نمونے لینے کی اجازت ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید اس وجہ سے بھی لوگ ڈی این اے کروانے سے گھبرا رہے ہوں کیونکہ ڈاکا زنی یا چوری جیسے جرائم میں ملوث افراد بھی خوفزدہ ہوں گے کہ اس طرح ان کا جرم سامنے آجائے گا۔''

جم کا دماغ اس کے لفظوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔

''پھر......''

بوب نے دستانے پہنے اور جم سے منہ کھولنے کو کہا۔ ''اب کل کے اخبار میں اس کی تصحیح شائع ہوگی۔'' اس نے ایک چھوٹا سا روئی کا پھایا اس کے اندرونی گال پر پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد میرا کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔ لوگ بخوشی ڈی این اے کروانے آجائیں گے۔''

اس [illegible] ایک [illegible] میں رکھ کر [illegible] کر دیا [illegible] دستانے اتار کر [illegible] میں پھینک دیے اور بولا۔ ''اب تم فارغ ہو۔''

جم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بارے میں کچھ پوچھے یا نہیں لیکن وہ اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اس پرانے کیس کی بھی تفتیش نہیں کرو گے جس کا ذکر تم نے گزشتہ شب کیا تھا؟''

''دوست! ہمارے پاس پہلے ہی بہت کام ہے۔''

اس نے جم کو باہر جانے کا راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال تمہارے آنے کا شکریہ۔ رات کی دعوت اچھی تھی۔ اگلے ہفتے ملاقات ہوگی۔''

باہر نکل کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے لگا کہ اس کی رگوں میں دوڑنے والا سیاہ سیال مادہ بتدریج کم ہو رہا ہے اور پھر وہ بالکل ختم ہو گیا۔ تب اس نے جانا کہ جرم پر اسے شرمندگی نہیں بلکہ خوف تھا اور اب وہ خوف کے حصار سے نکل آیا تھا۔

''مجھ سے شادی کروگی؟''

وہ اچانک سے اس کے سامنے آیا اور سوال کر دیا۔ وہ یک ٹک حیرت سے اس شخص کو دیکھے جارہی تھی جسے وہ جانتی تک نہ تھی۔ اس شخص کو ہر بار دیکھتے ہی وہ عجیب سے احساسات کا شکار ہو جاتی تھی۔ اس کے لیے اس سے نگاہیں ہٹانا بہت مشکل ہوتا تھا اور ہر بار وہ یہ مشکل کام کرتی آئی تھی مگر آج اس کے سوال پر وہ سارے مشکل کام کرنا بھول گئی تھی۔

وہ کئی دنوں سے اسے مسلسل ہر جگہ دیکھ رہی تھی۔ پے در پے اتفاقات پر اسے شدید حیرت بھی تھی مگر اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ شخص اس سے یہ بات یوں اچانک کر دے گا۔ اگرچہ اس کا مسلسل اسی کی طرف دیکھتے رہنا اسے کافی حیران بھی کرتا تھا مگر وہ کبھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ اس جیسا خوبصورت شخص اسے شادی کی آفر کر دے گا۔ کتنی دیر وہ منہ پھاڑے اسے دیکھتی رہی اور وہ جواب کا منتظر رہا۔

''مجھ سے شادی کروگی؟'' اس نے سوال دہرایا۔

''تم...... تم کون ہو؟'' وہ بہ مشکل بول پائی۔

''میں افق ہوں۔''

سات گلاب

غزالہ یاسمین

کسی کو محبت کا فریب دے کر اپنے لیے قربانی لے لینا... اس سے بڑی خود فریبی اور کیا ہوسکتی ہے۔ اس نے بھی ایسا ہی سوچا تھا کہ اس قربانی کے بدلے اس کی زندگی آسان ہو جائے گی مگر... ایسا کب ہوتا ہے۔ ناحق خون کبھی رائگاں نہیں جاتا... لہٰذا اس کی محبت اور زندگی ضایع ہو کر بھی کسی نہ کسی حوالے سے معتبر ٹھہر گئی تھی۔

غیر معمولی آنکھوں والی ساحرہ کی [illegible]

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

"کون افق......؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔
"بتادوں گا۔ سب جان جاؤ گی میرے بارے میں۔ مگر پہلے میری بات کا جواب دو۔" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
اور وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ اسے وہ کسی جادوگر کی آنکھیں لگیں۔ بے بس کر دینے والی...... سحر پھونکنے والی ساحر آنکھیں۔
سب کہتے تھے کہ اس کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ اور ایسا تھا بھی۔
اس کے پورے چہرے میں یہ آنکھیں ہی تھیں جو اس کی نہیں لگتی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ انتہائی عام شکل صورت کی مالک تھی۔ سوائے آنکھوں کے اس کے سارے نقوش بہت واجبی سے تھے۔
مگر اس کی آنکھیں الگ تھیں۔ گہری سیاہ خمار زدہ آنکھیں...... بہت انوکھی اور پُرکشش سی......
مگر اس سے اس کے چہرے پر کوئی غیر معمولی پن نہیں آیا تھا۔ بلکہ دیکھنے والے کو عجیب سا احساس ہوتا کہ شاید کسی اور کی آنکھوں کو اس کے چہرے سے جوڑ دیا گیا ہے۔ ایک بے جوڑ سا چہرہ لگتا تھا بلکہ اکثر اوقات مضحکہ خیز ہی لگتا تھا۔
مگر آج اس شخص کی آنکھیں دیکھ کر اسے سب کی، کی گئی تعریفیں سچ لگیں۔ آج اس سے کوئی [illegible] تعریف پوچھتا تو بلا سوچے سمجھے اس کی [illegible] بے حد سیاہ کسی جھیل سی گہرائی لیے...... پراسرار سی آنکھیں تھیں اس کی۔ اور وہ یقیناً اپنے اس ہنر سے واقف تھا۔ تب ہی تو وہ اس کی نگاہوں کو گرفت میں لیے پوچھ رہا تھا۔
کسی معمول کی طرح وہ دیکھتی گئی اور پھر اس نے ہاں بول دیا۔ اسے بولنا ہی پڑا۔ وہ اس وقت کچھ بھی سوچنے سمجھنے، کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قاصر تھی اور زبان اختیار میں نہ رہی۔
اس کا جواب سنتے ہی وہ رکا نہیں...... یکدم پلٹا اور چلا گیا اور وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔
"کتنی بے وقوف ہوں میں۔ ایک انجان آدمی کو جس کو جانتی بھی نہیں، جس سے پہلی بار بات کی اسے شادی کے لیے ہاں کر دی۔" اب وہ خود کو لتاڑ رہی تھی۔
ایسا نہیں تھا کہ وہ کسی بھی خوبصورت چہرے کو دیکھ کر ایسے ہی بے خود ہو جاتی تھی اور نہ ہی یہ بات تھی کہ کسی مرد سے بات کرتے ہوئے اسے ہچکچاہٹ ہوتی تھی مگر اس شخص میں جانے کیا تھا کہ وہ کچھ نہیں بول پائی...... بے اختیار ہو گئی اور ہاں کہہ دیا۔
یقیناً اس شخص نے مذاق کیا تھا یا اس کا مذاق اڑایا تھا۔ وجہ دونوں میں سے جو بھی تھی مگر تضحیک اس کی ہی ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایسے مذاق کے بعد وہ شخص اب اسے کہیں نظر نہیں آئے گا۔
"لیکن اگر وہ واقعی دوبارہ آ گیا تو......؟" کہیں اندر سے سوال ابھرا۔
"اگلی بار ملا تو نہ کر دوں گی۔" اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ اس ہاں کے بعد اسے انکار کرنا اب اس کے اختیار میں نہیں رہے گا۔
☆☆☆
وہ سارہ حبیب تھی۔ ایک عام سی شکل صورت کی مالک ایک عام سی لڑکی۔
بہت عام سی کہانی تھی اس کی جیسی کہ اکثر عام سا چہرہ رکھنے والے لوگوں کی ہوتی ہے۔ اماں ابا کے انتقال کے بعد چاچا چاچی نے پرورش کی اور اسے پوری طرح احساس دلایا کہ وہ ایک بوجھ ہے جو انہوں نے مجبوری میں دنیاداری کے لیے اٹھایا ہے۔ ایک احسان ہے اور وہ اس احسان پر ہمیشہ احسان مند رہی۔
چاچی کی لاڈلی بیٹی مریم کی اترن اس کا تن ڈھانپتی رہی اور سارا دن گھر کا کام کرنے کے عوض اسے پیٹ بھر کھانا [illegible] جاتا تھا۔ اس [illegible] بلکہ وہ [illegible] رہا تھا۔
چاچا نے البتہ ایک احسان اور کیا کہ اس کی تعلیم جاری رہنے دی۔ بظاہر اس بات پر چاچی کو بھی کوئی خاص اعتراض نہ تھا کیونکہ تعلیمی سلسلہ جاری رہنے سے اس کی گھریلو ذمے داریوں میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور سرکاری اسکول کے اخراجات بھی قلیل تھے، وہ چاچا کی جیب پر بالکل گراں نہ تھے۔
اچھا تھا کل کو دنیا کو منہ بھی دکھانا تھا۔ اب کہا جا سکتا کہ یتیم بچی کی پرورش سگی اولاد کی طرح کی ہے۔ کیا ہوا جو ادارے الگ تھے۔
پڑھائی میں وہ شروع سے ہی تیز تھی۔ کبھی بھی اسے ٹیوشن یا مدد کی ضرورت نہ پڑی بلکہ مریم کی انگلش میڈیم کی بھاری کتابیں بھی جلد ہی اسے سمجھ آنے لگیں۔ آہستہ آہستہ مریم کو ہوم ورک اور پڑھائی میں مدد کرنا بھی اس کی ذمے داری بن گیا۔ لیکن یہ واحد ذمے داری تھی جسے اس نے خوشی اور پورے دل سے اٹھایا تھا۔
میٹرک کے بعد تعلیمی اخراجات قدرے بڑھے تو چاچا نے بھی ہاتھ اٹھا دیے۔

"بس دسویں پاس کر لی بہت ہے۔ زیادہ پڑھ کر کیا کرنا ہے۔ کچھ گھرداری سیکھ، اپنی چاچی کا ہاتھ بٹا۔"
چاچی کی بھی پوری تائید ساتھ تھی۔
"چاچا! میں ٹیوشن پڑھا کر خرچہ نکال لوں گی۔" دبے لفظوں میں پہلی بار اس نے زبان کھولی۔
"اتنی کتنی ٹیوشن کرو گی کہ سارا خرچہ نکال لو گی؟" چاچی نے طنزاً اس کی کمائی کا حساب لگایا۔
"چاچی! نہ کر سکی تو چھوڑ دوں گی پڑھائی۔ بس ایک بار کوشش کرنے دیں۔" اب کی بار لہجے میں لجاجت در آئی تو چاچا کے تنے اعصاب بھی کچھ ڈھیلے پڑے۔
"اچھا ٹھیک ہے جو کرنا ہے کرو۔ مگر مجھ سے امید نہ رکھنا۔"
اور امید تو اس نے کبھی بھی ان رشتوں سے رکھی ہی نہیں تھی۔ بس اجازت درکار تھی، وہ مل گئی اور رکی ہوئی پڑھائی کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔
اور اب وہ گریجویشن کے بعد ایک ادارے میں کام کر رہی تھی۔ چاچا کے اجازت دینے کے احسان کا بدلہ اب انہیں اپنی کمائی دے کر پورا کر رہی تھی
☆☆☆
پورے ایک ہفتے بعد ٹھیک اسی وقت پر وہ شخص پھر سے اس کے سامنے تھا۔
گزشتہ پورا ہفتہ وہ اس شخص کو ذہن سے نکالنے میں [illegible] سراسر اس کی تضحیک تھی۔ اور اگلے چار دن اس یقین کے بعد کہ وہ سب ایک انجان شخص کا مذاق ہی تھا، وہ پھر بھی اسے بھلانے کی کوشش کرتی رہی۔
اور آٹھویں دن جب وہ اسے تقریباً بھول چکی تھی تو وہ پھر سے اس کے سامنے تھا۔ بلکہ اس کے گھر کے سامنے تھا۔
وہ اس کے گھر تک کیسے پہنچا؟ اسے پتا کہاں سے ملا؟ اس نے اسے کیسے ڈھونڈا؟
یہ سب وہ سوال تھے جو اسے سب سے پہلے سوچنے چاہیے تھے۔ مگر وہ ان میں سے کسی کو بھی نہیں سوچ پائی۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ وہ واقعی آیا ہے یا اس کی نظروں کا دھوکا ہے۔ اگر وہ سچ میں آیا ہے تو کیا وہ پروپوزل بھی سچ تھا؟
کچھ دیر بعد وہ اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ کچھ دیر قبل وہ جس حیرت کا شکار تھی، اب ویسی ہی حیرانی چاچا چاچی کے چہرے پر بھی طاری تھی۔ آنے والا اب وہی پروپوزل اس کے گھر والوں کے سامنے رکھ رہا تھا۔
مریم کو کبھی بھی وہ خود سے برتر نہیں لگی تھی مگر آج وہ حسد اور کمتری کے ملے جلے احساسات کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔
آنے والا لاکھ امیر سہی، خوبصورت سہی مگر اس نے مریم کو چھوڑ کر سارہ کا ہاتھ مانگا تھا۔ یہ بات ہی چاچا چاچی کو اسے انکار کا جواز فراہم کرنے کے لیے کافی تھی۔
وہ اس انکار پر کچھ نہیں بولا۔ بس اٹھا اور چلا گیا۔ اور وہ اب تک غائب دماغی کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سب جیسے کوئی ابہام تھا۔ کوئی خیال تھا یا شاید خواب......
آنے والا چلا گیا اور ہفتہ بھر جس خیال نے اس کا سکون درہم برہم رکھا تھا، وہ خیال پھر سے آ کر ذہن میں بیٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔
اس کی زندگی میں ایک ہی خوشی آئی تھی جو چاچا چاچی نے اس تک پہنچنے ہی نہیں دی۔ بچپن سے اب تک اس نے اپنے ساتھ کئی بار زیادتی ہوتے دیکھی تھی مگر اسے کبھی اتنا برا نہیں لگا تھا جتنا اس بار لگا۔
شاید کہیں دماغ کے کسی کونے میں یہ خیال ہمیشہ رہتا تھا کہ کچھ ایسا ہی ہوگا اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ مگر یہ پہلی بار تھا کہ اسے چاچا چاچی کے رویے سے تکلیف ہوئی تھی اور بے حد ہوئی تھی۔ اسے ان کا سفاک رویہ کھلا تھا۔ اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی کا احساس [illegible] تھا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ نہ اس کے اختیار میں پہلے [illegible] تھا، نہ ہی اب۔
[illegible] وہ بے آواز آنسوؤں کے ساتھ روتی رہی۔ کتنے ہی گلے شکوے تقدیر سے کیے اور کتنی بار اسے گھر چھوڑ کر جانے کا خیال آیا۔ مگر وہ اس خیال پر عمل نہیں کر پائی کیونکہ وہ پھر سے ان کے گھر پر تھا۔ اس بار اس نے چاچا چاچی کو منا لیا تھا۔ انہوں نے کماؤ بھتیجی کی شادی کے عوض ایک بھاری بھرکم رقم وصول کر لی تھی... جو ان سے ہاں کہلوانے کے لیے کافی تھی۔
☆☆☆
وہ حیرت سے ان پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ شاید ہی کسی کو رونمائی میں ایسا تحفہ ملا ہو۔ اسے کسی تحفے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا تحفہ اس کے سامنے تھا۔ اس کا شوہر اس کی محبت۔ اس دنیا کا وہ خوبصورت ترین انسان جس کے خوبصورت دل نے اس عام سی لڑکی میں بھی خوبصورتی اور محبت ڈھونڈ لی تھی۔
وہ خدا کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔ اس کی خود کے لیے اتنی چاہت اور اس سے شادی ہی بہت حیران کن تھی مگر وہ

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

ہر بار اسے مزید حیران کرنے کا کوئی نہ کوئی جواز نکال لاتا۔ جیسے کہ رونمائی میں دیے گئے وہ پھول۔

وہ اتنا امیر تھا کہ اس جیسے شخص سے کسی بھی مہنگے ترین تحفے کی امید کی جاسکتی تھی مگر اس نے اسے ایک انوکھا تحفہ دیا تھا۔ سیاہ گلاب...... پورے سات سیاہ گلاب......

اس نے کئی رنگوں کے گلاب دیکھے تھے۔ سرخ، نیلے، گلابی، بنفشی، زرد، سفید مگر اس قدر سیاہ گلاب کبھی نہیں دیکھے تھے......

سیاہ ترین...... کسی تاریکی سے بھی زیادہ...... اتنے سیاہ کہ ان کی پنکھڑیوں میں فرق کرنا بھی بے حد مشکل تھا۔

''اتنے سیاہ گلاب تمہیں ملے کہاں سے؟'' اس نے پھولوں کو سونگھا اور ہنستے ہوئے پوچھا۔

''بس مل گئے۔ ڈھونڈنے سے کیا نہیں مل جاتا۔ یہ تو چند گلاب ہیں۔'' اس نے گلابوں پر نظر جما کر کہا۔

''ہاں سب مل جاتا ہے مگر یہ گلابوں کا موسم نہیں ہے نا۔''

''یہ قسم کسی موسم کی محتاج نہیں۔ بلکہ موسم اس کے محتاج ہیں۔'' اس نے گلاب اس کے ہاتھ سے لے کر نرمی سے اس کی پنکھڑیوں کو چھوا۔

''کیا مطلب......؟'' اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں پھر کبھی بتاؤں گا۔ تم ایک کام کرو۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے اس گلدان میں سجادو۔'' اس نے ایک سیاہ گلدان نکال کر سامنے کیا۔

وہ کسی شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ [illegible] گلدان [illegible] ہاتھ میں پکڑا تو اندازہ ہوا کہ وہ کسی موی میٹریل کا بنا ہوا تھا۔ اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے لگا کہ وہ کسی بہت ہی نرم و نازک چیز کو ہاتھ لگا رہی ہے مگر اس کی چمک بہت جدا تھی۔

اس نے پھولوں کو ترتیب سے اس گلدان میں رکھا اور اسے پیش کر دیا۔

''یہ میری طرف سے۔'' وہ مسکرائی۔

''شکریہ۔ تم نہیں جانتیں کہ کب سے ان پھولوں کو تم سے لینے کا انتظار کر رہا تھا۔'' وہ بھی مسکرایا۔

اس کی نظریں اب بھی پھولوں پر ٹکی تھیں۔ وہ اس کی محویت کو دیکھ کر ہنس پڑی۔

''عجیب شخص ہے۔ پھولوں کو ایسے دیکھ رہا ہے جیسے مجھ سے نہیں ان سے شادی کی ہو۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''میں ان کو رکھ آؤں۔'' وہ اٹھنے لگا تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''یہاں ہی سجا دیں ان کو۔ اس کارنس پر۔'' اس نے دائیں جانب اشارہ کیا۔

''نہیں، ان کی جگہ یہ نہیں ہے۔''

وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور فوراً کمرے سے نکل گیا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

''تم نے مجھ میں کیا دیکھا جو مجھ سے شادی کر لی ہے؟'' اس نے ان گلابوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے سوال کیا۔

شادی کی رات اسے افق کی ان پھولوں سے انسیت جتنی کھلی تھی، آج اسی محبت کا وہ شکار تھی۔

دن کا بیشتر حصہ وہ ان پھولوں کو چھونے اور سنوارنے میں گزار دیتی۔ ان کو ہاتھ لگاتے ہی ایک سرشاری کا احساس جاگتا تھا۔ وہ عجیب پھول تھے جو مرجھانے کے بجائے اور کھلتے جارہے تھے۔ ان پھولوں کی چمک دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔

افق کا دیا گیا پہلا تحفہ آج اسے افق سے بھی عزیز ہو گیا تھا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' اس نے پھر سے پوچھا۔

یہ سوال وہ اب تک کئی بار پوچھ چکی تھی مگر وہ ہر بار ٹال جاتا۔

اس بار بھی اس نے ٹالنا چاہا۔

''تم [illegible] بتایا [illegible] بار کا دیا جواب پھر دہرا دیا۔

''نہیں مجھے سچ سچ بتاؤ۔''

''سچ بتاؤں......؟'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پکڑے پھولوں پر نظریں جما دیں۔ ''میں نے تم سے اس لیے شادی کی کیونکہ تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں بے حد سیاہ اور گہری ہیں۔'' اور اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

''اور دائیں آنکھ کے پاس یہ تل ہے۔'' اس نے اس کی آنکھ کو نرمی سے چھوتے ہوئے جواب دیا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

وہ ان آنکھوں کو اس سے شادی کی وجہ کہہ رہا تھا جنہوں نے اس کے چہرے کو بے جوڑ اور عجیب بنا رکھا تھا۔ وہ اس کو سبب قرار دے رہا تھا جو اس کے لیے ایک بدنما داغ سا تھا۔ اسے ہمیشہ وہ الگ سا لگتا تھا مگر آج بے حد عجیب بھی لگا۔

''تم بھی عجیب بات کرتے ہو۔ بھلا ایسا کیا ہے میری آنکھوں میں کہ تم نے ان کی وجہ سے مجھ سے شادی کر لی۔''

اس نے ہنستے ہوئے پھول دوبارہ گلدان میں رکھ دیے۔

''تم نہیں جانتیں کتنے برسوں انتظار کیا ہے میں نے ایسی آنکھوں کا۔ گہری سیاہ تل کا نشان لیے آنکھوں کا۔'' وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بول رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے سر جھٹکا۔ وہ جتنا عجیب تھا اس سے بھی عجیب اس کی باتیں تھیں۔

☆☆☆

وہ اس کی شادی کا ساتواں روز تھا جب وہ معمول کے مطابق پھولوں کو پھر سے ترتیب دے رہی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ ایک پھول مرجھا رہا ہے۔ اس نے اس پھول کی پتیوں کو چھوا تو وہ اسے بے حد سخت اور اکڑی ہوئی محسوس ہوئیں۔ پھول کی چمک پہلے کی طرح تھی مگر اس کی نرمی غائب ہو چکی تھی۔ اسے بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ 'یہ پھول کیسے مرجھا سکتا ہے؟' اس نے بے اختیار سوچا۔

اتنے دنوں تک ان پھولوں سے جو قربت رہی تھی اس نے اسے ان کا عادی بنا دیا تھا۔ اس نے اتنے دنوں میں ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ مرجھا بھی سکتے ہیں۔ اب ایک پھول کو مرجھاتا دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کا کوئی عضو اس سے الگ ہو رہا ہو۔

پتا نہیں پھول کو مرجھاتے دیکھنے کا صدمہ تھا یا صبح ناشتا نہ کرنے کی کمزوری کہ اسے ایکدم چکر آیا اور اگلے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

☆☆☆

[illegible] آنکھ کھلتے ہی افق [illegible] اس کے کان میں پڑا۔

''مجھے کیا ہوا تھا؟'' اس نے اٹھنے کی کوشش مگر شدید کمزوری کا احساس ہوا۔ وہ واپس لیٹ گئی۔

''کچھ نہیں بی پی لو ہونے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اب کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

''اب بھی کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔'' اس کی آواز پر نقاہت غالب تھی۔

''تم آرام کرو، میں کھانا بھجواتا ہوں۔ کچھ کھاؤ گی تو کمزوری دور ہو جائے گی۔''

وہ نرمی سے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

جھٹکا بہت زور کا تھا۔ کئی منٹ تک تو وہ سمجھ ہی نہ پائی کہ ہوا کیا ہے۔ اور جب سمجھ آیا تو حواس بالکل جامد ہو گئے۔

سارا دن آرام کے بعد شام میں اس نے جیسے ہی بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو اس پر ہولناک انکشاف ہوا کہ اس کے دونوں پیر بالکل مفلوج ہیں۔ انہیں ہلانا تو دور، وہ ان کو چھونے پر بھی ان کے ہونے کو محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔

[illegible] تو وہ کوئی ردعمل ہی نہ دے سکی اور جب دیا تو وہ [illegible] چیخوں [illegible] مشتمل تھا۔ اس کی چیخوں سے چند منٹ میں ہی گھر کے تینوں ملازم اس کے کمرے میں موجود تھے۔

''کیا ہوا! بیگم صاحبہ؟'' ملازمہ نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''افق...... افق کو بلاؤ۔'' چیخیں تھمیں تو آنسو رواں ہو گئے۔

''صاحب جی تو گھر پر نہیں ہیں۔''

''کہاں ہے وہ اس کو بلاؤ پلیز۔'' اب کی بار رونے میں لجاجت بھی شامل تھی۔

کسی ایک ملازم نے شاید فون کر دیا تھا کہ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد افق اس کے سامنے تھا۔

''افق! میرے پیر...... یہ ہل نہیں رہے۔ یہ مجھے محسوس ہی نہیں ہو رہے ہیں۔'' وہ روتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔

افق نے اسے تسلی دی اور ڈاکٹر کو فون کرنے لگا۔

☆☆☆

حفظِ مراتب

ادب آداب، تکلفات اور حفظِ مراتب کے ذکر میں پولیس کا نام آنے پر قارئین ضرور چونکے ہوں گے لیکن یہ حقیقت ہے اور ہم اس میں رتی بھر مبالغے سے کام نہیں لے رہے۔ اس کے ثبوت میں ہم وہ چند اہم اعلانات یہاں درج کرتے ہیں جو ٹریفک پولیس والے ان دنوں شارع قائداعظم پر لاؤڈ اسپیکر سے نشر کرنے میں مشغول رہتے ہیں، اس سے پتا چلے گا کہ چھوٹے بڑے کا لحاظ آج اگر کسی میں ہے تو وہ صرف پولیس میں ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔ نیلی ٹویوٹا والے صاحب، زحمت تو ہوگی مگر براہِ کرم اپنی گاڑی زیبرا کراسنگ سے ذرا پیچھے لے جائیں، اس سے ٹریفک میں دشواری پیش آرہی ہے۔ بہت نوازش، شکریہ...... ویسپا والے صاحب۔ دائیں طرف مڑنے کی کوشش نہ کریں پہلے مین روڈ کا ٹریفک گزرنے دیں، اتنی بے صبری کی ضرورت نہیں، شکریہ۔ اوئے سائیکل والے اندھا ہو گیا ہے؟ دیکھتا نہیں اشارہ بند ہے، یہ سڑک تیرے باپ کی نہیں ہے۔ دفع ہو جا۔ شکریہ۔

عطاالحق قاسمی کی کتاب ''روزنِ دیوار'' سے اقتباس

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

"بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی پاؤں کے مفلوج ہونے کی۔ ٹیسٹ سب کلیئر ہیں۔ پاؤں کی طرف خون کی گردش بھی بالکل نارمل ہے۔ مگر پھر بھی آپ کسی اسپیشلسٹ سے چیک کروا لیں شاید مزید تشخیص ہو سکے۔" ڈاکٹر سلمان نے افق کو اس کی کنڈیشن بتاتے ہوئے مشورہ دیا۔ افق نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک چھوڑ کئی اسپیشلسٹ سے رجوع کیا مگر کوئی بھی نہ صحیح وجہ بتا سکا نہ ہی علاج کر سکا۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد سارہ پر انکشاف ہوا کہ اس کا ٹخنوں سے گھٹنوں تک کا حصہ بھی مفلوج ہو چکا ہے۔

☆☆☆

یہ اس کی شادی کے اکیسویں دن کی بات تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھی اور تقدیر کے کھیل کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ان اکیس دنوں میں اس کی زندگی میں بہت کچھ عجیب ہو چکا تھا بلکہ شاید یہ ان اکیس دنوں سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔

وہ دن جب افق نے اسے راہ چلتے پروپوز کیا تھا۔ اس کے ساتویں دن جب افق اس کے گھر آیا اور اس کے اگلے ہفتے جب وہ شادی کر کے افق کے گھر آ گئی۔

اور شادی کے سات دن بعد پاؤں کا مفلوج ہونا اور اب اکیسویں دن اس کی پوری ٹا[illegible]ں کا احساس ختم ہو جانا۔

سات دن...... اور ہر سات [illegible]ن سے جڑا کوئی [illegible] کیا اسرار تھا اس سات کے عدد کا؟

ہر گزرا سات اس کی زندگی میں کچھ انہونا کر رہا تھا اور وہ سات پھول...... یکایک دماغ میں کچھ کھٹکا۔ ہر شے سات پر گھوم رہی تھی۔ کیا بھید تھا اس سات میں؟

اس سات کے عدد نے پہلے اس کی زندگی کی کایا پلٹی اور پھر زندگی کو پلٹ کر رکھ دیا۔ اسے اس بارے میں افق سے بات کرنا تھی مگر اس سے پہلے اسے کچھ اور جاننا تھا۔

اس نے ملازمہ کو آواز دی اور اسے سامنے رکھے پھول پکڑانے کو کہا۔ جب سے و[illegible] مفلوج ہوئی تھی اس نے ان پھولوں کو نہیں چھوا تھا۔

افق کو اس کی ان پھولوں سے محبت کا علم تھا اس لیے اس نے وہ اس کے بیڈ روم میں رکھوا دیے تھے۔

اب وہ انہیں بس دور سے دیکھتی تھی مگر ہاتھ نہیں لگا پاتی تھی۔

ملازمہ نے جیسے ہی اسے پھول لا کر دیے، اس نے ایک ایک کر کے انہیں چھوا اور اس پر ایک اور بھید کھلا۔

☆☆☆

"یہ سب تمہارا وہم ہے سارہ۔ میں نے کئی ڈاکٹرز [illegible] بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تمہارا اعصابی نظام بہت کمز[ور] ہو چکا ہے جس کی وجہ سے جسم مفلوج ہو رہا ہے۔ مگر یہ [مستقل] نہیں ہے۔ جیسے ہی اعصابی کمزوری دور ہوگی سب پہلے [کی] طرح ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کی بات سن کر پہلے تو وہ اس کی بے تکی باتوں پر [illegible] پھر اسے سمجھانے لگا۔

"اگر یہ سب اعصابی کمزوری ہے تو سب کچھ [illegible] سات دن بعد کیوں ہو رہا ہے؟ تم ملے، اس کے سات دن [بعد] تم میرے گھر آئے۔ اس کے سات دن بعد ہماری شادی ہوئی۔ شادی کے سات دن بعد میرے جسم کا ایک حصہ مفلوج ہوا اور اب ہر سات دن بعد کوئی نہ کوئی حصہ مفلوج ہو رہا ہے۔ یہ سب کیا ہے افق؟ یہ کیا چکر ہے؟ کیا اسرار ہے؟ پلیز مجھے بتاؤ۔" اس کی آواز میں اب تیزی در آئی تھی۔

"یہ سب ایک اتفاق ہے اور کچھ نہیں اور تم توہم پرست ہو رہی ہو اس لیے تمہیں یہ اتفاق پراسرار لگ رہا ہے۔" وہ اب بھی اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ "مجھے تمہارا گھر ڈھونڈنے میں وقت لگا اس لیے سات دن بعد تمہارے گھر [آ] سکا۔ تمہارے چاچا چاچی کو شادی کے لیے منانے میں وقت لگا [illegible] وہ مان [illegible] میں بہت جلد تم [illegible] فوراً شادی کی اور اس سب میں ایک ہفتہ لگا۔ یہ سب ایک اتفاق [ہے۔] تمہاری اعصابی کمزوری ایک تسلسل کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اس لیے ہر ساتویں دن کوئی عضو مفلوج ہو رہا ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے سارہ۔ پلیز اس پر زیادہ مت سوچو۔"

وہ اب اس کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ ساتھ تسلی بھی دے رہا تھا۔

"مان لیا یہ اتفاق تھا مگر ایک ایک کر کے ان گلابوں کا مرجھانا۔ یہ سب کیا ہے؟ جس دن مجھ پر پہلا اٹیک ہوا پہلا گلاب مرجھایا تھا۔ اب تک تین اٹیک ہوئے ہیں۔ تین ہفتے گزرے ہیں اور تین گلاب مرجھا چکے ہیں۔ یہ سب اتفاق نہیں ہے افق۔ پلیز اس بات کو سمجھو۔"

"بات کو تم سمجھو سارہ۔ پھولوں کو ایک دن مرجھانا ہوتا ہے اس لیے وہ مرجھا رہے ہیں۔" اس نے رسانیت سے سمجھایا۔

"تو یہ ایک ساتھ کیوں نہیں مرجھا رہے؟ ایک ایک کر کے وہ بھی ٹھیک سات روز بعد ہی کیوں؟ یہ سب اتفاق نہیں ہے افق۔" اب کی بار اس کے لہجے میں بے بسی نمایاں تھی۔

"سارہ! میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ خاص قسم کے گلاب ہیں۔ بہت دیر سے مرجھاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کو توڑنے کا وقفہ سات دن کا رہا ہو اس لیے اسی دورانیے سے مرجھا رہے ہوں۔" اس کے پاس ہر بات کا جواب تھا اور یقیناً مدلل بھی مگر وہ پھر بھی مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی۔

کچھ تھا جو کھٹک رہا تھا...... بے چین کر رہا تھا مگر نہ وہ اس چیز کو سمجھ پا رہی تھی نہ ہی افق کو سمجھا پا رہی تھی۔ وہ قائل نہیں ہوئی تھی مگر اب اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے ہر سوال کا جواب افق کے پاس تھا اور یہ بات وہ جان گئی تھی۔

"تم نے مجھے سیاہ گلاب ہی کیوں دیے افق؟"

وہ کمرے سے نکل رہا تھا کہ اس کا سوال سن کر رک گیا اور اس کی طرف پلٹ کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"کیونکہ تمہاری آنکھیں سیاہ ہیں۔"

سارہ کو اس کی آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی۔

☆☆☆

یہ اس کی شادی کا چھٹا ہفتہ تھا۔

اس کا پورا جسم مفلوج تھا۔ وہ سن رہی تھی۔ دیکھ رہی تھی۔ سمجھ بھی رہی تھی مگر اب کچھ بھی بولنے سے قاصر تھی۔

ان گزرے دنوں میں اسے بہت سی چیزوں کا ادراک ہوا تھا اور بہت سی چیزیں اب تک مبہم تھیں مگر اس سے کیا فرق پڑ[illegible] اسے روکنے سے قاصر تھی اور جو [illegible] کا جال [illegible] چکی تھی [illegible]

ہر سات دن [illegible] اس کے جسم کے [illegible] الگ کر دیا تھا۔ سات کے عدد پر اس کے جتنے شکوک و شبہات تھے، وہ سب سچ نکلے تھے۔

وہ سات کے دائرے میں گھوم رہی تھی اور ہر چکر پر اسے کچھ دان کرنا تھا۔ اب بس آخری چکر کا انتظار تھا۔ وہ چکر جس کے بعد سب ختم ہو جاتا...... مگر صرف اس کے لیے۔

کیونکہ افق کو ابھی ایسے کئی چکروں کا سامنا کرنا تھا۔

☆☆☆

سات کے پھیر کے ساتویں ہفتے زندگی کی ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

بے جان جسم کے ساتھ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ گہری سیاہ آنکھیں جو اب تک زندہ تھیں۔ ان کی چمک پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔

کارنس پر رکھے گلدان کا ساتواں پھول بھی مرجھا چکا تھا مگر اس کی چمک ویسی ہی تابناک تھی۔ سیاہ اور بے حد چمکدار......

افق نے ایک نظر اس کے مردہ جسم پر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے قدم کمرے سے باہر کی جانب تھے۔

اس کی آخری رسومات اسے اکیلے ہی ادا کرنا تھیں۔

ملازمین کو وہ دو ہفتے پہلے ہی فارغ کر چکا تھا اور وہ جانتا تھا کہ سارہ کا اب اس کے علاوہ کوئی رشتے دار نہیں تھا۔

چند منٹ بعد وہ واپس کمرے میں آیا تو اس کے ہاتھ میں منقش لکڑی کی ایک صندوقچی تھی جس کے کنارے کسی بے حد چمکدار دھات سے مزین تھے۔ دھات کی چمک اس قدر تیز تھی کہ کمرے کی روشنی بھی ماند پڑنے لگی۔

اس نے صندوقچی میز پر رکھی اور گلدان میں سجے مرجھائے ہوئے پھول نکال لیے۔ اور انہیں لے کر واپس صندوقچی کی طرف پلٹ آیا۔

ایک ہاتھ سے اس نے صندوقچی کے ڈھکن کو اٹھایا اور پھولوں کو اس کے اوپر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے انہیں مسل ڈالا۔ پتیاں باریک آمیزے میں ڈھل گئیں۔ وہ آمیزہ اس نے احتیاط سے صندوقچی میں الٹ دیا اور وہاں سے اٹھ کر وہ سارہ کے پاس آیا۔

اس نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کو اس کی آنکھوں کے کنارے پر رکھ کر دبایا اور اگلے ہی پل مردہ جسم کی زندہ آنکھیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔

سار[ہ] کا آنکھوں سے محروم مردہ جسم بستر پر پڑا تھا اور وہ [illegible] آنکھیں اس صندوقچی میں رکھ چکا تھا۔

"[illegible]...... جانِ افق! دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔"

وہ صندوقچی کی جانب دیکھ کر بول رہا تھا جس میں سے اب ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔

"تمہاری سیاہ آنکھوں کی قسم۔ میں تمہیں پھر سے پالوں گا۔ ہمارے ملن میں اب بس تین چاند گرہن حائل ہیں۔ دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ہر گرہن پر میں نے تمہاری آنکھیں تمہیں لوٹائی ہیں۔ اب تمہیں بھی اپنا وعدہ پورا کرنا ہے۔ ساتویں گرہن پر تمہیں واپس آنا ہے۔ میرے پاس...... اپنے افق کے پاس۔"

وہ صندوقچی پر نظریں جمائے کسی سرگوشی کے سے انداز میں بول رہا تھا۔

☆☆☆

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

گہری سیاہ خوبصورت آنکھوں والی لڑکی حیرت سے اس خوبصورت شخص کو دیکھ رہی تھی جسے وہ جانتی تک نہیں تھی۔

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

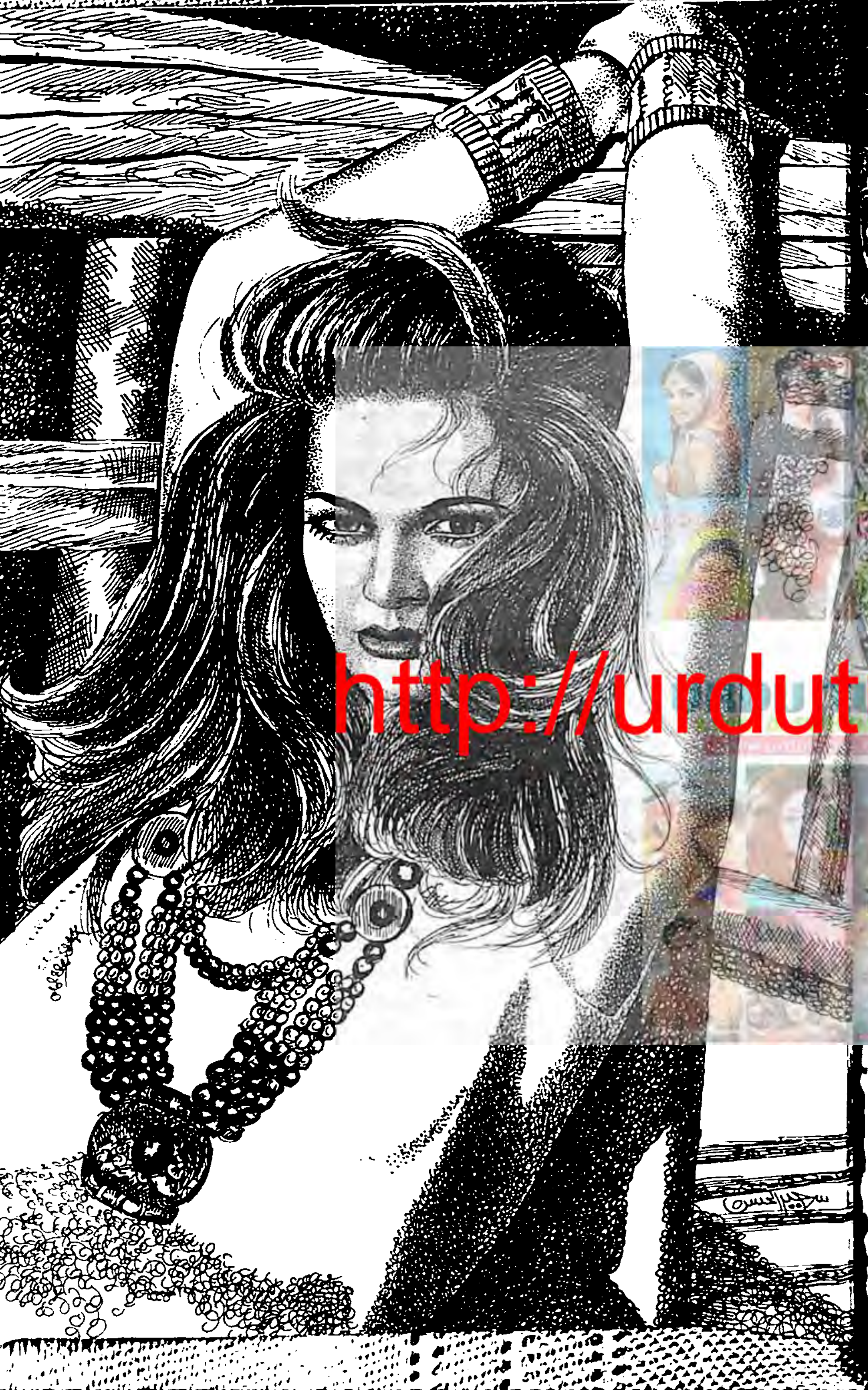

http://urdutubes.com/

اٹھارواں حصہ

رنگ آسماں

اے۔آر۔راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کران کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اتراکہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیالیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک وخون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق ومغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

Digitized by Google

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہِ شالیہ کے گھنے جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں میں ایک مختصر قافلہ محوِ سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جستجو اسے لندن سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ اس قافلے میں اس کی جوان اور حسین بیٹی رینا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً تجسس پسند اور مہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اوباش بھتیجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیا بھی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، ادھیڑ عمر خانساماں میاں بیوی نندو اور شانتا کے علاوہ ایک کڑیل نوجوان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔ یہ جرنل مائیکل شا کے سائیس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت عرف شوکی، رینا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً گھمنڈی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عناد ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ روا رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم جوئی کے دوران ایک پراسرار بستی کا کھوج لگاتا ہے۔ کوہِ شالیہ کی تین خودمختار ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور انہی سازشوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جری جانباز گوریلوں کا گروپ اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی ریحان ہے جو فوجِ آزادی کے سپہ سالار جنرل قمیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی ماہر کہا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذاتِ خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروپ ''کاروانِ مجاہد'' کہلاتا ہے۔ باقی دو ساتھی شرجیل اور قیصر شاہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شبہ تھا کہ منتشر مسلم باغی گروہ کوہِ شالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو یکجا کر سکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا ''سلسلۂ تسلط'' کوہِ شالیہ کی ان تینوں قابلِ ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔ لہٰذا مکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیلتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست [illegible] گرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف بہ ظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور پھر مشترکہ طور پر باقی دو ریاستوں تریپال اور پالن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جا سکے۔ تریپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالن پور میں مہاراجا مہندر سنگھ گدی نشین ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی نجو بائی اپنے بیٹے ایش کمار کو ولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی نجو بائی کی ایک جواں سال خوبصورت بیٹی سوجنا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار [illegible] مہا پجاری بدری ناتھ کے ساتھ [illegible] ہے جو سوائے اس کے اور اس کے [illegible] اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے پجاریوں کے ذریعے ہنری برنارڈ کو قتل کرا دیتا ہے۔ مہارانی نجو بائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملوا دیتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتا پی لیتا ہے اور پرتاب کمار کے بجائے وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی تحقیقات کرواتا ہے۔ شک نجو بائی پر ہوتا ہے تاہم پرتاب نجو بائی کو سزا نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر علی تریپال پہنچتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے تاہم اسے [illegible] بارے میں بتانے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر [illegible] پھر اسے نواب کے بھائی سراج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم وہ نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سراج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں کچھ لٹیرے پولیس کی گاڑی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکلتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر اریبہ کے ہاتھوں فرنگی افسر بروجر کا قتل ہو جاتا ہے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شوکی اینڈ کمپنی کے خیموں میں آگ لگ جاتی ہے اور امجد خان، نندو بابا اور شانتا جل کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار بستی کے عجیب و غریب لوگ لگاتے ہیں تاہم رینا انہیں رام کر لیتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی بلی چڑھا دیتا ہے۔ ماریا کا خنجر ایک لڑکی بالی کے پاس ہوتا ہے جو بدری ناتھ کے [illegible] چڑھ جاتا ہے۔ پرس رام اسے سمجھاتا ہے کہ وہ خنجر ان کے لیے مصیبت بن سکتا ہے مگر وہ اس کی بات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ راجا پرتاب کمار اریبہ کو بری کر دیتا ہے جس کے باعث وہ انگریزوں سے دشمنی پال لیتا ہے۔ ادھر بھچورام ماریا کے باپ کرنل اینڈرسن کو خبر دیتا ہے کہ اس کی بیٹی کے غیاب میں مندر کے پجاریوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ پھر بھچورام کرنل کو حتمی خبر دیتا ہے کہ ماریا کے غیاب میں مندر والوں کا ہاتھ ہے۔ انگریز کوہِ شالیہ پر چڑھائی کی منظوری دے دیتے ہیں۔ ادھر بدری ناتھ اپنے چیلوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس گوری حسینہ رینا کو اغوا کر لیں۔ دو پجاری رینا کو اغوا کر کے مندر لے آتے ہیں۔ اریبہ اور شاہ زمان سی ہاک نامی جہاز کو تباہ کرنے کے مشن پر روانہ ہوتے ہیں تاہم وہ دھر لیے جاتے ہیں۔ ادھر شوکی رینا کی تلاش میں کالی کے مندر جا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پجاری گھیر لیتے ہیں۔ انگریز وہاں حملہ کر دیتے ہیں۔ شوکی کا مقابلہ بدری ناتھ سے ہوتا ہے۔ شوکی کی مدد ایک نادیدہ قوت کرتی ہے جس کے نتیجے میں کالی کا مندر تباہ ہو جاتا ہے اور شوکی ملبے تلے دب جاتا ہے۔ ادھر شاہ زمان آزاد ہو کر اریبہ کو چھڑانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ شاہ زمان فرنگیوں کے کیمپ تک پہنچ جاتا ہے اور اریبہ کو وہاں سے رہا کروا لیتا ہے۔ ادھر رابرٹ اپنی بہن گارشیا کا گلا دبا کر سوجنا کو راج محل سے بھگا لے جاتا ہے۔ تاہم گارشیا بچ جاتی ہے۔ اس پر قاتلانہ حملے کی وجہ سے راج محل میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ شوکی کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک غار میں ہوتا ہے۔ شوکی کے سامنے ایک حسین و جمیل عورت ہوتی ہے جسے دیکھ کر وہ مبہوت ہو جاتا ہے۔ اس کا نام سدھا ہوتا ہے، وہ اس سے مدد کی درخواست کرتی ہے اور اپنی داستان سناتی ہے۔ ادھر شاہ زمان اور اریبہ سی ہاک پر پہنچ جاتے ہیں، رینالڈ بھی وہاں پہنچتا ہے اور کیپٹن جیمس اور شاہ زمان کو زخمی کر دیتا ہے۔ رابرٹ سوجنا کو لے کر بذریعہ جہاز انگلستان کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ ادھر زمان زخمی حالت میں رینالڈ سے مقابلہ کرتا ہے تاہم رینالڈ اریبہ کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ سی ہاک وہاں سے روانہ ہو جاتا ہے۔ راج محل میں نجو بائی بھچورام اور گارشیا کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے کیونکہ راجا کی موت کے بعد وہاں اس کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ ادھر راجا کی طرف سے بھیجے جانے والے چیتن شرما کو جہاز میں سوجنا نظر آ جاتی ہے، وہ راجکماری کو پہچان لیتا ہے۔ سوجنا گھبرا جاتی ہے۔ رینا راکاشی بستی سے نکل شکمیر گھاٹی پر آ جاتی ہے۔ وہاں ایک انجانی قوت اسے اپنے زیرِ اثر کر کے بپتا ٹائز کر لیتی ہے۔ ادھر علی اور شاہ زمان وغیرہ ہاؤس بوٹ میں سی ہاک کے تعاقب میں چل پڑتے ہیں، راستے میں ان کا سامنا بحری قزاقوں سے ہو جاتا ہے جو سب کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ علی اور شاہ زمان دو ڈاکوؤں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں اسی دوران طوفان کے باعث ان کی بوٹ پر ہلچل مچ جاتی ہے۔ ادھر وائٹ فالکن بھی طوفان کی زد میں آ جاتا ہے اور اس کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ کیرتن اور شوبھا اس طوفان میں موت کا شکار بن جاتے ہیں۔ شوکی رینا کو کھوجتا ہوا شکمیر گھاٹی پہنچتا ہے۔ بدری ناتھ رینا کو اپنے شیطانی عمل سے قابو کرنا چاہتا ہے تاہم شوکی اسے بچا لیتا ہے۔ وہ دونوں کوہِ شالیہ سے روانہ ہو کر دلی پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر ہاؤس بوٹ پر شاہ زمان اینڈ کمپنی بحری قذاقوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ وہ سب ایک جزیرے پر پہنچ جاتے ہیں اور ڈاکوؤں کو اپنی بوٹ سے اتار دیتے ہیں۔ علی ریحان کو وہاں سی ہاک نظر آ جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

صبح دم کی روشنی میں علی ریحان اور شاہ زمان پھیلی ہوئی آنکھوں سے ایک طرف کو جھکے ہوئے جہاز کو تکے جا رہے تھے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو خود کو ''منزل'' سے بھٹکا ہوا سمجھے ہوئے تھے، اب وہ ان کے بالکل قریب، گویا ان کی آنکھوں کے سامنے تھی لیکن تب ہی انہیں اپنی قسمت پر ہی نہیں بلکہ ان قذاقوں کی خوش [illegible] بھی [illegible] تھا، کیونکہ وہ بھی انہی کے ساتھ اس [illegible] چکے تھے۔

یہ لوگ اسی وقت واپس اپنی لانچ پر لوٹ آئے اور اریبہ اور کیپٹن جیمس وغیرہ کو یہ حیرت انگیز حقیقت بتائی تو وہ بھی حیرانی کا شکار ہو گئے۔

''لیکن ہمیں اب یہاں بیک وقت دو محاذوں سے برسرِ پیکار ہونا پڑے گا۔'' علی ریحان سنجیدگی سے بولا۔ ''کیونکہ وہ بدخصلت ڈاکو بھی اسی جزیرے پر موجود ہیں۔''

''برادر علی! آٹوما اور چری اپا ہمارا بھلا کیا بگاڑ سکتے ہیں، ہمیں ان کی فکر کرنے کے بجائے اپنی پوری توجہ سی ہاک پر قبضہ جمانے پر مرکوز کرنی چاہیے۔'' شاہ زمان نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ اپنے عظیم مشن کو سامنے پا کر اس کے اندر فوراً ایک جوش کی سی کیفیت عود کر آئی تھی۔

''زمان! علی بھائی صحیح کہہ رہے ہیں۔'' اریبہ نے علی کی تائید میں کہا۔ ''سی ہاک پر قبضہ کرنے کا مشن اپنی جگہ اہم ہے لیکن آٹوما اور چری اپا کے ساتھ ہمیں ان دونوں ساتھی عورتوں امپارا اور بابیلا کو بھی نہیں بھلانا چاہیے۔ وہ بھی کم نہیں ہیں۔ یہ ہمارے لیے مشکل کھڑی کر سکتے ہیں۔''

''باوجود اس کے میں یہی کہوں گا کہ ہمیں اپنی توجہ سی ہاک پر ہی مرکوز رکھنا چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے ہم بحری قذاقوں کے اس ٹولے سے بھی بے خبر ہو کر نہیں بیٹھے رہیں گے۔'' زمان نے بدستور اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ چاروں اگر ہماری راہ میں آئے تو اب انہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''میں مسٹر زمان کی بات کی تائید کروں گا۔'' اچانک کیپٹن جیمس نے کہا۔ بالآخر وہ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ سی ہاک پر کیسے قبضہ کیا جائے؟ لیکن ساتھ ہی انہیں آٹوما اور چری اپا کی جانب سے بھی یہی خدشہ تھا کہ ان کی نظروں سے بھی یقیناً سی ہاک چھپا نہ رہا ہوگا، کیونکہ یہ ان دونوں پارٹیوں کا مشترکہ ''مطلوبہ'' جہاز تھا۔ یوں یہ عین اسی طرح وہ بھی انہی کی طرح جزیرے کے کسی گمنام گوشے میں چھپے بیٹھے یہی منصوبہ بنا رہے ہوں گے کہ کس طرح اس جہاز کو شکار کیا جائے۔

''ایک بات تو طے شدہ ہے۔'' اچانک اریبہ نے کہا۔ اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ دور کی کوڑی لائی ہو اور یہ ایک حقیقت بھی تھی۔ اسی جوش تلے وہ آگے بولی۔

''یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ جہاز کو واپس ہندوستان لے جانا ہے۔ کیونکہ اس میں چوری کا خزانہ موجود ہے، جبکہ آٹوما اور چری اپا وغیرہ کے علم میں یہ بات

http://urdutubes.com/

نہیں کہ اس جہاز میں خزانہ موجود ہے۔ یوں ان کا مقصد صرف جہاز کے سواروں (کپتان اور عملہ وغیرہ) سے اپنے ساتھیوں کی موت کا انتقام لینا ہے۔ اگر ہم بجائے خود پیش قدمی کرنے کے پہلے آرام سے ان کی لڑائی کا انجام تک تماشا دیکھیں کہ کون بچتا ہے اور کون رہتا ہے تو بعد میں ہمارا کام مزید آسان ہو جائے گا۔''

اریبہ کی اس بات پر وہ سب مسکرا اٹھے۔ اگرچہ انہیں اریبہ کی بات پر صاد بھی تھا، تاہم علی بولا۔

''اریبہ بہن! تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اس انتظار میں اور ان کا کھیل دیکھنے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا دانش مندی نہیں ہوگی۔ کیا خبر جلد یا بہ دیر جہاز میں موجود خزانے کا انہیں علم ہو جائے۔''

''باتیں دونوں ہی اپنی جگہ درست ہیں۔'' شاہ زمان نے کہا۔ ''ڈاکوؤں سے ابھی ہمارا بہ ظاہر کوئی تنازعہ نہیں رہا۔ ہمارا ٹارگٹ صرف سی ہاک پر اپنا تسلط قائم کرنا ہے۔ وہ ہم کریں گے۔''

''رائٹ۔'' کیپٹن جیمس نے بھی لب کشائی کی۔ ''ہم اپنے ٹارگٹ پر جم کر نگاہ رکھیں گے اور اس کے لیے ہمیں فی الحال کسی دھواں دھار ایکشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے ہم گوریلا کارروائی (کمانڈو ایکشن) کریں گے۔''

بالآخر اسی لائحہ عمل پر صاد کیا گیا اور اس کے لیے انہوں نے یہی ضروری اور بہتر سمجھا کہ اپنی بوٹ کو سمندر اور جزیرے کے اسی قریبی ساحلی مقام پر لنگر انداز رہنے دیا جائے، کیونکہ سردست یہ نگاہوں سے اوجھل تھا۔

لہٰذا یہ موٹر بوٹ ایک طرح سے ان کا ''بیس کیمپ'' بن گئی۔ البتہ جزیرے پر جا کر ایک عارضی ٹھکانا بنانا ضروری تھا۔ خوراک کا بھی مسئلہ جزیرے کے اسی عارضی ٹھکانے سے حل کیا جا سکتا تھا کیونکہ ان کی ہاؤس بوٹ میں خوراک کے نام پر ایک دانہ اور پانی کا ایک قطرہ تک ناپید ہو چکا تھا۔

اب دھیرے دھیرے دن کی روشنی میں سمندر کا ساحلی پانی چمکنے لگا تھا۔ آسمان صاف تھا اور صبح کا سورج اپنی کرنیں بکھیرنے لگا تھا۔ دور سے نظر آنے والے جزیرے کے جنگل پر انواع و اقسام کے پرندے دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ دیر پہلے صبح کاذب سے ساحلی پانیوں پر جو دھند اور دھوئیں کی کیفیت تھی وہ بتدریج مفقود ہونے لگی تھی۔

پروگرام یہی طے پایا تھا کہ خواتین ابھی موٹر بوٹ پر ہی موجود رہیں گی اور کیپٹن جیمس ان کے ساتھ ہوں گے، جبکہ علی اور زمان عارضی ٹھکانے کی تلاش اور خوراک کا مسئلہ حل کریں گے۔ اس لیے کہ ابھی اس بات کی تصدیق نہیں ہوئی تھی کہ آخر اس گمنام جزیرے میں آبادی تھی بھی یا نہیں۔

البتہ اس سلسلے میں کیپٹن جیمس نے اپنے تجربے کی بنا پر اتنا ضرور کہا تھا کہ، چونکہ یہ جزیرہ، جزائر مڈغاسکر کے اریب قریب کا ہے تو یقیناً اس جزیرے میں آبادی کے آثار مل سکتے تھے۔ نیز یہ جزیرہ بے آب و گیاہ نہیں ہو سکتا۔

بہرکیف...... علی اور زمان نے ڈاکوؤں سے چھینی ہوئی تلواریں سنبھالیں اور ایک بار پھر پانی میں اتر گئے اور جزیرے کے ریتیلے ساحل کا رخ کیا۔ جلد ہی وہ دونوں جنگل میں تھے۔ نباتاتی بو ان کے نتھنوں سے ٹکرائی، رنگ برنگے پھول اور سرسبز جنگلی بیلیں اور انواع و اقسام کے پھلوں سے درخت لدے ہوئے نظر آ رہے تھے، ان کی خوشبوؤں سے جنگل کی فضا معطر ہو رہی تھی۔ جلد ہی عقدہ کھلا کہ وہ ایک قدرتی جھیل تھی، یہ شاید کوئی بارانی جزیرہ تھا، جہاں اکثر بارشوں کا زور رہتا تھا۔ علی اور زمان کو یہ جھیل بڑی بھلی محسوس ہوئی۔ وہ محتاط روی اور اطراف میں نظریں ڈالتے ہوئے اس کی جانب بڑھے، تو انہیں جھیل کا پانی اس قدر شفاف معلوم ہوا کہ اس کے کناروں پر مختلف النوع اور رنگ برنگی مچھلیاں تیرتی ہوئی دکھائی دیں۔ باقی درمیان میں پانی کا [illegible] جز نظر آتا تھا، اس [illegible] با[illegible] تھا۔

جھیل کے کنارے انہیں سفید پروں والے بی ایگل اور بگلے بھی دکھائی دیے۔

جزیرہ بڑا ہی دلفریب تھا۔ علی اور زمان کو پورا یقین تھا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ اس قدر خوب صورت جزیرے میں انسان نہ آباد ہوں۔

انہوں نے جھک کر پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کی ''اوک'' بنا کر تھوڑا پانی لے کر ایک گھونٹ بھرا۔ چکھنے پر معلوم ہوا کہ پانی واقعی صاف اور شفاف ہے۔

ہاؤس بوٹ سے روانگی کے وقت انہوں نے فوری طور پر اپنے ساتھیوں کے لیے خوراک لے جانے کے لیے چھاگلیں اٹھالی تھیں۔ انہوں نے خود بھی جی بھر کے پانی پیا اور ان میں بھی بہت سا پانی بھرا۔

عارضی ٹھکانے کے لیے انہیں یہ مقام بہتر محسوس ہوا۔ یہاں کئی ایک ایسے جڑواں اور موٹے تنوں والے درخت بھی تھے، جن کے درمیان میں خیمہ گاڑ کر ٹھہرا جا سکتا تھا۔ یوں جو گوشہ اس قدرتی جھیل کے کنارے انہوں نے منتخب کیا

تھا، وہ ہر لحاظ سے محفوظ سمجھا جا سکتا تھا اور اس طرف جھاڑیوں کے جھنڈ کی بہتات سے وہ کافی حد تک چھپے بھی رہ سکتے تھے۔

انہوں نے پھل وغیرہ بھی توڑے اور انہیں ایک تھیلے میں بھر کر دوبارہ بوٹ پر پہنچے اور ساتھیوں کو خوش خبری سنائی کہ جزیرے میں عارضی ٹھکانے کی جگہ ڈھونڈ لی گئی ہے۔

سب سے پہلے تو اریبہ، ازابیلا اور کیپٹن نے پانی پیا اور پھل کھائے۔ اس کے بعد بوٹ سے کچھ ضروری سامان سمیٹا اور پھر یہ پانچوں بوٹ سے ساحلی پانیوں میں اترے اور جزیرے کی سمت روانہ ہو گئے۔

عارضی ٹھکانے پر پہنچ کر ہی وہ اگلا لائحہ عمل تیار کر سکتے تھے لیکن سب سے پہلے انہوں نے جھیل سے مچھلی اور کوئی چھوٹا موٹا جانور شکار کرنے کا پروگرام بنایا۔

جب تک یہ سارے امور نمٹائے گئے سہ پہر ہو گئی۔ علی اور زمان نے دو جنگلی خرگوش جبکہ کیپٹن جیمس نے جھیل کنارے چند مچھلیاں شکار کر لیں۔ تب تک اریبہ اور ازابیلا نے اریب قریب سے خشک جھاڑیاں اکٹھی کر لی تھیں، ان میں درختوں سے توڑی ہوئی سوکھی چھالیں بھی تھیں۔ اس کے بعد موٹی شاخیں زمین میں گاڑ کر ان کی قینچی بنائی گئی اور گوشت بھوننے کا عمل شروع کیا گیا۔

یہ سب لوگ الاؤ کے گرد بیٹھ چکے تھے۔ گوشت اور مچھلی بھوننے [illegible] جزیرے [illegible] آسمان پر [illegible] شام [illegible] نارنجی [illegible] ابھر آئی تھیں۔ دن بھر کی گردش کرتی فضا جیسے تھمنے کو تھی۔ ایک سکون، ایک ذرا افسردگی کا سا ماحول طاری ہونے لگا تھا ہر سو۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو مچلتی شام نے جیسے اسرار بھری سی بے آواز سرسراہٹ کے ساتھ اپنا آنچل سمیٹ لیا۔ آسمان تاریک ہونے لگا۔ چاند دور کہیں ساحلوں کی طرف جھکا ہوا تھا۔

یہ سب خیمے میں آ گئے۔ الاؤ دھیما کر دیا گیا تھا۔ طے پایا کہ علی اور زمان رات کی تاریکی میں سی ہاک کی طرف جا کر وہاں کی سرگرمیوں اور جائزے وغیرہ کے علاوہ ان کی تعداد اور طاقت جانچنے کی کوشش کریں گے اور ممکنہ حد تک پہلے ان کا اسلحہ چوری کیا جائے گا، تاکہ اگر نوبت جنگ یا لڑائی کی پیش آئے تو جم کر ان کا مقابلہ کیا جائے۔

اریبہ ان کے ساتھ جانے کے لیے بے تاب تھی، مگر زمان اور علی نے اسے سمجھایا کہ اگرچہ کیپٹن جیمس یہاں موجود رہے گا مگر اخلاقاً یہ مناسب نہیں لگتا کہ ان دونوں میاں بیوی کو اکیلا چھوڑا جائے، اریبہ کی بات اور تھی، اسی لیے اسے انہی کے پاس ٹھہرنا چاہیے۔ تاہم کیپٹن جیمس نے کہا۔

''اریبہ ایک بہادر اور جنگجو خاتون ہے۔ میرا خیال ہے، اریبہ ہی ازابیلا کی حفاظت کے لیے کافی ہے۔ رکنا مجھے بھی یہاں نہیں چاہیے۔ سی ہاک کا مشن زیادہ اہم ہے اور صرف تم دونوں کا وہاں جانا مناسب نہیں۔'' یوں کیپٹن جیمس بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

یہ تینوں رات کی تاریکی میں خیمے سے نکلے اور اسی طرف کو ہو لیے جدھر شمالی سمت کے ساحل کے قریب اتھلے پانیوں میں مونگے کی چٹانوں کے قریب سی ہاک پھنسا ہوا تھا۔

ان کے پاس ڈاکوؤں کی چھینی ہوئی چار پڑ نما تلواریں تھیں مگر صرف دو جو علی اور زمان نے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں، جبکہ جیمس کے پاس اپنا ایک خنجر تھا۔

راہ میں گھنی جھاڑیاں، لمبے چوڑے پتوں والے کوتاہ قامت درخت اور گھنی...... گھاس سے گزرتے ہوئے یہ تینوں نسبتاً ایک کھلی جگہ پر آ گئے۔

یہاں مختصر سا گھاس کا ایک مسطح قطعہ تھا۔ اس کے پار چھدری چھدری سی جھاڑیاں تھیں۔ وہ تینوں محتاط روی کے ساتھ اور گرد و پیش میں نگاہ ڈالتے ہوئے اسی طرف کو بڑھے اور اس کے بعد جب یہ سلسلہ بھی پار ہوا تو مرطوب ہواؤں [illegible] اور سمندری لہروں کے سرسراتے شور نے ان کا استقبال کیا۔ وہ مطلوبہ ساحلی رخ کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ [illegible]جھاڑیوں کی اوٹ سے انہوں نے سامنے دیکھا۔ جزیرے کی جنوب مشرقی سمت سے پھیلا ہوا مختصر چٹانی سلسلہ یہاں سے ساحل کے ساتھ ساتھ سمندر کے اندر کافی دور تک چلا گیا تھا اور وہاں سے خاصا کائی زدہ ہو رہا تھا۔ اسی کے درمیان میں کھاڑیاں بنی ہوئی تھیں اور وہیں سی ہاک پھنسا ہوا تھا، بلکہ ایک جانب سے خاصا جھک بھی گیا تھا۔ لیکن آج قریب سے صحیح معنوں میں اس کا حشر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کس قدر برباد اور بے کار ہو رہا تھا۔ وہاں کچھ روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔ چند انسانی ہیولے بھی متحرک دکھائی دیے تھے۔

''اوہ...... اس کی حالت تو بے حد خستہ اور خراب ہو رہی ہے۔'' اچانک زمان نے سرگوشی میں کہا۔

''ایسا ڈاکوؤں اور طوفان کا مقابلہ کرنے کے سبب ہوا ہوگا۔'' علی نے بھی تبصرہ کیا۔

''یقیناً۔'' کیپٹن جیمس نے بھی ہولے سے کہا۔ ''اور میرا نہیں خیال کہ یہ قابلِ مرمت بھی رہا ہوگا، ایسے میں پھر کس

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

طرح جہاز کو اس کے عظیم خزانے سمیت ہندوستان پہنچایا جاسکے گا؟" کیپٹن جیمس کی بات علی اور زمان دونوں کے لیے قابلِ غور تھی لیکن پھر علی نے تھوڑا غور کرنے کے بعد کہا۔

"پہلے جہاز اور خزانے پر اپنا تسلط قائم کرلیا جائے اس کے بعد ہی سوچا جاسکتا ہے کہ خزانے کو کس طرح یہاں سے پار لگایا جائے۔"

"میرا خیال ہے، اس کام کے لیے ہماری موٹر بوٹ بھی کم نہیں ہے۔" زمان بولا۔ "جیمس کا خیال صحیح ہے برادر علی! ہمیں خزانے اور جہاز تک رسائی کو کامیاب بنانا ہے۔"

"اس جہاز میں کتنے افراد کا عملہ ہوسکتا ہے؟ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کیپٹن جیمس؟" علی نے کہا۔

"کم از کم دس سے پندرہ......" جیمس نے جواب میں کہا۔ "اس کے علاوہ چند ایک اہم شخصیات بھی اس میں موجود رہتی ہیں۔ میرے خیال میں ان کی تعداد تین، چار سے زیادہ نہیں ہوگی، جن میں سے کچھ کا تعلق برٹش آرمی اور چند ایک بکنگھم پیلس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوں ہندوستان کا یہ بیش قیمت اور نادر و نایاب مگر چوری شدہ خزانہ انہی مذکورہ شخصیات کی زیرِ نگرانی افریقا کے ساحلی راستوں سے انگلستان (لندن) پہنچایا جارہا ہے۔"

"ہوں......" زمان کے منہ سے [illegible] برآمد ہوا۔ کسی خیال کے تحت اس نے جیمس سے ایک سوال کرنا ضروری [illegible] بولا۔

"ان مذکورہ برٹش آرمی اور بکنگھم پیلس سے تعلق رکھنے والی شخصیات کی موجودگی میں کیا تمہارا ہمارے ساتھ یہ مشن انجام دینا مناسب ہوگا؟"

علی ریحان بھی زمان کی طرح جیمس کے چہرے کی جانب تکنے لگا۔ یہ سوال جیمس کے لیے اہم تھا۔ وہ ہولے سے مسکرایا اور بولا۔

"میں تمہارے سوال کا مطلب سمجھ رہا ہوں جنٹلمین! بٹ ڈونٹ وری اباؤٹ اٹ...... جو چیز غلط ہے وہ غلط ہے۔ میں بغیر کسی جانب داری کے اس مشن میں ساتھ رہوں گا۔ جب تک کہ چوری کا یہ خزانہ بہ طور امانت، واپس ہندوستان نہیں پہنچا دیا جاتا۔"

"سوچ لو، اگر ان میں سے کوئی زندہ بچ گیا اور اس نے تمہاری شکایت کردی تو تمہیں برٹش سرکار سخت سزا بھی دے سکتی ہے۔" علی بولا۔

"مجھے اس کی پروا نہیں، ویسے میں دفاع کرنے کی طاقت رکھتا ہوں کیونکہ یہ ایک گریٹ روبری...... کے زمرے میں آتی ہے اور جو انگلستان کے لیے ایک بدنما داغ کے سوا کچھ نہیں، میں خود ملکۂ عالیہ اور بکنگھم پیلس تک یہ بات پہنچا سکتا ہوں۔"

جیمس نے بے پروا انداز میں کہا اور علی اور زمان اس کی وضع داری پر اش اش کر اٹھے۔ دونوں نے ایک دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ زمان نے تو ہولے سے کہہ بھی دیا۔

"اصلی نر کا بچہ ہے یہ انگریز......" علی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا پھر ذرا دیر بعد یہ لوگ جہاز کی جانب فیصلہ کن پیش قدمی کر چکے تھے۔

☆☆☆

علی ریحان، شاہ زمان اور کیپٹن جیمس کے ساحل کی جانب روانہ ہونے کے بعد اریبہ اور ازابیلا...... خیمے کے اندر محدود ہوگئی تھیں۔ خیمے کے باہر الاؤ دھیرے دھیرے ماند پڑنے لگا تھا۔ رات بتدریج گہری ہوتی جارہی تھی۔ ہر سو دل دھڑکا دینے والا سکوت طاری ہوچکا تھا۔

ازابیلا ان حالات سے مخدوش دکھائی دیتی تھی لیکن اریبہ کا معاملہ اور تھا۔ برعکس اس کے وہ خاصی پُرجوش سی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے مشن کے قریب تھے۔ پہلے وہ بھی ان حالات سے تھوڑا مایوس سی ہوگئی تھی، کیونکہ یہ [illegible] اور شاہ زمان [illegible] تھا [illegible] وہ دونوں اس [illegible] ایک جانب [illegible] بعد میں اس مشن میں علی ریحان اور کیپٹن جیمس بھی شریک ہوگئے تھے۔ تاہم اب وہ پُرامید تھی کہ ان کا یہ اہم اور نیک مقصد کامیابی سے ہمکنار ہوسکتا تھا۔

وہ ازابیلا کو تسلی بھی دیتی اور اس سے باتیں کرکے اس کا دل بھی بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اچانک ازابیلا چونکی۔

"تت...... تم نے ایک آواز سنی؟" اس نے ہراساں سے لہجے میں اریبہ سے کہا۔

"کیسی آواز؟" اریبہ نے قدرے چونک کر اس سے پوچھا۔

"خ خ...... ابھی ابھی خیمے کے باہر سے ایک آواز ابھری تھی جیسے...... خشک جھاڑیوں پر کوئی چل رہا ہو۔" ازابیلا نے بتایا۔ خیمے کے اندر آتی تاروں بھرے آسمان کی مدھم سی روشنی میں اس کا خوب صورت معصوم چہرہ خوف سے مرتعش دکھائی دیا۔

اریبہ یہی سمجھی تھی کہ یہ اس کا وہم ہے مگر جب اس نے بھی تھوڑا غور کیا تو وہ بھی چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ خیمے کے باہر قریب میں ہلکی سی سرسراہٹ ابھری تھی مگر وہ بالکل خوف زدہ نہیں تھی۔ تاہم ماحول اور غیر یقینی

حالات کے پیشِ نظر اس کا دل بھی اس گمنام جزیرے کے پُراسرار اثر سے تھوڑا بے چین ضرور تھا۔

"میرا خیال ہے کوئی چھوٹا موٹا جانور ہوگا۔ خیر، تم ادھر ہی ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں۔" اریبہ نے اس سے ازراہِ تشفی کہا اور خود اٹھ کر باہر جانے لگی تو ازابیلا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں، تم اکیلی مت جاؤ باہر، میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

اریبہ مسکرائی اور بولی۔ "فکر نہ کرو، میں خود دیکھ لیتی ہوں۔" مگر ازابیلا نہ مانی۔

دونوں خیمے سے باہر آگئیں اور ادھر ادھر خوف زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

چہار اطراف سناٹا طاری تھا۔ جزیرے کی یہ رات پورے جوبن پر اتری ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ دور کہیں جھکا ہوا چاند بھی اب قدرے بلند ہونے لگا تھا۔ اس کی طلسماتی روشنی میں جنگل، جھاڑیاں اور جھیل سب ہی نظر آرہے تھے۔ جھیل کی سطح چاندنی میں چمک رہی تھی۔ یہ بڑا دلفریب منظر تھا۔ اریبہ کا بے اختیار جی چاہا کہ جھیل کے کنارے چلی جائے۔

"دیکھ لو، یہاں کچھ نہیں ہے۔" اریبہ نے ایک گہری سانس لے کر ازابیلا کا خوف دور کرنے کی کوشش کی۔ "آؤ، [illegible] جھیل کے کنارے [illegible]، دیکھو تو کتنا حسین منظر ہے۔" [illegible] ازابیلا کا خوف [illegible] حد تک دور ہوگیا تھا۔ وہ بھی ہولے سے مسکرائی اور دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا اور جھیل کی طرف چل دیں۔

ابھی وہ چند قدم ہی چلی ہوں گی کہ اچانک...... ایک تیز چیخ سے جنگل کا سناٹا دور تک مجروح ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

سمندری طوفان کی زد میں آیا ہوا "سی ہاک" اپنی منزل سے بھٹک کر اس ویران اور گمنام جزیرے کے ساحل سے کچھ دور قدرے اتھلے پانیوں کے حصار میں پھنس چکا تھا۔ وہ اب ساحلی سمندر کے قریب ابھری ہوئی چٹانوں میں اٹک کر پھنس چکا تھا اور قدرے جھک بھی گیا تھا۔ اس طرف مونگے کی چٹانیں دور تک سمندر میں جاتی دکھائی دیتی تھیں۔

سی ہاک کا پچاس سالہ جھلسی ہوئی رنگت کا فرنگی کپتان گرے ہنٹ جس کے ذمے چوری کا یہ خزانہ انگلستان کے ساحل تک پہنچانا تھا، اس وقت سخت پریشان اور فکر مند نظر آتا تھا۔

گرے ہنٹ صورت سے ہی ایک بدقماش اور کرخت مزاج شخص نظر آتا تھا۔ جسم کسرتی اور قد درمیانہ تھا۔ اس کی رنگت کبھی سرخ و سپید رہی ہوگی لیکن شاید مسلسل سمندر گردی موسموں کی سختی، مزاج کے تناؤ اور کالے اعمالوں نے اس کی صورت کریہہ بنادی تھی۔

پختہ العمری کے باوصف...... وہ خاصا جنگجو، توانا اور مستعد نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ بھاری اور جبڑوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں جو اسے خاصا سخت کوش بتاتی تھیں۔ اس کے کسرتی جسم پر خاکی چست پتلون اور اسی رنگ کی قدرے مٹیالی سی شرٹ تھی۔ سر پر فیلٹ ہیٹ تھا۔ شرمناک ماضی کا حامل گرے ہنٹ...... ایک پرتگالی عورت کے بطن سے تھا۔ اس کی ماں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ایک خطرناک بحری قذاق کی رکھیل تھی جن کا بہت بڑا گروہ تھا۔ ڈاکوؤں کے اس خطرناک گروہ نے بحیرۂ ہند سے رود بار انگلستان (انگلش چینل) اور بحر اوقیانوس تک لوٹ مار اور قتل و غارت گری مچائے رکھی تھی۔ اس کی ماں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے لزبن کی بڑی بااثر شخصیات کے ساتھ ناجائز تعلقات رہے تھے اور انہی کی سپورٹ میں وہ اس گروہ کو زندہ رکھے ہوئے تھی۔

یہی نہیں جب اس گروہ کے ہاتھوں ایک بااثر شخصیت کا قتل [illegible] گیا تو اس کی سرکوبی کے لیے لزبن کی مشینری حرکت میں آگئی اور پھر اس گروہ کا قلع قمع بھی گرے ہنٹ کی ماں کے ذریعے ہی کروایا گیا۔

بعد میں اس کی ماں پرتگال سے انگلستان چلی گئی اور لندن میں دریائے ٹیمز کے کنارے آباد کسی گمنام بستی میں چند دن روپوشی کی زندگی گزارتی رہی اور وہیں ایک ماہی گیر سے شادی رچالی۔ گرے ہنٹ کی پیدائش وہیں ہوئی تھی۔

بہرکیف...... گرے ہنٹ سمندری حالات اور بحری قذاقوں سے جنگ کرنے کا بڑا زبردست تجربہ رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طوفان کے دوران ہی اسے جب آٹوما کے گروہ سے نبرد آزما ہونا پڑا تو اس نے ان کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ ان کا جہاز بھی تباہ کرڈالا تھا اور کئی ڈاکو بھی ہلاک کر ڈالے تھے۔

تاہم اس دوران میں... آنے والے طوفان اور بحری ڈاکوؤں سے اپنے جہاز کو تباہ ہونے اور لٹنے سے بچا تو لیا تھا مگر اسے منزل سے بھٹکنے سے نہیں بچا پایا تھا۔

سی ہاک میں اس کے عملے سمیت چند اہم شخصیات

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

http://urdutubes.com/

بھی سوار تھیں، جن میں سے کچھ کا تعلق برٹش آرمی اور چند ایک بکنگھم پیلس سے تعلق رکھتے تھے تاہم یہ خود کو سوداگر بھی کہتے تھے۔

ہندوستان کا یہ بیش قیمت اور نادر و نایاب خزانہ انہی مذکورہ شخصیات کی زیر نگرانی افریقا کے ساحلی راستوں سے انگلستان (لندن) پہنچایا جا رہا تھا۔ اس وقت وہ سب گرے ہنٹ کے رحم و کرم پر تھے، لیکن انہیں گرے ہنٹ پر پورا اعتماد تھا کہ وہ انہیں اپنے تجربے کی بنا پر اس مصیبت سے بھی نکال لے گا۔

گرے ہنٹ شراب کا رسیا تھا۔ دو فٹ گہرا ایک فٹ چوڑا چوبی پیپا (ڈول) اس نے پورا شراب سے بھر رکھا تھا۔ گرے ہنٹ ایک سخت گیر کپتان مشہور تھا۔ اپنے عملے سے وہ کسی قسم کی رعایت نہیں برتتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات تو وہ ان کی پٹائی بھی لگا دیا کرتا تھا۔

اہم شخصیات کو تسلی دینے کے بعد وہ اپنے پندرہ افراد کے عملے کو کچھ ضروری ہدایت دینے میں مشغول تھا۔ اس کے عملے کے پندرہ افراد میں سے صرف چھ افراد لڑائی بھڑائی کرنا جانتے تھے، جنہیں سمندری ڈاکوؤں سے لڑنے کا بھی خاصا تجربہ تھا اور وہ اسلحے کا استعمال بھی جانتے تھے اگرچہ خالصتاً جہاز کے ملاحوں میں ان کا شمار نہیں ہوتا تھا، لیکن بہرحال وہ یہ کام بھی سنبھالنے کی ذمے داری [illegible]

لہٰذا گرے ہنٹ نے مذکورہ [illegible] افراد کو اسلحے [illegible] جہاز کے ڈیک پر مقرر کر دیا تھا جبکہ باقی نو افراد میں سے سات کو جہاز کی مرمت وغیرہ میں لگا دیا تھا۔ رہ گئے دو، تو ان میں سے ایک ملاح کو اپنی خدمت گزاری اور دوسرے کو رہائشی کیبن میں موجود ان پانچ اہم شخصیات کی خدمت وغیرہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔

جہاز میں زادِ راہ موجود تھا۔ ہنٹ اپنے وہیل کیبن میں ہی موجود رہتا تھا۔ یہاں سے ایک اسکرین نما قدرے لمبی اور چوڑی اسکرین سے وہ باہر جزیرے کے ساحل پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب شراب کی ایک ربڑ کی صراحی موجود تھی اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے گھونٹ بھر کے سامنے اسکرین سے پار دیکھ رہا تھا۔

اس وقت اس کے خاکستری چہرے پر تفکر و تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ جبڑے بھنچے ہوئے تھے جس کے باعث رگیں کھنچی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھیں۔

وہیل کیبن میں روشنی تھی۔ وہاں دو بلب روشن تھے۔ بعد میں ایک اس نے بجلی کی بچت کے لیے خود آف کر دیا تھا۔ کیونکہ جہاز کا انجن خراب ہو کر بند ہو چکا تھا اسی لیے چارجنگ سسٹم منقطع ہونے کی صورت میں بجلی کی کمی کا مسئلہ درپیش ہو سکتا تھا۔

یہی ہدایت اس نے دوسروں کو بھی کر رکھی تھی تاکہ کم سے کم بجلی خرچ ہو اور جو جمع شدہ ہے اسی سے کام چلایا جاتا رہے۔

ایسے میں ایک ٹھگنے مگر گھٹی ہوئی جسامت کا بنگالی ہندو راجن اندر داخل ہوا۔ اس کے چمکتے جسم پر محض ایک بغیر آستینوں والی صدری تھی۔ نیچے اس نے ملاحوں والی کھلی ڈلی شلوار پہن رکھی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے مؤدبانہ انداز میں گرے ہنٹ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''جناب! اندر صاحب لوگوں کے کمرے میں آپ کو بلا رہے ہیں۔''

گرے ہنٹ نے چڑھی ہوئی تیوریوں سے اسے گھورا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔

''پتا ہے مجھے وہ کیوں بلا رہے ہیں۔ کہہ دو ان سے میں مصروف ہوں...... جاؤ۔''

''جناب! وہ لوگ اس نئی صورتِ حال پر سخت پریشان ہو رہے ہیں۔'' راجن نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

''پریشان ہو رہے ہیں تو میں کیا کروں؟ ہم کیا خوش ہیں۔ ہمیں فکر نہیں؟'' وہ [illegible] بولا۔ ''جا [illegible] ان سے کہو [illegible] بار بار مجھے بلا [illegible] پریشان [illegible] کام کروں [illegible] اور پھر یہاں سے [illegible] کی کوشش کریں گے۔''

راجن الٹے پیروں واپس لوٹ گیا۔ گرے ہنٹ نے صراحی منہ سے لگا لی۔ ایک بڑا گھونٹ بھرا اور آستین سے بھیگی باچھیں صاف کیں۔ وہ اس وقت بہت چڑچڑا ہو رہا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ اسے بمبئی کے اس ٹریژر آئی لینڈ نامی جزیرے سے اچانک اور ہنگامی حالات میں روانہ ہونا پڑا تھا۔ جس کے سبب ایک تو وہ اپنی انڈین سانولی محبوبہ کا بنا کو نہ لے سکا تھا جس نے مقررہ وقت میں آنے کا وعدہ اس سے کر رکھا تھا۔ دوسرے وہ...... شراب...... مزید نہیں رکھوا سکا تھا۔ چوبی ڈول میں جو شراب رکھی تھی، وہ سب کے کام میں لائی جا رہی تھی اور گرے ہنٹ نہیں جانتا تھا کہ شراب کا یہ ذخیرہ کب تک ساتھ دے گا، کیونکہ یہاں وہ سب غیر یقینی حالات کا شکار تھے۔

نہ جانے کتنے دن اس گمنام جزیرے پر رہنا پڑتا۔ اس پر مستزاد جہاز میں سوار معتبر شخصیات اس کے لیے الگ دردِ سر بنی ہوئی تھیں۔ اب وہ کیا بتاتا؟ بار بار انہیں تسلیاں

Digitized by Google

دے دے کر گرے ہنٹ خود بھی چڑچڑا ہو گیا تھا۔

پھر اسکرین سے پلٹ کر وہ میز پر آن بیٹھا۔ یہاں کمپاس، نقشہ، قلم اور کاغذ موجود تھا۔ وہ اس پر جھک گیا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ...... اس کے کیبن کا دروازہ کھلا۔ وہ اس وقت میز پر جھکا ہوا تھا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو اس کا منہ بن گیا۔

وہ کونن ڈائل نامی ایک پختہ العمر شخص تھا۔ وہ بڑے رعب سے اپنا تعلق بکنگھم پیلس سے بتاتا تھا۔ اس کی بیوی ریتا بھی ساتھ تھی۔ وہ ایک پینتیس، چالیس سالہ بھرے بھرے بدن اور پرکشش خدوخال کی عورت تھی۔ زیادہ حسین تو اسے نہیں کہہ سکتے تھے مگر قبول صورت تھی۔ چہرہ گول تھا اور آنکھیں قدرے چھوٹی، بال ہلکے سرخ رنگ کے تھے۔ انداز و اطوار دلبرانا تھے، خاصی آزاد خیال اور شراب کی رسیا۔ یہ جوڑا بے اولاد تھا۔ اس نے گھٹنوں سے نیچے تک لمبا اسکرٹ اور ہلکے گرے رنگ کا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ تاڑنے والے پرانے ''شکاری'' یا پرانے ''پاپی'' اس کے گورے اور بھرے بھرے شانوں اور بانہوں میں خاص قسم کا گداز پن محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ مزاجاً بھی کچھ شوقین ٹائپ عورت تھی، مصیبت سے جلد گھبرا کے سپر ڈال دینے والی۔

ایک تیسرا آدمی بھی ان کے ساتھ تھا، جس کی گردن کچھ زیادہ ہی تنی ہوئی لگتی تھی۔ وہ [illegible] جوزف تھا اور خود کو برٹش آرمی کا میجر [illegible] بتاتا تھا۔ عمر اس کی بھی پچاس سے متجاوز ہی تھی۔ رنگت دبی دبی سی تھی، صحت البتہ اچھی اور قد کا قدرے دراز تھا، مگر سی ہاک کے کپتان گرے ہنٹ سے زیادہ کسرتی جسم اور قد و کاٹھ کا نہ تھا۔

گرے ہنٹ کا منہ ریتا کو دیکھ کر کبھی نہیں بن سکتا تھا مگر ساتھ میں اس کے شوہر کونن ڈائل اور آرمی آفیسر جوزف بھی تھے۔ کونن ڈائل کے منہ میں پائپ دبا ہوا تھا۔ وہ تمباکو پینے کا عادی تھا۔

لہٰذا وہ بھی ایک سرسری سی بیزار کن نگاہ ان تینوں پر ڈال کے میز پر جھک گیا۔ اس نے اب کے ان کی تعظیم میں کھڑے ہونے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

''مسٹر گرے! ہم سب بے حد پریشان ہیں۔ سمجھ نہیں آتا کہ آپ جیسا تجربہ کار کپتان اتنے بڑے جہاز کو طوفان سے بچا نہ سکا اور یہاں ایک گمنام جزیرے کے ساحل پر آ پھنسا؟'' کونن ڈائل نے منہ میں دبے پائپ کا ایک گہرا کش لگاتے ہوئے گرے ہنٹ کو مخاطب کر کے کہا۔

گرے ہنٹ نے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا اور اکھڑے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

''طوفان سے بچ کر ہی ہم یہاں آن بھٹکے ہیں۔ ورنہ جس نوعیت کا طوفان تھا وہ ہمارے جہاز کو تنکے کے مانند اڑا دیتا۔ شکر کرو کہ جہاز غرق ہونے سے بچ گیا اور یہاں آن پھنسا۔''

''لیکن اب کیا صورتِ حال ہے؟'' اس بار کونن کی بیوی ریتا نے اس سے سوال کیا۔ اس نے آج اپنے بالوں میں خوبصورت سا پھولدار رومال باندھ رکھا تھا۔

گرے ہنٹ آج زیادہ ہی چڑچڑا ہو رہا تھا، اس بار اس نے ریتا کو بھی سیدھے منہ جواب نہیں دیا۔ اسی طرح بولا۔

''مسز ڈائل! آپ لوگ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا ہوں، نقشوں اور کمپاس کی مدد سے راستہ تلاش رہا ہوں۔''

''لیکن کیا جہاز اس قابل ہے کہ راستہ پانے کے بعد اس گمنام جزیرے کے ساحل سے نکل کر دوبارہ اپنی منزل کی جانب نکل سکے؟''

یہ جوزف تھا۔ گرے ہنٹ نے اس کی طرف بھی کڑی نظروں سے دیکھا اور حتی المقدور اپنی آواز اور لہجے کو دھیمار کھتے ہوئے بولا۔

''ضرور، کل سے جہاز کی مرمت کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ دس سے پندرہ دن لگ جائیں گے۔''

[illegible]

دن...... ہم یہاں ساحل پر کیا کریں گے؟''

''جزیرے کی سیر کریں۔ ویسے یہ جزیرہ کچھ اتنا زیادہ برا بھی نہیں، کافی ہرا بھرا اور دل بہلانے کے لیے اچھا ہے۔'' گرے ہنٹ نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا اور دوبارہ میز پر جھک گیا۔

کونن ڈائل نے اس سے کچھ کہا تھا مگر گرے ہنٹ نے کوئی توجہ نہ دی اور اپنے کام میں مشغول رہا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ اب وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے، لہٰذا وہ تینوں واپس لوٹ گئے۔

☆☆☆

ہاؤس بوٹ کا قبضہ چھوڑنے کے بعد وہ چاروں...... جزیرے کے ریتیلے ساحل پر پہنچ گئے تھے۔

ہاؤس بوٹ سے روانہ ہوتے وقت انہوں نے آپس میں جو کھسر پھسر کی تھی، اس کے مطابق انہوں نے یہی خفیہ منصوبہ بنایا تھا کہ ہاؤس بوٹ والوں پر کسی اور وقت میں دھوکے سے ہلّا بول کر قابض ہونے کی کوشش کی جاسکتی تھی،

کیونکہ وہ علی اور زمان وغیرہ سے مقابلہ تو نہ کر سکے تھے، لہٰذا اب دھوکے سے ان پر شب خون مارنا انہوں نے بہتر سمجھا تھا۔

بنیادی طور پر یہ خطرناک منصوبہ سردار آٹوما اور چری اپا کی پیداوار تھی۔ بابیلا بھی اس میں شامل تھی، مگر امپارا اس کے خلاف تھی لیکن وہ اس وقت خاموش رہی تھی۔

اب یہ علی اور زمان وغیرہ کی خوش قسمتی تھی یا ڈاکوؤں کی بدقسمتی کہ انہوں نے جس طرف سے ساحل کا رخ کیا تھا، وہاں سے انہیں سی ہاک دکھائی نہیں دے پایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جزیرہ بیضوی تھا۔

ایک ذرا مشرقی سمت کا رخ کرنے پر یہ چاروں جزیرے کی ایسی سمت پہنچے تھے جہاں ایک مختصر سے جنگل کے فوراً بعد ایک وادی کے آثار شروع ہو گئے تھے۔

وہ وہاں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرے اور ہاؤس بوٹ والوں پر حملے کے لیے پر تولنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس دوران میں انہوں نے چھوٹا موٹا شکار کیا اور پھل توڑ کر کھائے تھے۔

''ہمیں ان لوگوں کا خیال دل سے نکال کر کچھ اور سوچنا چاہیے۔'' امپارا نے کہا۔ ''کیونکہ ہم پہلے بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکے ہیں اور اب تو ان لوگوں نے ہماری تلواریں بھی چھین لی ہیں۔ صرف ایک تلوار بچی ہے ہمارے پاس اور خود ہم بے خانماں ہو کر رہ گئے ہیں۔''

چری اپا نے غصیلی نظروں سے اپنی منگیتر کی طرف [illegible] بولا۔ ''تو تمہارا کیا خیال ہے [illegible] ہم اپنے ساتھیوں کے قتل کا بدلہ ان بوٹ والوں سے نہ لیں؟ انہیں ایسے ہی چھوڑ دیں؟''

''ہرگز نہیں......'' اس بار بابیلا نے بھی چری اپا کی حمایت میں کہا۔ اس کا چہرہ نفرت و انتقام تلے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ آگے بولی۔ ''ہم انہیں کسی قیمت پر بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اپنے ساتھیوں کی موت کا بھی بدلہ لیں گے اور ان کی دونوں عورتوں سمیت بوٹ بھی اپنے قبضے میں کر کے رہیں گے۔ اگر تم ہمارا ساتھ نہیں دینا چاہتیں۔ تو نہ دو، یہ کام میں اور چری اپا بھی انجام دے سکتے ہیں۔''

''تم لوگ آپس میں مت لڑو۔'' سردار آٹوما نے درمیان میں کہا۔ پھر اپنی بیٹی امپارا کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''امپارا! تم کیوں ان سے اتنا ڈری ہوئی ہو؟ کیا ایک بہادر سردار کی بیٹی ہو کر تمہیں یہ کہنا زیب دیتا ہے کہ ہم ان بوٹ والوں سے ہار مان لیں اور اپنے ساتھیوں کا بدلہ نہ لیں؟ کیا یہ ہماری روایات رہی ہے؟''

باپ کے درمیان میں بولنے پر امپارا خاموش ہو گئی۔ اس کے خاموش ہونے پر چری اپا اور بابیلا ہی نہیں بلکہ خود سردار کو بھی تھوڑی حیرت ہوئی تھی۔ ورنہ امپارا خاموش ہونے والی نہیں تھی اور اپنے دفاع میں اس وقت تک بولتی رہتی تھی جب تک مدمقابل کو قائل نہ کر لے۔

ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ امپارا اس زندگی سے ہی اکتانے لگی تھی۔ بے گناہ لوگوں کے ساتھ قتل و غارت، خون ریزی، لوٹ مار دیکھ دیکھ کر وہ اندر سے بہت بوجھل رہنے لگی تھی۔

اس نے آج تک اپنی زندگی کو بھاگتے دوڑتے ہی دیکھا تھا۔ ایسی زندگی جس میں کشت و خون اور وحشتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ بے سکونی کی اس زندگی سے وہ بیزار سی ہونے لگی تھی۔

چری اپا اسے بالکل پسند نہ تھا۔ وہ کئی بار اس پر اپنے منگیتر ہونے کا حق جتا کر مجرمانہ حملہ بھی کرنے کی کوشش کر چکا تھا مگر امپارا آبرو باختہ لڑکی نہیں تھی۔ ایک بار تو اس نے چری اپا کی پٹائی لگا دی تھی اور باپ سے بھی اس کی شکایت کرنے کی دھمکی دے چکی تھی۔

لیکن امپارا کی ذہنی سوچ کی تبدیلی کی ایک خاص وجہ اور بھی تھی۔ شاید وہ اب تک خود کو بدلنے کا سوچتی ہی رہتی مگر بدل نہیں سکی تھی لیکن ہاؤس بوٹ والوں کی جرأت، دلیری اور ایک دوسرے سے محبت نے امپارا کو بے حد متاثر کیا تھا۔ بالخصوص اس خوبرو سے نوجوان علی ریحان کی نڈر طبیعت، دلیرانہ شخصیت اور ذہانت نے تو اس کا دل موہ لیا تھا۔

امپارا نے بہادری اپنے ساتھیوں میں بھی دیکھی تھی، لیکن نہیں، وہ بھلا بہادری کب کہلاتی تھی؟ وہ تو بزدلی تھی، ظلم تھا۔ بھلا کمزور، بے گناہ اور نہتے لوگوں کو ہلاک کرنا یا انہیں قیدی بنا کر غلاموں کی منڈی میں بیچ دینا کہاں کی بہادری تھی؟ اصل بہادری تو ظلم کے خلاف ڈٹ جانا اور کمزور اور بے گناہ کی مدد کرنا ہوتا ہے۔

یہ لوگ عارضی ٹھکانا بنا چکے تھے اور تو کچھ ان کے پاس تھا نہیں، درختوں کی گھنیری شاخیں، بڑے بڑے پتے، ٹہنیاں، گھاس پھونس اور بیلوں کی رسی سی بنا کر انہوں نے جیسے تیسے دو عدد جھونپڑے سے خیمے بنا لیے تھے۔

رات کو ان لوگوں نے بوٹ والوں کی طرف شب خون مارنے کا منصوبہ بنایا اور روانہ ہو گئے۔ امپارا جان بوجھ کر سوتی بن گئی اور اس نے طبیعت کی خرابی کا بھی بہانہ بنا لیا تھا۔

لیکن جب سردار آٹوما، چری اپا اور بابیلا ساحل کے

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

نزدیک لنگرانداز علی اور زمان وغیرہ کی موٹربوٹ پر ہلا بولنے کے لیے روانہ ہو چکے تو امپارا اٹھی اور اس نے وہ نیزہ اٹھا لیا جو اس نے اپنے ساتھیوں کی طرح موٹی شاخوں کو تراش کر بنایا تھا۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ظالم ساتھی ان موٹربوٹ والوں پر یوں بزدلوں کی طرح وار کریں اور اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو جائیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اب بھی اس خوبرو اور بہادر نوجوان علی ریحان کا چہرہ گردش کر رہا تھا۔

اسے یاد تھا، علی نے اس کے کہنے پر ہی اس کے وحشی منگیتر چری اپا کی جان بخش دی تھی، ورنہ تو وہ علی کی تلوار کی نوک کی زد میں آچکا تھا۔

لہٰذا آٹوما، چری اپا اور بابیلا کے روانہ ہوتے ہی، وہ اٹھی اور اپنا نیزہ ہاتھ میں لے لیا پھر پھونس کے جھونپڑے سے باہر نکل آئی۔

مدھم چاندنی میں جزیرے کی یہ سنہری اور اسرار بھری رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ چہار اطراف گہرے سناٹے کا راج تھا۔

امپارا نیزہ ہاتھ میں لیے اپنے ساتھیوں کے تعاقب میں چلی جا رہی تھی۔

ایسے وقت اس کے سینے میں ایک [illegible] تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اپنے ساتھیوں [illegible] بوٹ والوں کی مدد کے لیے جا رہی تھی...... مگر کیوں؟ اس میں یہ اچانک تبدیلی کیوں آگئی تھی؟ کیا اس کی وجہ اس کے اپنے اندر کی تبدیلی تھی، یا چری اپا کا سلوک؟ یا پھر خوبرو بہادر نوجوان جو اس کے دل میں بسنے لگا تھا...... کچھ تو تھا۔

وہ آگے بڑھتی رہی، یہاں تک کہ وہ اس ساحل کے نزدیک جا پہنچی جدھر وہ موٹربوٹ لنگرانداز تھی۔ اس نے دیکھا کہ موٹربوٹ پر خلافِ توقع خاموشی طاری تھی، مگر کیوں؟ اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔ وہ تو یہ سمجھے ہوئے تھی کہ یہاں جنگ کا سماں ہوگا، حتیٰ کہ یہ بھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو بوٹ...... تک پہنچنے سے پہلے ہی جا لے گی، مگر وہ تو جیسے راستے ہی میں کہیں اچانک غائب ہو گئے تھے۔

پھر بھی اپنی تسلی کی خاطر وہ پانی میں اتر گئی اور بوٹ تک جا پہنچی تو حیران رہ گئی، بوٹ خالی تھی۔ نہ بوٹ والے تھے نہ ہی اس کے اپنے ساتھی۔

وہ ایک الجھن آمیز پریشانی کا شکار ہو گئی۔

''کہاں چلے گئے آخر یہ سب لوگ؟'' امپارا خود کلامیہ بڑبڑائی۔ پھر واپس پلٹی اور دوبارہ اسی جگہ پہنچی...... جہاں سے چلی تھی۔ وہاں اس نے اپنے ساتھیوں کے قدموں کے نشانات دیکھے۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے ساتھی یہاں سے دوسرے راستے پر پلٹ گئے تھے۔ وہ ابھی وہیں کھڑی...... شش و پنج کا شکار تھی کہ اچانک دائیں بائیں کی جھاڑیوں سے چار پانچ ننگ دھڑنگ وحشی جنگلی اس پر ٹوٹ پڑے۔

امپارا کے حلق سے تیز چیخ خارج ہوئی۔ اسی وقت جنگلیوں نے اس پر جال پھینک دیا اور اسے قابو کر کے اپنے ساتھ جال ہی میں لپیٹے ہوئے جزیرے کی اندرونی سمت چل دیے۔

☆☆☆

بچھورام کا دوسرا روپ لیے آتماشکلہ، راج کمار ایش کا تحریر کردہ خط لے کر اسی وقت راج محل سے نکلا اور ناگرہ سے سیدھا دلی جا پہنچا۔

وہاں اس نے ریزیڈینسی میں شیورائے بھولکر سے ملاقات کی اور اسے راج کمار ایش کا خط تھما دیا۔ آتماشکلہ ایک مکار آدمی تھا، جانتا تھا کہ بچھورام کے شیورائے سے کیسے تعلقات تھے اسی لیے وہ بھی اس سے ایسے ہی تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔

[illegible] نے بھولکر [illegible] کر دیا تھا۔

اس نے بھولکر کو ایش کمار کا خط تھماتے ہوئے راجا پرتاب کمار کی ایک شکاری مہم میں اچانک حادثاتی موت کے بارے میں بھی آگاہ کر دیا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ اب ناگرہ کے تخت پر مہارانی نجو بائی سریر آرا ہو چکی ہیں۔

بلاشبہ یہ خبریں شیورائے بھولکر کے لیے بڑی سنسنی خیز اور دھماکا خیز تھیں۔ اس نے خط پڑھنے اور یہ ساری خبریں سننے کے بعد جب آتماشکلہ کی پیٹھ ٹھونکی تو اس کا سینہ پھول کر کپا ہو گیا۔

''ہمیں یاد ہے تم ہمارے پرانے خیرخواہ بچھورام کے ساتھ آئے تھے۔ ہمیں اس کی عبرت ناک موت کا دکھ ہے، لیکن بہت جلد اس کا ازالہ کیا جائے گا۔'' شیورائے حوصلہ افزا لہجے میں اس سے بولا۔ ''ہمیں خوشی ہے کہ بچھورام کی جگہ تمہیں ہمارا خیرخواہ بنا گیا۔ ہم تمہیں قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اب تم کچھ دن یہاں گیسٹ روم میں رہو گے، تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میں آج رات ہی قلعہ

حویلی جا کر جنرل مائیکل شا سے ملاقات کر کے آتا ہوں۔''

اس کی بات پر آتماشکلہ نے آئندہ بھی اپنی ''وفاداری'' کا یقین دلایا۔

وہ بہت خوش تھا کیونکہ ریزیڈینسی میں اب وہ آئندہ ملنے والے احکامات یا ایش کمار کے نام جوابی پیغام کے ملنے تک بڑے ٹھاٹ باٹ سے یہ چند دن گزار سکتا تھا۔

شیورائے بھولکر اسی رات کو قلعہ حویلی جا پہنچا اور جنرل مائیکل شا کو ناگرہ اور راج محل کے سیاسی و غیر سیاسی حالات کے بارے میں آگاہ کیا۔

بھولکر نے سب سے پہلے جنرل مائیکل شا کو خط پڑھنے کے لیے دیا جسے پڑھ کر جنرل کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر اس نے جنرل کو آتماشکلہ کے بارے میں بتایا اور وہ سب کچھ بھی جو اس نے اطلاعاً اس سے کہا تھا۔

''ویل مسٹر شیورائے......!'' جنرل مائیکل شا ایک دم مسرت انگیز انداز میں شیورائے بھولکر سے بولا۔ ''تم نے ایک بہت بڑا کام کر ڈالا ہے، ایسا کام جسے کرنے کے لیے ہم اپنا پورا زور، طاقت اور دولت سب داؤ پر لگا چکے تھے لیکن بری طرح ناکام رہے تھے۔ آئندہ بھی ہمیں کوئی نیا منصوبہ نہیں سجھائی دیتا تھا لیکن اب...... اب تو جیسے سب کچھ مجھے اپنی مٹھی میں بند نظر آ رہا ہے۔''

اس کے بعد وہ بھولکر کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ''تم [illegible] انعام کے مستحق ہو بھولکر......!''

''سرکار......! آپ میری وفاداری کو [illegible] سمجھتے ہیں، بھلا اس سے بڑھ کر اور میرے لیے کیا انعام ہو سکتا ہے۔'' بھولکر نے مکارانہ فروتنی سے کہا پھر جلدی سے دوبارہ اور قدرے رازداری سے بولا۔

''سرکار! اب دیر مت کیجیے۔ اسی وقت اپنا کوئی قابلِ اعتماد آدمی ناگرہ روانہ کر دیجیے۔ وہ ایش کمار کے پاس آپ کا دایاں بازو بن کر رہے گا۔ لیکن خیال رہے کہ کوئی انگریز نہ ہو، آدمی انہی میں سے ہی ہو تو زیادہ بہتر ہوگا اور آدمی بھی ایسا جو وہاں رہ بھی چکا ہو اور کافی عرصہ گزار بھی چکا ہو۔''

''تم اس کی فکر نہیں کرو بھولکر!'' جنرل مائیکل شا بولا۔ وہ ابھی تک سرمستی کے عالم میں اپنا سر دھنے جا رہا تھا اور شراب کا گلاس آدھا کر چکا تھا۔

''ہم ایسے آدمی کا پہلے ہی سے انتخاب کر چکے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے جنرل مائیکل شا کی آنکھوں کے سامنے اس کے بوڑھے سائیس کریم بخش کا بیٹا شوکت حسین عرف شوکی کا چہرہ رقص کر رہا تھا۔ وہ شوکی جو اس کی خوبصورت بھتیجی رینا کا امیدوار اور عاشق بھی تھا۔

بھولکر کو انعامات دینے کا وعدہ کر کے مائیکل شا نے اسے رخصت کر دیا اور اگلے دن ہی شوکی مقررہ وقت پر اس کے روبرو پیش کیا جا چکا تھا۔

جنرل مائیکل شا کے روبرو جانے سے پہلے رینا اور وہ دونوں ملے تھے اور رینا نے شوکی کو بھرپور امید دلائی تھی کہ انکل مائیکل شا کو اس رشتے پر بالکل انکار نہیں ہوگا۔ وہ تم سے کافی خوش اور مطمئن دکھائی دے رہے ہیں۔

''لیکن رینا! مجھے جانے کیوں ایک نامعلوم سا ڈر بھی لگ رہا ہے۔'' رینا کے تمام تر اطمینان دلانے کے باوصف شوکی ایک الجھن آمیز سی پریشانی سے بولا۔

''یہ تمہارا وہم ہے۔ جاؤ اب...... انکل تمہارا انتظار کر رہے ہیں، اپنے کمرے میں اور فکر مت کرو، میں دروازے کے پیچھے کھڑی یہ سب سن رہی ہوں گی۔''

رینا نے کہا اور تھوڑی دیر بعد شوکی، جنرل مائیکل شا کے سامنے کھڑا تھا۔

''ویل جنٹلمین! بیٹھو، کھڑے کیوں ہو؟ تمہارے جیسے بہادر اور ذہین نوجوان تو ہماری کمزوری ہیں اور انہیں ہم منہ مانگا انعام دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔'' جنرل مائیکل نے اس کی طرف دیکھ کر مکاری سے مسکراتے [illegible]

شوکی اس کے سامنے والی ایک خالی نشست پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اسے جنرل مائیکل شا کا لہجہ کافی حوصلہ افزا محسوس ہوا تھا۔ رینا کی بات اسے درست معلوم ہو رہی تھی کہ انکل مائیکل شا اس کے بارے میں ذاتی طور پر ایک اچھی رائے رکھتے ہیں۔

لہٰذا جب جنرل مائیکل نے اس سے منہ مانگے انعام والی بات کی تو اس کا جی چاہا کہ وہ برملا کہہ ڈالے کہ اسے کوئی انعام نہیں چاہیے، صرف اپنی بھتیجی رینا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دے لیکن وہ ابھی اپنے اشتیاق اور جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوں اسے ایک نامعلوم سی بے چینی بھی لگی ہوئی تھی۔

شوکی جب نشست پر براجمان ہو چکا تو جنرل مائیکل شا شراب کا گلاس بھر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ شوکی نے بھی اس کے احترام میں فوراً کھڑے ہونا چاہا لیکن جنرل نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنا کا کہا اور بولا۔

''جنٹلمین! تم پچھلے دنوں ناگرہ میں بہت سا وقت

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

گزار کر آئے ہو۔ تم نے اپنے سچے خادم ہونے کا ثبوت دے دیا ہے کہ آج رینا صحیح سلامت ہمارے سامنے موجود ہے مگر افسوس کہ ہمارا بھائیوں جیسا دوست پروفیسر ہنری برنارڈ اس دنیا میں نہیں رہا اور دیگر ساتھی بھی اس مہم میں جان کی بازی ہار گئے۔ کچھ عبرت ناک حالات کا شکار ہوئے اور چند ایک کھو گئے۔"

وہ اتنا کہہ کر رکا، ایک گھونٹ گلاس سے شراب کا لیا اور آگے بولا۔

"رینا نے ہمیں سب بتا دیا ہے کہ تم نے کس طرح اپنی جان جوکھم میں ڈال کر پروفیسر ہنری برنارڈ کے اس مختصر قافلے کی دست گیری کرنے کی کوشش کی تھی خیر!"

ایک ذرا توقف کے بعد اس نے اپنا بیان جاری رکھا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ تم نہ صرف ناگرہ بلکہ راج محل میں بھی کافی عرصہ گزار کے آئے ہو اور ضرور وہاں کے ماحول، فضا اور اندرونی معاملات کے بارے میں جانتے ہوگے یا پھر اندازہ تو ضرور ہی رکھتے ہوگے۔ رینا نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس سے شادی کے خواہاں ہو اور مجھے بھی کوئی خاص اعتراض نہیں ہے کیونکہ رینا آفٹر آل ایک بالغ اور عاقل لڑکی ہے، اپنا برا بھلا سمجھتی ہے اور اس کی ذمے دار بھی خود ہی ہے۔"

وہ رکا تو شوکی کا دل سینے میں ازراہ مسرت تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا [illegible] نظریں مائیکل شا کے کاندھوں کے [illegible] سامنے کے پردے پر پڑ گئیں جدھر رینا کھڑی اپنے رخِ ماہ روشن چہرے کے ساتھ اسی جانب دیکھ رہی تھی۔ خوشی سے اس کا حسین چہرہ بھی گلنار ہو رہا تھا۔

اسی وقت جب جنرل مائیکل شا اپنے ہاتھ میں پکڑے گلاس کا ایک اور گھونٹ بھر کے اس کی جانب مڑا۔ شوکی فوراً دروازے کی جانب سے نظریں ہٹا کر مائیکل شا کے چہرے کو تکنے لگا۔

"لیکن ایک قباحت مجھے اس میں دکھائی دیتی ہے۔" جنرل نے کہا۔ "بے شک میرا رینا سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہے، وہ میرے بھائیوں جیسے مرحوم دوست پروفیسر ہنری کی بیٹی ہے، میں بھی اسے اپنی بھتیجی ہی کی طرح سمجھتا ہوں، قباحت یہ ہے کہ پروفیسر ہنری یہاں میرے قریبی اور معزز دوستوں کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ اگر رینا کی شادی تم سے کر دی جاتی ہے تو مجھ پر انگلیاں اٹھ سکتی ہیں کہ ایک ادنیٰ ملازم...... سوری! مجھے یہ کہنا پڑا، مگر مجبوری ہے جبکہ تم اب میرے ادنیٰ ملازم نہیں رہے ہو، میں ایک خاص عہدہ تمہیں سونپنے والا ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں تم میرے ان سپاہیوں میں شامل ہو جاؤ جو ہمارے اور ہمارے وسیع تر مفادات کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا تمہیں بھی ہمارا سپاہی بن کر ایک بڑا کارنامہ انجام دینا ہوگا۔"

"آپ کا سپاہی بننے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جناب!" شوکی نے کہا۔ "لیکن کارنامے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ ذرا کھل کر بتائیں تو شاید میری سمجھ میں آجائے۔"

"تمہیں ناگرہ جانا پڑے گا اور راج محل میں اس وقت تک قیام کرنا پڑے گا جب تک ہمارا منصوبہ کامیاب نہیں ہو جاتا۔" جنرل مائیکل شا نے اس سے کہا تو شوکی پریشان ہو گیا۔ اس نے ایک نظر دروازے پر بھی ڈالی تھی۔ رینا نے بھی اپنے انکل کی بات سن لی تھی اور وہ بھی متوحش نظر آنے لگی تھی۔

"جناب! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" بالآخر شوکی نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ وہ جنرل مائیکل کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو ہماری مہم کا وہ حصہ معلوم نہیں ہے جس میں راج محل ہی نہیں بلکہ وہاں کے لوگ بھی ہمارے [illegible] بن گئے تھے۔ بعض حوالوں سے [illegible] مجھے سخت ناپسند [illegible] [illegible] سے اپنی جانیں بچا کر بھاگے ہے وہاں [illegible]"

"ہو سکتا ہے ایسا ہوا ہو۔" جنرل مائیکل بولا۔ اب وہ بھی دوبارہ اپنی نشست پر آبیٹھا تھا۔ "لیکن اب ناگرہ اور راج محل کے حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ وہ شاید تمہارے علم میں نہیں آئے۔" یہ کہتے ہوئے جنرل مائیکل نے اسے دھیرے دھیرے سب بتا دیا۔

شوکی یہ سب سن کر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ دروازے کی اوٹ سے کان لگائے کھڑی رینا نے بھی یہ سب سنا تھا اور اسے ناگرہ کے راجا پرتاب کمار کی یوں اچانک شکاری مہم میں حادثاتی موت کا سن کر بے حد دکھ ہوا تھا۔

رینا نے چونکہ کارشیا کے عبرت ناک انجام کے بارے میں شوکی کو بتا رکھا تھا، لہٰذا وہ یہ سب برداشت نہ کر پائی اور ایک دم دروازے کی اوٹ سے نکل آئی۔

جنرل مائیکل شا اسے اچانک اپنے سامنے پا کر ذرا بھی نہیں چونکا۔ رینا اس سے مخاطب ہو کر بولی۔

"نہیں انکل! شوکی کا ناگرہ یا راج محل جانا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ بے شک وہاں کے حالات بدل چکے ہوں

مگر مہارانی اور اس کا بیٹا ایش کمار شوکی کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔"

جنرل مائیکل شا کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے سناٹے کے تاثرات ابھرے تھے، پھر وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ہم اس خطرے کو سمجھ رہے ہیں لیکن شوکی وہاں کسی اور بھیس میں جائے گا۔ ہم بہت جلد وہ علاقہ فتح کر لیں گے۔ اس کے بعد......"

"ہرگز نہیں انکل!" رینا نے اس بار ناراض سے لہجے میں جنرل مائیکل شا کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور شوکی کے... پاس جا کھڑی ہوئی۔ "شوکی اور میں بہت طویل اور جاں گسل جدائی کے بعد ملے ہیں۔ اب ہمارے اندر ایک دوسرے سے بچھڑنے کی سکت نہیں رہی ہے انکل! پلیز...... ہمیں اس خطرناک امتحان میں مت ڈالیں۔"

"اوکے...... اوکے...... ڈونٹ کرائی بے بی!" جنرل مائیکل شا ہاتھ اٹھا کر مکاری سے بولا۔ "ہم تم دونوں کو جدا نہیں کریں گے۔ ہم کسی اور آدمی کا بندوبست کر لیں گے، تم دونوں جاؤ اور اپنی شادی کی تیاری کرو۔"

رینا، شوکی کو فوراً بازو سے پکڑے دوسرے کمرے میں لے آئی اور متوحش لہجے میں بولی۔

"شوکی! مجھے تو اب یہاں بھی ڈر لگ رہا ہے۔ یہاں سے بھاگ چلو۔ ہم کہیں دور نکل چلتے ہیں لیکن...... میں [illegible] ناگرہ یا راج محل ہرگز نہیں [illegible]" وہ بے [illegible] ہوئی تھی۔

[illegible] کو بھی اندازہ ہو چلا تھا کہ جنرل مائیکل شا اسے رینا کا لالچ دے کر اپنے خطرناک مقاصد میں استعمال کرنا چاہ رہا ہے جبکہ اسے کسی لالچ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ رینا اس سے شادی کے لیے تیار تھی۔ وہ ایک عاقل و بالغ لڑکی تھی۔ باپ مر چکا تھا اور وہ کسی کی سرپرستی میں نہیں تھی۔ اپنے برے بھلے کی خود ذمے دار تھی، جبکہ عیار مائیکل شا اس پر محض اس کے باپ کی دوستی اور منہ بولی بھتیجی کا حق جتا رہا تھا۔

لہٰذا ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد شوکی نے رینا کو تسلی دیتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

"رینا! تم کسی بات کی فکر مت کرو، ہمیں اب کوئی نہیں جدا کر سکتا، نہ ہی میں تمہیں چھوڑ کر کہیں جا رہا ہوں۔ مجھے اپنے اللہ پر کامل بھروسا ہے اور اسی نے اب تک میری دست گیری کی ہے۔ کتنے مصائب جھیل کر ہم دوبارہ آن ملے ہیں، ہمارا پیار سچا اور پاکیزہ ہے۔"

رینا کو شوکی کی بات نے بہت حوصلہ دیا۔ وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ شوکی محبت سے اس کے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

[illegible] کی کو بالآخر اپنے باپ کریم بخش کو سارا قصہ بتانا پڑا۔ ماں بھی ساتھ تھی۔

اس کے بوڑھے ماں باپ اپنے بیٹے کی یہ ساری داستان سن کر پہلے تو گنگ سے ہو گئے، پھر فکرمند بھی نظر آنے لگے، تاہم انہیں اپنے بیٹے کی دلیری پر پورا یقین تھا۔

"جمعہ خاں تانگے والا صحیح کہتا تھا، یہ سالے فرنگی مفاد پرست ہوتے ہیں۔ ہم جتنا بھی ان کی وفاداری کا دم بھر لیں، حتیٰ کہ اپنی جانیں بھی داؤ پر لگا دیں، انہیں صرف اپنے مفاد سے ہی غرض ہوتی ہے۔" کریم بخش نے بیٹے کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"تو فکر نہ کر، یہاں سے اب نکلنے کی تیاری پکڑ۔ خبردار! اس گورے جنرل (مائیکل شا) کے جھانسے میں مت آنا۔ یہ کبھی بھی تمہاری شادی رینا سے نہیں ہونے دے گا۔"

"شوکی کے ابا! ہم جائیں گے کہاں؟" شوکی کی ماں نے فکرمندی سے پوچھا۔

"تو اس کی فکر نہ کر...... مچن آباد میں میرا ایک پرانا دوست رہتا ہے۔ وہاں باغیوں کا زور بھی زیادہ ہے، وہیں

پڑیے گر بیمار

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں باعزت طریقے سے مرنا ایک حادثہ نہیں، ہنر ہے۔ جس کے لیے عمر بھر ریاض کرنا پڑتا ہے۔ اور اللہ اگر توفیق نہ دے تو یہ ہر ایک کے بس کا روگ بھی نہیں۔ بالخصوص پیشہ ور سیاستدان اس کے فنی آداب سے واقف نہیں ہوتے۔ بہت کم لیڈر ایسے گزرے ہیں جنہیں صحیح وقت پر مرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ہر لیڈر کی زندگی میں، خواہ وہ کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ ذرا جی کڑا کر کے مر جائے یا اپنے سیاسی دشمنوں کو رشوت دے کر اپنے آپ کو شہید کرا لے تو وہ لوگ سال کے سال نہ سہی، ہر الیکشن پر ضرور دھوم دھام سے اس کا عرس منایا کریں۔ البتہ دقت یہ ہے کہ اس قسم کی سعادت دوسرے کے زورِ بازو پر منحصر ہے اور سعدی کہہ گئے ہیں کہ دوسرے کے بل بوتے پر جنت میں جانا عقوبتِ دوزخ کے برابر ہے۔ پھر اس کا کیا علاج کہ انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "چراغ تلے" سے اقتباس

چلے چلتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔'' کریم بخش نے کہا۔

دو روز بعد یہ مختصر سا کنبہ پہر رات کی خاموشی میں قلعہ بند حویلی سے کوچ کر چکا تھا۔ محبن آباد پہنچنے میں انہیں دو روز لگے تھے۔

شوکی اور رینا بہت خوش تھے۔ رینا کو کالے رنگ کا برقع اوڑھا دیا گیا تھا۔ کریم بخش کے اس دوست کا نام توفیق احمد تھا۔ اس بے خانماں خاندان کی اس نے پوری مدد کی اور گویا دوستی کا حق ادا کر دیا۔ وہ ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا لیکن اس کا اپنا بھی کنبہ تھا جو پانچ افراد پر مشتمل تھا۔

تاہم کریم بخش اور شوکی وغیرہ کے پاس بھی کچھ جمع جتھا تھا۔ اسی لیے پہلے رہائش کا مسئلہ حل کیا گیا اور توفیق ہی کی مدد سے انہیں دو کھولی نما کمروں کا مکان کرائے پر مل گیا۔ یہ ایک ہندو بنیے کا مکان تھا۔ محبن آباد میں یوں تو مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی مگر وہاں ہندو اور عیسائی بھی رہتے تھے۔

فرنگیوں کی غاصبانہ کارروائیوں نے ان تینوں قوموں کو بہ ظاہر اتحاد کی ایک زنجیر میں پرو دیا تھا، لیکن یہاں بھی وہی معاملہ تھا...... یعنی نظریۂ ضرورت...... مسلم آبادی تو آپس میں ہم آواز تھی، مگر ہندوؤں اور عیسائیوں کے اعتماد ڈانوں ڈول تھے۔ یہاں زیادہ تر غریبوں ہی کی آبادی تھی اسی لیے وہ بھی فرنگیوں سے ڈرے ہوئے رہتے تھے اور [illegible] کارروائی [illegible] باغی گروپ کا حصہ بننے سے کتراتے تھے۔ پتا نہیں کن لوگوں نے ان مذکورہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھادی تھی کہ فرنگیوں کے خلاف ایک ذرا بھی آواز بلند کرنے سے ان پر کسی وقت بھی تباہی و بربادی نازل ہو سکتی ہے۔

بہرکیف...... ڈر اور خوف کی فضا یہاں بھی قائم تھی مگر اتنی نہیں جتنی کہ دیگر شہروں میں تھی۔

گھر جیسا ٹھکانا ملتے ہی انہوں نے سکون کی سانس لی اور اب مسئلہ روزگار کا تھا۔ وہ بھی توفیق احمد نے یوں حل کر دیا کہ شوکی کو اس نے اسی فیکٹری میں لگوادیا جہاں وہ خود مزدوری کرتا تھا۔ کریم بخش بھی نوکری کرنا چاہتا تھا مگر وہ بہت بوڑھا اور کمزور ہو گیا تھا، شوکی نے اسے کام کرنے سے منع کر دیا۔

زندگی کی گاڑی کچھ دن چلی اور جب سکون سے ایک ڈگر پر محسوس ہونے لگی تو اسی قصبے میں مسجد کے ایک پیش امام کے ہاتھوں رینا نے اسلام قبول کر لیا اور اس کا اسلامی نام کوثر رکھ دیا گیا۔ وہیں شوکی اور کوثر کا نکاح پڑھوا دیا گیا۔

یوں ان دونوں کو منزلِ مراد ملی اور ایک دوسرے کو پا کر دونوں بے حد خوش ہوئے۔

سہاگ رات، اگرچہ ان دونوں محبت کرنے والے دیوانوں نے ایک چھوٹے سے گھر کے کھولی نما کمرے میں بتائی تھی مگر وہ ان کے لیے یادگار ثابت ہوئی۔

بان کی کھاٹ پر ٹاٹ کا بستر تھا۔ بوسیدہ سی دیواروں پر کچھ پھول ذرا ذرا فاصلے پر ٹانک دیے گئے تھے۔ کمرے میں عطر چھڑک کر اسے خوشبودار بنا دیا گیا تھا۔

محبن آباد جیسے اس چھوٹے سے قصبے میں سرِ شام ہی رات اتر آتی تھی۔ اس دن موسم سہانا ہو چلا تھا۔ ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی، باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور گلی محلے میں ایک سحر زدہ سی خاموشی طاری تھی۔

شوکی کی ماں نے ایک جوڑا اپنے بیٹے کی دلہن کے لیے پہلے ہی سے بنوا رکھا تھا، وہی اسے پہنا دیا گیا تھا۔ خود شوکی نے بھی سادہ سا شلوار کرتہ پہن رکھا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اندر ایک کمزور پاور کا بلب روشن تھا۔ چھت کی طرف لگے روشندان سے مقدور بھر آنے والے روشن آسمان کی ضوفشانی اندر ٹھنڈی کرنوں کی صورت پڑتی تھی۔

شوکی نے پہلے دروازے کو اپنے عقب میں بند کیا [illegible] سمٹی بیٹھی کوثر پر جم کر رہ گئی تھیں۔

اس نے مشرقی دلہنوں کی طرح اپنا سر جھکا رکھا تھا۔ گوٹا کناری والے سرخ عروسی جوڑے میں کوثر کا [illegible] کسی چاند کے مانند دمکتا دکھائی دیتا تھا۔

چند ثانیے نظریں بھر بھر کر اپنی محبت، اپنی [illegible] سفر اور دلہن کو دیکھتے رہنے کے بعد شوکی ہولے سے انداز میں کھنکھارا۔

تب ہی دلہن کے گھونگھٹ نکلے مکھڑے میں بھی تھوڑی اضطراری سی حرکت پیدا ہوئی، اس نے تھوڑا سر اٹھا کر نکلے ہوئے گھونگھٹ کے مقدور بھر خلا سے اپنے مجازی خدا کو دیکھنے کی کوشش کی مگر شاید ناکام رہی اور ہولے سے اپنے گٹھری سے بدن کو جنبش دی۔ گویا یہ اپنے دلہا کے استقبال کا اشارہ ہو۔

اس اشارے میں ملن کی بے چینیاں بھی تھیں اور جستجوئے راحتِ جاں کی وہ تسکین بھی جسے صرف محسوس کیا جا سکتا تھا، اظہار نہیں اور جہاں ایسے ''بے چین'' جذبات کا

اظہار نہ ہو سکے، وہاں احساسات اپنا اثر دکھاتے ہیں، اسی اثر پذیری کو محسوس کرتے ہوئے شوکی کے لیے بھی پھر مزید یہ پل بھر کی دوریاں ناقابلِ برداشت ہونے لگیں مگر اس میں کسی بھی طور جلد باز ہوس کاری کا بالکل بھی دخل نہ تھا۔ بس، سچ سچ سا اندازِ محبت، قربتیں پا لینے اور جلوتوں کو اپنی بے لوث چاہتوں کا امین بنانے کا وہ پاکیزہ جذبہ رگوں میں محبت بن کے دوڑنے لگا کہ...... نزاکتوں کی قربتوں کا اپنا ہی ایک الگ مزہ ہوتا ہے۔

وہ اس کے قریب...... بالکل قریب بیٹھ گیا پھر شوکی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بہت دھیرے سے...... کوثر کا گھونگھٹ ہٹایا تو جیسے کمرا کیا، پورا گھر روشن ہو گیا بلکہ گھر کیا اس کا اپنا ''اندر'' بھی روشن ہو گیا۔

معمولی سجی سنوری دلہن میں سادگی و پرکاری کا روپ چڑھا ہوا تھا۔ سادگی اس کا لبادہ تھا تو اس کا ملکوتی حسن پرکار تھا۔

''رینا......!'' شوکی نے دل کی گہرائیوں سے جیسے اسے بہت دھیرے سے پکارا۔

''اونہوں...... رینا نہیں کوثر......'' کوثر نے جیسے اس کی تصحیح کی۔ اس کے عنابی ہونٹ جیسے بھیدوں بھرے انداز میں تھرکے۔

''جانتا ہوں میں...... لیکن دنیا والوں کے لیے تم کوثر ہو، مگر میرے لیے صرف رینا ہو۔'' شوکی نے کہا تو کوثر کی [illegible] ابھری۔

''رینا تم خوش [illegible]......''

''ایسا کیوں پوچھا تم نے؟''

''اس لیے کہ مجھے جہاں تمہیں حاصل کرنے کی بے بہا خوشی محسوس ہو رہی ہے، وہیں ایک قلق بھی دل کو ستاتا ہے کہ یہ سب تمہارے شایانِ شان نہیں۔ مجھے تو تمہاری صورت میں جیسے دنیا جہان کی دولت مل گئی مگر تمہیں کیا ملا؟''

''تم...... اور تمہاری وہ بے لوث اور سچی محبت جو میرے لیے تمہارے دل میں موجود ہے۔''

''رینا! تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''میں بھلا جھوٹ بولتی ہوں؟ اور وہ بھی تم سے...... نو اینڈ نیور......''

''رینا! میں کوشش کروں گا کہ تمہیں زندگی کی آسائشیں بھی فراہم کروں، لیکن یہ سب ایک دم نہیں ہوگا۔''

''خاموش...... میں تمہاری بات کا مطلب سمجھتی ہوں۔ میں اَن پڑھ جاہل نہیں ہوں اور تم بھی کم پڑھے لکھے نہیں۔ ہم دونوں مل کر زندگی کے راستوں کو آسان بنائیں گے۔''

''انشاء اللہ۔''

اس کے بعد ارمانوں بھری یہ شبِ زفاف ملن کی سیج پر شادمانیاں بکھیرنے لگی۔

☆☆☆

وائٹ فالکن کے کپتان کنگ برڈ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد چیتن شرما مایوس نہیں ہوا تھا۔ اسے ابھی تک ناگرہ اور راج محل کے اچانک اور ''حادثاتی'' سیاسی اور غیر سیاسی حالات بدلنے کی کوئی خبر نہ تھی اور ہوتی بھی کیسے؟ وہ تو بحری جہاز میں محوِ سفر تھا۔

اس نے جب دیکھا کہ بنگال کا ایک مسلم نوجوان شفیق، سونجا میں غیر معمولی دلچسپی لیے ہوئے ہے، نیز وہ اس گورے بدمعاش نوجوان رابرٹ سے بھی بھڑ چکا تھا، چیتن شرما نے فرنگیوں والی چال چلی، یعنی دشمن کے دشمن سے دوستی......

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے نوجوان......!'' وہ اس کے پاس جا پہنچا۔ اس وقت شام سمندری ہواؤں میں لپٹ کر رات کا راگ الاپنے میں مشغول تھی۔ بیشتر مسافر خلافِ معمول اپنے کیبنوں میں موجود تھے۔

خلافِ معمول اس لیے کہ ان کے کیبنوں کی مرمت ہو چکی تھی، وہ دو ایک راتوں تک ہال میں پڑے رہے تھے۔ اب کیبن نصیب ہوتے ہی وہ زیادہ تر اپنا وقت وہیں گزارنے لگے تھے، ورنہ اس خوبصورت سمندری شام اور اسرار بھری رات کے مسحور کن مناظر کا لطف لینے اور چائے کافی پینے کے لیے عرشے پر ہی موجود ہوتے۔

یوں تو اب بھی عرشے پر لوگ اس دلفریب سمندری نظارے سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی تھی۔

ان میں شفیق بھی موجود تھا جبکہ اس کا باپ مقبول مٹھون اپنے کیبن میں آرام کر رہا تھا۔ بدلتے ہوئے سمندری موسموں نے اسے کچھ بیمار سا کر دیا تھا۔

بہرکیف...... چیتن شرما کی بات پر شفیق خیالوں سے چونک کر اس کی جانب مڑا۔

اس کے عقب میں ریلنگ کے پار اٹھلاتی موجوں کی روانی پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالنے کے بعد چیتن شرما نے مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب مصافحے کے لیے اپنا ایک ہاتھ بھی بڑھا دیا۔

شفیق اور اس کے درمیان بالکل ابتدا میں ایک تلخی سی

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

پیدا ہوئی تھی، لیکن پھر حالات کچھ ایسے نہج پر آگئے کہ دونوں کے درمیان دوسری بار ذرا مروتاً گفتگو ہوئی تھی لیکن اس بار تو انداز خالصتاً دوستانہ تھا لیکن شفیق جانے کیوں اس کی بات سن کر کسی نامعلوم سے مخمصے کا شکار ہو گیا تھا۔

تاہم اس نے جبراً مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور سوال کیا۔

''میری مدد کی بھلا آپ کو کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟''

''کیا تم نہیں چاہتے کہ وہ معصوم لڑکی سونجنا، اس گورے بدمعاش رابرٹ کے شیطانی چنگل سے آزادی حاصل کر لے؟'' چیتن شرما نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

اس کی بات پر شفیق اندر سے کھٹکا۔ وہ ایک متحمل مزاج کا سہی مگر ذہین نوجوان تھا اور یہ اس نے اپنے باپ اور کاروبار سے سیکھا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا بھی رابرٹ پر کوئی زور نہیں چل سکا ہے اور چونکہ وہ اسے کئی بار سونجنا کے ساتھ مخاطب ہوتے اور اسی سلسلے میں رابرٹ سے بھڑتے بھی دیکھ چکا ہے، تو یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے کسی مقصد کے لیے اسے ساتھ ملانا چاہتا تھا، اگرچہ ایک مقصد شفیق کا بھی تھا، وہ یہی کہ سونجنا کو دل سے چاہنے لگا تھا، لیکن رابرٹ والے معاملے نے اسے دور ہونے پر مجبور تو کیا تھا مگر پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ شفیق کو اندازہ ہو چلا تھا کہ رابرٹ، معصوم اور حسین سونجنا کو کسی فریب میں [illegible]

لہٰذا پھر بھی اس نے محتاط انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

''کون یہ نہیں چاہتا کہ کوئی معصوم انسان کسی فریبی شیطان کی چال میں آنے سے بچ جائے۔ یہ بات انسانی ہمدردی کے زمرے میں ہی آتی ہے۔''

''چلو چھوڑو اس بحث کو...... آگے بات کرتے ہیں۔'' چیتن نے معاملہ فہمی اختیار کی۔ ''یہ سالا گورا بدمعاش ناگرہ کی ایک راجکماری کو بہلا پھسلا کر دھوکے سے اپنے ساتھ انگلستان لے جا رہا ہے اور اس کے پاس چوری کا مال بھی ہے جس کا تعلق راج محل کے قیمتی اثاثوں سے ہے۔''

''تم شاید کپتان کنگ برڈ سے اس سلسلے میں بات کرنے تو گئے تھے؟'' شفیق نے درمیان میں سوال کیا۔

''ہاں!'' چیتن نے ایک ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر وہ بھی سالا ایک گورا ہی ہے اور اس نے رابرٹ ہی کی حمایت کی تھی۔''

''کیا تم نے یہ بات اس کے گوش گزار نہیں کی تھی؟''

''کی تھی۔'' وہ جواب میں بولا۔ ''لیکن اس نے یہی کہا تھا کہ اگر لڑکا لڑکی راضی ہیں تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''

''ایک طرح سے ٹھیک ہی کہا تھا اس نے۔'' شفیق بولا۔ وہ بھی مایوس سا نظر آ رہا تھا۔

''لیکن سونجنا کا چہرہ تم نے نہیں دیکھا، کس قدر کملایا ہوا ہے۔ وہ اندر سے خوش نہیں ہے۔ نادانی میں وہ جو غلط قدم اٹھا بیٹھی ہے۔ اس کا اسے قلق تو ہے، مگر اب وہ کیا کرے؟ وہ اپنی ساری کشتیاں جلا چکی ہے۔''

''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' شفیق نے سوالیہ نظروں سے چیتن شرما کی طرف دیکھا۔

''تم میرا ساتھ دو، ہم اسے لندن میں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ بکنگھم پیلس میں ہماری ریاست کا ایک سیاسی ایجنٹ اشوک کھٹپال موجود ہے۔ میں خود ناگرہ کے ایک اعلیٰ عہدے دار کی حیثیت رکھتا ہوں، بکنگھم پیلس تک میری رسائی ہے۔'' چیتن بولا۔

شفیق اس کی بات پر بے تاثر انداز میں مسکرایا اور اسی لہجے میں بولا۔

''جب تم خود اتنی بڑی حیثیت کے مالک ہو تو پھر میری ضرورت تمہیں کیوں پڑ گئی ہے؟''

چیتن لاجواب سا ہو کر منہ بنا کر بولا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ تم بھی میری طرح [illegible] نفرت کرتے ہو گے جنہوں [illegible] ہماری عزت دار عورتوں کو بھی ورغلا کر ان کے [illegible] سمیت بھگا کر لے جا رہے ہیں۔''

شفیق اس کی بات پر پھر مسکرایا، وہ اس کی مکاری بھی سمجھ رہا تھا کہ چیتن اسے غیرت دلا کر اپنا کام نکلوانا چاہتا ہے، یہی نہیں وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ اس کے پاس مدد کے لیے کیوں آیا تھا، کیونکہ اس مکار چیتن شرما کو اس حقیقت کا اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ سونجنا کو پسند کرتا ہے، اسی کی آڑ میں اسے اکسا کر... پہلے اپنا الو سیدھا کرے اور بعد میں اپنی راہ لے۔ شفیق نے اسی لیے محتاط انداز اختیار کر رکھا تھا۔ وہ اپنے طور پر سونجنا والے ''معاملے'' کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا، بغیر کسی کی مدد اور مشورے کے۔ لہٰذا وہ اپنے کاندھے اچکا کر بولا۔

''یہ معاملات بڑے گمبھیر ہوتے ہیں شرما جی! ہم ٹھہرے ایک کاروباری آدمی۔ میں خود اپنے باپ کے ساتھ لندن ایک خالصتاً کاروباری دورے پر جا رہا ہوں۔ براہ کرم مجھے ایسے معاملات سے دور ہی رکھیں۔''

''ہوں......'' چیتن شرما ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

درحقیقت چیتن، رابرٹ سے ڈرتا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس کے مقابلے میں ایک تنومند اور نوجوان مرد تھا جبکہ چیتن شرما خود ایک عمر رسیدہ اور کمزور آدمی تھا۔ وہ رابرٹ جیسے بدمعاش کو اسی کی طرح کے بھرپور اور صحت مند نوجوان کے ذریعے ہی شکست دینا چاہتا تھا۔

دراصل چیتن، رابرٹ کو لندن کی بندرگاہ پر چھاپ لینا چاہتا تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ رابرٹ اگر ایک بار سونجنا کو لے کر بندرگاہ سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا تو بھول بھلیوں میں گم ہو جائے گا اور بعد میں اس کا اتا پتا چلانا مشکل ہو جائے گا۔

تب ہی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی لندن کی بندرگاہ پر اترتے ہی بکنگھم پیلس کا رخ کرنے کے بجائے سب سے پہلے رابرٹ کی نظروں میں آئے بغیر ان کا تعاقب کرے گا اور ان کے ٹھکانے سے آگاہ ہونے کے بعد بکنگھم پیلس کا رخ کرے گا اور اشوک کھٹپال سے ملاقات کرے گا۔

اسے پوری امید تھی کہ ناگرہ کے سفیر اور سیاسی ایجنٹ ہونے کے ناتے اشوک اس کی بھرپور طریقے سے مدد کرے گا۔

شفیق کچھ مایوس سا رہنے لگا تھا۔ چیتن شرما کی زبان سے اس کی مکمل حقیقت آشکار ہوتے ہی اسے دکھ ہوا تھا کہ سونجنا کیسے خطرناک آدمی کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ اندازہ تو خیر اسے بھی ہو چکا تھا، مگر اب اس کی تصدیق بھی ہو چکی [illegible]

[illegible] مرحلے [illegible] کا تصور کیا جاتا ہے لیکن چند ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر اس کا الٹ اثر ہوتا ہے، وہ اسے اپنی ضد بنا لیتے ہیں۔ مایوسی کا یہ مرحلہ انہیں توڑتا نہیں بلکہ مزید سرکشی پر اکساتا ہے، یہی شفیق کے ساتھ بھی ہوا، جب اس کی مایوسی انتہا کو پہنچی تو اس نے بھی تہیہ کر لیا کہ وہ سونجنا کے معاملے میں اب چپ کا نہیں بیٹھا رہے گا۔ اب تو اس بات کی بھی تصدیق ہو چکی ہے کہ بدخصلت رابرٹ، معصوم سونجنا کو دھوکا دے رہا تھا۔

شفیق نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ سونجنا کو رابرٹ کے چنگل سے نکالنے کی ایک اور کوشش ضرور کرے گا اور اب ہار نہیں مانے گا، آگے تقدیر کو جو منظور۔

جاری سفر کا کہیں نہ کہیں اختتام ضرور ہوتا ہے، چاہے وہ منزلوں اور راستوں کا ہو یا پھر سفرِ آخرت کا۔ وائٹ فالکن کا سفر بھی اپنے ناساعد حالات اور ان سے جڑی کہانیوں کے ساتھ بالآخر اختتام پذیر ہوا۔

لندن کی بندرگاہ پر اترتے ہی رابرٹ نے کسی چالاک اور بدکے ہوئے لومڑ کی طرح سونجنا کو بغل میں دبوچ لیا۔ وہ بھی کم کائیاں نہ تھا۔ اسے خدشہ تھا اس بات کا کہ اس کا تعاقب کیا جا سکتا ہے، سب سے پہلے اسے چیتن شرما کی طرف سے خطرہ تھا۔ دوسرا وہ اس نوجوان شفیق سے بھی محتاط تھا۔

لیکن وہ چیتن کو تو کسی طرح دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا مگر شفیق کو جل نہ دے سکا۔ ممکن ہے اس میں یہ وجہ بھی رہی ہو کہ رابرٹ کو زیادہ خطرہ چیتن کی طرف سے تھا، اسی لیے وہ شفیق پر زیادہ توجہ نہ دے پایا ہو۔

☆☆☆

سونجنا بالآخر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے رابرٹ کے ساتھ لندن پہنچ چکی تھی......

لیکن یہ عجیب بات ہی تھی کہ جس سرزمین پر پہنچنے کے اس نے رابرٹ کے ساتھ خواب دیکھے تھے یا اسے دکھلائے گئے تھے، وہ سونجنا کو ایک آنکھ نہ بھائے۔ موسم سرما اپنے جوبن پر تھا، ایک یخ بستہ سی دھند اور بے کیف سی کہر میں لپٹا ہوا لندن سونجنا کو قابلِ نفرین ہی معلوم ہو رہا تھا۔

حالانکہ دن کا سماں تھا مگر سورج کسی سراسیمہ بچے کی طرح بادلوں کی اوٹ میں دبکا ہوا محسوس ہوتا تھا، جبکہ شہر کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ ڈر کے مارے سکڑا سمٹا دکھائی دیتا تھا۔

سونجنا ایک تکلیف دہ حیرت کے ساتھ سوچتی تھی کہ کیا یہ وہی لندن ہے جس کی دلکشی اور خوب صورتی کے رابرٹ ہر وقت اس کے سامنے گن گایا کرتا تھا؟ اور جس کا خیال خود اس کے اپنے قلب و روح...... میں ایک ان کہی سی سرخوشی پھونک دیا کرتا تھا۔

یہی لندن اب اسے یاسیت، مایوسی اور ایک طرح کے نامعلوم سے خوف سے دوچار کرنے لگا تھا۔ وہ خوف، جو اس کے دل کے کسی گوشۂ نہاں میں اس وقت سے ہی بے چینی کا سبب بنا رہا تھا کہ اس کے ساتھ ویسا نہیں ہونے جا رہا جیسا کہ اس سے کہا گیا ہے۔

یہاں کیا تھا؟ فقط دھند، کہر، سردی اور تنہائی تھی اور ان گنت فکروں کے ہجوم تھے۔

تب ہی سونجنا کو اپنے ہندوستان کی سرزمین یاد آگئی، ناگرہ کی وہ فلک بوس چوٹیاں، جس کے پیچھے سے سورج بڑی آب و تاب سے سر ابھارتا تھا۔ موسم سرما کے بادلوں سے تو وہ جیسے شریر بچے کی طرح کھیلا کرتا تھا۔ کبھی ناگرہ کی برف پوش چوٹیوں سے لڑھکتا تو ہر دوار کے ٹھٹھرتے جنگل پر بادلوں کو چیرتا ہوا مسلط ہو جاتا اور انہیں اپنی تیز کرنوں سے

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

خوش گواریت عطا کرتا۔

وہاں کے ہر موسم کے دلفریب مناظر تو خوش الحانیاں بکھیرتے تھے ہر سو، لیکن یہاں تو جیسے سردی نے موت کی سی مردنی طاری کر رکھی تھی ماحول پر۔

رابرٹ اس کی دلی کیفیات سے بے نیاز تھا۔ موٹر گاڑیاں یہاں بھی چلتی دکھائی دیتی تھیں، وکٹوریہ تانگے اور چھکڑے تک سونجنا نے دیکھ لیے...... ٹرام بھی دیکھی مگر اسے یہاں کچھ بھی نیا پن نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ جو تھوڑا بہت "نیا پن" نظر آ بھی رہا تھا وہ تھی بے مروتی، کسی کو کسی سے کوئی غرض نہ تھی۔ ہر کوئی ادھر ادھر دوڑے جا رہا تھا۔ نفسانفسی تھی اور ہر کسی کو اپنی فکر تھی۔ ایک خشک مزاجی سی تھی یہاں کے لوگوں میں...... اگرچہ کہیں اخلاقی طور پر دو ایک جملے سننے کو مل بھی جاتے تھے۔

دل اور دل کی بات، جذب و جذبات کا کوئی دخل نظر نہیں آتا تھا یہاں، بس ایک مشینی سا اندازِ حیات تھا۔

رابرٹ اسے فلہم روڈ پر واقع ایک تنگ و تاریک اور ٹھٹھرے ہوئے سیلن زدہ سے کابک نما فلیٹ میں لے آیا۔ فلیٹ بھی کیا تھا، بس ایک کمرا ہی تھا، جو اسے ایک بوڑھی عورت نے اسی وقت ہفتہ وار کرائے پر دے دیا۔ ساتھ میں لاؤنج کے نام پر تھوڑی سی جگہ تھی اور وہیں ایک چھوٹی سی سیمنٹ کی سالخوردہ سلیب نصب کر کے کچن بنا [illegible] گیا [illegible] وہیں ایک کونے میں سنگل پٹ والے دروازے کے ساتھ واش روم تھا۔

"رابرٹ! یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟" بالآخر سونجنا نے ایک تکلیف دہ سی آہ بھرنے کے انداز میں اس سے کہا۔

"کیا مطلب کہاں لے آیا ہوں؟" رابرٹ نے اسے گھورا۔

"تم تو کہتے تھے کہ لندن ایسا ہے ویسا ہے، اس کے مقابلے میں ہندوستان اور تاگرہ تو کیا راج محل بھی کچھ نہیں...... لیکن یہاں تو......"

"تم نے مجھ سے سچی محبت کی ہے یا کوئی سودے بازی......؟" رابرٹ نے زہریلے انداز میں کہا۔ یہ چالاک لومڑ کا میٹھے پر ایسا وار تھا کہ معصوم اور سادہ لوح سونجنا کو چپ سی لگ گئی۔ رابرٹ کو خیال آیا۔ ایک تگڑی ڈوز کے بعد ہولا ہاتھ رکھنا بھی ضروری ہے، لہٰذا اگلے ہی لمحے کینچلی بدلتے ہوئے مگر اسی طرح سنجیدگی سے بولا۔

"ابھی تو لندن آئے ہمیں چند ہی گھنٹے ہوئے ہیں۔ چند دنوں میں سب بہتر ہو جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں بھی کافی عرصے یہاں سے دور رہا ہوں اور بہت کچھ بدل گیا ہو گا، اسے نئے سرے سے دیکھنا اور سنوارنا ہو گا مجھے۔ باہر نکلوں گا، کچھ کروں گا تو آگے بھی بات بن جائے گی۔"

"لیکن تم تو کہتے تھے کہ یہاں تمہاری ایک اسٹیٹ ہے اور......" سونجنا کہتے کہتے رک گئی کیونکہ رابرٹ درمیان میں اس کی بات کاٹ کر ہنس دیا تھا، پھر محبت سے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کا بوسہ لیا اور بولا۔

"مائی ڈارلنگ! میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں یہاں کسی ریاست کا نواب ہوں۔ تم میرا مطلب غلط سمجھی تھیں۔ ہاں! یہ ضرور کہا تھا کہ یہاں میرا کاؤنٹی سے تعلق ہے، وہی کہہ رہا ہوں کہ میں کافی عرصے یہاں سے اچانک غائب رہا ہوں۔ اب وہاں کے کیا حالات ہیں کچھ نہیں جانتا۔ اچھا تھوڑا آرام کر لو، پھر میں ذرا باہر جاؤں گا، تم اندر ہی رہنا۔ یہاں تم نئی ہو، باہر نکلیں تو راستہ بھول جاؤ گی اور پریشانی الگ ہو گی، کیونکہ تمہارے لیے یہاں شناخت کا باعث صرف میری ہی ذات ہے، ورنہ تمہارے لیے قانونی مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔"

رابرٹ نے چالاکی سے کہا اور پھر دو ایک گھنٹوں کے بعد وہ باہر گیا۔ وہ فلہم [illegible] اس کے جسم پر پرانی پتلون، کھلی [illegible] کوٹ تھا اور سر پر ہیٹ۔

وہ ایک اسٹیم بس کے ذریعے سوہو کے علاقے میں واقع ایک کلب "پیراڈائز نائٹ کلب" پہنچا۔

سب کچھ ویسا ہی لگا، بھلا اتنے دنوں میں کیا بدل جاتا تھا۔ یہ تو اس نے سادہ لوح سونجنا کو بے وقوف بنانے کے لیے کہا تھا۔ کلب کے دو پارٹنرز، جو اور رینڈی تھے۔ جو کی فربہ اندام بیوی، فریو...... جس پر رابرٹ عاشق بھی تھا، محض اس لیے کہ یہ کلب اسی کی ملکیت تھا اور اس کے شوہر کی پارٹنر رینڈی اخراجات کا ذمے دار، بہرحال پارٹنرز کی اچھی بیت رہی تھی۔

رینڈی کی بیوی مر چکی تھی اور اس نے کسی ڈانسر سے ان دنوں دوستی گانٹھ رکھی تھی۔ بعد میں اس دوستی کا کیا انجام ہوا، یہ رابرٹ نہیں جانتا تھا۔

رابرٹ کو انہوں نے یہاں تین پاؤنڈ ہفتہ مشاہرے پر "سیکسوفون" بجانے کی نوکری پر لگا رکھا تھا۔ رابرٹ سیکسوفون بہت اچھا بجاتا تھا۔ جو اور رینڈی اس کے نخرے بھی اسی وجہ سے سہتے تھے۔ رابرٹ ان سے اپنی اجرت

بھی بڑھواتا رہتا تھا۔ نت نئی فرمائشیں الگ کرتا۔

جو کی بیوی سے "چھیڑ چھاڑ" جاری تھی، وہ رشوت کے طور پر اس کی چھیڑ چھاڑ سہہ لیا کرتی تھی، مگر ایک حد سے زیادہ اسے بڑھنے نہیں دیتی تھی۔

رابرٹ کو پورا یقین تھا کہ اسے دیکھتے ہی جو اور رینڈی ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اس نے بھی سوچ رکھا تھا کہ وہ زیادہ مشاہرے کے علاوہ ان سے رہائش کا بھی بندوبست کرنے کا مطالبہ کرے گا۔

رابرٹ ایک چالاک شخص تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس کے پاس نادر و نایاب نمونوں کا صندوقچہ تھا۔ وہ صرف انہیں ہی منہ مانگے داموں فروخت کر دیتا تو اس کی پوری عیاشیوں کے ساتھ اس کے سال دو سال بغیر کسی ملازمت کے نکل جاتے۔

لیکن حالات کے سرد و گرم نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے انہیں بیچنے میں جلدبازی کا مظاہرہ کیا تو اس سے یہ دولت چھن بھی سکتی تھی۔ ان دنوں لندن میں لاقانونیت اور لوٹ مار اور چوربازاری عروج پر تھی۔

اس لیے وہ بڑے دھیان سے اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہتا تھا۔ ایک نئی زندگی کو معمول پر لانے کے لیے اس نے فی الحال خاموشی اختیار کرنا اور نارمل انداز میں [illegible] رابرٹ [illegible] پیراڈائز نائٹ کلب پہنچا تو رابرٹ کو وہ تینوں دیکھتے ہی پہچان گئے لیکن رابرٹ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے اسے کوئی خاص لفٹ نہیں کروائی۔ اسے کلب کی رونقوں اور چمک دمک میں بھی اضافہ ہی محسوس ہوا تھا۔

ایک رسمی سی ہائے، ہیلو انہوں نے کی تھی اور پھر اسے باہر کا راستہ دکھا دیا تھا۔

رابرٹ کو جیسے ہی اپنی اوقات یاد آئی تو وہ الثاان کی منت سماجت پر اتر آیا اور پرانے واسطے دیے۔ اگرچہ پرانے واسطے بھی اس کے کوئی قابلِ ذکر نہیں تھے، لیکن پھر بھی رینڈی اور جو کو اس پر رحم آ ہی گیا اور انہوں نے بہت کم اجرت پر اسے سیکسوفون بجانے پر ملازمت پر رکھ لیا۔

رابرٹ کے لیے یہی بہت تھا۔ اب وہ اطمینان سے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اب سونجنا کو کہیں "کھپانے" یا بالفاظِ دیگر اسے کام میں لانے کے منصوبے بنانے لگا۔ اسی دوران چند روز مزید بیت گئے۔

ادھر قسمت کی ماری الم نصیب سونجنا کو اس بھیانک حقیقت کا احساس ہونے لگا تھا کہ تقدیر اس کے ساتھ کیسا خوف ناک مذاق کر چکی تھی۔ رابرٹ کو ایک نائٹ کلب میں سیکسوفون کی گھٹیا درجے کی نوکری کرتے دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اب راج کماری نہیں رہی تھی، بلکہ وہ تو کچھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی مثال تو رابرٹ کی ایک رکھیل جیسی بن گئی تھی۔ وہ مشرقی لڑکی تھی، ذلت کی جس کھائی میں اپنی نادانی میں آ کر گر چکی تھی، اس کے لیے وہ تقدیر کو بھی دوش نہیں دے سکتی تھی۔

تب اس نے مشرقی لڑکیوں کی طرح سوچا کہ جو بچی کھچی شناخت اس کے پاس رہ گئی تھی، کم از کم اسے ہی معتبر بنا لے۔ اس کے لیے اس نے رابرٹ پر شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا مگر وہ اسے مسلسل ٹالتا رہا۔ کبھی پیار سے کبھی غصے سے...... جھڑک بھی دیتا۔ سونجنا رونے لگتی تو رابرٹ اسے پیار سے سمجھانے لگ جاتا۔

"ڈارلنگ! تم بہت جلدی دل چھوٹا کر لیتی ہو۔ اس وجہ سے میں بھی چڑچڑا ہو جاتا ہوں۔ دیکھو، ہمیں لندن آئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ میں کوئی آوارہ گردی تو نہیں کرتا، کام کرنے لگا ہوں۔ کچھ دن صبر کر لو...... بہت جلد حالات اچھے کر لوں گا۔"

"رابرٹ! میرا یہاں تنہائی میں دل گھبراتا ہے۔ [illegible] سناتے ہیں، تم شام کو جاتے ہو رات [illegible] میں پاگلوں کی طرح کھاٹ پر پڑی رہتی ہوں۔" وہ سسک کر کہتی۔

اچانک رابرٹ کے ذہن میں ایک خیال آیا، اس نے کچھ سوچ کر چالاکی سے کہا۔

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ ایسی تنہائی میں تمہارا دل ضرور گھبراتا ہو گا۔ چلو، آج تم بھی میرے ساتھ کلب چلو، وہاں تمہارا دل بہل جائے گا اور ممکن ہے تمہیں وہاں کوئی کرنے کو اچھا کام بھی مل جائے۔"

سونجنا سوچتی رہ گئی اور رابرٹ اسے تیار کر کے نائٹ کلب میں لے آیا۔

رینڈی اور جو نے رابرٹ کے ساتھ ایک معصوم، مگر حسین اور جمیل لڑکی کو دیکھا تو مبہوت سے ہو کر رہ گئے۔

رابرٹ کے چہرے پر کمینی سے مسکراہٹ رقصاں ہو گئی تھی اور ادھر سونجنا، کلب کے دھواں دھار شور شرابے والے ماحول کو دیکھ کر سراسیمہ سی نظر آنے لگی۔

☆☆☆

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

چیتن شرما، لندن کی بندرگاہ پرا تر ااور رابرٹ اور سونجنا کو ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔ اس نے ان دونوں کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ دونوں اسے مل کر ہی نہ دیے، یوں جیسے ان دونوں کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

وہ بالآخر اپنا سامنہ لے کر بکنگھم پیلس کی طرف چل دیا۔

لیکن رابرٹ، شفیق کو جل دینے میں ناکام رہا تھا۔ اس میں شفیق کا سونجنا سے دلی لگاؤ بھی تھا اور ایک جذبۂ ہمدردی بھی کہ اس نے ان دونوں کو ایک پل کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے دور نہیں ہونے دیا تھا، یوں اس میں اس کی چابک دستی کا بھی دخل تھا۔

اس نے لندن میں ایک جگہ اپنے باپ مقبول مٹھون کو بٹھا کر اپنا انتظار کرنے کا کہا اور فوراً ان دونوں کے تعاقب میں ہولیا۔ یہاں تک کے اس نے فلہم روڈ پر ان کا بوسیدہ اور تنگ و تاریک ٹھکانا بھی دیکھ لیا۔ پھر یہ سوچ کر کہ اب چونکہ اس نے سونجنا کا ٹھکانا دیکھ ہی لیا ہے اور دوبارہ بھی یہاں آسکتا ہے تو وہ پلٹ گیا اور اپنے باپ کو لے کر ان کے دوست مشتاق قیصرانی کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

جزیرے میں رات کی گہری پڑتی تاریکی میں وہ تینوں کوہ شکن عزم اور حوصلوں کے ساتھ سی ہاک کی جانب پیش قدمی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ [illegible] جہاز تاریکی میں غرق تھا۔

"یہ بہترین موقع ہے گوریلا کارروائی کا۔" کیپٹن جیمس نے جوش سے مرتعش اور سرگوشی کا تاثر دیتی آواز میں کہا۔

"ہوں...... آگے بڑھتے رہو۔" علی بھی اسی انداز میں بولا۔ ابھی یہ تینوں چند ہی قدم مزید آگے بڑھے تھے کہ زمان نے انہیں ایک دم رکنے کا اشارہ کر دیا۔

"کیا ہوا؟" علی نے پوچھا۔

"شش...... آواز مدھم رکھو۔" زمان بولا۔ "اور سامنے ذرا غور سے دیکھو۔ مجھے وہاں کچھ لوگوں کے ہیولے متحرک محسوس ہوئے ہیں۔"

زمان کی بات درست ثابت ہوئی۔ ایک طرف کو جھکے جھکے سے جہاز کے ڈیک پر انہیں بھی چند انسانی ہیولوں کی حرکت نظر آ گئی۔

"اوہ...... یہ تو پہرے پر ہیں۔" علی کے منہ سے مدھم سے الفاظ برآمد ہوئے۔

"نہ صرف پہرے پر بلکہ یہ سب مسلح بھی لگتے ہیں۔" جیمس بولا۔

"کوئی پروا نہیں، دکھائی تو دے رہے ہیں نا۔ اب انہی پر سب سے پہلے حملہ کرنا ہو گا۔" زمان نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم تینوں اب ایک ساتھ جہاز کی طرف بڑھنے کے بجائے تین الگ الگ سمتوں سے آگے بڑھیں۔" علی نے جنگی حکمتِ عملی بیان کر ڈالی۔

اس پر صاد کرتے ہوئے وہ پانی میں اتر گئے۔ کھوکھلی شاخوں کا بندوبست انہوں نے پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ انہیں منہ میں دبا کر اور اس کا سرا پانی کی سطح سے اونچا کر کے وہ پانی کے اندر ہی اندر تیرتے ہوئے بالآخر جہاز تک جا پہنچے۔

اس کے بعد وہاں سے، کپتان گرے ہنٹ کے مسلح پہرے داروں کی نظروں میں آئے بغیر جھولتے رسوں کی مدد سے اوپر چڑھنے لگے۔

بلاشبہ یہ ان کا ایک خطرناک عمل کہا جا سکتا تھا۔ عرشے پر موجود کسی بھی پہرے دار کی ان پر نگاہ پڑ جاتی تو وہ آسانی سے اپنی بارودی بندوق سے ان کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ بدقسمتی تھی یا پھر منزل قریب پا کر فوراً اس کی جانب پیش قدمی کرنے کا جنون کہ زمان ایک پہرے دار کی نظر میں آ گیا۔ اس نے وہیں سے ریلنگ پر ذرا جھک کر اپنی بندوق سے دھماکا کر ڈالا۔ زمان کی چیخ ابھری اور وہ عرشے کے قریب پہنچتے [illegible] زور دار چھپاکا [illegible] بندوق کا دھماکا اور زمان کی چیخ نے علی کو دہلا دیا۔ کیپٹن جیمس کے بھی اوسان خطا ہو گئے۔

اب اگلے چند لمحات میں ان کا بھی دیکھ لیا جانا تھا۔ علی کو اپنے ساتھی زمان کی تشویش ہو رہی تھی، زمان کی پر اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اس کے چشم تصور میں ایک صورت رقصاں ہونے لگی جو پھونس کے جھونپڑے میں زمان کی منتظر تھی۔

ان نازک گھڑیوں میں اسے فوری فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے مشن جاری رکھنے کو ترجیح دی اور اپنی رفتار تیز کر دی، یہی کیپٹن جیمس نے بھی کیا۔

دونوں جیسے ہی عرشے پر نکلے، تاریکی میں بیک وقت کئی بندوقوں نے شعلہ دار دھماکے اگل دیے، اس بات کی توقع تھی، اسی لیے عرشے پر پاؤں رکھتے ہی وہ دونوں خود کو پہلے ہی گرا چکے تھے۔ خنجر اور تلوار ان کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ دونوں مختلف سمتوں میں لڑھک گئے اور بڑے بڑے لوہے کے ڈرموں کے عقب میں چلے گئے۔

علی کی تاریکی میں گھورتی عقابی نظروں نے دو بندوق

بردار ہیولوں کو قریب آتے دیکھا اس نے لات مار کے ایک ڈرم کو پرے دھکیلا، وہ دونوں بدک کر اس طرف متوجہ ہوئے اور علی چیتے جیسی برق رفتاری کے ساتھ رینگتا ہوا ان کے عقب میں طلوع ہوا اور تلوار کا ایک وار دشمن کی پیٹھ پر کیا۔ وہ وہیں کریہہ انگیز چیخ مار کے گرا، دوسرا اچھل کر پلٹا ہی تھا کہ علی نے اس کے بھی سینے میں تلوار پیوست کر دی، وہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔

دونوں بندوقیں قبضے میں کرتے ہی علی، کیپٹن جیمس کی مدد کو جا پہنچا۔ جدھر وہ ایک ہٹے کٹے ملاح سے نبرد آزما تھا۔ علی بہت بروقت اس کے قریب پہنچا تھا کیونکہ ایسے سنگین لمحات میں جیمس کے عقب میں دو ملاح ابھرے اور جیمس کو نشانہ بنانے کے لیے پر تول ہی رہے تھے کہ علی نے ایک پر فائر کر دیا۔ وہ چیخ مار کے گرا...... جیمس چونکا، تب اس نے اپنے مدمقابل کے پہلو میں خنجر سے وار کر ڈالا...... وہ چیخ مار کے اپنا پہلو پکڑے گر پڑا۔

بندوق سے مرنے والے کا ساتھی، علی کو نشانہ بنانے لگا تھا کہ علی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ برجی کی آڑ میں چلا گیا اور جیمس کو بھی اپنے ساتھ رگید لیا۔ ہٹا کٹا ملاح دیکھتا ہی رہ گیا مگر جھلا کر اس نے فائر داغ ڈالا۔ رات کے سناٹے میں ایک اور بھیانک چیخ ابھری۔ یہ کون تھا جو اس فائرنگ کی آواز پر اپنے کیبن سے بوکھلاہٹ اور پریشانی میں اوپر [illegible] گیا۔ [illegible] برٹش آرمی آفیسر جوزف [illegible] تھا۔ وہ ایک اور [illegible] جو معاملے کو دیکھنے لیے نکل آئے تھے، لیکن بدقسمتی سے کوتن کچھ زیادہ ہی جلد بازی کا مظاہرہ کر بیٹھا تھا اور گویا "کراس فائرنگ" کی زد میں آ گیا تھا۔

علی اور جیمس کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ آ گیا تھا۔ سی ہاک کا کپتان گرے ہنٹ اپنا بارودی پستول لیے اوپر آ چکا تھا۔ وہ یہی سمجھے ہوئے تھا کہ شاید جزیرے کے وحشی قبائلیوں نے حملہ کر دیا ہے۔

وہ دھڑلے سے عرشے پر آیا تو اس کے باقی ماندہ آدمیوں نے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

جب گرے ہنٹ کو یہ پتا چلا کہ حملہ آور جنگلی وحشی نہیں بلکہ ان کی طرح کے ہی بہادر آدمی تھے تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن باوجود اس کے گرے ہنٹ کی سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے تھے۔

وہ دہاڑ کر بولا۔ "انہیں ڈھونڈو اور بھون ڈالو انہیں۔" ساتھ ہی اس نے دیگر ملاحوں کو بھی اوپر مدد کے لیے بلا لیا۔

علی اور جیمس برج کے پیچھے سے رینگتے ہوئے اس طرف کو بڑھنے لگے تو بیک وقت کئی ملاحوں نے ان پر چھلانگیں لگا دیں۔ یہ حملہ اچانک تھا۔ وہ ان کے نرغے میں آکر بے بس ہو گئے۔ انہوں نے ڈنڈے سونٹے یا جو بھی ان کے ہاتھ لگا تھا، وہ ان پر برسا دیے۔

علی اور جیمس بے بس ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہی ان کی مشکیں کس کر گرے ہنٹ کے سامنے اس کے کیبن میں پیش کیا گیا۔ گرے ہنٹ بڑی خشم آلود نظروں سے ان کی طرف گھورنے لگا۔

دیگر مذکورہ شخصیات بھی مع جوزف کے وہاں...... موجود تھیں۔ ریٹا شوہر کی ہلاکت پر رونا دھونا مچا کر غشی میں مبتلا ہو گئی تھی اور اسے دوسرے کیبن میں چند ملاح سنبھالنے میں مصروف تھے۔

"کون ہو تم لوگ اور ہم پر حملہ کیوں کیا؟" گرے ہنٹ نے زہر خند لہجے میں باری باری ان کے چہروں کی طرف گھورتے ہوئے سوال کیا۔

علی کے ہمراہ ایک انگریز کو دیکھ کر ان سب کو حیرت بھی ہوئی تھی۔ بالخصوص جوزف جو خود بھی بہ قول اس کے برٹش آرمی کا افسر تھا، بہ غور کیپٹن جیمس کو تکے جا رہا تھا اور سخت قسم کے مخمصے کا شکار تھا۔

"ہم لوگ بھٹکے ہوئے مسافر ہیں۔" علی نے دماغی چالاکی چلتے ہوئے جواب میں کہا۔

"ہوں...... مسافر......" گرے ہنٹ زہریلے طنز سے بولا۔ اس دوران جوزف نے مداخلت کرتے ہوئے ان سے کچھ پوچھنا چاہا تھا کہ گرے ہنٹ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کرا دیا اور علی کی جانب بدستور زہر خند نظروں سے گھورتے ہوئے غرا کر بولا۔

"بھٹکے ہوئے مسافر تلواروں سے ایک پھنسے ہوئے جہاز پر اس طرح ہلا بولتے ہیں؟ تیس برس ہو گئے ہیں مجھے سمندر گردی کرتے ہوئے۔ آسمان پر اڑتے پرندے دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ وہ خشکی کے ہیں یا پانی کے۔ سچ سچ بتاؤ تم دونوں کون سے بحری ڈاکوؤں کے گروپ سے تعلق رکھتے ہو؟ آٹوما بنگا، یا پھر شو پر اسٹانز......؟"

کپتان گرے ہنٹ کو ڈاکوؤں کے گروہوں کے نام گنواتے سن کر علی فوراً جانچ گیا کہ اس کا سامنا کسی عام کپتان سے نہیں بلکہ کسی گھاگ آدمی سے ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گرے ہنٹ نے اپنی آنکھوں سے انہیں جہاز پر ہلا بولتے نہیں دیکھا تھا۔

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

لہٰذا وہ بھی مرعوب ہوئے بغیر بولا۔ ''یہ تمہاری غلط فہمی ہے جو ہمیں ایسا سمجھ رہے ہو۔ ہم خود بے خانماں و برباد لوگ ہیں۔ اس جہاز کو دیکھ کر ہم دونوں مدد کے لیے ہی یہاں آ رہے تھے کہ ہم پر بغیر پوچھے آتشیں اسلحے سے حملہ کر دیا گیا۔ ہمارے ایک ساتھی کو بھی گولی ماردی گئی۔ ہمیں بھی غصہ آ گیا اور تلواریں ہمیں عرشے پر ہی پڑی ملی تھیں۔''

''تم لوگ آواز دے سکتے تھے؟''

''تاریکی میں ہمیں جہاز میں کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔'' اس بار کیپٹن جیمس نے جواب میں کہا۔ وہ بھی اب علی کی ''حکمت عملی'' سمجھ چکا تھا اور اس نے بھی ویسا ہی موقف اور اندازِ گفتگو اپنایا تھا۔ وہ آگے بولا۔

''ہم یہی سمجھے تھے کہ...... یہ ایک تباہ حال جہاز ہے جو طوفان میں گھر کر یہاں آن پھنسا تھا۔''

''تم کون ہو؟'' جوزف نے گرے ہنٹ کے منع کرنے کے باوجود ازراہِ تجسس جیمس سے سوال پوچھ لیا۔

''میں ...... میں برٹش آرمی کا ایک کیپٹن ہوں، میرا نام جیمس ہے۔'' بالآخر جیمس نے اپنا تعارف کرایا تو جوزف کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے کڑک دار آواز میں گرے ہنٹ سے کہا۔

''کپتان! یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ درست ہے، مجھے پہلے ہی......''

''یوشٹ اپ......'' گرے ہنٹ نے [illegible] طرح اسے جھڑک دیا۔ جوزف بھی اگرچہ ایک آرمی افسر ہی تھا اور اب تک حالات کی مجبوری کے پیش نظر اس کے منہ لگنے سے اجتناب ہی برتتے ہوئے تھا لیکن اس بار وہ بھی گرے ہنٹ کا سخت رویہ برداشت نہ کر سکا اور کڑک کر بولا۔

''مسٹر گرے! اپنی زبان کو لگام دو۔ ہم بہت دیر سے تمہارا یہ بے ہودہ رویہ برداشت کیے ہوئے ہیں۔ مت بھولو کہ...... ریتا کا شوہر بھی تمہارے ہی جنگجو وحشی ملاحوں کی گولی کا نشانہ بنا ہے......''

اس کی بات پر گرے ہنٹ ہتھے سے اکھڑ گیا اور فوراً اپنا پستول نکال لیا۔ وہ اس کی طرف مڑا اور نال جوزف کی پیشانی سے لگا دی۔ کیبن میں چند کراہتی ہوئی آوازیں ابھریں۔

''مسٹر جوزف! اگر تم نے ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نکالا تو میں تمہاری پیشانی میں سوراخ کر دوں گا۔'' گرے ہنٹ نے یہ سفاکانہ الفاظ اس قدر غصیلے انداز میں کہے تھے کہ اس کے منہ سے رال بہہ نکلی تھی۔ جوزف کو ایک لمحے کے لیے جیسے سانپ سونگھ گیا۔

اسی وقت وہ پلٹا اور ایک ملاح سے تحکمانہ در[illegible] پاگل دیوانوں کی طرح چیخ کر بولا۔

''اسے میرے کیبن سے لے جاؤ اور اگر یہ[illegible] یہاں نظر آیا تو میں تمہیں گولی سے اڑا دوں گا۔'' [illegible] ملاح اس کے حکم پر جیسے چابی بھرے کھلونوں کی طرح [illegible] میں آئے اور...... جوزف کو بازوؤں سے دبوچ [illegible] کی طرف بڑھے اور اسے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

''خبردار! اب اگر کوئی میرے معاملات [illegible] بولا...... میں اس جہاز کا کپتان ہوں اور یہاں صرف [illegible] چلے گا۔'' غصے سے دہاڑتے ہوئے گرے ہنٹ [illegible] لوگوں کو بھی اپنے رہائشی کیبن میں چلے جانے کا حکم [illegible]

وہ سب ایک ایک کر کے باہر نکلتے چلے گئے [illegible] صرف وہاں چند ملاح رہ گئے تھے۔

گرے ہنٹ نے علی اور جیمس کو بھی ایک [illegible] اسٹور نما کیبن میں ڈلوا دیا اور اپنے چند جنگجو مسلح ملا[illegible] جزیرے کی طرف روانہ کر دیا کہ اگر ان کے اور [illegible] ہوں تو انہیں زندہ یا مردہ یہاں پکڑ کے لے آئیں۔

وہ سب فدویانہ انداز میں اس کے حکم کے آ[illegible] کر کیبن سے نکلتے چلے گئے۔

ان سب کے جانے کے بعد گرے ہنٹ [illegible] جگہ پر کھڑ[illegible] اپنی پتلون کی بیلٹ [illegible] انڈیلی اور اپنی میز کے پاس آ بیٹھا۔ ہاتھ میں پکڑے گلاس سے ایک گھونٹ شراب [illegible] کے بعد اس نے وہ میز پر رکھا اور کسی گہری سوچ میں [illegible] ہو گیا۔

دوسرا گھونٹ شراب کا بھرا تو اسی وقت اس [illegible] راجن اندر داخل ہوا۔

''کوئی حکم سرکار......؟'' وہ اس کے سا[illegible] باندھ کر مؤدبانہ بولا۔

''راجن! چرا دو مجھے......'' گرے ہنٹ نے [illegible] سے کہا۔ راجن نے فوراً اپنی بغیر آستینوں والی [illegible] جیکٹ سے ایک کپڑے کی گوتھلی اس کی جانب بڑھا د[illegible]

''بیٹھ جاؤ یہاں......'' گوتھلی اس کے ہاتھ [illegible] کر گرے نے اس سے کہا۔

راجن خاموشی سے اس کے سامنے والی کرسی [illegible] گیا۔ گرے ہنٹ کی نظریں اس کے جھکنے پڑ[illegible] چہرے پر جمی رہیں اور ساتھ ہی وہ گوتھلی کی ڈوری [illegible]

کرنے لگا۔

''کیا صورت حال ہے؟''

''کچھ ٹھیک نہیں سرکار......!'' وہ اسی طرح جھکے سر سے جواب میں بولا۔

''ہوں......'' گرے ہنٹ کے منہ سے نکلا۔ اس وقت اس کی وحشت برساتی آنکھوں سے عجیب تاثرات مترشح ہو رہے تھے۔ ''پھر بھی، کچھ بتاؤ تو سہی، پتا چلے کہ اندر میرے بارے میں کیا سوچا جا رہا ہے۔''

کہتے ہوئے اس نے گوتھلی کے کھلے سرے سے تھوڑا کچا تمبا کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر الٹا، گوتھلی میز پر رکھی اور دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے اسے مسلتے ہوئے راجن کے جھکے ہوئے چہرے کو گھورنے لگا۔

''ان کا...... خیال ہے...... کہ آپ کی نیت...... ٹھیک نہیں ہے۔'' راجن نے جیسے اٹکتے اٹکتے انکشاف کیا۔ گرے ہنٹ نے کھانسنے کے انداز میں استہزائیہ ساٹھ کا مارا۔ اسی لہجے میں بولا۔

''میری نیت کو کیا ہوا ہے؟ کھل کر بولو...... کیا سمجھے ہوئے ہیں وہ مجھے؟''

راجن نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک نگاہ دروازے پر ڈالی، کھڑا ہوا اور چند قدم آگے بڑھا پھر کیبن کا دروازہ تھوڑا کھول کر رازدارانہ انداز میں باہر جھانکا۔ گرے ہنٹ گمبھیر سی ساکت [illegible] سے اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتا ر[illegible] راجن [illegible] دروازہ بند [illegible] واپس پلٹا اور کرسی پر دوبارہ بر[illegible] ہو [illegible] بولا۔

''سرکار......! ان کا خیال ہے کہ آپ خزانے پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔'' اپنے خادم خاص کے اس انکشاف پر گرے ہنٹ پہلے تو ذرا چونک سا گیا۔ پھر چند لمحے اس کے چہرے پر سناٹے کی سی کیفیت طاری رہی، اس کے بعد اس نے ایک بدمست سا قہقہہ بلند کیا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔

''ہوں...... ان کا خیال تو غلط ہے مگر بُرا ہرگز نہیں۔''

راجن نے قدرے چونک کر سر اٹھا کر گرے ہنٹ کی طرف دیکھا۔

''ان کے اس الزام نے تو مجھے ایک نئی راہ سجھا دی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے راجن......؟'' گرے ہنٹ نے آخر میں یہ کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

راجن، جو اپنے کپتان کی بات کا کچھ کچھ مطلب سمجھنے لگا تھا، اٹکتے ہوئے جواب میں بولا۔

''مم...... میں شاید آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا......'' اس کا انداز محتاط تھا۔

گرے ہنٹ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مکاری سے مسکرایا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شراب کا گلاس اس نے میز سے اٹھا لیا تھا۔ راجن بھی کھڑا ہو گیا۔ گرے ہنٹ اس کے قریب پہنچا اور گہری نظروں سے راجن کے چہرے کی طرف تکنے لگا پھر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بھاری آواز میں بولا۔

''تم میری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نن...... نہیں سرکار! جج...... جیسا آپ کا حکم۔'' راجن ہکلانے لگا۔

''تم میرا ساتھ دو گے نا......؟''

''سس...... سرکار! میں نے کہا نا...... جیسا آپ کا حکم۔''

''ساری زندگی عیش و آرام میں گزرے گی ہماری۔''

''لل...... لیکن سرکار! اتنا بڑا خزانہ...... سنبھلے گا کیسے؟''

''یہ میرا کام ہے، بس! تم میرا ساتھ دو......''

''بب...... باقی لوگ......؟''

''ہوں...... باقی لوگ...... یہ سوچنے کی بات ہے۔''

گرے ہنٹ رخ موڑ کر کچھ سوچنے کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک گھونٹ بھرا۔ اس کی گھنی بھوری بھوؤں سے ڈھکی آنکھوں میں اسرار بھری چمک ہلکورے لینے لگی تھی......

☆☆☆

شاہ زمان [illegible] ''کاروانِ مجاہد'' کا ایک خالصتاً جنگجو مزاج [illegible] گولی چلا تھا۔ اس نے دھماکے کی آواز سنتے ہی رسّے کو چھوڑ دیا تھا۔ ممکن ہے یہ غیر ارادی عمل رہا ہو، مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے حلق سے چیخ بھی بلند کی تھی تاکہ فائر کرنے والے کی تسلی ہو جائے کہ اس کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔

ایک زوردار چھپاکے سے پانی میں گرنے کے بعد ہی اس نے فوراً ڈبکی لگا دی تھی اور...... دوسری جگہ سے ابھرا تھا۔ اس نے پہلے دل ہی دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر... ادا کیا کہ اسے موت کے سفاک پنجوں میں جانے سے بچا لیا۔

اب وہ پہلے سے بھی زیادہ محتاط تھا لیکن اسے فکر علی اور جیمس کی تھی کہ وہ بھی ان کی نظروں میں آ گئے ہوں گے، بلکہ وہ اس کے لیے بھی فکرمند ہو گئے ہوں گے۔ اس دوران میں اوپر جہاز کے عرشے پر بندوق کے دھماکے ہوئے۔

''فکر مت کرنا دوستو! زمان کا خون اتنا سستا نہیں...... میں بھی آ رہا ہوں۔'' وہ جوش تلے خود کلامیہ بڑبڑایا اور پانی

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

میں آہستہ آہستہ ہاتھ پیروں کو چپوؤں کے انداز میں چلاتا ہوا ذرا دیر بعد نسبتاً...... محفوظ مقام سے ایک جھولتا رسّا تاک کر اسے پکڑ لیا اور اوپر چڑھتا چلا گیا۔

ایسے ہی لمحات میں ایک بار پھر اسے بندوقوں کے دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں، اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے دونوں ساتھی اوپر عرشے پر اپنے قدم جما چکے تھے اور ان پر حملہ کر دیا گیا تھا۔

یہ سوچتے ہی جیسے اس کے توانا بازوؤں میں بجلی دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ جب تک وہ وہاں پہنچا، معاملہ نمٹ چکا تھا۔ چند ایک مسلح افراد کے سوائے اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ اس کی تلوار پانی میں گر چکی تھی۔ وہ نہتا ہونے کے باوصف خود کو کبھی نہتا نہیں سمجھتا تھا، وہ صرف اپنے شیر دل جذبے کو ہی ہتھیار سمجھتا تھا۔

اس نے عرشے ہی کے ایک مقام پر چھپ کر سامنے اور دائیں بائیں کا نظارہ کیا اور پھر جھکا جھکا آگے کی طرف بڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر پہلے اسے عرشے پر کچھ مزید لوگوں کی چہل پہل اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آئی تھیں پھر خاموشی چھا گئی تھی۔

اس نے کسی چیتے جیسی پھرتی کے ساتھ ایک تنومند ملاح کو جا دبوچا۔ وہ گڑبڑایا اور جوابی حملے کی نیت سے اپنی بندوق چھتیانے کی کوشش کی مگر اب شاہ زمان [illegible] موقع دینے والا تھا۔ ایک زوردار گھونسا اس کی کنپٹی [illegible] رسید کر دیا [illegible] ساتھ ہی اس کے منہ کو بھی ایک ہاتھ سے بند کر دیا تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ گھٹی گھٹی سی کراہ خارج کرنے کے بعد وہ ملاح ٹھنڈا پڑ گیا۔

شاہ زمان نے اس کی بندوق چھین لی تھی اور دوبارہ آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک اور شخص اس پر پل پڑا۔ اس کے ہاتھ میں موٹا سا سونٹا تھا۔ زمان اس پر بندوق سے حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا، لہٰذا جیسے ہی وہ ملاح سونٹا تانے اس کے قریب آیا، زمان نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق کو لٹھ کی طرح گھما کر اس کے سر پر بجا دیا۔ ملاح کا سر کسی ناریل کی طرح تڑخا اور وہ تیورا کر گر پڑا۔

اس نے بہ سرعت اپنی جگہ بدلی اور ایک تاریک کونے میں جا دبکا۔

چند ثانیے وہ اردگرد کی سن گن لیتا رہا، پھر خاموشی پا کر جہاز کے اس گوشے کی طرف رینگ گیا، جدھر اسے ایک چھوٹا سا اسٹور نما کیبن نظر آیا تھا۔ اس نے دروازے کو دیکھا اور چونک گیا۔ اس پر بڑا سا زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ لکڑی کے پٹ پر متوازی جھریاں بنی ہوئی تھیں۔

اس نے ایک جھری سے آنکھ چپکائی تو بری طرح چونکا۔ اندر مدھم روشنی میں اسے اپنے دونوں ساتھی علی ریحان اور کیپٹن جیمس رسن بستہ حالت میں کیبن کے سیلن زدہ فرش پر پڑے نظر آئے۔

زمان نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ لیے۔

☆☆☆

امپارا کوئی عام لڑکی نہیں تھی، ورنہ اتنے سارے وحشی جنگلیوں کو دیکھ کر مارے خوف کے اس کا دم ہی نکل جاتا۔

جنگلی تقریباً برہنہ تھے۔ انہوں نے بھورے کپڑے کی لنگوٹ باندھ رکھی تھی۔ ان کی کمر تک لنگوٹ نما کپڑا بندھا ہوا تھا۔

وہ سب کے سب مختلف نوعیت کے نیکلس اور بازو بند پہنے ہوئے تھے۔ بعض نے اپنے جسم پر رنگ بھی کیا ہوا تھا اور کئی نے سبز پتے بازوؤں پر باندھے ہوئے تھے۔

بعض کا جسم راکھ ملنے کی وجہ سے بھورا ہو رہا تھا، لیکن ان میں سب سے اچھوتی بات ان کے بالوں کا انداز تھا اور بیشتر کے بال وِگوں سے بھی زیادہ گھنے اور سخت لگ رہے تھے۔ جو گنجے تھے ان کی چندیا چمک رہی تھی۔

امپارا کو [illegible] ... جزیرے کے اندر کافی دور تک لے آئے۔

یہاں جا بجا الاؤ روشن تھے اور مشعلیں بھی روشن تھیں۔ ان کی روشنی میں امپارا کو اطراف میں پھونس اور کھپریل کے جھونپڑ دکھائی دیے۔

وہاں بھی اسے مختصر ستر پوشی میں جنگلی مرد عورتیں اور بچے بھی نظر آئے۔ ایک بڑے سے کھلے میدان میں جھولا رکھ دیا گیا مگر جال سے امپارا کو نہیں نکالا گیا۔ وہ ابھی تک مزاحمت کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔

تمام قبائلی اس کے گرد مجمع لگائے اکٹھے ہو گئے۔ شاید انہیں کسی کا انتظار تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب فضا میں ایک عجیب سی آواز ابھری۔ اس آواز کے سنتے ہی تمام لوگ دائرے کی صورت میں کئی قدم پیچھے ہٹتے چلے گئے۔

امپارا...... کو نہ جانے کیوں پہلی بار خوف کے عجیب احساس نے آن گھیرا تھا۔

(جاری ہے)

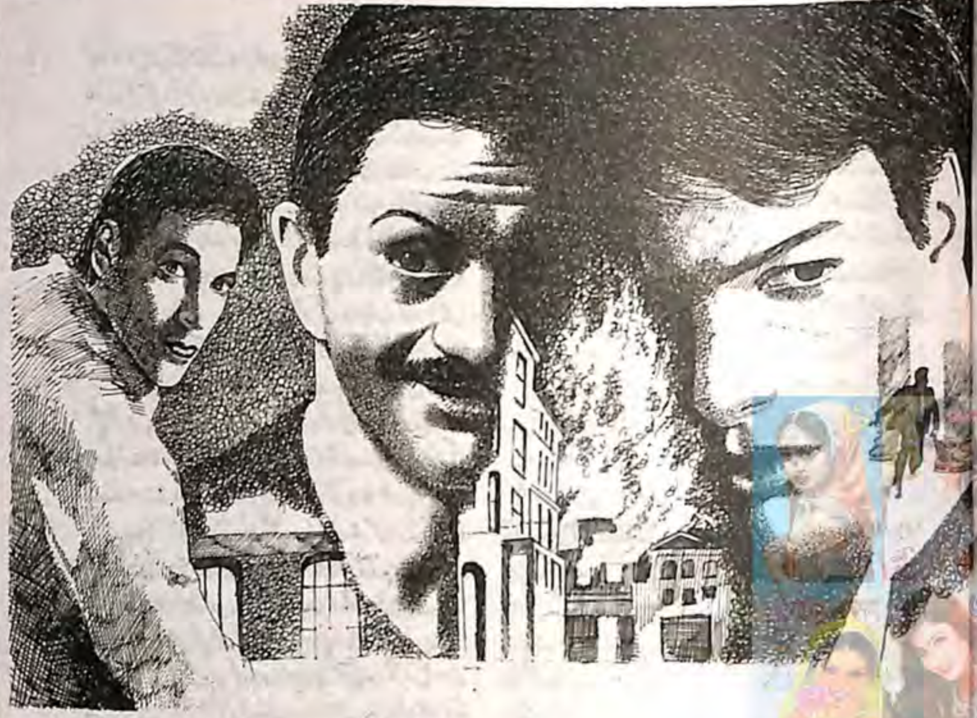

لاحاصل

[illegible]

مغربی معاشرے کی جس طرح محبت عجیب ہوتی ہے اسی طرح نفرتوں کا انداز بھی بڑا انوکھا ہوتا ہے... اگرچہ اسے جو چاہیے تھا اس کے لیے اس نے اپنی تمام توانائی خرچ کر ڈالی تھی مگر اس کی ہر کوشش لاحاصل ہی رہی کیونکہ... وہ اپنی تدبیروں میں گم ہو کر تقدیر کے لکھے کو بھول گیا تھا۔

ایک سعی لاحاصل کی تھکن کا عبرت اثر احوال

کرسمس سے اگلے دن جارج اور نارمن جارج کے اپارٹمنٹ میں لیمو کی عمدہ قسم کی شراب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جارج نے ہی فون کر کے نارمن کو اپنے اپارٹمنٹ میں بلایا تھا کیونکہ اس کے پاس مالا مال ہونے کا ایک بہترین پلان تھا۔ نارمن کو ہر قسم کے تالے کھولنے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ وہ دونوں اچھے دوست تھے اور زیادہ تر وارداتیں ساتھ ہی کرتے تھے۔ جارج کی نارمن سے پہلی ملاقات دو سال پہلے جیل میں ہوئی تھی، اس وقت جارج کی عمر

http://urdutubes.com/

عورت کا پرس چھیننے کے جرم میں سات ماہ کی سزا کاٹ رہا تھا۔ دونوں ہی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے اور ایک سی ذہنیت کے حامل تھے، جلد ہی دونوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ جارج کی رہائی سے دو ہفتے پہلے نارمن کی سزا مکمل ہوگئی۔ دونوں کے درمیان لائحہ عمل طے پایا تھا کہ نارمن باہر جاکر جارج کا انتظار کرے گا اور پھر جب جارج جیل سے رہا ہوا تو طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ سیدھا نارمن کے پاس پہنچ گیا۔ ان دو سالوں میں دونوں نے ساتھ ساتھ کئی کامیاب وارداتیں کیں......اور خوش قسمتی سے پولیس کی پکڑ سے بھی محفوظ رہے۔

نارمن نے شروع سے ہی یہ بات جارج پر واضح کردی تھی کہ جب اس کے پاس ایک معقول رقم جمع ہوگئی تو وہ مجرمانہ زندگی سے تائب ہوکر ورجینیا چلا جائے گا اور اپنی باقی زندگی بدلے ہوئے انسان کی حیثیت سے شریفانہ طریقے سے گزارے گا۔ اسی خواہش کی تکمیل کے لیے نارمن نے رقم جمع کرنا شروع کردی تھی جبکہ جارج کا رجحان شروع سے ہی نائٹ کلبوں میں جوا کھیلنے اور وہاں آنے والی عورتوں کی طرف تھا۔ اس کی زندگی میں کئی عورتیں آئیں اور جارج نے ان پر اچھا خاصا پیسا خرچ بھی کیا مگر جارج کی بدقسمتی تب شروع ہوئی جب اس کی زندگی میں شیرل آئی۔ وہ ستائیس سال کی چھوٹے سے قد کی مالک تھی۔ اس کے سنہرے بال لڑکوں کی طرح کٹے ہوئے تھے مگر اس کے نین نقش بڑے [illegible] خاصا پرکشش تھا۔ وہ جوئے کی بہت بڑی [illegible] اور منشیات کی عادی تھی۔ جارج نے اس پر بے دریغ دولت لٹائی حالانکہ نارمن نے شیرل کو لے کر جارج کو کئی بار خبردار بھی کیا مگر جارج نے کوئی توجہ نہیں دی۔ جلد ہی جارج کے اخراجات زیادہ اور آمدنی کم ہونے لگی۔ شیرل جارج کے ساتھ صرف تین ماہ رہی اور پھر جارج کے ایک لاکھ ڈالر لے کر کہیں غائب ہوگئی۔

شیرل کی بے وفائی اور دولت سے محرومی نے جارج کی صحت پر خطرناک اثرات مرتب کیے۔ وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوگیا۔ اسی ذہنی تناؤ نے اس کی جسمانی صحت تباہ کردی۔ اس کی قوت برداشت تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلد مشتعل ہوجاتا تھا۔ [illegible] رات بھی کرسمس پارٹی میں جارج نارمن سے ایک واردات کے بارے میں بات کرنے ہی والا تھا کہ نشے میں دھت ایک شخص جارج سے ٹکرا گیا اور اس کے ہاتھ میں موجود وائن جارج کے کپڑوں پر گرگئی۔ جارج کا چہرہ غصے اور طیش سے لال بھبوکا ہوگیا۔

"خبیث انسان! یہ تم نے کیا کیا؟" جارج خطرناک انداز میں اسے مارنے کے لیے جھپٹا۔ نارمن نے بہ مشکل اسے قابو کیا اور گھر لے آیا۔ نارمن اسے غصے کو قابو میں رکھنے کے مختلف طریقے بتاتا رہا۔ کچھ دیر بعد جارج نے سکون آور ادویات کھا کر نارمن کو جانے کے لیے کہا اور سو گیا۔

کرسمس سے اگلے دن یعنی آج جارج نے نارمن کو اپنے ہاں بلایا نئی واردات کی منصوبہ بندی کے لیے۔ یمو...کی شراب کا بندوبست جارج نے ہی کیا تھا۔ آج وہ خوشگوار موڈ میں لگ رہا تھا۔ جب اس نے دوسرا گلاس بھرا تو نارمن نے اسے ٹوکا۔

"بس کرو جارج! تم ذہنی تناؤ کے مرض میں مبتلا ہو، شراب کی زیادہ مقدار تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔"

"ہاں میرے دوست! صرف ایک مرتبہ اور۔" جارج نے تیسرا گلاس تیار کیا اور جلدی سے حلق میں اتار لیا۔ نارمن نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ جارج نے نارمن کی ناگوار نظروں کو محسوس کرلیا تھا اسی لیے وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"ایک یہی تو میرے اعصاب قدرے پرسکون رکھتی ہے اور میرے لیے......"

"یہ سب منفی اور مہلک طریقے ہیں۔" نارمن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "سچ کہو تو مجھے لگتا ہے کہ اسی چیز نے تمہارے اندر تحمل اور بردباری ختم کردی ہے۔ شاید تمہیں کرسمس پارٹی یاد نہیں ہے تم نے وہاں جو بدمزگی دکھائی وہ بیان سے باہر ہے۔"

"ہاں تم صحیح [illegible] ذہن کو قدرے قابو کیا تھا۔" جارج نے شراب کی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا اس بحث کو ختم کرتے ہیں، تم کسی واردات کا ذکر کرنے والے تھے؟" نارمن اصل موضوع کی طرف آیا۔

"ہاں میں تمہیں بتاتا ہوں۔" جارج اسے صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔

"میں پارک میں واک کے لیے گیا تھا وہاں قدرے ڈھلتی ہوئی عمر کی ایک عورت پریشان صورت لیے خاردار جھاڑیوں میں کچھ تلاش کررہی تھی۔ ساتھ ہی وہ اونچی آواز میں باربار ٹیری، ٹیری پکار رہی تھی۔ میں اس کے قریب رک گیا اور پریشانی کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ صبح سے اس کی پالتو بلی جس کا نام ٹیری تھا، گھر سے غائب ہوگئی، تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ان خاردار جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ بلی کو نکالنے کے چکر میں اس عورت کے ہاتھوں پر چند خراشیں آگئی تھیں۔

"میں نے عورت کو ایک طرف ہونے کا کہا اور قدرے دشواری کے بعد اس کی بلی کو خیریت سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔

"اوہ میری پیاری ٹیری۔" عورت نے جلدی سے مجھ سے بلی کو لیا اور پیار سے گلے لگالیا۔ میں مسکراتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھا تو عورت نے جلدی سے مجھے پکارا۔ "اے لڑکے...... ذرا ٹھہرو۔" میں مڑا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ "تمہارا بے حد شکریہ۔" وہ تشکرانہ لہجے میں بولی۔ "تم نے میری بہت مدد کی ہے۔ جانتے ہو ٹیری مجھے اپنی اولاد کی طرح ہی عزیز ہے، تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔"

"نہیں شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"تو چلو میرے ساتھ، میرا گھر قریب ہی ہے، ایک کپ کافی ہی پی لینا۔"

"تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد میں اس عورت کے ساتھ چل پڑا۔ وہ بہت باتونی عورت تھی۔ راستے میں اس نے اپنے بچوں، شوہر اور گھر سے متعلق بہت ساری باتیں مجھے بتائیں، پہلے تو اس کی باتوں سے مجھے خاصی کوفت ہونے لگی اور خود کو کوسنے لگا کہ کافی کی پیشکش پر اس کے ساتھ کیوں آگیا لیکن جب اس نے یہ بتایا کہ اس کا شوہر اور وہ نوادرات جمع کرنے کے شوقین ہیں تو میری کوفت مسرت میں بدل گئی۔"

اتنا بتاکر جارج نے اپنا سانس ذرا ہموار کیا اور قدرے توقف کے بعد سلسلہ دوبارہ جوڑنے ہی والا تھا کہ کمرے سے [illegible] مکمل طور پر تیار ہوکر نکلی اور باہر جانے والے دروازے کے قریب پہنچ کر اونچی آواز میں بولی۔ "اوکے جارج، میں لوئیسا کی پارٹی میں جارہی ہوں، کھانے کے لیے میرا انتظار مت کرنا۔ اب شاید کل ملاقات ہوگی۔ اوکے بائے۔" سیلی نے جارج کو وہیں سے مطلع کیا اور باہر نکل گئی۔

"بدتمیز...... احمق!...... بے وقوف عورت۔" جارج کے تیور بدل گئے۔ وہ غصے سے چلایا۔ "مجھے بیوقوف بنا کر جارہی ہے، اس کی تو میں......" جارج کے منہ سے سیلی کے لیے مغلظات کا طوفان نکل پڑا۔

"آرام سے...... سکون سے جارج!" نارمن نے ملائمت سے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "یوں چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر اس طرح قابو سے باہر ہوجانا تمہارے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے......" کچھ دیر بعد جارج نے اپنا منہ تو بند کرلیا تاہم غصے کے اظہار کے لیے ہاتھ مار کر شراب کی بوتل اور گلاس گرادیے۔

نارمن جارج کی اس حرکت پر خفگی سے بولا۔ "اسی طرح معمولی باتوں کو لے کر مشتعل ہوتے رہے تو وہ وقت دور نہیں جب بڑا نقصان کر بیٹھوگے، اچھا دوست ہونے کے ناتے میں تمہیں مفید مشورہ دے رہا ہوں۔ خود پر قابو کرنا سیکھو ورنہ برے نتائج کے ذمے دار خود ہوگے۔"

"آئی ایم سوری۔" جارج نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "مجھے واقعی اپنے غصے پر قابو رکھنے کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔"

"ایسے وعدے تم پہلے بھی کئی بار کرچکے ہو۔" نارمن نے اسے یاد دلایا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مجھے یاد ہے کہ میں یہی سب کچھ پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں لیکن کیا کروں! تم تو جانتے ہو کہ میرے حالات کیسے چل رہے ہیں۔ شیرل کے بعد مجھے کئی تلخ مسائل کا سامنا رہا ہے جن میں سرفہرست مالی معاملات ہیں۔ بس ذرا...... یہ میرے مالی معاملات کچھ بہتر ہوجائیں تو میرا چڑچڑاپن خود بخود دور ہوجائے گا۔ دوسری طرف سیلی بھی میرے لیے پریشانی کا سبب بنی ہوئی ہے، دیکھ لو! آج رات بھی وہ کوئی بہانہ بنا کر غائب ہوگئی ہے۔"

"تم اب بھی سمجھتے ہو کہ وہ تم سے مخلص ہے؟" نارمن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں پہلے وہ مجھ سے مخلص تھی۔" جارج جلدی سے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ آج کل وہ کسی اور مرد میں بھی دلچسپی لے رہی ہے اور مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہے۔ میں یقیناً اس کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا ہوں بلکہ میں نے زندگی میں کوئی خاص ترقی نہیں کی۔"

"تم جانتے ہو تمہارے ان حالات کی ذمے دار شیرل اور سیلی جیسی عورتیں ہیں؟" نارمن نے جارج کو غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم میں عقل کی شدید کمی ہے، پہلے تم نے جوئے اور عورتوں پر دولت خرچ کی۔ بعد میں شیرل نے بھی تمہیں خوب لوٹا اور تمہاری رقم لے کر فرار ہوگئی۔ اب رہی سہی کسر یہ سیلی پوری کردے گی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تمہیں سیلی سے تعلقات قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی......؟"

"سیلی بری نہیں ہے۔" جارج نے دھیرے سے کہا۔ "جس منصوبے پر بات ہورہی ہے اگر یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہوگیا تو مجھے پوری امید ہے کہ سیلی سے میرے تعلقات بہتر ہوجائیں گے اور تم دیکھنا کہ......" جارج نے کچھ اور کہنا چاہا مگر نارمن نے اسے جملہ مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا اور چڑ کر بولا۔

"ٹھیک ہے تم سیلی سے اپنے تعلقات بہتر کرتے

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

رہنا لیکن جس منصوبے پر بات کر رہے تھے، اسے مکمل کرو۔ تم بتا رہے تھے کہ وہ عورت نوادرات وغیرہ جمع کرنے کی شوقین ہے؟“

”ہاں میں یہی بتانے والا تھا۔“ جارج نے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔

”وہ سونے اور چاندی کی یادگار شیلڈ اور ٹرافیاں جمع کرتی ہے، اس کے پاس ایسی گراں قدر اشیا کا ایک بڑا خزانہ موجود ہے۔“

”قیمت کا کچھ اندازہ ہے؟“ نارمن نے جلدی سے سوال کیا۔

”یوں سمجھو کہ کم از کم سات لاکھ ڈالرز کا مال ہے۔“ جارج نے جواب دیا۔

”سات لاکھ ڈالرز!“ نارمن کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”مگر ہمیں سات لاکھ ڈالرز نہیں ملیں گے۔“ جارج بولا۔

”کیوں؟“ نارمن نے پوچھا۔

”میں نے ایسی چیزوں کا خفیہ کاروبار کرنے والوں سے رابطہ کیا ہے...... ان کا کہنا ہے کہ وہ ہمیں دو لاکھ تک ادائیگی کریں گے۔“ جارج نے بتایا۔

”یہ تو بہت کم ہیں جارج۔ سات لاکھ مالیت کے نوادرات کے صرف دو لاکھ؟“ نارمن نے قدرے مایوسی سے کہا۔

”پھر بھی ہم دونوں کو ایک ایک لاکھ تول جائیں گے۔“ جارج نے کہا۔ پھر توقف کے بعد گویا ہوا۔

”میں بھی جانتا ہوں کہ وہ ہمیں کم ادائیگی کرتے ہیں لیکن یہ بھی تو سوچو کہ صرف چند گھنٹوں کی محنت کے بدلے میں ہم لکھ پتی بن سکتے ہیں۔ ایسے دو چار پروجیکٹ اور مل جائیں تو میرے تقریباً تمام ہی مسائل حل ہو جائیں گے......“

”مگر مجھے ایک نہیں بلکہ ڈیڑھ لاکھ ملنے چاہئیں کیونکہ تالے کھولنے جیسا اہم کام مجھے ہی انجام دینا ہے، اس لیے میرا حصہ بھی زیادہ ہونا چاہیے۔“ نارمن نے ضدی لہجے کہا۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ جارج نے ناراضی سے کہا۔ ”اگر تم میرے اس کام میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو تمہاری مرضی۔“ اس کی آواز ایک مرتبہ پھر بلند ہونے لگی اور چہرے پر برہمی کے تاثرات نمودار ہوئے۔

”آرام سے...... تحمل سے۔“ نارمن نے اسے قابو سے باہر ہوتے دیکھ کر کہا۔ ذرا دیر چپ ہوا اور پھر کہا۔

”ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تم اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرو گے اور ابھی فوراً ہی تم بے قابو ہونے لگے۔ تم خصہ مت کرو میں لاکھ پر ہی قناعت کر لوں گا۔ اب بتاؤ کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟“

”میں ایک بار پھر تم سے معافی مانگتا ہوں نارمن!“ جارج نے بے بسی سے کہا۔ ”دراصل یہ کم رقم کمانے کا غم ہے۔ آمدنی کم اور اخراجات زیادہ ہوں تو انسان یونہی موقع بے موقع آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ نارمن نے جارج کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردی سے کہا۔ ”اب بتاؤ آگے کیا کرنا ہے؟“

”یہ بات تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ بلی کو جھاڑیوں سے نکالنے پر وہ عورت مجھ پر خاصی مہربان ہوئی تھی، اس کا شوہر بھی مجھ سے متاثر ہوا۔ کافی پلانے کے بعد اس جوڑے نے مجھے نوادرات اور گھر کا بڑی تفصیل سے دورہ کرایا۔ اس معائنے کے دوران میں نے ایسی ہر چیز پر خاص نگاہ رکھی جو ہمارے مقصد میں کام آسکتی تھی۔ انہوں نے تمام نوادرات ایک ہی جگہ اکٹھے رکھے ہوئے ہیں۔“

”کیا نوادرات کی حفاظت کے لیے الارم لگا ہوا ہے؟“ نارمن نے پوچھا۔

”بالکل۔“ جارج نے اطمینان سے سر ہلا کر کہا۔ ”ایک فرسودہ الارم جس کی بجلی کی تاریں کٹتے ہی [illegible] الارم ختم ہو جاتا ہے؟ [illegible]

[illegible] ہے۔“ نارمن نے [illegible]

”نہیں ایسا کوئی سسٹم نہیں ہے۔“ جارج نے [illegible] انداز میں کہا۔ ”میں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے، میں کافی دنوں سے اس جوڑے کی نگرانی کر رہا ہوں، ایک بار ان کی غیر موجودگی میں، میں ان کے گھر بھی گیا تھا اور ان کے گھر کے عقبی حصے میں موجود باغ کا بھی اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے۔ اطمینان رکھو نارمن! کہیں سے بھی کوئی خفیہ تار وغیرہ نہیں گزر رہا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ نارمن خوشی سے بولا۔ ”تو پھر ہمیں کب اس بوڑھے جوڑے کو ان کے نوادرات سے محروم کرنا چاہیے؟“

”آئندہ ہفتے یا اتوار میں سے کسی دن یہ کام کرنا ہوگا۔“ جارج نے جواب دیا۔

”کیوں ان دنوں میں کوئی خاص بات ہے؟“ نارمن نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں!“ جارج بولا۔ ”کیونکہ وہ عورت اور اس کا معصوم صورت شوہر ان دو دنوں کے لیے نیویارک اپنے پوتے کی

سالگرہ کے لیے جا رہے ہیں۔ اسی دوران میں ان کا گھر...... بالکل خالی ہوگا اور ہم اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کریں گے۔ جانتے ہو نارمن! اس بوڑھے جوڑے کا خیال ہے کہ ان کا نصب کرایا ہوا الارم ان کے خزانے کی حفاظت کے لیے کافی ہے۔“

”تو پھر ہم یہ کام اتوار کو کریں گے۔“ نارمن نے حتمی لہجے میں کہا۔

”دراصل ہفتے کو میری ملاقات کسی لڑکی سے طے ہے۔“

”اچھا تمہارے بھی لڑکیوں سے تعلقات ہیں؟“ جارج نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”دیکھ لو سب تمہاری صحبت کا اثر ہے۔“ نارمن نے مسکراتے ہوئے جارج کو الزام دیا۔

”ایک لاکھ ڈالرز کے لیے بھی کیا تم اس ملاقات کو ملتوی نہیں کر سکتے؟“

”کیوں نہیں جارج! ملتوی کیا اس ملاقات کو منسوخ کر سکتا ہوں لیکن اگر معاملہ صرف ایک دن کا ہوتا تو میں یقیناً ایک لاکھ ڈالر کو ترجیح دیتا مگر چونکہ ہم اپنا کام اتوار کو بھی بہ آسانی کر سکتے ہیں تو کیا حرج ہوگا اگر میں ڈالرز کے ساتھ ساتھ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ بھی کچھ وقت گزار لوں۔“ نارمن نے کہا اور مسکرا دیا۔

”تو گویا اس واردات کے لیے اتوار کا دن طے ہو گیا۔“ جارج نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مزید کہا۔ [illegible] میرے ساتھ کھا سکتے ہو۔ سیلی ویسے ہی کہیں مدعو ہے۔“ جارج نے کہا۔

”نہیں جارج! آج رات نہیں۔“ نارمن نے نرمی سے اس کی دعوت قبول نہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آج مجھے کچھ اور ضروری امور نمٹانے ہیں...... کھانا کل کھا لیں گے یا پھر واردات کے بعد ہی کوئی شاندار سا پروگرام طے کر لیں گے اور ہاں! اس دوران تم ذرا اپنے غصے پر قابو رکھنا، میں نہیں چاہتا کہ واردات سے پہلے تم کسی مصیبت سے دوچار ہو جاؤ۔“

”بے فکر رہو نارمن!“ جارج نے یقین دلایا۔ ”ابھی سے...... مجھ پر آنے والے خوشگوار دنوں کا خمار طاری ہونا شروع ہو چکا ہے اور مجھے امید ہے کہ اب میری طبیعت خوشگوار رہے گی۔“

”پھر بھی بدقسمتی سے اگر کوئی ناخوشگوار صورت حال پیش آ بھی جائے تو وعدہ کرو جارج کہ تم حتی الوسع بچنے کی کوشش کرو گے۔“ نارمن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”میں نے کہا نا تم بے فکر رہو، میں پوری طرح محتاط رہوں گا اور میرے لیے تمہاری فکرمندی مجھے اچھی لگی۔ واقعی تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔“ جارج نے نارمن کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا اور رات کے کھانے کی تیاری کے لیے کچن کی طرف چل پڑا۔ نارمن معنی خیز نظروں سے جارج کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

درحقیقت اسے جارج کی فکر نہیں تھی بلکہ اسے تو اپنے مفادات سے غرض تھی۔ اس نوادرات کی واردات کے بعد وہ اپنی جمع کردہ رقم کے مطلوبہ ہدف کے تقریباً قریب پہنچ جائے گا اور اپنی خواہش کے مطابق معقول رقم کے ساتھ ورجینیا جانا شرافت سے پرسکون اور بے فکر زندگی بسر کرتا۔

نارمن دل ہی دل میں اس عہد کو دہرا رہا تھا کہ وہ مجرمانہ زندگی سے مکمل طور پر تائب ہو کر شرافت کی زندگی اختیار کرے گا اور اگر اسے شریفانہ زندگی کے لیے کچھ دشواریاں بھی برداشت کرنا پڑیں تو وہ کر لے گا۔ ان پرانے ٹھکانوں سے...... غلط سلط قسم کے لوگوں سے بالکل دور رہے گا، حتیٰ کہ شراب کو بھی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ آئندہ زندگی کا خوب صورت تصور ہی اس کے دل میں ایک عجیب سی روشنی پھیلا رہا تھا اور اس کی پوری کوشش تھی کہ اس دوران جارج تحمل سے رہے اور واردات تک کوئی گڑبڑ نہ ہو اور یہ مرحلہ بہ آسانی طے ہو جائے کیونکہ نارمن کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اب جارج کو اپنی مزاجی کیفیات پر قابو نہیں رہا تھا اور یہی بات نارمن کے اندر خطرے کا الارم بجا رہی تھی کیونکہ جارج کی یہ کیفیت اس کے بنے بنائے پلان کو بگاڑنے کا سبب بن سکتی تھی۔

☆☆☆

ہفتے کے دن جارج نے نیند سے بیدار ہوتے ہی روزمرہ کے کاموں کو مثبت انداز سے سرانجام دیا۔ اس نے گزشتہ دنوں ہی خود سے عہد کیا تھا کہ وہ اپنے سر پر سوار خاموش قاتل یعنی ذہنی دباؤ کا مقابلہ مثبت طرز فکر اور صحت مند طریقوں سے کرے گا۔ اتوار کو ہونے والی واردات کی کامیابی کے بعد سیلی کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے کسی پرسکون جگہ جائے گا۔ بارہ بجے سیلی اٹھی تو جارج نے اس کے لیے ناشتا تیار کیا اور محبت سے اس کے سامنے رکھا۔ ”شکریہ جارج!“ سیلی نے کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کافی کی شدید طلب ہو رہی تھی۔“

”سیلی! میں سوچ رہا تھا کہ آج رات تم اور میں کہیں ڈنر کے لیے چلتے۔“ جارج نے مسکراتے ہوئے فرمائش کی۔

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

''سوری جارج! میں آج رات میلسا کے کنسرٹ میں جارہی ہوں۔''

''کیا تمہاری کنسرٹ میں شرکت ضروری ہے؟'' جارج نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میرا مطلب ہے ہمیں ساتھ وقت گزارنا چاہیے، اس سے ہمارے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔''

''اچھا تو پھر ہم دونوں اپنے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ڈنر کبھی بھی کر سکتے ہیں لیکن کوریا کی گلوکارہ میلسا ہیری کا کنسرٹ ہمارے شہر میں صرف ایک بار ہی ہوتا ہے اور میں میلسا سے ملنے کا یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی۔'' حسبِ توقع سیلی نے جارج کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور کنسرٹ میں جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔

جارج نے اپنے اندر اشتعال کی اٹھتی ہوئی لہروں کو کنٹرول کیا اور کپڑے تبدیل کر کے اپارٹمنٹ کو لاک کیا اور قریبی ریسٹورنٹ کی جانب چل پڑا۔ راستے میں جارج نے نارمن کو فون کیا اور ریسٹورنٹ میں ملاقات کے لیے بلایا تو جواب میں نارمن نے جلدی سے کہا۔

''ابھی مجھے بے حد ضروری کام ہے، میں نہیں آسکتا، اب کل ہی ملاقات ہوگی۔'' اس سے پہلے کہ جارج کچھ اور کہتا نارمن کی جانب سے سلسلہ منقطع کیا جاچکا تھا۔ جارج کو نارمن کی عجلت پر غصہ آیا۔ اسی کشمکش میں وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ ریسٹورنٹ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ [illegible] میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو اسے [illegible] کے قریب ایک میز خالی مل گئی۔ جارج نے جلدی سے میز سنبھال لی۔ یہاں سے مختلف کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ویٹر نے مینیو کارڈ اس کے سامنے رکھا۔ ''مجھے فرائی فش اور ساتھ سادہ نوڈلز چاہئیں۔'' جارج نے مینیو کارڈ دیکھے بغیر اپنی پسندیدہ ڈش بتائی۔

''او کے سر...... پانچ منٹ لگیں گے۔'' ویٹر نے مؤدب لہجے میں کہا اور کچن کی طرف چلا گیا۔ جارج نے وقت گزاری کے لیے میز پر پہلے سے پڑا میگزین اٹھالیا اور کھول کر سرسری انداز میں دیکھنے لگا۔ میگزین کے تیسرے صفحے پر کوریا سے آنے والی گلوکارہ میلسا ہیری کی بڑی سی تصویر چھپی ہوئی تھی اور نیچے اس کے کنسرٹ سے متعلق تفصیلات درج تھیں جسے دیکھ کر جارج کے حواس مختل ہو گئے کیونکہ کنسرٹ کی جو تاریخ وہاں درج تھی وہ چھ دن پہلے کی تھی یعنی آج سیلی جس کنسرٹ کے لیے جارج کی محبت بھری ڈنر کی دعوت کو ٹھکرا گئی تھی اس کنسرٹ کو ختم ہوئے تو کئی دن گزر چکے تھے اور شاید گلوکارہ میلسا ہیری اب تک واپس کوریا بھی جاچکی ہوگی۔ مطلب صاف تھا سیلی اسے بے وقوف بنا کر پتا نہیں کہاں اور کس کے ساتھ گئی تھی۔ جارج شدید طیش کے عالم میں ریسٹورنٹ سے نکل کر واپس اپنے اپارٹمنٹ آیا۔ غیظ و غضب کے عالم میں میز پر رکھی تمام چیزیں ہاتھ مار کر گرا دیں اور چلانے لگا۔ ''مجھے بے وقوف سمجھتی ہے...... میں آج سیلی کو چھوڑوں گا نہیں بس آج میں اس کا کام تمام کردوں گا۔'' جارج کافی دیر تک تنہا غراتا رہا۔ سیلی کی حرکات اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھیں۔ وہ کوئی نہ کوئی الٹا سیدھا بہانہ کر کے اکثر گھر سے غائب رہنے لگی تھی اور وہ خود تنہائی میں کڑھتا رہتا تھا۔

جارج کا پارہ آہستہ آہستہ پھر بلند ہوتا جارہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے غصے کا اظہار کرے۔ پھر اسے یاد آیا کہ آئندہ رات کارروائی والی رات تھی اور اس وقت تک نارمن نے سختی سے اسے اپنے آپ پر قابو رکھنے کی ہدایت کی تھی۔

''لعنت ہو۔'' جارج نے خود کو کوسا۔ ''میں نے نارمن سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپے سے باہر نہیں ہوں گا مگر اس سیلی کی بچی نے مجھے اتنا تنگ کر دیا ہے کہ بس......'' وہ بڑبڑانے لگا لیکن نارمن کی ہدایت اور اپنے وعدے کے مطابق اس نے اپنے اشتعال کو شکست دینے کی کوشش شروع کر دی، جس میں [illegible] حد تک کامیاب [illegible] اور میز پر سے فرش [illegible] میں اچانک اسے ایک بالکل نئی ماچس کی ڈبیا نظر آئی۔ جارج نے اسے اٹھا کر دیکھا تو اس پر شہر کے ایک معروف مگر مہنگے ریستوران کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا دکھائی دیا۔ جارج سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی ماچس پر گرفت سخت سے سخت تر ہونے لگی تھی۔ یہ ریستوران رومان پسند جوڑوں کے حوالے سے خاصا مشہور تھا۔ جارج نے اپنی زندگی میں کبھی اس ریستوران میں قدم نہیں رکھا تھا۔ تو کیا سیلی وہاں گئی تھی؟ اس خیال کے آتے ہی اسے ایک مرتبہ پھر اپنے خون میں ابال آتا محسوس ہونے لگا تھا۔ چند لمحے جارج اسی طیش کے عالم میں بیٹھا الٹے سیدھے منصوبے بناتا رہا کہ اب سیلی کے واپس آتے ہی وہ اس کے ساتھ یہ کر دے گا، وہ کر دے گا مگر پھر دھیرے دھیرے ہوش مندی اس کے منفی جذبات پر غالب آنے لگی اور وہ آنے والی رات کے تصور میں کھو کر خود کو اعتدال پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ رات کس وقت سیلی کی واپسی ہوئی، جارج کو کچھ علم نہیں ہوا۔ البتہ جب وہ سو کر اٹھا تو سیلی حسبِ معمول گہری نیند میں تھی۔ اس عالم میں اس کے چہرے پر بکھری ہوئی مسکان

انگنت داستانیں سنا رہی تھی۔

جارج کا جی چاہا کہ وہ سیلی کو اٹھا کر سب کچھ اس کے سامنے بیان کر دے مگر اس نے خود کو بے قابو ہونے سے بچایا اور رات ہونے والی واردات کی نوک پلک میں مصروف ہو گیا۔

گیارہ بجے جب سیلی نیند سے بیدار ہوئی تو جارج پوری طرح معمول پر آچکا تھا۔ اس نے خوش دلی سے سیلی کے لیے ناشتا تیار کیا اور گزری ہوئی رات کے بارے میں ہلکے پھلکے سوال کرتے ہوئے اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا رہا جیسے وہ نہایت احمق اور بے وقوف قسم کا انسان ہے۔

☆☆☆

جیسے ہی دن کی روشنی ختم ہوئی اور رات نے کالی چادر اوڑھی، جارج اور نارمن مطلوبہ مکان تک پہنچ گئے۔ انہیں اندر داخل ہونے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ انہوں نے بجلی کی ضروری تاریں پہلے ہی کاٹ کر اطمینان کر لیا تھا۔ جس کے بعد نارمن نے ایک مڑے تڑے تار کے ذریعے اپنے فن اور مہارت کا جادو چلا کر مکان کی عقبی جانب واقع فرنچ ونڈو کا تالا کھول دیا تھا اور اب وہ دونوں خالی گھر میں موجود تھے۔

''نوادرات اس کمرے میں ہیں۔'' جارج نے انگلی کے اشارے سے نارمن کو آگاہ کیا۔

اس دروازے کو کھولنے میں بھی نارمن کی مہارت کام آئی۔ وہ کمرا دوسرے کمروں کے مقابلے میں کشادہ اور بڑی [illegible] ترتیب دیا [illegible] تھا۔ چاروں [illegible] شیشے کی الماریاں نصب تھیں جن میں [illegible] رنگ برنگے اور دیدہ زیب نوادر جارج کے ہاتھ میں موجود فلیش لائٹ کی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔

''کیا بات ہے۔'' بے اختیار نارمن کے منہ سے نکلا۔ ''یہ مالدار بوڑھا جوڑا تو خاصا خوش ذوق دکھائی دیتا ہے۔''

جارج ٹارچ کی روشنی میں دھیرے دھیرے ایک الماری کی طرف چلنے لگا۔ اس کی تمام تر توجہ الماری اور اس میں سے جھلملاتے نوادرات کی طرف تھی۔ اسی لیے وہ اپنے پاؤں میں آنے والی چھوٹی سی میز کو نہیں دیکھ سکا۔

وہ اس سے ٹکرایا اور میز آگے کی طرف لڑھکی۔ اس کے ساتھ ہی جارج بھی میز کے پایوں سے الجھ کر فرش پر گر گیا۔ ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹی اور لڑھکتی ہوئی ایک الماری کے نیچے چلی گئی۔ شاید جھٹکا لگنے کے باعث ٹارچ کے سسٹم میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی، اس لیے وہ زمین پر گرتے ہی اپنی روشنی کھو بیٹھی تھی۔

''لعنت ہو۔'' جارج آہستگی سے غرایا۔

''اب اس ٹارچ کو بھی ٹٹول کر ڈھونڈنا ہوگا۔'' کمرے میں گہری خاموشی اور تاریکی چھا گئی تھی۔ جارج مضروب گھٹنوں کے ساتھ گھسٹتا ہوا الماری کے پاس پہنچا اور ہاتھ بڑھا کر ٹارچ ٹٹولنے ہی والا تھا کہ نارمن اندھیرے میں آنکھیں پھاڑتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا اور اپنی جیبوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''یہ لو۔ اندھیرے میں ٹارچ ڈھونڈنا مشکل ہوگا۔''

نارمن نے اپنی ایک جیب سے ماچس کی ڈبیا نکال کر جارج کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک تیلی جلا کر دیکھو تمہیں آسانی ہوگی۔''

جارج نے نارمن کی ہدایت پر ماچس جلائی۔ ٹمٹماتی روشنی میں اس کی نظر جوں ہی ماچس کی ڈبیا پر پڑی تو اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ماچس کی ڈبیا پر اسی معروف ریستوران کا نام چھپا ہوا تھا، جس کی ماچس اسے اپنے گھر میں ملی تھی۔

جیسے ہی جارج پر سب کچھ واضح ہوا اس کے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔

''تم کمینے...... دھوکے باز...... دغا باز......'' وہ بے قابو ہو کر بے اختیار دھاڑنے لگا۔ ''تو تم اسی لیے کل شام فارغ نہیں تھے اور یہی وہ وجہ تھی کہ تم کرسمس سے اگلے دن کو بھی میرے ساتھ کھانا کھانے کے لیے تیار نہیں ہو رہے تھے۔''

''چپ ہو جاؤ۔'' نارمن نے سراسیمہ ہو کر کہا۔ ''یہ تم کیا فضول بکواس کر رہے ہو۔'' جارج تو جیسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس نے ماچس کی تیلی فرش پر پھینکی اور قریب رکھے ہوئے بھاری بھرکم ٹیبل لیمپ کو اٹھا کر غراتا ہوا نارمن پر حملہ آور ہو گیا، ساتھ ساتھ وہ بری طرح چلا بھی رہا تھا۔

''تو یہ تم ہو۔ خبیث انسان...... جو میری سیلی کو ورغلا رہے ہو۔ اسے اپنے چکر میں پھانس کر مجھے بے وقوف بنا رہے ہو...... اسی لیے وہ گزشتہ رات میلسا کے کنسرٹ کا کہہ کر غائب تھی اور عموماً راتوں کو گھر سے غائب رہتی تھی۔ تم دونوں رات ریستوران میں ساتھ تھے اور میں گھر میں تنہا جل رہا تھا۔''

''ٹھہرو...... ٹھہرو......'' نارمن نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''فرض کرو کہ واقعی میں نے ہی کچھ تھوڑا بہت وقت سیلی کے ساتھ گزارا...... تو اس میں!......''

''فرض کرو......؟'' جارج نے نارمن کو اپنا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا اور چیخ کر بولا۔ ''یہ فرضی بات نہیں ہے، یہ حقیقت ہے۔ تم نے ہی سیلی کو بگاڑا ہے کیونکہ شروع میں تو وہ میرے

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

ساتھ بہت مخلص تھی بلکہ اب تو مجھے لگتا ہے کہ شیرل والے معاملے میں بھی تمہارا ہی ہاتھ تھا۔'' یہ کہتے ہوئے جارج نے دیوانہ وار ٹیبل لیمپ کو گھمایا اور نارمن کی بدقسمتی کہ اس کا سر ٹیبل لیمپ کی زد میں آگیا۔

نارمن کو بے اختیار چکر سا آیا اور وہ فرش پر گر گیا۔ جارج بدستور ٹیبل لیمپ سے اس پر ضربیں لگاتا رہا۔ کچھ دیر بعد نارمن بے حس وحرکت ہوگیا تو اسے احساس ہوا کہ اس نے نارمن کے ساتھ کچھ زیادہ ہی غلط کردیا تھا۔ جارج نے نارمن کی سانسوں کو چیک کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی پر ایک گہرا سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے اپنے غصے پر قابو پانے کے لیے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔''

جارج نے متاسفانہ انداز میں خود سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''یہ تو بہت گڑبڑ ہوگئی۔ اب ایک لاکھ ڈالرز کیسے ملیں گے؟......'' وہ سوچ رہا تھا۔ ''مگر ایک لاکھ کیوں، اب تو مجھے پورے دو لاکھ ڈالرز ملیں گے۔'' یکا یک جارج کی آواز سے تاسف رخصت ہوگیا اور عجیب سی مسرت پھوٹنے لگی۔ ''یہ بددیانت اور آستین کا سانپ تو مر گیا اب اس کا حصہ بھی میرا ہے۔ میں یہ سارا خزانہ سمیٹ کرلے جاؤں گا اور اب سیلی صرف اور صرف میری ہوکر رہے گی۔'' اتنا کہتے ہی جارج نے خوشی خوشی ایک الماری کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ مقفل تھی۔ جارج کو تالوں وغیرہ کا کچھ علم نہیں تھا۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا اور [illegible] سفر آخرت پر روانہ کرنے والے ٹیبل لیمپ [illegible] ضربات سے الماریوں کے شیشے توڑنے شروع کردیے۔ اس کے بعد کا کام آسان تھا۔ جارج نے اطمینان سے تمام نوادر ایک تھیلے میں بھرنے شروع کردیے۔

☆☆☆

آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ جارج تمام کارروائی خوش اسلوبی سے مکمل کرنے کے بعد خوش خوش ساحلی سڑک پر ڈرائیونگ کررہا تھا۔ اس کی کار کی ڈکی میں دو بڑے تھیلے بری طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ ایک میں بوڑھے جوڑے کے مکان سے ملنے والے نوادر بھرے ہوئے تھے اور دوسرا تھیلا نارمن کے بے جان وجود کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ جارج کو ان دونوں تھیلوں کو ڈکی میں رکھنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر اس نے کسی نہ کسی طرح انہیں ٹھونس ہی دیا۔ اب اس کی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح احتیاط کے ساتھ اپنا سفر مکمل کرلے۔ اس کا ارادہ تھا کہ پہلے وہ نارمن کی لاش کو ساحل کے کسی دور دراز گوشے میں ٹھکانے لگائے گا اور پھر بعد میں نوادرات کو کیش کرانے کی کارروائی مکمل کرے گا۔ رات کے اس پہر بھی سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک موجود تھا۔ جارج اپنی دھن میں ایک اوپن ایئر ریستوران کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اچانک گہرے سرخ رنگ کی ایک اسپورٹس کار اس کے داہنی طرف سے غرائی اور بالکل اس کی کار کے سامنے سے بے تکے انداز میں مڑ کر ریستوران کی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوگئی۔ جارج کو اپنی کار کو حادثے سے بچانے کے لیے خاصی تگ ودو کرنا پڑی تھی۔ ''خبیث انسان۔'' جارج حلق کے بل چیخا۔ ''خود تو مرے گا ہی اور دو چار کو بھی ساتھ لے کر مرے گا۔''

اچانک کار روکنے کی کوشش میں اس کا سر خاصی قوت سے اسٹیئرنگ سے جاٹکرایا تو اس کے منہ سے حسب معمول مغلظات کا طوفان نکلنے لگا۔ اسی حالت میں اس نے اپنی کار واپس کی اور سرخ رنگ کی کار کے عقب میں پارکنگ لاٹ میں داخل ہوگیا۔ پارکنگ لاٹ کی جگہ ڈھلوانی تھی۔ جارج نے سرخ رنگ کی کار کے عقب میں کار روک دی۔ وہ کار سڑک سے ہٹ کر دوسری کاروں کے درمیان کھڑی تھی اور اس میں سے ایک مختصر الوجود شخص نکل کر اسے لاک کررہا تھا۔

جلالی انداز میں جارج نے کار چھوڑی اور تین چار قدم اٹھا کر مختصر الوجود شخص کے پاس پہنچ گیا۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ تم کس طرح ڈرائیونگ کررہے ہو؟'' جارج اس کے پاس پہنچ [illegible]

مختصر الوجود شخص نے [illegible] بولا۔

''شاید تم غصے میں اپنی کار کا ہینڈ بریک لگانا بھول گئے تھے، وہ دیکھو تمہاری کار خود بخود بھاگتی جارہی ہے۔''

جارج نے جلدی سے مڑ کے دیکھا اور پھر بے اختیار کار کے پیچھے دوڑنے لگا۔ سڑک ڈھلوانی ہونے کے باعث کار کی رفتار لحہ بہ لحہ بڑھتی جارہی تھی۔ جارج دیوانہ وار اس کے عقب میں دوڑ رہا تھا۔ اسی وقت ایک بڑی سی اسٹیشن ویگن پارک کی ہوئی گاڑیوں کے درمیان سے برآمد ہوئی اور جارج کی کار سے ٹکرا گئی۔ تصادم خاصا زوردار تھا۔

ایک جھٹکے سے کار کی ڈکی کھلی اور پہلے نارمن کی لاش کا تھیلا سڑک پر گر کر پھٹا، دوسرے ہی لمحے نوادرات والا تھیلا بھی سڑک پر گرتے ہی پھٹا اور اس میں سے جگمگاتے مختلف نوادرات، چاند کی روشنی میں جھلملاتے نظر آنے لگے۔

''اوہ میرے خدایا......'' جارج کے حلق سے بے اختیار نکلا اور وہ وہیں چکرا کر گر گیا۔

شہر کے مہنگے ترین اسپتال کے اس کمرے میں زخموں سے چُور بدن لیے وہ کئی دن سے زیرِ علاج تھیں۔ کشادہ صاف ستھرا کمرا، چابکدستی سے کام کرتا اسٹاف، خوبصورت مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے بار بار چیک کرتے ڈاکٹرز، دولت کی اہمیت واضح کررہے تھے مگر یہ سب کچھ ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ مسز ثریا بابر، کاروباری حلقے کا ایک جانا پہچانا نام تھیں۔ ایسی پیشہ ورانہ آؤ بھگت ان کے معمول کا حصہ تھی۔

جو چیز انہیں دواؤں سے زیادہ تقویت دے رہی تھی، وہ رشتوں کی خوبصورتی تھی۔ خود سے منسلک رشتوں کی محبت، اپنے لیے فکرمند چہرے ان کی روح کو سکون دے رہے تھے۔

اس سب کے باوجود بھی دل و دماغ کی جنگ سے ایک مسلسل الجھن ذہن پر سوار تھی۔ دماغ جو منطق سے سوچتا تھا اور سب پر شک کرکے انہیں کٹہرے میں لا کھڑا کرتا تھا۔ دل جو اتنی توجہ پاکر پگھلا جارہا تھا اور دماغ کے تمام اندیشے ایک اتفاقی حادثے کی پٹاری میں بند کردینا چاہتا تھا۔

''بس ایک چمچ اور لے لیں ماما۔''

ان کی بیٹی لائبہ سوپ کا پیالہ ہاتھ میں پکڑے اصرار کررہی تھی۔ انہوں نے پیار بھری نظر اپنی لاڈلی پر ڈالی جو کبھی ان سے اتنی قریب نہ تھی۔ وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔ اپنے طبقے کے دیگر لوگوں کی طرح لائبہ بھی شخصی آزادی کی قائل تھی۔ وہ کسی کو اپنی زندگی میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتی، چاہے وہ اس کے والدین ہی ہوتے لیکن اب غیر متوقع طور پر ماں کی محبت میں بے قرار گھر بار چھوڑے دواؤں کی بو سے بھرے اسپتال میں ڈیرا ڈالے بیٹھی تھی۔ اس حادثے نے ثریا کو جہاں موت بہت قریب سے دکھائی تھی وہاں دلوں میں چھپی محبت بھی آشکار کی تھی۔ سعود کے بار بار اصرار پر آخر انہوں نے ہی لائبہ کو زبردستی دو، تین بار گھر بھیجا تاکہ وہ کچھ آرام کرلے۔

سعود لائبہ کا محبوب شوہر تھا۔ پہلی بار جب لائبہ اسے نوکری دلوانے آفس لے کر آئی تو وہ انہیں ایک نظر نہ بھایا تھا۔ لمبے بالوں

دل کے سب سے زیادہ نزدیک ایک جیون ساتھی کا اصل روپ

جو جتنا قریب ہوتا ہے اتنا ہی تمام کمزوریوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ اگر دوست ہے تو سب سے بڑی طاقت اور اگر دشمنی پر اتر آئے تو اس سے زیادہ کوئی زہریلا نہیں ہوتا۔ وہ جو شریک سفر تھے اس آخری محاذ میں جانے کہاں سے چھپی کدورت اور نفرت نکل کر انتقام پر اتر آئی۔

آخری محاذ

[illegible]شہ تنویر

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

کی پونی، ہاتھ میں بینڈ، منہ میں چیونگم کے ساتھ ان کے شاندار آفس پرستائشی نظریں دوڑاتا وہ لاابالی سا نوجوان ان کی بیٹی کا انتخاب تھا۔ سعود کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ ثریا کا خیال تھا کہ وہ محنت سے جان چھڑا کر لائبہ کے ذریعے ایک چھلانگ میں ترقی کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے سعود کو رد کر دیا تھا۔ بابر ہمیشہ کی طرح ہر فیصلے میں اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ مگر لائبہ کے اصرار بلکہ ضد اور ہٹ دھرمی سے جب یہ شادی ہوئی تو انہیں اندازہ ہوا کہ سعود اپنے حلیے کے برعکس بہت سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ انہیں عزت دیتا، لائبہ سے محبت کرتا۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ کسی قسم کے مطالبات تو دور کی بات، وہ اسے جب بھی کچھ دیتیں تو وہ لینے سے انکار کر دیتا۔ انہیں اتنی دولت کا کیا کرنا تھا اگر اکلوتی بیٹی کے کام نہ آتی، سو بصد اصرار لائبہ کو رخصت کرنے کے بجائے سعود کو ہی اپنے عالیشان بنگلے میں رکھ لیا اور اپنی کمپنی میں جگہ دی۔ سعود نے کہیں انہیں مایوس نہیں کیا، وہ انہیں ماں جیسی عزت دیتا اور محنت سے کام کرتا تھا۔ اب بھی وہ اپنے پرانے انداز میں ان کی خیریت معلوم کرنے آ جاتا۔

ثریا دماغ میں کھد بد کرتے سوال چھپائے بہ ظاہر مسکرا کر ملتیں لیکن نظریں گہرائی سے اس کا جائزہ لیتی رہتیں۔

"شاید میرا پہلا تاثر ہی درست تھا، سعود دولت کی حرص میں تمام اخلاقیات بھلا چکا ہے۔ لیکن لائبہ؟ کتنی بھی ہٹ دھرم سہی لیکن وہ اس کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتی۔ آخر میں اس کی ماں ہوں۔"

مختلف سوچیں ہر وقت دماغ میں سر سراتی رہتیں۔

حادثے کا کٹھن وقت ابھی یادداشت کے [illegible] ہوا تھا۔ جب سنسان سڑک پر ٹرک انہیں ٹکر مار کر بھاگا تھا۔ یہ معجزہ ہی تھا کہ نہ صرف وہ زندہ تھیں بلکہ خطرے سے باہر بھی تھیں۔ گاڑی کا دروازہ لاک نہیں تھا اور ایکدم دروازہ کھل کر وہ جھٹکے سے دور جا گریں۔ گاڑی پوری طرح تباہ ہو گئی جبکہ وہ کتنی دیر نیم بے ہوشی کے عالم میں مدد کی منتظر پڑی رہیں۔ اپنے گھر والوں کے چہرے ان کی نظروں میں گھومتے رہے۔ سڑک کنارے تڑپ تڑپ کر بے کسی کی موت مرنے کا تصور روح فرسا تھا۔

"اللہ کسی کو بھیج دے، اگر مرنا ہی ہے تو کم از کم یوں لاوارث لاش تو نہ کہلائے میری......" زخم زخم بدن اور ڈوبتے دل سے انہوں نے دعا کی۔

شاید قبولیت کا وقت تھا۔ تب ہی اس ویران سڑک پر چند لڑکے ان کی مدد کو آ گئے۔ ان لڑکوں نے ہی پولیس کو بلوایا اور انہیں اسپتال پہنچایا۔ جب وہ سرکاری اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھیں، تب ان کے گھر والے انہیں پورے شہر میں ڈھونڈ رہے تھے۔ پتا چلتے ہی انہوں نے ثریا کو مہنگے ترین اسپتال میں اچھے علاج کے لیے منتقل کیا۔ بہترین نگہداشت، خیال اور محبت کا ہی نتیجہ تھا کہ اب وہ تیزی سے روبہ صحت تھیں۔

ان کا کوئی دشمن نہ تھا۔ پولیس کو دیے گئے بیان میں انہوں نے کسی پر شک ظاہر نہیں کیا تھا۔ ٹرک والا موقع سے فرار ہو چکا تھا۔ پولیس نے بھی اسے ایک حادثہ قرار دے کر فائل بند کر دی تھی۔ سعود کا بھی یہی خیال تھا کہ ٹرک ڈرائیور کا پکڑے جانا ممکن نہیں سو اس پر وقت ضائع کرنا بے کار ہے۔

بابر سعود سے متفق نہ تھا۔ وہ ڈرائیور کو ڈھونڈنے اور سزا دلوانے کے لیے اپنے تمام تعلقات استعمال کر رہا تھا۔ انہوں نے بھی اپنے خدشات صرف بابر سے ہی بیان کیے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی تھیں۔

اپنے معمولی تنخواہ دار لیکن بہت زیادہ محبت لٹانے والے شریکِ حیات کا خیال ان کے لب پر مسکان بکھیر گیا۔

انہوں نے ایک ساتھ بہت اچھی زندگی گزاری تھی۔ اپنی مصروف زندگی میں بھی انہوں نے اپنے شوہر کو کبھی فراموش نہ کیا، اس کا خیال رکھا، سدا اس کی وفادار رہیں۔ آسمان سی بلندیوں کو چھوتے ہر زینے پر چڑھتے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔ کامرانیوں کی عروج پا کر بھی اپنے رشتے کو غیر متوازن نہ ہونے دیا۔

تب ہی تو اب اتنے دن سے وہ فکر مند اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والا شخص تھا، جس کے اندر تک پہنچنا بہت مشکل تھا لیکن اس سے بچھڑ جانے کے خوف نے اس کے خول میں دراڑ ڈال دی تھی۔

[illegible] کے چہرے پر [illegible] کہ وقت پر چین ظاہر نہیں دیتیں۔ پھر خیال آتا تو ڈاکٹروں کے پیچھے یہ معلوم کرنے جاتا کہ ان دواؤں کے کوئی سائیڈ ایفیکٹس نہ ہوں، جن سے صحت متاثر ہو۔

سوچوں کے تانے بانے ایک دم لائبہ کی آواز سے ٹوٹے۔

"درد تو نہیں ہو رہا؟"

سوپ پلا کر نیپکن سے ان کا منہ صاف کرتے ہوئے لائبہ پیار سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں، زید کہاں ہے۔"

نرم مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر وہ اپنے بھائی کے بارے میں دریافت کر رہی تھیں۔

"ڈاکٹر سے بات کر رہے ہیں، ضرورت پڑی تو آپ کو علاج کے لیے باہر لے جائیں گے۔"

لائبہ نے چیزیں سیٹ کرتے ہوئے جواب دیا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

زندگی نے انہیں بہت نوازا تھا۔ مڈل کلاس کی وہ عام سی لڑکی اپنی جانفشانی کے بل پر نامور بزنس وومین بنی تھیں۔ انہوں نے بہت محنت کی تھی۔ کامیابی پانے کے لیے دن رات کام کیا تھا اور بے پناہ مصروف زندگی گزاری تھی، لیکن اپنے عروج کی سرشاری میں کبھی خود سے جڑے رشتوں کو نہیں بھولی تھیں۔ وہ انہیں وقت تو نہیں دے سکی تھیں لیکن محبت اور آسائشات میں کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

اپنے چھوٹے بھائی کو بھی اولاد کی طرح چاہا اور ساتھ ساتھ رکھا۔ وہ ان کا بھائی نہیں بلکہ وہ وعدہ تھا جو انہوں نے خود سے کیا تھا۔ اس کی ہر خواہش پوری کر کے انہیں یوں محسوس ہوتا کہ وہ اپنے والدین کی ان دیکھی دعاؤں کے حصار میں آ گئی ہیں۔ وہ ان سے بہت خوش ہیں۔

زید عمر میں ان سے کافی چھوٹا تھا۔ انہوں نے ماں بن کر کسی صلے کی تمنا کے بغیر اسے پالا تھا۔ ان کے لاڈ پیار نے اسے کافی غیر ذمے دار بنا دیا تھا۔ تعلیم مکمل کر کے سنجیدگی سے اپنا کیریئر بنانے کے بجائے وہ فضول تفریحات میں وقت کا زیاں کرتا۔

اب بھی وہ دوستوں کے ساتھ پاکستان ٹور پر نکلا ہوا تھا۔ ان کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملتے ہی وہ جس طرح سب سیر و تفریح چھوڑ چھاڑ کر فوراً اسپتال پہنچا تھا، اس نے ان کا دل جیت لیا تھا۔ ماں جیسی بہن کی تکلیف پر اس کے بے اختیار بہتے آنسو اس کے سچے جذبات کے غماز تھے۔ انہیں اس سے بہت محبت تھی۔ اس کے غیر ذمے دارانہ رویے کے باوجود انہیں یقین تھا کہ وہ اس حادثے میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک وجہ تو [illegible] کی شہر میں غیر موجودگی تھی۔ [illegible] وہ خود اس حادثے کو [illegible] ان کی [illegible] جاری تھا [illegible] ڈاکٹرز سے رابطے میں تھا کہ کہیں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

یہ سب کچھ ان کی ساری زندگی کی محنت کا ثمر ہی تو تھا۔ یہ مقام اور رشتے انہوں نے بہت مشقت سے کمائے تھے۔ خود سے جڑے رشتوں سے ان کی محبت ہی تھی کہ وہ سب پر دل کھول کر خرچ کرتیں۔ بعض اوقات تو ان کے شوہر کو بھی بہت فکر ہو جاتی۔

"سعود کے لیے نئی گاڑی لینے کی کیا ضرورت تھی، اب کیا بیٹی کے ساتھ داماد کو بھی پالو گی؟"

"زید کو بھی کام سے لگاؤ، بڑا ہو گیا ہے اب۔ لگتا ہے تم تو اپنی محنت کی کمائی یوں ہی لٹا دو گی......"

وہ ہنس کر ٹال جاتیں۔ یہ چند رشتے ہی تو ان کی زندگی تھے۔ ان سے کیا حساب کتاب کرنا۔

جب انہیں اسپتال کے بستر پر ہوش آیا تو سب کے ہوائیاں اڑے چہروں پر لرزتے لب کے ساتھ اپنی زندگی و سلامتی کی دعائیں انہیں بے پایاں مسرت سے ہمکنار کر گئیں۔

"بلاشبہ میں بہت امیر ہوں، کیونکہ میں محبت و دعا کے خزانوں سے مالا مال ہوں۔"

تفاخر سے انہوں نے سوچا تھا۔

ایک، دو دن میں جب دماغ نے تسلی سے کام کرنا شروع کیا، تو بے شمار خیال آنے لگے۔ یہ حادثہ ان کے قتل کی سازش لگتا تھا۔ ایسا کون تھا، جسے ان کے قتل سے فائدہ ہوتا۔

سوچ سوچ کر ان کا دماغ تھک گیا تھا۔ انہوں نے بہت پیار سے اپنے ان پیارے رشتوں کو کہہ بھی دیا تھا کہ وہ اسپتال سے فارغ ہوتے ہی اپنی وصیت میں چند تبدیلیوں کے بعد اس کا باقاعدہ اعلان بھی کر دیں گی۔

ابھی ان کے لیے ہلنا جلنا محال تھا سو انہوں نے کاروباری امور کے لیے اسپتال میں ہی منیجر اور وکیل کو بلوانا چاہا لیکن ان کے خیر خواہوں نے محبت بھری دھونس کے ساتھ انہیں کچھ بھی کرنے سے منع کر دیا۔

رات ہو چکی تھی۔ وہ پلکیں موندے لیٹی تھیں، کمرا خالی تھا۔ جب ایک نرس نے آ کر ان کی ڈرپ میں انجیکشن شامل کیا۔ انہوں نے مسکرا کر نرس کو دیکھنا چاہا لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ ان کے ہاتھ سے پٹی کھولنے اور بینڈیج ہٹانے میں مصروف تھی۔ وہ سوال کرنا چاہتی تھیں لیکن انجیکشن سریع الاثر تھا۔ ان کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ حلق سے آواز نکلنا محال تھا۔ معاً انہیں دروازہ کھلنے اور نرس کے بولنے کی آواز آئی۔

"اندر آ کر جلدی سے انگوٹھا لگوا لیں، مجھے دوبارہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے پٹی کرنی ہوگی۔ پوسٹ مارٹم نہ ہو تو بہتر ہے، ورنہ [illegible] آ جائے گی۔"

[illegible] نرس [illegible] نے کس سے مخاطب تھی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں بہت کچھ منکشف ہوا تھا...... "تو حادثہ واقعی محض حادثہ نہ تھا۔" وہ جسم کی ساری ہمت مجتمع کر کے بھی آنکھیں نہیں کھول پا رہی تھیں۔ سن ہوتے جسم کے ساتھ اپنی تمام حسیات مرتکز کر کے وہ اپنے مجرم کو پہچاننا چاہ رہی تھیں مگر محض فائل کے صفحے پلٹنے کی آواز آ رہی تھی۔

"بس منٹوں کا کام ہے۔"

پھر ایک روشنی کا جھماکا ہوا اور...... اپنے قابلِ اعتبار اور بہت پیار سے زندگی گزارنے اور ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والے شوہر کی آواز اور اپنے انگوٹھے پر اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہوئے وہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے جا چکی تھیں۔ یہ کیسا ساتھ تھا...... کیا محبت اور سچے جذبوں کے بھی کئی روپ ہو سکتے ہیں۔ وہ جو زندگی کے ہر محاذ پر اپنی بیوی سے دو قدم پیچھے ہو کر ہی چلتا رہا جسے وہ اس کا پیار اور خلوص سمجھتی رہیں...... مگر کیا خبر تھی کہ اس کا احساس کمتری اس شخص کو دُہری شخصیت میں ڈھال دے گا...... دوست سے پیارا جیون ساتھی تھا وہی زندگی کا دشمن نکلا۔

http://urdutubes.com/

آسمانی فیصلہ

ملک صفدر حیات

جس طرح محبت اندھی ہوتی ہے اسی طرح قانون کو بھی اندھا کہا جاتا ہے مگر کمال یہ ہے کہ ان دونوں کی خواہش اور کوشش درست سمت کی تلاش ہی ہوتی ہے... اور مجرم جس کی دو نہیں بلکہ دس آنکھیں ہوتی ہیں، جو ہر سمت سے چوکنا رہتا ہے... ہر آہٹ پر دل دھڑکتا ہے اس کے باوجود وہ غلط سمت میں ہی محوِ سفر رہتا ہے اور بالآخر اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے... بالکل اسی طرح اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مبتلا لوگ اپنی خواہش کے خلاف کچھ بھی سننا نہیں چاہتے۔ اس نے بھی نہیں چاہا۔ جو مانگا نہ مل سکا تو اسے تباہ کردیا... وہ جو رشتے میں اس کی بیٹی جیسی تھی مگر وہ اس کا باپ جیسا نہ بن سکا۔ قاتل بن گیا لہٰذا جہاں خونی واردات ہو وہاں ملک صفدر کی حاضری نہ ہو، ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ اگرچہ قانون کو جو سزا دینا تھی وہ تو ملنا ہی تھی مگر قدرت نے ایک ایسا آسمانی فیصلہ کر ڈالا تھا کہ ہر شخص انگشت بدنداں رہ گیا۔

بارش، بجلی اور مجرم کے درمیان حیرت انگیز معرکہ آرائی......

اور خوفناک انجام

http://urdutubes.com/

دنیا کے ہر ملک میں عدل وانصاف کے نظام کو بروئے کار لانے کے لیے عدالتیں کام کررہی ہیں۔ جہاں کہیں عدالتی نظام وجود نہیں رکھتا وہاں اس کا متبادل جرگہ سسٹم رائج ہے یا اسی سے ملتا جلتا کوئی اور طریقہ کار۔ ان تمام مراکزِ انصاف کے اوپر ایک نادیدہ نظمِ قدرت بھی قائم ودائم ہے جہاں قاضی القضاۃ اپنے آفاقی اصولوں کی بنا پر فیصلے سناتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے اس آفاقی عدالت کے صادر کردہ فیصلے کے خلاف دنیا کی کسی عدالت میں اپیل نہیں کی جاسکتی...... زیرِ نظر کہانی بھی ایک زمینی معاملے کے خلاف آسمانی فیصلے کی ترجمانی ہے۔

ماہ جون کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ گندم کی کٹائی کا کام ختم ہوچکا تھا۔ تاحدِ نگاہ کھیت فصل کے وجود سے خالی نظر آتے تھے۔ بعض کھیتوں میں اگلی فصل کی تیاری کے لیے ہل چلنا شروع ہوگئے تھے۔ ان دنوں میری تعیناتی تھانہ کاموکی میں تھی۔ لاہور اور گوجرانوالہ کے درمیان واقع ''کاموکی'' نامی یہ قصبہ ایک خاص سبب کے لیے بہت مشہور تھا اور وہ سبب تھا ''غلہ منڈی''۔ کاموکی کی غلہ منڈی دور ونزدیک جانی، پہچانی اور مانی جاتی تھی۔

ایک صبح میں حسبِ معمول تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک اور گرم دن کا آغاز ہوچکا تھا۔ اس وقت آٹھ اور نو بجے کے درمیان کا عمل تھا لیکن دھوپ کی تیزی کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ سورج سر پر آچکا ہے۔ جسم میں برچھیاں مارتی ہوئی چمکدار دھوپ چاروں جانب پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا تو کانسٹیبل قادر میرے لیے ٹھنڈے پانی کے دو گلاس بھرلایا اور دونوں گلاسوں کو میرے سامنے میز پر رکھ کر وہ باادب، باملاحظہ، ہوشیار کھڑا ہوگیا۔

''قادر! خیریت تو ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ادھر تھانے میں تو سب خیریت ہی ہے جناب پر......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر عجیب سی نظر سے مجھے تکنے لگا

Digitized by Google

اور بولا۔ ''آپ ٹھنڈا پانی پئیں جناب۔ آج بہت زیادہ گرمی ہے۔''

''ہاں...... وہ تو ہے۔'' میں نے بہ دستور قادر کی جانب دیکھتے ہوئے پانی کا ایک گلاس اٹھالیا۔

میں نے قادر کے ایک ساتھ پانی کے دو گلاس لانے پر حیرت سے اس کی خیریت دریافت کی تھی لیکن اس کے جواب نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ میں نے ایک گلاس کو خالی کرنے کے بعد دوسرے گلاس کی سمت ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''اگر تھانے میں سب خیریت ہے تو پھر تمہیں کہاں خیریت نظر نہیں آرہی قادر علی......؟''

''وہ جناب...... ادھر گاؤں کے اندر۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

جن دنوں کا یہ واقعہ ہے اس زمانے میں منڈی کاموکی ایک چھوٹا موضع ہی ہوا کرتا تھا۔ آج کل تو یہ ایک صحت مند قصبے کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اس کی آبادی میں بھی روز افزوں اضافہ ہوا ہے۔

''کیوں بھئی...... گاؤں کے اندر ایسا کیا ہو گیا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ قادر علی کا تعلق بھی منڈی کاموکی ہی سے تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

''ملک صاحب! گاؤں کی ایک لڑکی غائب ہو گئی ہے۔''

''لڑکی غائب ہو گئی ہے......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''جناب! ظہور حسین کی بیٹی شانی کا کچھ اتا پتا نہیں چل رہا۔ جوان جہان لڑکی معلوم نہیں، کہاں چلی گئی ہے۔''

''کیا کسی نے تھانے آکر اس کی گمشدگی کی اطلاع دی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''تمہیں اس واقعے کے بارے میں کیسے معلوم ہوا......''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ سب تو میں آپ کو اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر بتا رہا ہوں۔ ابھی تک گاؤں میں سے کسی نے تھانے کا رخ نہیں کیا لیکن مجھے پتا چلا ہے، وہاں سے کچھ لوگ آنے والے ہیں آپ کے پاس۔''

مذکورہ تھانے میں تعینات ہوئے مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا تاہم میں اس علاقے کے حالات اور وہاں بسنے والے افراد کے بارے میں کافی حد تک آگاہی حاصل کر چکا تھا۔ کانسٹیبل قادر علی چونکہ موضع کاموکی ہی کا وسنیک تھا لہٰذا میں نے تصدیقی انداز میں اس سے پوچھا۔

''قادر علی! کیا تم اسی ظہور حسین کا ذکر کر رہے ہو جو کچھ عرصہ پہلے جو فوت ہو چکا ہے؟''

''جی ملک صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بے چارے نے پورے دو سال محتاجی کی زندگی گزاری تھی۔ فالج کے اٹیک نے اس کو چارپائی سے لگا دیا تھا۔ ہر طرح کا علاج معالجہ کر کے دیکھ لیا مگر وہ ٹھیک نہیں ہو سکا تھا پھر ایک سال پہلے وہ اللہ کو پیارا ہو گیا......'' قادر علی نے اداسی بھرے انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اور کل رات اسی ظہور حسین مرحوم کی اکلوتی بیٹی شہناز عرف شانی اچانک کہیں غائب ہو گئی ہے۔''

قادر علی کی فراہم کردہ اطلاع نے مجھے تشویش میں ڈال دیا۔ میں نے دوسرا گلاس بھی غٹاغٹ اپنے اندر اتارا اور خالی گلاس کو میز پر رکھنے کے بعد کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''قادر علی! تمہارے خیال میں شانی کہاں گئی ہے...... میرا مطلب ہے، اس سلسلے میں تمہاری کسی سے بات ہوئی ہے۔ گاؤں [illegible] شانی کی گمشدگی کے بارے میں [illegible] کہتے ہیں؟''

''ابھی بتاتا ہوں ملک صاحب۔'' وہ میرے سامنے میز پر سے دونوں خالی گلاس اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''پہلے میں آپ کے لیے اور پانی لے آؤں۔''

''بس قادر۔ میں نے جی بھر کر ٹھنڈا پانی پی لیا ہے۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اور پیاس نہیں ہے۔ تم نے کیا مجھے ڈھور ڈنگر سمجھ رکھا ہے......؟''

''نہیں سر جی۔ میں تو گرمی کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''اس تپتے ہوئے موسم میں ٹھنڈا پانی اللہ پاک کی ایک انمول نعمت ہے۔''

''اللہ کی ہر نعمت انمول ہے قادر علی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے تو سوہنا رب انسانوں کو عطا کردہ مختلف نعمتوں کو گنواتے ہوئے قرآن مجید کی سورۃ الرحمٰن میں بار بار فرماتا ہے...... اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟''

''آہو جی......!'' قادر نے پلکیں جھپکانے کے بعد سر کو اثباتی جنبش دی اور بولا۔ ''بندہ بڑا ہی ناشکرا ہے ملک

صاحب۔ کاش ہم اللہ کی عنایتوں کی قدر کرنا سیکھ لیں......''

بات کے اختتام پر وہ میرے کمرے سے نکل گیا۔ دونوں خالی گلاس بھی قادر علی کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔ قادر علی کے خلوص اور خدمت گزاری کے جذبے کو دیکھتے ہوئے میں نے پھر اسے پانی لانے سے منع نہیں کیا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ بھی کفرانِ نعمت ہوتا۔ اگر سردست میری پیاس بجھ گئی تھی تو اس امر کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ تھوڑی دیر کے بعد مجھے دوبارہ پیاس نہیں لگے گی۔ موسم کے تیور تو بہ زبانِ خاموشی یہ اعلان فرما رہے تھے کہ آج بار بار پانی کی حاجت محسوس ہوگی...... تھانے کے کشادہ صحن میں چوبی اسٹینڈ پر پانی سے بھرے ہوئے تین مٹکے رکھے تھے۔ ایک بات کا یقین کر لیں کہ ہمارے زمانے کے مٹکوں والا پانی آج کل کے فریج میں رکھے ہوئے برانڈڈ منرل واٹر سے زیادہ اور صحت بخش ہوا کرتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے وقتوں کا انسان اسّی سال کی عمر میں بھی پوری جاں فشانی اور جفاکشی کے ساتھ کھیتوں میں کام کیا کرتا تھا اور اسّی پلس عمر میں بھی بغیر عینک کے قرآن مجید کی تلاوت بہ آسانی کر لی جاتی تھی۔

قادر علی کی واپسی کے ساتھ ہی تھانے کے اندر مجھے ہلچل کے آثار محسوس ہوئے۔ برآمدے کی جانب سے بعض لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اغلب امکان یہی تھا کہ قادر علی کی پیش گوئی کے مطابق گاؤں کے لوگ شانی کی [illegible] کرانے تھانے پہنچ [illegible] تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ میرے سامنے تھے۔

وہ کل تین افراد تھے جن میں دو مرد اور ایک عورت شامل تھی۔ ابتدائی تعارف کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ عورت گمشدہ شانی کی ماں جمیلہ بی بی تھی۔ مردوں میں ایک جوان شانی کا بڑا بھائی صفدر اور دوسرا جمیلہ کے مرحوم شوہر ظہور حسین کا بہنوئی ریاض احمد تھا۔ ریاض کی بیوی سلطانہ مرحوم ظہور حسین کی اکلوتی بہن تھی یعنی وہ شانی کا پھوپا لگتا تھا۔ مجھ سے گفتگو کا آغاز بھی ریاض احمد ہی نے کیا تھا۔

''ملک صاحب! ہم عزت دار لوگ ہیں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ شانی کہاں گم ہو گئی ہے۔ ہماری عزت کی لاج رکھنا اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اس یقین کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں کہ آپ اپنے در سے ہمیں خالی نہیں لوٹائیں گے۔''

''سب کی عزتوں کا رکھوالا میرا پروردگار ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم سب کو اسی نیلی چھتری والے سے امید لگا کر رکھنا چاہیے۔ باقی جہاں تک میرے اختیارات کا تعلق ہے تو میں ان شاء اللہ آپ کو مایوس نہیں کروں گا......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے باری باری ان تینوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''شانی کب اور کہاں سے غائب ہوئی ہے؟''

''تھانے دار صاحب!'' جمیلہ بی بی نے روہانسی آواز میں بتایا۔ ''وہ کل شام سے کہیں نظر نہیں آرہی۔ پتا نہیں، اسے زمین نے نگل لیا ہے یا آسمان کھا گیا ہے۔ میں نے تو کل اچھا خاصا اسے گھر سے روانہ کیا تھا لیکن وہ واپس نہیں لوٹی۔''

''جمیلہ بی بی! تم نے اپنی بیٹی کو کہاں روانہ کیا تھا؟'' میں نے ضروری پوائنٹ نوٹ کرنے کے لیے کاغذ قلم سنبھال لیا۔ ''اور اسے کب تک واپس لوٹ آنا چاہیے تھا؟''

''تھانے دار صاحب! آپ غلط سمجھے ہیں۔'' گم شدہ لڑکی کے بھائی نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''شانی گاؤں سے باہر کہیں نہیں گئی۔ وہ ادھر ہی کہیں لاپتا ہو گئی ہے۔''

''صفدر!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے بعد میں سوال جواب کروں گا۔ تمہاری والدہ کا بیان مکمل ہو جائے، پھر تمہاری باری بھی آئے گی۔''

''جناب! صفدر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' جمیلہ بی بی نے اپنے بیٹے کی حمایت کرتے ہوئے بتایا۔ ''شانی سہ پہر کے وقت اپنی سہیلی کے ساتھ گھر سے نکلی تھی۔ وہ دونوں روزانہ کچھ وقت ساتھ گزارتی ہیں۔ کل شانی مجھے بتا کر گئی تھی کہ وہ شاہ جی کے مزار پر فاتحہ خوانی کرنے جا رہی ہے اس لیے میں نے...... خوشی خوشی اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ لوٹ کر واپس نہیں آئے گی۔''

بات کے اختتام پر اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسوؤں کو پونچھنے لگی۔ میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔

''شانی کی اس سہیلی کا کیا نام ہے جس کے ہمراہ وہ گزشتہ روز شاہ صاحب کے مزار پر گئی تھی؟''

گاؤں کے آخری سرے پر قبرستان تھا۔ اسی قبرستان کے احاطے میں پیر فرید حسین شاہ کا مزار تھا جہاں پر ان دنوں مرید حسین نامی ایک شخص نے آستانہ بنا رکھا تھا۔ مرید حسین بھی اپنے نام کے ساتھ ''شاہ'' کا لفظ لگاتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ صاحبِ مزار یعنی پیر فرید حسین شاہ کا سچا جانشین ہے۔ مذکورہ مزار پر فاتحہ خوانی کی غرض سے آنے والے لوگ مرید حسین شاہ سے بھی ملاقات کرتے تھے۔ دعا کے علاوہ مرید حسین تعویذ دھاگے کا کام بھی کرتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ بندہ کوئی فراڈ ڈبا پیر نہیں تھا۔ باقی

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

دلوں اور نیتوں کا احوال صرف میرے معبود کو معلوم ہے۔
جمیلہ بی بی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔
"شانی کی سہیلی کا نام تو نسیم اختر ہے لیکن سب اسے چھیماں کہتے ہیں۔"
"کیا چھیماں کل خیر خیریت سے اپنے گھر پہنچ گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔
جمیلہ بی بی نے اثبات میں جواب دیا۔
"تم نے چھیماں سے شانی کے بارے میں نہیں پوچھا؟" میں نے جمیلہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔"اگر پوچھا تھا تو اس نے کیا جواب دیا؟"
"چھیماں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دونوں سہیلیاں مغرب کی اذان سے پہلے واپس آ گئی تھیں۔" جمیلہ نے کہا۔
"چھیماں ہماری گلی کے کونے تک شانی کے ساتھ تھی۔ جب شانی اپنی گلی میں مڑ گئی تو چھیماں اپنے گھر چلی گئی تھی۔"
"کیا چھیماں کا گھر گاؤں کی کسی دوسری گلی میں ہے؟"
"جی تھانے دار صاحب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔"وہ ہماری پچھلی گلی میں رہتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہمارے مکان پچھواڑے سے ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔"
"سمجھ گیا۔" میں نے قلم کو کاغذ پر گھستے ہوئے کہا پھر پوچھا۔"چھیماں شانی کی گمشدگی کے بارے میں کیا کہتی ہے؟"
"وہ اس معاملے پر اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہی ہے۔"
جمیلہ بی بی نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔"میں نے بہت کرید کرید کر اس سے پوچھا ہے تھانے دار صاحب لیکن اسے شانی کی گمشدگی کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ وہ بھی اپنی سہیلی کی پراسرار روپوشی پر حد درجہ پریشان ہے۔"
"جمیلہ بی بی! تم نے چھیماں کو جتنا کریدنا تھا، کرید لیا۔ باقی کی تفتیش میں شانی کی دوست سے خود کرلوں گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔"یہ بتاؤ، کیا شانی اس سے پہلے بھی کبھی گھر سے غائب ہوئی ہے؟"
"کبھی نہیں تھانے دار صاحب۔" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔
میں نے پوچھا۔"تمہارے خیال میں وہ کہاں جاسکتی ہے؟"
"کہیں نہیں تھانے دار صاحب۔" وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔"وہ آج تک اکیلی گاؤں سے باہر نہیں گئی۔ مجھے تو لگتا ہے، اس کے ساتھ خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔"
"کیسا حادثہ؟" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
وہ بے بسی سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا جناب۔"
میں چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے جمیلہ بی بی کو دیکھتا رہا پھر صفدر اور ریاض سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
"میں تنہائی میں جمیلہ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ دونوں تھوڑی دیر کے لیے باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔"
ان دونوں نے سوالیہ نظروں سے پہلے مجھے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا لیکن ان کی زبان سے کوئی سوال نہیں پھسلا۔ وہ چپ چاپ اٹھے اور بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے کمرے سے باہر نکل گئے۔
"جمیلہ بی بی!" صفدر اور ریاض کے جانے کے بعد میں شانی کی ماں کی جانب متوجہ ہو گیا۔"اب بتاؤ، تم کس حادثے کا ذکر کر رہی تھیں؟"
"تھانے دار صاحب! حادثے والی بات تو آیوں آپ میرے منہ سے نکل گئی تھی۔" وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بولی۔"ورنہ ایسا کوئی واقعہ میرے علم میں نہیں۔ بس، میرا دل کہتا ہے کہ شانی گاؤں سے باہر کہیں نہیں گئی۔"
"گاؤں سے باہر نہیں گئی تو اس کا مطلب ہے، شانی [illegible]
[illegible]
"کیا تم نے کل شام سے اب تک شانی کو گاؤں میں تلاش نہیں کیا؟"
"تھانے دار صاحب! ہم نے کاموکی کے ایک ایک گھر میں جھانک کر دیکھ لیا ہے اور ایک ایک بندے سے پوچھ لیا ہے مگر شانی کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔" وہ دل شکستہ لہجے میں بولی۔"بس، سب سے آخر میں کل شام کو چھیماں ہی نے اسے دیکھا تھا۔ اپنی گلی میں داخل ہونے کے بعد شانی کہاں چلی گئی، کسی کو نہیں پتا۔"
"کیا تمہارا بیٹا صفدر شادی شدہ ہے؟"
"جی تھانے دار صاحب۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔
"صفدر کی شادی سات آٹھ سال پہلے ہوئی تھی۔ اس وقت شانی کا باپ زندہ تھا۔ ماشاءاللہ! صفدر کا ایک چھ سال کا بیٹا بھی ہے۔ ہم سب لوگ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔"
"اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ابھی تک تم نے شانی کا کہیں رشتہ طے نہیں کیا؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے تھانے دار صاحب۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔"میری تو یہی خواہش تھی کہ شانی جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جائے لیکن پتا نہیں، وہ کہاں گم ہو گئی ہے......"
بات کے اختتام پر اس کی آنکھیں ایک بار پھر امڈ آئیں۔ میں اس دکھی ماں کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن اس سے پوچھ گچھ بھی ضروری تھی لہٰذا چند لمحات کے توقف کے بعد میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔
"جمیلہ بی بی! جس گھر میں بیری کا درخت لگا ہو اس گھر کے صحن میں پتھر بھی لازمی آیا کرتے ہیں۔ یعنی، جس گھر میں جوان لڑکی موجود ہو وہاں رشتے بھی آتے ہیں۔ کیا شانی کے لیے بھی کوئی رشتہ آیا ہوا تھا؟"
میرا انداز تو ظاہر ہے، کریدنے والا ہی تھا لیکن میں نے جمیلہ کی قلبی کیفیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے لب و لہجے میں بڑی نرمی اور اپنائیت رکھی ہوئی تھی تاکہ اسے جواب دینے میں کوئی دقت یا پریشانی نہ ہو۔
"تھانے دار صاحب! کچھ عرصہ پہلے بھائی ریاض نے اپنے بیٹے کے لیے شانی کا رشتہ مانگا تھا۔" جمیلہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔"لیکن میں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بھائی ریاض سے معذرت کرلی تھی۔ یہ تو بھائی ریاض کا بڑا پن ہے کہ اس نے میرے انکار کا [illegible] اور ہمارے خاندانی تعلقات بالکل ویسے [illegible] زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ آپ دیکھ لیں، شانی کی گمشدگی نے بھائی ریاض کو کس قدر فکر مند کر رکھا ہے۔ پچھلی پوری رات، وہ ایک پل کے لیے نہیں سویا اور اس وقت بھی وہ ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔"
"سچی اور اصلی رشتے داری ایسی ہی ہوتی ہے جمیلہ بی بی۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔"شانی، ریاض کے سالے کی بیٹی ہے۔ اسے پریشان تو ہونا ہی چاہیے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی......!"
میں نے سوالیہ نظر سے جمیلہ کی جانب دیکھا تو وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔"کون سی بات تھانے دار صاحب؟"
"رشتے سے انکار والی بات!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
"وہ دراصل بات یہ ہے تھانے دار صاحب......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔"شانی، ثاقب کو بالکل پسند نہیں کرتی۔"
ثاقب یقیناً ریاض احمد کے اس بیٹے کا نام تھا جس کے رشتے سے جمیلہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے جواب نے میرے اندر تجسس پیدا کیا اور میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
"شانی، ثاقب کو کیوں پسند نہیں کرتی تھی۔ کیا ثاقب کے اندر کوئی شرعی عیب موجود ہے؟"
"نہیں جناب!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
"تو کیا ثاقب کوئی بدشکل انسان ہے؟" میں نے پوچھا۔"یا اس کے اندر کوئی جسمانی معذوری ہے؟"
"ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔" وہ جلدی سے بولی۔
"پھر کیسی بات ہے؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔"آخر کوئی تو معقول وجہ ہوگی ثاقب کا رشتہ مسترد کرنے کی۔ تم نے اس بارے میں شانی سے یقیناً پوچھا ہوگا......!"
"جی۔ میں نے پوچھا تھا۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔
"میری اور شانی کی رائے ایک جیسی ہے تھانے دار صاحب۔"
میں نے ٹٹولتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔"اور وہ رائے کیا ہے؟"
"ثاقب ایک دم بونگا لڑکا ہے تھانے دار صاحب۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔"اگر آپ کی کبھی ثاقب سے ملاقات ہوئی تو آپ کو میری بات کا یقین [illegible]
"ا[illegible] تو میں لازمی ثاقب سے ایک تفصیلی ملاقات کروں گا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔"باقی جہاں تک اس رشتے سے انکار کا معاملہ ہے تو اگر ثاقب بونگا نہیں بھی ہے تو شانی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے بغیر کسی وجہ کے مسترد کر دے اور یہ حق شانی کو مذہب اور قانون دونوں نے دے رکھا ہے......" لحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔
"جمیلہ بی بی! شانی کی اپنی مرضی کہاں تھی؟"
"اس نے مجھے کبھی اپنی پسند کے بارے میں نہیں بتایا۔"
"اور تمہارا رجحان کس طرف تھا؟" میں نے پوچھا۔
"تم شانی کی ماں ہو۔ تم نے یقیناً اس کے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچ رکھا ہوگا۔ جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے تم نے بتایا ہے کہ تمہاری خواہش تھی کہ شانی جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جائے......؟"
"میں تو اپنی چھوٹی بہن شکیلہ کے اکلوتے بیٹے آفتاب سے شانی کی شادی کرنا چاہتی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔"یہ لوگ ادھر ایمن آباد میں رہتے

http://urdutubes.com/

ہیں۔ میرے بہنوئی اکرام اللہ کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ایک زہریلے سانپ نے اکرام اللہ کو ڈس لیا تھا اور وہ ادھر ہی دم توڑ گیا تھا۔ اب اس خاندان میں صرف یہی ماں بیٹا بچے ہیں۔ ان کے پاس لگ بھگ دس ایکڑ زرعی اراضی ہے۔ آفتاب بڑی محنت سے کھیتی باڑی کرتا ہے۔ وہ لوگ ہماری نسبت کافی غریب ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آفتاب شانی کو بہت خوش رکھے گا مگر...... شانی کا کچھ پتا چلے تو......" بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "جمیلہ بی بی! حوصلہ رکھو۔ میں تمہاری بیٹی کو بہت جلد ڈھونڈ نکالوں گا۔ اپنے آپ کو سنبھالو اور میں جو سوال کر رہا ہوں اس کا سوچ سمجھ کر جواب دینا۔"

"جی......" وہ دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔ "پوچھیں تھانے دار صاحب!"

"تم نے اپنی خواہش تو مجھے بتا دی۔" میں نے کہا۔ "کیا شانی کو آفتاب سے شادی کرنا منظور تھا۔ اس رشتے کے حوالے سے تم نے شانی کی مرضی جاننے کی کوشش کی تھی؟"

"میں نے شانی کے سامنے آفتاب کے رشتے کے بارے میں دو تین مرتبہ بات کی تھی۔" اس نے بتایا۔ "وہ آفتاب کا نام سنتے ہی شرما جاتی [illegible] میں سمجھ [illegible] شانی کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں [illegible] شادی [illegible] دونوں خاندانوں کا بھلا ہو جاتا۔ ایک طرف شانی میری چھوٹی بہن شکیلہ کی بہو بن جاتی تو دوسری جانب کاشت کاری کے لیے آفتاب کی اراضی میں اچھا خاصا اضافہ ہو جاتا۔ میں نے شانی پر واضح کر دیا تھا کہ اس کا باپ اپنی زندگی میں زرعی اراضی کا جو بٹوارا کر گیا ہے! اس کے مطابق شانی کے حصے کے بیس ایکڑ میں جہیز میں اسے دے دیتی۔ اس طرح آفتاب اور شکیلہ کے پاس کھیتی باڑی کے لیے تیس ایکڑ اراضی ہو جاتی۔ گھر میں خوشحالی آتی تو یقیناً اس سے شانی کی زندگی میں آرام، خوشی اور آسائشات کی بھرمار ہو جاتی۔"

ایک ماں ہونے کے ناتے جمیلہ بی بی شانی کے مستقبل کے حوالے سے بڑے مثبت اور صحت مند انداز میں سوچ رہی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے مجھے مزید بتایا کہ مرحوم ظہور حسین کے پاس کل ساٹھ ایکڑ زرعی اراضی تھی۔ فالج کے اٹیک کے بعد وہ کم و بیش دو سال تک زندہ رہا تھا۔ اسی دوران میں ظہور حسین نے اپنی مرضی سے پکے کاغذات پر اس ساٹھ ایکڑ زمین کو تین برابر حصوں میں تقسیم کر دیا تھا جس میں سے بیس ایکڑ جمیلہ کے نام، بیس ایکڑ صفدر کے نام اور بیس ایکڑ شانی کے نام لگا دیے گئے تھے۔ اس تقسیم کا وراثت کے قانون سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا کیونکہ مرحوم ظہور حسین نے یہ کام اپنی زندگی میں کیا تھا جبکہ قانونِ وراثت کا اطلاق کسی شخص کی موت کے بعد اس کے ترکے پر ہوتا ہے لہٰذا اب قانوناً شانی، صفدر اور جمیلہ بیس بیس ایکڑ زرعی اراضی کے مالک تھے۔ یہ الگ بات کہ وہ تینوں چونکہ ایک گھر میں، ایک فیملی کی حیثیت سے رہتے تھے اس لیے مذکورہ ساٹھ ایکڑ کی فصل سے ہونے والی آمدنی بھی مشترکہ طور پر اسی گھرانے پر خرچ ہو رہی تھی اور اس طریقہ کار پر سب خوش بھی تھے۔

میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد جمیلہ بی بی کو اس وعدے کے ساتھ فارغ کر دیا۔ "تم بالکل مطمئن ہو کر گھر جاؤ۔ میں ابھی اور اسی وقت شانی کی تلاش کا کام شروع کر رہا ہوں اور اس سلسلے میں، میں گاؤں کے چکر بھی لگاؤں گا۔ انشاء اللہ! میں بہت جلد تمہاری بیٹی کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

میں نے جمیلہ کے علاوہ صفدر اور ریاض احمد سے بھی پوچھ تاچھ کی تھی لیکن کوئی ایسا پوائنٹ نکل کر سامنے نہیں آ سکا تھا جسے پکڑ کر میں شانی کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا۔ اس بات کا مجھے بخوبی [illegible] [illegible]

☆☆☆

میں کام کرنے سے کبھی گھبرایا ہوں اور نہ ہی کبھی تھکا ہوں۔ کسی کام کو دیکھ کر پریشان ہو جانا مرد کی شان کے خلاف ہے بلکہ کھلے الفاظ میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ زندگی کے مسائل اور مصائب سے منہ موڑ لینا ایک مرد کی موت ہے اور کوئی بھی مرد جیتے جی خود کو "مردہ" کہلانا پسند نہیں کرتا۔

جمیلہ بی بی کی زبانی مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کی بنا پر گمشدہ شانی کو ڈھونڈ نکالنا آسان نہیں تھا لہٰذا اس تلاش کے سلسلے میں مجھے عملی میدان میں کودنا پڑا اور میں تھانے سے نکل کر کاموکی کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ کانسٹیبل قادر علی میرے ہمراہ تھا۔ میں نے اپنی تفتیش کا آغاز شانی کی سہیلی نسیم عرف چھیماں سے کیا۔ چھیماں وہ واحد انسان تھی جس نے آخری بار شانی کو زندہ حالت میں دیکھا تھا۔ چنانچہ میری نگاہ میں چھیماں کی بڑی اہمیت تھی۔

جیسا کہ جمیلہ بی بی نے مجھے بتایا تھا، چھیماں کا گھر ان کی پچھلی گلی میں واقع تھا۔ ہم نذیر کوچوان کے دروازے

پر پہنچ گئے پھر میرے اشارے پر قادر علی نے دروازے پر دستک دی۔

نذیر عرف جیرا چھیماں کا باپ تھا۔ وہ تانگا چلا کر اپنی روزی کماتا تھا۔ گھر کی معاشیات میں جیرا کی بیوی آمنہ بھی اس کا خاطر خواہ ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ پورے کاموکی میں "آمنہ ماچھن" کے نام سے مشہور تھی کیونکہ اس نے اپنے گھر کے سامنے تنور لگا رکھا تھا۔ گاؤں کے لوگ آمنہ ماچھن کے تنور پر روٹیاں لگوانے آتے تھے۔ علاوہ ازیں تنور کے ساتھ ہی آمنہ نے ایک بھٹی (بھاڑ) بھی بنائی ہوئی تھی جہاں وہ مکئی، چنے، چاول...... وغیرہ بھونا کرتی تھی۔ اس وقت گلی میں جیرا کا تانگا موجود نہیں تھا جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ اپنے روزگار پر نکل چکا تھا۔

دستک کے جواب میں آمنہ ماچھن نے دروازہ کھولا پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرا گئی۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"ہائے وے ربا...... پولیس آ گئی۔"

ہم دونوں اس وقت یونیفارم میں تھے۔ پولیس کی یونیفارم کا ایک اپنا رعب و دبدبہ ہوتا ہے۔ عام انسان کسی باوردی پولیس والے کو دیکھتے ہی گھبرا جاتا ہے۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں آمنہ۔" میں نے اس کی گھبراہٹ کو کم کرنے کی غرض سے کہا۔ "میں تمہیں [illegible] نہیں آیا ہوں۔"

[illegible] اس نے قادر علی کو بھی [illegible] قادر علی اسی گاؤں کا دستک تھا جس پر نظر پڑتے ہی اس کی سانس میں سانس آ گئی تھی پھر میرے نرم لہجے نے بھی اس کے اندر حوصلہ بھر دیا تھا۔ وہ میری جانب دیکھتے ہوئے قدرے مضبوط لہجے میں بولی۔

"تھانے دار صاحب! میں نے ایسا کچھ کیا بھی نہیں کہ آپ کو میری گرفتاری کی ضرورت پیش آئے۔ اللہ پاک ہمیں تھانے کچہری کے چکر سے بچائے۔"

"آمنہ! اللہ سب کو ان جھمیلوں سے دور رکھے کیونکہ ان چکروں میں بڑے بڑوں کا چین لٹ جاتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں۔ میں تم سے اور تمہاری بیٹی سے تھوڑی تفتیش کرنے آیا ہوں۔"

"تفتیش......؟" اس نے متوحش نظر سے مجھے دیکھا اور گھبراہٹ آمیز لہجے میں مستفسر ہوئی۔ "کیسی تفتیش تھانے دار صاحب؟"

"کہیں آرام سے بٹھاؤ تو بتاؤں نا......" میں نے قدرے سخت انداز میں کہا۔ "گلی میں کھڑے کھڑے کیا بات کروں؟"

وہ میرے مقصد کی تہ میں اترتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "آپ اندر آ جائیں تھانے دار صاحب۔"

ہم دونوں کھلے ہوئے دروازے سے آمنہ ماچھن کے گھر میں داخل ہو گئے۔ آمنہ نے داخلی دروازہ بند کیا اور ہمیں گھر کی بیٹھک میں لا بٹھایا پھر یہ کہتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھی۔

"میں آپ کے لیے کوئی لسی پانی لے کر آتی ہوں جی......"

"اس کی ضرورت نہیں آمنہ۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "تم ادھر ہی بیٹھو۔ پہلے کام کی بات ہو جائے۔ اس کے بعد لسی پانی کے بارے میں بھی سوچ لیں گے۔"

وہ واپس پلٹی اور ہمارے سامنے ایک موڑھے پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے حد درجہ الجھن دکھائی دی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"گھر میں اس وقت بڑا سناٹا محسوس ہو رہا ہے۔ کیا تمہارے سوا اس گھر میں اور کوئی موجود نہیں ہے؟"

"جیرا ایک گھنٹا پہلے تانگا لے کر گیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"اور چھیماں کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کرامت علی کی دکان پر کچھ سودا لینے گئی ہے۔" آمنہ ماچھن نے جواب دیا۔ "بس، وہ آتی ہی ہوگی۔"

"میں دراصل چھیماں ہی سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس سے چند ضروری سوال کرنا ہیں۔"

"کس سلسلے میں تھانے دار صاحب؟" وہ پریشان ہو گئی۔

"اس سلسلے کا نام ہے...... شانی!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بات تو تمہارے علم میں ہوگی کہ جمیلہ کی بیٹی شانی کل رات سے غائب ہے......؟"

"جی۔ میں جانتی ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "اس شانی کی وجہ سے تو ہم مصیبت میں آ گئے ہیں۔ میں نے چھیماں کو لاکھ بار سمجھایا ہے کہ زیادہ دوستیاں اچھی نہیں ہوتیں پر کیا کریں، آج کل کی اولاد ماں باپ کی سنتی ہی کہاں ہے۔"

اولاد کے حوالے سے والدین کو اس نوعیت کا شکوہ

http://urdutubes.com/

ماضی میں بھی رہا ہے اور اللہ کے حکم سے مستقبل میں بھی لازمی رہے گا لہٰذا حال کا کیا رونا۔

''واقعی۔ آج کل کی اولاد کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے آمنہ۔'' میں نے اس کے دل کی بات کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''شانی کی وجہ سے تم لوگ کیوں مصیبت میں آ گئے ہو؟''

جیرا کوچوان اور آمنہ ماچھن کی صرف ایک ہی اولاد تھی یعنی نسیم اختر عرف چھیماں۔ اکلوتی اولاد ویسے بھی خاصی ضدی اور خودسر ہوا کرتی ہے پھر میری معلومات کے مطابق چھیماں اپنے باپ کی لاڈلی بھی تھی لہٰذا اس کی خودسری اور من مانی چہار چند تھی۔

''تھانے دار صاحب!'' وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''ہر کوئی ہم سے شانی کے بارے میں سوال کر رہا ہے۔ ہم تو جواب دے دے کر تنگ آ گئے ہیں۔ کل رات شانی کا پھوپھا ریاض بھی ہم سے کافی پوچھ پرتیت کر کے گیا ہے۔ اگر شانی کہیں غائب ہو گئی ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ کیا ہم نے اسے گم کیا ہے؟''

آمنہ ماچھن نے آخری جملے بڑی بیزاری سے ادا کیے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''دیکھو آمنہ! اگر ہر کوئی تم لوگوں سے شانی کے بارے میں پوچھ رہا ہے تو اس کے [illegible] خاص اسباب ہیں......''

''کون سے خاص اسباب تھانے دار صاحب؟'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی پلکیں جھپکاتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''نمبر ایک، شانی کی تمہاری بیٹی چھیماں سے بڑی گہری دوستی ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''نمبر دو، کل سہ پہر میں وہ دونوں ایک ساتھ فرید حسین شاہ کے مزار پر گئی تھیں اور پھر ایک ساتھ ہی وہ واپس بھی آئیں لیکن اس کے بعد گڑبڑ ہو گئی۔ چھیماں تو صحیح سلامت اپنے گھر پہنچ گئی مگر شانی کا تاحال کوئی اتا پتا نہیں ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں بھی چھیماں سے اسی سلسلے میں ملنے آیا ہوں کہ جس شخص نے آخری بار شانی کو زندہ حالت میں دیکھا ہے، وہ تمہاری بیٹی چھیماں ہے۔ وہی مجھے شانی کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہے۔''

''چھیماں کیا خاک آپ کو بتائے گی۔'' وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''اسے تو خود کچھ پتا نہیں ہے۔ کل شام میں مزار سے واپسی پر اس نے شانی کو اس کی گلی میں چھوڑا تھا۔ اس کے بعد چھیماں اپنے گھر آ گئی تھی۔ ایک گھنٹے کے بعد شانی کی تلاش شروع ہوئی پھر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہمارے گھر کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ جمیلہ، صفدر اور گاؤں کے دوسرے کئی لوگوں نے سوال پوچھ پوچھ کر میرا، چھیماں اور جیرا کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ شانی کا پھوپھا ریاض تو باقاعدہ کسی تھانے دار کی طرح تفتیش کر کے گیا ہے...... آپ بھی اسی مقصد سے یہاں آئے ہیں۔''

''یہ سب اس لیے ہے کہ شانی اپنے گھر نہیں پہنچی۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''جمیلہ بی بی اور اس کے بیٹے صفدر کی پریشانی بجا ہے اور ریاض احمد بھی اگر اپنی بیوی سلطانہ کی بھتیجی یعنی ظہور حسین مرحوم کی بیٹی شانی کے لیے فکرمند ہے تو یہ بالکل فطری سی بات ہے۔ ہم سب کی یہ خواہش اور کوشش ہے کہ شانی جلد از جلد بازیاب ہو جائے اور میں...... تو ہر قیمت پر شانی کو ڈھونڈ ہی نکالوں گا۔''

میرے ادا کردہ آخری جملے میں اس قدر توانائی تھی کہ آمنہ ماچھن حیرت سے آنکھیں پھیلا کر مجھے تکنے لگی۔ اسی لمحے چھیماں بھی گھر میں داخل ہوئی۔ میں نے آمنہ ماچھن سے کہا۔

''[illegible] چھیماں سے [illegible] چاہتا ہوں۔ [illegible] دوسرے میرے مقصد [illegible]'' [illegible] جلدی سے بولی۔ ''ٹھیک ہے جناب! آپ چھیماں سے پوچھ تاچھ کر لیں۔ میں آپ کے پینے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔ دوپہر سر پر آ گئی ہے اور کافی گرمی بھی ہو رہی ہے۔''

اب کی بار میں نے اسے منع نہیں کیا۔ اس کی اس بات میں اچھا خاصا وزن تھا کہ آج بڑی گرمی ہو رہی تھی۔ میں نے تھانے سے روانہ ہوتے وقت پانی کے وہ دو گلاس بھی اپنے معدے میں انڈیل لیے تھے جو قادر علی دوسرے پھیرے میں میرے لیے مٹکے سے بھر کر لایا تھا۔ چار گلاس پانی پینے کے دو گھنٹے بعد ہی مجھے پیاس کا احساس ہونے لگا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں آمنہ لسی سے بھرا ہوا ایلومینیم کا ایک جگ اور دو پیتل کے کنگ سائز گلاس لے کر بیٹھک میں آ گئی۔ اس نے یہ سامانِ خاطر داری ایک چوبی تپائی پر رکھا پھر ہمارے لیے گلاسوں میں چاٹی کی گاڑھی نمکین لسی بھرنے کے بعد یہ کہتے ہوئے بیٹھک سے نکل گئی۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے چھیماں سے جو بھی پوچھنا ہے، تسلی سے پوچھ لیں۔ میں تو جا رہی ہوں تنور میں

بالن ڈالنے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد گاؤں کی عورتیں روٹیاں لگوانے آنے لگیں گی۔ ابھی بالن (ایندھن خصوصاً خشک لکڑیاں) ڈال کر تنور کو دہکاؤں گی تو وہ روٹی لگانے کے قابل ہو گا۔''

آمنہ کے جانے کے بعد میں اس کی اکلوتی بیٹی چھیماں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چھیماں میرے سامنے اسی موڑھے پر آ کر بیٹھی تھی جہاں سے اس کی ماں اٹھ کر گئی تھی۔ چھیماں کی عمر میرے اندازے کے مطابق تیئس چوبیس سال رہی ہو گی۔ وہ عام سی شکل و صورت کی مالک ایک تیز طرار سانولی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے میں مجھے آمنہ کی شباہت نظر آئی۔ میں نے چھیماں کو تیز طرار اس لیے کہا کہ اس کی آنکھیں مسلسل حرکت میں تھیں۔ اگرچہ وہ اپنے سامنے پولیس کو دیکھ کر تھوڑی دباؤ میں تھی تاہم وہ کہیں سے بھی نروس دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ''چھیماں!'' میں نے اس کی متحرک آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، تم اپنے باپ کی بڑی لاڈلی ہو......؟''

''جی تھانے دار صاحب۔'' وہ فخریہ انداز میں بولی۔ ''ابا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں اور مجھے ''لاڈو'' کہتے ہیں۔''

''چھیماں! ہر باپ اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔'' میں نے اس کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔ ''[illegible] چاہو تو میری لاڈو بھی بن سکتی ہو......!''

''[illegible] سچ......!'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں سچ۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اگر میں آپ کی لاڈو بن گئی تو پھر میری بڑی ٹور ہو جائے گی۔'' وہ دلچسپ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''سب لوگ مجھ سے ڈرنے لگیں گے۔''

''ایسا تو ہو گا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''بالکل، تھانے دار کی لاڈو کے سامنے بھلا کس کی مجال ہے کہ دم مارے!''

''پھر تو میں آپ کی وردی پہن کر فوٹو بھی کھنچواؤں گی۔'' وہ ننھے بچوں کے مانند خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''پولیس کی وردی میں، میں بھی پولیس والی ہی لگوں گی......!''

''ہاں ضرور...... یہ تو ہو گا۔'' میں نے تصدیقی انداز میں کہا۔

''بس، تو پھر آپ مجھے جلدی سے اپنی لاڈو بنا لیں۔'' وہ بے حد پُرجوش انداز میں بولی۔ ''تاکہ میں اپنی ساری خواہشیں جلد از جلد پوری کر لوں۔''

پہلی نظر میں چھیماں مجھے جتنی تیز طرار محسوس ہوئی تھی، اس سے گفتگو کے بعد وہ ویسی ثابت نہیں ہوئی۔ ابھی تک اس نے مجھ سے جو بات چیت کی تھی اس کی روشنی میں وہ ایک معصوم اور بھولی بھالی لڑکی لگ رہی تھی، ایسی تیئس چوبیس سال کی جوان جہان لڑکی جس کا بچپن ابھی تک اس کے اندر مقید تھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے بہت اچھی...... بہت پیاری لگی۔ میں نے اس کی فطری معصومیت اور بھولے پن کو کام میں لاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''چھیماں! میں فوری طور پر تمہیں اپنی لاڈو بنا تو لوں لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے......!''

میں چھیماں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے غیر محسوس انداز میں بہ آہستگی اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔ میری بات سنتے ہی اس نے الجھن زدہ انداز میں پلکیں جھپکائیں اور پوچھا۔

''کیسی شرط تھانے دار صاحب؟ ابا نے تو مجھے اپنی لاڈو بناتے وقت کوئی شرط نہیں رکھی تھی......!''

''نذیر تو تمہارا سگا باپ ہے نا......'' میں نے اس کا ذہن صاف کرنے کی غرض سے کہا۔ ''اسے کوئی شرط رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم تو بغیر کسی شرط کے بھی نذیر عرف جیرا کی آنکھوں کا نور اور اس کے کلیجے کی ٹھنڈک ہو۔''

میرے اس مشفقانہ انداز نے چھیماں کو بہت متاثر کیا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے مستفسر ہوئی۔

''تو اس کا مطلب ہے، منہ بولے رشتوں کے معاملے میں شرطیں رکھنے اور شرطیں منوانے کی ضرورت پیش آتی ہے؟''

''بالکل، ایسا ہی ہے۔'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''چھیماں! تم تو بڑی سیانی لڑکی ہو۔''

''ہاں جی......!'' وہ بڑی ادا سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''اب آپ مجھے اپنی شرط بھی بتا دیں تھانے دار صاحب!''

میں نے اپنے نپے تلے الفاظ کی تپش سے حالات کے لوہے کو اس قدر گرم کر دیا تھا کہ چوٹ لگانے کا وقت آن پہنچا تھا لہٰذا میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چھیماں! میری بس ایک ہی شرط ہے اور وہ یہ کہ تم کبھی مجھ سے غلط بیانی نہیں کرو گی۔ میں تم سے جو بھی سوال کروں گا تم اس کا سولہ آنے سچا اور کھرا جواب دو گی۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کی متحرک آنکھوں میں جھانکا اور

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

جیل نمبر، کنوارہ نمبر، خودکشی نمبر، دوسری شادی نمبر، عشق ناکام نمبر،
بینا نابینا نمبر، خطا نمبر، مرگ ناگہاں نمبر جیسے معرکۃ الآرا خاص
شماروں کے بعد سرگزشت کا ایک اور تہلکہ خیز نمبر

خودساز نمبر

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مئی 2019ء کے اس خاص شمارے میں ان شخصیتوں
کی روداد حیات جنہوں نے اپنی قسمت خود سنواری

جنہوں نے ناکامیوں
کے پہاڑ کو ٹھوکروں سے اڑا دیا

وہ لوگ جن کی جیب خالی تھی لیکن حوصلے بلند تھے اور محنت
کرنا چاہتے تھے تبھی تو وہ دولت کے انبار پر نظر آ رہے ہیں

دوسروں کی کامیابیوں سے سبق حاصل کرنا ہی عقلمندی ہے۔ زندگی میں کامیابی
حاصل کرنے کے خواہشمندوں کے لیے ہی یہ خاص شمارہ ترتیب دیا گیا ہے

ایک ایسا شمارہ جسے آپ مجلد کرا کر محفوظ رکھیں گے، ایسے خاص نمبر صرف سرگزشت ہی پیش کر سکتا

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔
''کیا تمہیں میری یہ شرط منظور ہے؟''
''یہ بھی بھلا کوئی شرط ہوئی۔'' وہ بھویں اچکاتے ہوئے بولی۔ ''میں تو ویسے بھی جھوٹ نہیں بولتی ہوں۔ اماں ابا نے مجھے جھوٹ بولنا سکھایا ہی نہیں۔ آپ نے تو بہت ہی آسان سی شرط رکھ دی ہے تھانے دار صاحب......''
''شرط آسان ہے یا مشکل، تم اس چکر میں نہ پڑو۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''بس، مجھے ہاں یا نہ میں جواب چاہیے۔''
''میرا جواب ''ہاں'' میں ہے تھانے دار صاحب!'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔''
''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''آج سے بلکہ اسی وقت سے تم میرے لیے بھی لاڈو ہو اور......اب میں تمہیں چھیماں نہیں، لاڈو کہہ کر پکاروں گا۔''
''ٹھیک ہے جی!'' اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔
میں نے سوالیہ نظر سے اس کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''لاڈو! تو کیا اب شروع کریں؟''
''کیا؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
''سوال وجواب!'' میں نے اس کی الجھن رفع کرتے ہوئے کہا۔
''اوہ......اچھا......!'' وہ ایک گہرا اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ [illegible] جو بھی پوچھنا ہے، بے دھڑک پوچھیں تھانے دار صاحب۔ میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتاؤں گی۔''
''میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنی سہیلی شانی کی گمشدگی کا بڑا دکھ ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم شانی کے اچانک غائب ہو جانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو۔'' میں نے اپنی پلاننگ کے مطابق بالکل منفرد انداز میں چھیماں سے پوچھ تاچھ کا آغاز کیا۔ ''اس لیے میں تم سے ایسا کوئی سوال نہیں کروں گا جیسے سوالات کل شام سے اب تک درجنوں لوگوں نے تم سے کیے ہیں۔''
''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ میری بات کی تائید کرتے ہوئے بولی۔
میں نے کہا۔ ''لاڈو! مجھے پتا چلا ہے کہ کل سہ پہر کے وقت تم اور شانی ایک ساتھ قبرستان والے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے گئی تھیں اور مغرب سے تھوڑی دیر پہلے تم دونوں واپس آ گئی تھیں پھر تم نے شانی کو اس کی گلی کے کونے پر چھوڑا اور اپنے گھر چلی گئیں۔ ہیں نا؟''

میں ذرا مختلف انداز میں چھیماں سے وہی سوالات پوچھ رہا تھا جن کے جواب وہ پہلے بھی درجن بھر افراد کو دے چکی تھی لیکن میرا استفسار اسے کوفت میں مبتلا نہیں کر رہا تھا۔
''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔''
''یہ بات بھی میرے علم میں آئی ہے کہ تم دونوں اس سے پہلے بھی قبرستان والے مزار پر جاتی رہی ہو......؟''
''ہاں جی۔ جاتی رہی ہیں۔'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔
''مزار پر حاضری کا مقصد صرف فاتحہ خوانی ہی ہوتا ہے یا پھر......!''
میں نے دانستہ پراسرار انداز میں اپنے جملے کو ادھورا چھوڑا تو وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔
''یا پھر کیا تھانے دار صاحب؟''
''ادھر مزار پر مرید حسین شاہ نے اپنا آستانہ بھی بنا رکھا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مرید حسین تعویذ گنڈے کا کام بھی کرتا ہے۔ کیا کبھی تم لوگ اس کے پاس بھی گئی تھیں، اپنے کسی کام کے لیے؟''
''نہ جی، نہ!'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بھی پتا ہے کہ مرید شاہ تعویذ دھاگے کا کام بھی کرتا ہے لیکن ہمیں کبھی اس سے رجوع کرنے کی ضرورت [illegible] نہیں پڑی۔ ہمارے سارے مسئلے [illegible] ہی حل ہو جاتے ہیں۔''
''حاضری سے کیسے تمام مسئلے حل ہو جاتے ہیں؟'' میں نے اسے کریدا۔ ''کیا تم وہاں جا کر کوئی خاص قسم کی دعا وغیرہ کرتی ہو؟''
''دعا بھی اور منت بھی۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''بس جی، یہ تو اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے نا......!''
میں نے اس کے عقیدے کو کریدنے یا ٹٹولنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ ہر انسان کو اپنا عقیدہ بہت عزیز ہوتا ہے اور وہ اس کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ نہایت ہی حساس معاملہ ہے اسی لیے سیانے کہہ گئے ہیں...... دوسرے کے عقیدے کو چھیڑو نہیں اور اپنے عقیدے کو چھوڑو نہیں۔
''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو لاڈو۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''عقیدہ تو اللہ اور بندے کا ذاتی معاملہ ہے۔ کسی تیسرے کو اس میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔''

http://urdutubes.com/

''میں بھی تو یہی کہتی ہوں تھانے دار صاحب!'' وہ اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میری بات کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتی!''

''تم دوسروں کو چھوڑو لاڈو۔'' میں نے اسے بڑے پیار سے مخاطب کیا۔ ''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں، یہی کافی ہے۔''

''آپ بہت اچھے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''ایک پولیس افسر کو ایسا ہی سمجھ دار اور سیانا ہونا چاہیے۔''

''تم بھی بڑی سچی اور کھری ہو۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو دھیرے دھیرے سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''ایک لاڈو کو ایسا خالص اور شفاف ہونا چاہیے۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ لاڈو......'' میں نے دانستہ ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے پوچھا۔

''کل سہ پہر میں تم دونوں محض فاتحہ خوانی کے لیے مزار پر حاضری دینے گئی تھیں یا کوئی منت شنت کا معاملہ بھی تھا؟''

''میں آپ سے سچ بولنے کا وعدہ کر چکی ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اس لیے سب کچھ صاف صاف بتاؤں گی۔''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ لمحے بھر کے لیے خاموش ہوگئی۔ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب [illegible] چپ چاپ بیٹھا اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ [illegible] بعد اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانا شروع کیا۔

''تھانے دار صاحب! کل تو میں خالصتاً شانی کی وجہ سے مزار پر گئی تھی۔ وہ کافی دنوں سے الجھی ہوئی تھی اور اسے شاہ صاحب کے مزار پر ایک خاص منت بھی ماننا تھی۔''

''اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ تمہاری دوست شانی کس الجھن میں گرفتار تھی اور مزار پر اس نے کس قسم کی منت ماننا تھی؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

میرے اس دہرے سوال پر چھیماں مجھے تذبذب کا شکار نظر آئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھے کوئی اہم بات بتانا چاہتی ہے لیکن یا تو اسے اپنی بات کہنے کے لیے موزوں الفاظ نہیں مل رہے اور یا پھر اس کا دماغ اسے بولنے سے روک رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ شانی کی گمشدگی کے معاملے کا کوئی اہم سرا میرے ہاتھ لگنے والا تھا۔

''لاڈو......!'' میں نے متذبذب چھیماں کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بڑے دلار سے کہا۔ ''تم مجھ سے سچ بولنے کا وعدہ کر چکی ہو۔ اسی شرط پر میں نے تمہیں اپنی لاڈو بنایا تھا۔''

''جی...... مجھے یاد ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''یاد ہے تو پھر کس سوچ میں گم ہوگئی ہو۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو۔ کیا کوئی پریشانی ہے؟ کیا تم نہیں چاہتی ہو کہ میں جلد از جلد شانی کو ڈھونڈ نکالوں......؟''

''شانی کے لیے مجھ سے زیادہ فکرمند اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھانے دار صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''میں تو کل سے یہی دعا مانگ رہی ہوں کہ شانی جہاں بھی ہے، جلدی واپس آجائے......''

''لاڈو! یہ دنیا ہے اور اس دنیا میں اپنا مقصد پانے کے لیے دعا کے ساتھ ساتھ دوا دارو بھی کرنا پڑتی ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں چھیماں سے کہا۔ ''تم اپنی سہیلی کی بازیابی کے لیے دعا کا عمل جاری رکھو، میں دوا دارو کرتا ہوں لہٰذا تم فوری طور پر میرے سوال کا جواب دو تاکہ میں شانی کی تلاش کا کام شروع کر سکوں۔ تم سمجھ رہی ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''جی، جی......'' وہ بڑی سرعت سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''میں چنگی طراں سمجھ رہی ہوں تھانے دار صاحب۔''

[illegible] اگر سمجھ [illegible] تھی کہ وہ منت ماننے قبرستان والے مزار پر گئی تھی؟''

''شانی کو ایک لڑکے سے محبت ہوگئی تھی تھانے دار صاحب!'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ''لیکن وہ لڑکا شانی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ شانی نے کل مزار پر جا کر اسی لیے منت مانی تھی کہ وہ لڑکا اس کا ہو جائے۔''

''کیا تم شانی کی خالہ کے بیٹے آفتاب کی بات کر رہی ہو؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''وہ جو ادھر امین آباد میں رہتا ہے......''

''نہیں جی......'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکی پھر بتانے لگی۔ ''آفتاب، اس کی ماں اور شانی کی ماں تو اس رشتے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ شانی کے بھائی صفدر کو بھی اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ شانی کو آفتاب کے لیے کوئی منت ماننے کی ضرورت نہیں تھی۔''

''پھر......'' میں نے الجھن زدہ استفساری نظر سے اس کی جانب دیکھا۔ ''شانی کس لڑکے کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی تھی۔ وہ لڑکا ریاض احمد کا بیٹا ثاقب تو ہو نہیں

سکتا۔ شانی کی نظر میں ثاقب تو ایک بونگا لڑکا ہے۔''

''کوئی ایسا ویسا بونگا......'' وہ معنی خیز انداز میں بولی پھر میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! کیا آپ نے کبھی ثاقب کو دیکھا ہے؟''

''ابھی تک تو نہیں دیکھا لیکن میرے دل میں اسے دیکھنے کی تمنا جاگ اٹھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں دوسری فرصت میں ثاقب سے ملاقات کروں گا۔''

''پہلی فرصت میں کیوں نہیں تھانے دار صاحب؟'' اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ پہلی فرصت میں تو میں اپنی لاڈو کے ساتھ مصروف ہوں۔'' میں نے چھیماں کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''میری لاڈو مجھے اس لڑکے کا نام بتانے والی ہے، شانی کو جس سے محبت ہوگئی تھی......''

''اس کا نام قیصر ہے تھانے دار صاحب۔'' چھیماں نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا قیصر بھی اسی گاؤں کا رہنے والا ہے؟'' یہ نام میرے لیے بالکل نیا تھا۔ جمیلہ بی بی یا صفدر یا ریاض احمد نے قیصر کا کہیں ذکر نہیں کیا تھا۔ چھیماں نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

''نہیں جی۔ قیصر تو شہری بابو ہے۔ وہ [illegible] [illegible] قیصر کا [illegible] گھر رہنے آیا تھا۔ قیصر [illegible] واپس لاہور گیا ہے۔''

چھیماں نے نہایت ہی سادہ الفاظ میں مجھے جو معلومات فراہم کی تھیں وہ شانی کی گمشدگی کے کیس کو حل کرنے کے لیے بڑی مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔ میں نے مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔

''لاڈو! تم شانی کی رازدار سہیلی ہو۔ اس نے تمہیں اپنی محبت کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔ شانی کو قیصر کے حصول کے لیے مزار پر منت ماننے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قیصر اس میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ تم نے مجھے یہی بتایا ہے نا؟''

''جی بالکل!'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔ ''یہی حقیقت ہے تھانے دار صاحب۔''

''اور قیصر کی اس عدم دلچسپی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے چھیماں کی طرف دیکھا۔

''یہ بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آئی تھانے دار صاحب۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ''شانی میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ وہ گوری چٹی اور حسین و جمیل لڑکی ہے۔ آپ اسے لاکھوں میں نہ سہی، ہزاروں میں ایک کہہ سکتے ہیں، پتا نہیں، قیصر اپنے آپ کو سمجھتا کیا تھا۔ ٹھیک ہے، اس کا تعلق شہر لاہور سے ہے اور پڑھا لکھا شہری بابو ہے مگر میں یہ سمجھتی ہوں کہ شانی، قیصر سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔ میں نے شانی کو بہت سمجھایا کہ قیصر اگر تمہاری محبت کی قدر نہیں کر رہا تو اس کا خیال دل سے نکال دے لیکن میرے اس سمجھانے بجھانے کے جواب میں وہ بڑی بے بسی سے کہتی...... چھیماں پاگلے! وہ دل ہی سے تو نکلتا نہیں......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''ہر کوشش میں ناکامی کے بعد وہ منت ماننے شاہ صاحب کے مزار پر گئی تھی اور مجبوراً مجھے بھی اس کے ساتھ جانا پڑا۔ یہ ہے کل کہانی تھانے دار صاحب......!''

''یہ خاصی المیہ کہانی ہے لاڈو۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شانی کا تو ایسا معاملہ تھا کہ...... منڈا شہر لاہور دا، میرے دل تے تیر چلائے!''

''جی تھانے دار صاحب!'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''قیصر تو شانی کے دل پر تیر چلا کر واپس لاہور چلا گیا اور پچھلی شام سے شانی بھی غائب ہے۔ ان دونوں کی [illegible] سے مصیبت ہم پر آگئی ہے......!''

بات کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس کے لہجے سے بیزاری ٹپکنے لگی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے تسلی دی۔

''لاڈو! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے ہوتے ہوئے تم پر کوئی مصیبت نازل نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں تمہیں بے فکر رہنا چاہیے۔ جب تمہیں اپنی لاڈو بنا لیا ہے تو پھر میں تمہیں ہر آفت اور مصیبت سے بھی بچاؤں گا...... کیا سمجھیں؟''

''سمجھ گئی جی۔'' وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یقین ہے، آپ ہر [illegible] کریں گے۔''

''تم نے بتایا ہے کہ قیصر کل لاہور واپس چلا گیا تھا۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کتنے بجے کاموکی سے روانہ ہوا تھا؟''

''اس کے جانے کے صحیح ٹائم کا تو مجھے پتا نہیں تھانے دار صاحب!'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''بس اتنا پتا ہے

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

کہ وہ کل دوپہر کے بعد کہیں نظر نہیں آیا۔ آپ اس کے تایا نواب دین سے پوچھ لیں جی۔"

"نواب دین سے ملنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بس، تم سے ایک آخری سوال......"

میں اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو چھیماں منتظر نگاہ سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"لاڈو! کہیں ایسا تو نہیں کہ شانی بھی لاہور چلی گئی ہو؟"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے جی۔" وہ الجھن بھرے لہجے میں بولی۔ "قیصر لگ بھگ ایک ماہ تک اپنے تایا کے گھر میں رہا ہے اور اس نے ایک دن بھی شانی کو گھاس نہیں ڈالی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لاہور کیسے لے جاسکتا ہے؟"

"تم میری بات کو دوسرے زاویے سے دیکھو۔" میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں یہ نہیں کہہ رہا کہ قیصر، شانی کو اپنے ساتھ لاہور لے گیا ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ شانی اپنی مدد آپ کے تحت گھاس چرنے اس کے پیچھے لاہور روانہ ہوگئی ہو......؟"

میری بات کے دوسرے پہلو پر غور کرنے کے بعد چھیماں کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ آنکھیں پھیلا کر حیرت بھری آواز میں بولی۔

"اس انداز میں تو میں نے سوچا ہی نہیں......!"

"پہلے نہیں سوچا تو اب سوچو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں سے جارہا ہوں۔ میرے جانے کے بعد اگر تمہیں کوئی خاص بات یاد آجائے تو اپنے ابا کے تانگے پر بیٹھ کر سیدھی میرے پاس تھانے آجانا۔ مجھے یقین ہے، شانی کو تلاش کرنے میں تم میری بھرپور مدد کروگی۔"

بات کے اختتام پر میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بھی میری تقلید میں موڑھے سے اٹھ گئی پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔

"میں آپ کی بات چنگی طراں سمجھ گئی ہوں تھانے دار صاحب۔"

"اور ابھی جو ہمارے بیچ شانی کی محبت اور قیصر کے بارے میں جتنی بھی گفتگو ہوئی ہے اس کا کسی سے ذکر نہیں کرنا، کم از کم اس وقت تک جب تک میں شانی کو بازیاب نہیں کرلیتا۔" میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ "ان معاملات کو ابھی راز ہی رہنا چاہیے۔"

"میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گی۔" اس نے فرماں برداری سے کہا پھر قادر علی کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

میں چھیماں کی نظر میں چھپے ہوئے تذبذب کی گہرائی میں اتر گیا پھر اس کی تسلی کی خاطر کہا۔ "تم قادر علی کی فکر نہ کرو۔ یہ کامونکی کا دسنیک ضرور ہے مگر مکمل طور پر یہ میرا وفادار ہے۔ یہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا اور اس بات کا بھی اطمینان رکھو کہ اب تمہارے گھر پر تفتیش کے نام پر تم لوگوں کو کوئی تنگ کرنے نہیں آئے گا۔"

وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"شکریہ تھانے دار صاحب!"

میں جانے کے لیے پلٹا تو چھیماں نے کہا۔ "آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا؟"

"کون سا وعدہ لاڈو؟" میں نے رک کر پوچھا۔

"وہ میری خواہشیں پوری کرنے والا وعدہ......!"

"ہاں، ہاں...... اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "لاڈو! میں پولیس کی وردی میں تمہارے دو تین فوٹو بنواؤں گا۔ تم بالکل تھانے دارنی لگوگی اور میں لوگوں کو یہ بھی بتاؤں گا کہ میں نے تمہیں اپنی لاڈو بنالیا ہے لہٰذا وہ تم سے ڈرا کریں......" لمحاتی توقف کر کے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پوچھا۔

"تم یہی سب چاہتی ہو نا؟"

"جی تھانے دار صاحب۔" وہ ایک دم کھل اٹھی۔

میں نے کہا۔ "اور میں تمہاری یہ فرمائشیں اس وقت پوری کروں گا جب شانی کو میں ڈھونڈ نکالوں گا۔ یہ بات تمہیں اپنے ذہن میں رکھنا ہوگی۔"

"رکھوں گی تھانے دار صاحب۔" وہ فرماں برداری سے بولی۔

"ایک بات اور......" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آج کے بعد تم مجھے 'تھانے دار' بھی نہیں کہوگی!"

"کیوں جی......" وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "کیا آج کے بعد آپ پولیس کی نوکری چھوڑ دیں گے؟"

"میں اگر پولیس کی نوکری چھوڑ دوں گا تو پھر تمہاری سہیلی شانی کو کون تلاش کرے گا؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں جی۔ یہ بھی ہے......!" وہ آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔ "پھر میں آپ کو کیا کہوں جی؟"

"تھانے دار میں دوسرے لوگوں کے لیے ہوں مگر تم

تو اب میری لاڈو بن چکی ہو۔" میں نے کہا۔ "اس لیے تم مجھے "انکل" کہا کرو۔"

لڑکی سمجھ دار تھی، جلدی سے بولی۔ "ٹھیک ہے انکل۔"

میں آمنہ ماچھن کے گھر سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

سورج آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ گرمی کی شدت کو دیکھ کر یہ کہنے کو دل چاہتا تھا کہ آج سورج سوا نیزے پر آگیا ہے۔ ہم جیرا کوچوان کی گلی سے نکلے تو قادر علی نے کہا۔

"ملک صاحب! اس لڑکی نے جو انکشاف کیا ہے، ادھر تھانے میں، میں بھی آپ کو اسی بارے میں بتانے والا تھا۔"

قادر علی کے یاد دلانے پر مجھے فوراً یاد آگیا کہ جب وہ میرے لیے ٹھنڈا پانی لینے جارہا تھا تو میرے ایک استفسار کے جواب میں اس نے کہا تھا۔ "ابھی بتاتا ہوں ملک صاحب۔" میرا وہ سوال شانی کی گمشدگی کے حوالے سے تھا لیکن پھر جمیلہ بی بی اینڈ کمپنی تھانے آگئے تھے اور میں ان لوگوں کے ساتھ مصروف ہوگیا تھا چنانچہ قادر علی کو اپنی بات کہنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

"تم چھیماں کے کون سے انکشاف کی بات کر رہے ہو قادر علی؟" میں نے پوچھا۔

"شہری بابو والے انکشاف کی سر جی۔" وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ "شانی اور قیصر والے معاملے کی کئی لوگوں کو خبر ہے لیکن کوئی کھل کر اس موضوع پر بات نہیں کرتا اور اس سلسلے میں چاچی خدیجہ سب سے زیادہ باخبر ہے۔"

"یہ چاچی خدیجہ کون ہے؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"چاچی خدیجہ کرامت علی کی بیوی ہے ملک صاحب۔" قادر علی نے بتایا۔ "کرامت علی کریانے کی دکان چلاتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے چھیماں اسی کی دکان سے سودا لے کر گئی تھی۔" میرے استفسار پر قادر علی نے مجھے مزید بتایا کہ خدیجہ چاچی ایک شکی مزاج، دوسروں کی ٹوہ میں رہنے والی ایک بانجھ عورت تھی یعنی خدیجہ اور کرامت کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ یہ بے اولاد جوڑا پانچ مرلے کے ایک مکان میں رہتا تھا اور گھر کی بیٹھک میں کرامت علی نے کریانے کی دکان کھول رکھی تھی جہاں سے گاؤں کے دسنیک اپنی ضرورت کے مطابق سودا سلف لینے آتے تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی مل کر دکان چلایا کرتے تھے۔ خدیجہ کا مکان جمیلہ کے مکان کی دائیں جانب تھا جبکہ نواب دین کا مکان جمیلہ کے گھر کی بائیں طرف تھا، نواب دین جو شہری

بابو قیصر کا تایا تھا۔ گویا جمیلہ بی بی کا گھر ان دونوں مکانوں کے بیچ میں واقع تھا اور اس کی جوان جہان بیٹی شانی گزشتہ رات اچانک غائب ہوگئی تھی۔ قادر علی کے بقول، خدیجہ چاچی نے شانی اور قیصر کے معاملے پر بڑی گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ دورِ جدید کے مطابق آپ دورِ قدیم کی آنٹی خدیجہ کو ایک سی سی ٹی وی کیمرا سمجھ لیں۔

"قادر علی! تم اسی گاؤں کے رہنے والے ہو لہٰذا یہاں کے لوگوں اور ان کے معاملات کو مجھ سے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہو۔" میں نے موجودہ حالات کی روشنی میں ایک فوری فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں شام تک کا وقت دیتا ہوں۔ تم چاچی خدیجہ، نواب دین اور دیگر لوگوں سے مل کر وہ تمام معلومات اکٹھا کرو جو شانی کی تلاش کے سلسلے میں ہمارے کام آسکتی ہیں۔ ان معلومات کی روشنی میں ہم آیندہ کا لائحہ عمل تیار کریں گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟"

"ایک سو ایک فیصد ملک صاحب۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں سب متعلقہ لوگوں کی کنڈلی نکالتا ہوں۔ انشاء اللہ! شام تک میں آپ کو کافی مفید رپورٹ دوں گا۔"

"شاباش!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بس فوراً سے پیشتر اپنے کام سے لگ جاؤ۔"

"اور آپ......!" اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ "کیا آپ واپس تھانے جارہے ہیں؟"

"ہاں!" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن اس سے پہلے میں ایک چکر قبرستان والے مزار کا لگانا چاہتا ہوں۔"

قادر علی معنی خیز انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

منڈی کامونکی نامی اس گاؤں میں زیادہ تر لوگوں کا ذریعۂ معاش کاشتکاری ہی تھا، یہ الگ بات کہ ان میں کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا زمیندار تھا۔ شہری بابو قیصر کا تایا نواب دین بھی ایک چھوٹا زمیندار تھا۔ اس کے پاس پندرہ ایکڑ زرعی اراضی تھی۔ نواب دین اور اس کی بیوی بلقیس کی کل پانچ اولادیں تھیں۔ جن میں دو بیٹیاں اور تین بیٹے شامل تھے۔ بتیس سالہ حمیدہ، تیس سالہ رشیدہ اور پچیس سالہ وہاب دین کی شادیاں ہوچکی تھیں جبکہ ان سے چھوٹے دو بیٹے، بیس سالہ جمال دین اور اٹھارہ سالہ کمال دین ابھی غیر شادی شدہ تھے۔ قیصر، نواب دین کے چھوٹے بھائی فیروز دین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ فیروز دین لاہور میں کپڑے کی دکان چلاتا

http://urdutubes.com/

تھا۔ آپ کو یہ تمام تر تفصیل بتانے کا مقصد یہ ہے کہ دورانِ مطالعہ کسی موقع پر آپ کا ذہن الجھن کا شکار نہ ہو۔

پیر مرید حسین کا آستانہ قبرستان کے اندر مزار کے احاطے ہی میں تھا جو "شاہ جی" کہلاتا تھا اور خود کو صاحب مزار فرید حسین شاہ کا سچا جانشین بتاتا تھا۔ گاؤں کے لوگ مرید حسین کی بڑی عزت کرتے تھے اور اپنی ضروریات کے پیش نظر اس سے تعویذ وغیرہ بھی لیا کرتے تھے۔ چھیماں کی زبانی شانی کے بارے میں مجھے جن حقائق کا علم ہوا تھا وہ اس امر کا متقاضی تھا کہ میں اس سلسلے میں مرید حسین سے بھی پوچھ تاچھ کروں اگرچہ چھیماں کے بیان کے مطابق شانی نے صرف مزار پر فاتحہ خوانی کی تھی اور شہری بابو قیصر کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے خصوصی منت بھی مانی تھی۔ محبت کرنے والے بڑے معصوم اور سادہ دل ہوتے ہیں۔ اپنے محبوب کو پانے کے لیے وہ ہر کس و ناکس اور ہر ممکن و ناممکن سے امیدیں وابستہ کر بیٹھتے ہیں۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ...... محبت اندھی ہوتی ہے۔

مرید حسین نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا۔ مجھے عزت سے بٹھایا۔ خاطر تواضع کے لیے پُرخلوص انداز میں پوچھا پھر میرے انکار پر اس نے ٹھہرے ہوئے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"ملک صاحب! آج فوجوں نے میرے آستانے پر کیوں چڑھائی کی ہے۔ سب خیریت تو ہے نا......"

"شاہ جی!" میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔ "جب تک خطے میں امن و امان قائم رہتا ہے، افواج کو بیرکوں سے نکلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن جیسے ہی ملک کے طول و عرض میں کہیں بھی کسی بدامنی اور افراتفری کی اطلاع موصول ہوتی ہے، فوجوں کو ہنگامی بنیادوں پر میدان میں اترنا پڑتا ہے، چاہے وہ زمین کا خطہ منڈی کا مونگی ہی کیوں نہ ہو۔"

میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں جو کچھ بھی کہا تھا، اسے پیر سائیں نے من و عن سمجھ لیا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر مجھے کسی قسم کی الجھن دکھائی نہیں دی تاہم پھر بھی اس نے تصدیق طلب انداز میں کہا۔

"منڈی کا مونگی پر کون سی افتاد ٹوٹ پڑی ہے ملک صاحب۔"

"شاہ جی! آپ ماشاءاللہ بہت پہنچے ہوئے ہیں، بڑے کرنی والے ہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "یہ بات یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ گزشتہ رات اس علاقے سے ایک جوان جہان لڑکی غائب ہوگئی ہے......!"

"اوہ......!" اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔ "آپ کہیں ظہور حسین مرحوم کی بیٹی شانی کی بات تو نہیں کر رہے؟"

"یقیناً!" میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "میں شانی کی گمشدگی کا ہی ذکر کر رہا ہوں۔ آج صبح شانی کی ماں، اس کا بھائی اور ان کا ایک قریبی رشتے دار ریاض احمد میرے پاس تھانے شانی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آئے تھے۔ میں اس وقت شانی کی بازیابی کے لیے تفتیش کرتا پھر رہا ہوں۔"

"سمجھ گیا جناب!" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "شانی کے اچانک غائب ہو جانے والا واقعہ میرے علم میں ہے۔ آپ شانی کی تلاش میں میرے پاس تشریف لائے۔ میں آپ کو سو بسم اللہ کہتا ہوں لیکن......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھا پھر خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

"میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ شانی کی گمشدگی سے میرے آستانے کا کیا تعلق ہے؟"

"صرف تعلق ہی نہیں بلکہ بہت گہرا رشتہ کہیں شاہ جی!" میں نے اپنے مخصوص [illegible] کی کوشش کی۔

"[illegible] آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں ملک صاحب؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ "شانی کا میرے آستانے سے بھلا کیا رشتہ ہو سکتا ہے۔"

"وہی رشتہ جو ایک مرید کا پیر سے ہوتا ہے۔" میں نے گھسائی کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جو رشتہ ایک دینے اور لینے والے کا ہوتا ہے......!"

"ملک صاحب!" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے، کھل کر کہیں، بجھارتوں میں بات کرنا معاملے کو اور الجھا سکتا ہے۔"

"اس نکتے پر میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں شاہ جی۔" میں نے پیر مرید حسین کی زبان کھلوانے کے لیے حقیقت کے اندر فکشن کی آمیزش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے آستانے کا رخ کرنے کا ایک خاص سبب ہے۔"

"کون سا سبب؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ کل سہ پہر کے وقت شانی آپ کے آستانے پر آئی تھی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے کہا۔ "شانی کے ساتھ اس کی سہیلی چھیماں بھی تھی۔ چھیماں تو بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ گئی لیکن شانی تا حال لاپتا ہے۔"

"جناب! آپ دیکھ رہے ہیں، یہاں قبرستان میں میرے مرشد پیر فرید حسین شاہ صاحب کا مزار بھی ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "روزانہ کئی مرد و زن فاتحہ خوانی کے لیے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ شانی اور چھیماں بھی یقیناً یہاں آئی ہوں گی۔ میں مزار پر آنے والے لوگوں کا حساب نہیں رکھتا جناب۔"

بات کے اختتام پر پیر سائیں کے لہجے میں روکھا پن اتر آیا تھا۔ میں نے مثبت بنی بر مصلحت دروغ گوئی کے مکھن سے اس کے مزاج کو تر کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میں مزار کی نہیں، آپ کے آستانے کی بات کر رہا ہوں سرکار!"

"یعنی...... آپ کا مطلب ہے، شانی کل سہ پہر مجھ سے ملنے آئی تھی؟" اس کے لہجے سے حیرت عیاں تھی۔

"بالکل، میرا یہی مطلب ہے سرکار!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "پہلے شانی نے مزار پر فاتحہ خوانی کی، پھر اس نے مزار کی جالیوں کے ساتھ منت کا دھاگا باندھا۔ اس کے بعد وہ آستانے پر [illegible] تعویذ وغیرہ لینے آئی تھی......!"

[illegible] گزشتہ روز ان کا مزار والا دورہ صرف دعا اور منت تک محدود رہا تھا۔ انہوں نے شاہ جی سے ملاقات کی تھی اور نہ ہی ان سے کوئی تعویذ شعویذ لیا تھا۔ اس وقت میں مرید حسین کے ساتھ جو کچھ بھی کر رہا تھا اسے میری تفتیش کا حصہ سمجھ لیں۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب!" میری بات کے جواب میں وہ خاصے تیز لہجے میں بولا۔ "اگر کل شانی مجھ سے کوئی تعویذ لے کر گئی ہوتی تو مجھے اچھی طرح یاد ہوتا۔ آپ کو کسی نے اس بارے میں بالکل غلط بتایا ہے......" وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا۔ چند لمحات تک اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا پھر سوال کیا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ شانی مجھ سے کس مقصد کے لیے تعویذ لینے آئی تھی؟"

"محبت میں کامیابی کا تعویذ۔" میں نے پیر سائیں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "شانی کو ایک پردیسی سے محبت ہوگئی تھی لیکن وہ پردیسی، شانی کی محبت کو پہچانتا نہیں تھا اور شانی کی خواہش تھی کہ وہ بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے دے۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر شانی نے مزار پر دعا کی، منت مانی اور پھر آپ سے کوئی چمت کاری تعوی لینے کی غرض سے وہ......!"

"ایک منٹ ملک صاحب!" میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے بولا پھر بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"کہیں آپ نواب دین کے بھتیجے قیصر کی بات تو نہیں کر رہے......؟"

"بالکل! میں اسی شہری بابو کا ذکر کر رہا ہوں شاہ جی۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "شانی، قیصر کو اپنی طرف مائل کرنے کی تگ و دو میں لگی ہوئی تھی۔"

"میری ایک بات کا یقین کر لیں ملک صاحب!" مرید حسین بڑے مستحکم انداز میں بولا۔ "کل شانی میرے آستانے پر بالکل نہیں آئی تھی، تعویذ لینا تو دور کی بات ہے اور جہاں تک قیصر کے حصول کا معاملہ ہے تو میں سمجھتا ہوں، اس کام کے لیے شانی کو کسی تعویذ کی حاجت ہرگز نہیں تھی۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ مرید حسین نے آخری جملے اتنے اعتماد کے ساتھ ادا کیے تھے کہ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"یہ بات آپ اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"ہم [illegible] پورے وثوق ہی سے کہتے ہیں ملک صاحب۔" [illegible] "میں" سے "ہم" پر بات کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔ "ہمیں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی عادت نہیں ہے۔"

"تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ نے اپنی کسی روحانی قوت کے طفیل یہ سب معلوم کر لیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں!" اس نے دیانت داری سے کام لیتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم آپ کو آنکھوں دیکھا احوال بتا رہے ہیں ملک صاحب۔"

"کیسا آنکھوں دیکھا احوال شاہ جی؟" میری حیرت دوچند ہوگئی۔

"کل شام ہم مغرب کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے آستانے سے باہر نکلے تھے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ہم نے اپنی آنکھوں سے ان دونوں کو ایک ساتھ سڑک کے کنارے کھڑے دیکھا تھا۔"

شاہ جی بہت بڑا انکشاف کر رہے تھے۔ میں نے تصدیق طلب نظر سے مرید حسین کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کا مطلب ہے، شانی اور قیصر کو آپ نے سڑک کے

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

کنارے کھڑے دیکھا تھا؟"

"جی، بالکل!" وہ پورے وثوق سے بولا۔ "ہمارا یہی مطلب ہے۔"

"وہ دونوں سڑک کے کنارے کھڑے کیا کر رہے تھے؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"اس بارے میں ہم آپ کو کچھ نہیں بتا سکتے ملک صاحب۔" وہ معتدل لہجے میں بولا۔ "ہم گاؤں والوں کے ذاتی معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے۔ ایک بات کا ہمیں یقین ہے کہ وہ دونوں آپس میں لڑائی جھگڑا نہیں کر رہے تھے۔ اس کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ ان میں گہرا اتفاق ہے۔ اسی بنا پر میں نے آپ سے کہا تھا کہ قیصر کو پانے کے لیے شانی کو کسی تعویذ کی ضرورت ہرگز نہیں۔"

"آپ نے تو اس کیس کو کسی اور ہی رخ پر ڈال دیا ہے شاہ جی۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کی باتوں سے تو میں یہی نتیجہ اخذ کر رہا ہوں کہ شانی اچانک کہیں گم نہیں ہوئی بلکہ وہ اپنی مرضی سے قیصر کے ساتھ گئی ہے۔"

"ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "ہم نے جو کچھ دیکھا، وہ آپ کو بتا دیا۔ باقی دلوں کا حال تو صرف رب کو معلوم ہے۔"

"بے شک! میرا پروردگار ہی دلوں کو پڑھنے والا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن شاہ جی! آپ نے کل سے اب تک اتنی بڑی حقیقت کو کیوں چھپائے رکھا؟"

"ملک صاحب!" اس نے نہایت ہی تحمل سے میرے سوال کا جواب دیا۔ "ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ ہم... خوامخواہ گاؤں والوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ باقی جہاں تک اس معاملے کو چھپانے کا سوال اٹھتا ہے تو ہم سچ کہہ رہے ہیں، اس طرف پہلے ہمارا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ کسی نے ہم سے آ کر پوچھا ہی نہیں اور ہمیں اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ شانی اور قیصر کے بیچ محبت کا کوئی سلسلہ چل رہا ہے۔ یہ سب کچھ تو آپ کی زبانی ہمیں پتا چلا ہے۔"

مرید حسین تو یہ وضاحت پیش کر کے بری الذمہ ہو گیا تھا لیکن وہ میرے ذہن میں سوچ کا ایک نیا دروازہ کھول چکا تھا۔ ایسا دروازہ جس سے گزر کر میں شانی تک پہنچ سکتا تھا۔ اگر شاہ جی کی آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا اور کوئی مغالطہ نہیں ہوا تھا تو پھر یہی سمجھ میں آ رہا تھا کہ شانی، قیصر کے ساتھ ہی کہیں گئی تھی اور شانی نے اپنے اس منصوبے کی چھیماں کو ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔ حالات و واقعات کی روشنی میں یہ میرا وقتی اندازہ تھا۔ حقیقت کیا تھی، یہ اب بہت جلد کھل کر میرے سامنے آنے والی تھی...... بہت جلد!

میں نے شاہ جی کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور آستانے سے نکل آیا۔

☆☆☆

غروب آفتاب سے تھوڑی دیر پہلے گمشدہ شانی کا بھائی صفدر مجھ سے ملنے تھانے چلا آیا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ امید یہی تھی کہ وہ شانی کے حوالے سے کوئی تازہ ترین اطلاع لے کر آیا ہوگا لیکن معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے استفسار کیا۔

"تھانے دار صاحب! میری بہن کا کچھ پتا چلا؟"

"کل کسی بھی وقت میں شانی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے یقینی لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کے لیے مجھے آپ لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔"

صفدر کی عمر لگ بھگ اٹھائیس سال تھی۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کا ایک چھ سال کا بیٹا جنید بھی تھا۔ صفدر کی بیوی صفیہ ایک سیدھی سادی گھریلو دیہاتن تھی۔ میری بات سن کر صفدر کا چہرہ شکن آلود ہو گیا۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

[illegible]

جناب! ہم تو آپ سے ہر قسم کا تعاون کر رہے ہیں۔"

"ہر قسم تو رہ گیا ایک طرف......" میں نے شاکی انداز میں کہا۔ "تم لوگ کسی بھی قسم کا تعاون نہیں کر رہے ہو۔ اس طرح تفتیش کی گاڑی آگے نہیں بڑھے گی لہٰذا میں شانی کی بازیابی کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔"

"لیکن ابھی تو آپ نے کہا ہے کہ کل کسی بھی وقت آپ شانی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے......؟" اس نے بے حد الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میری کامیابی تم لوگوں کے تعاون کے ساتھ مشروط ہے صفدر۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے تم نے میری بات کو غور سے نہیں سنا۔"

"بہت توجہ اور غور سے سنا ہے میں نے تھانے دار صاحب۔" اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔ "لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ ہمارے تعاون سے مطمئن کیوں نہیں ہیں۔"

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم لوگ مجھ سے صد فیصد سچ بولو اور چھوٹی سے چھوٹی بات بھی مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کرو۔"

"ہم نے آپ سے کیا چھپایا ہے تھانے دار صاحب؟" وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔

"شانی کی محبت کے حوالے سے آپ لوگوں نے حقائق کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی ہے۔" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"شانی کی محبت......" وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ "حقائق کی پردہ پوشی......؟" اس کی حالت دیدنی تھی۔

"یہ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب......؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں صفدر۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ شانی، قیصر کو پسند کرتی تھی؟"

"کون قیصر؟" اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

"میں اس لاہوری منڈے کی بات کر رہا ہوں جو ایک ماہ تک تمہارے پڑوس میں رہ کر گیا ہے۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ "نواب دین کا بھتیجا قیصر......"

"اچھا وہ شہری بابو۔" صفدر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس سے تو میری اچھی خاصی سلام دعا رہی ہے۔ وہ ادھر لاہور کے کسی اسکول میں پڑھاتا ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے تایا نواب دین سے ملنے آیا ہوا تھا۔ وہ کل ہی واپس لاہور چلا گیا ہے۔ لیکن آپ شانی کی محبت اور پسندیدگی کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ شانی کی شادی تو میری خالہ شکیلہ کے بیٹے آفتاب سے ہونے [illegible]"

[illegible] کا ٹھوس ثبوت بھی ہے میرے پاس۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم کل شام تک انتظار کرو۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

"پتا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں......!" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

"تھوڑا صبر کر لو۔ پھر سب پتا چل جائے گا۔"

"اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا تو آپ کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شانی گھر سے بھاگ گئی ہے۔" وہ بے بس لہجے میں بولا۔ "مطلب وہ قیصر کے ساتھ لاہور چلی گئی ہے؟"

"ابھی اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا صفدر۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بتایا۔ "ایک امکان بہرحال یہ بھی ہے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا تھانے دار صاحب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں شانی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ اپریل 2019ء کی جھلکیاں

نکتہ رس

اس مشہور شاعر خوش نوا کا زندگی نامہ جس کی آواز کھو گئی تھی

شہنشاہ ظرافت

ایک باکمال پاکستانی اداکار کا تذکرۂ خاص

...ت سے واپسی

ایک ایسا واقعہ جس نے تہلکہ مچا دیا تھا، اس واقعے پر کتابیں لکھی گئیں، کئی فلمیں بنیں

النکاح من سنتی

اسلام نے اس حکم نامے کو کیوں لازم قرار دیا ہے، ایک دوشیزہ کی عبرت بھری سچ بیانی

اس کے علاوہ

بہت سی سچ بیانیاں، سچے واقعات اور دلچسپ قصے جو صرف سرگزشت کا خاصہ ہے

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں آپ خود گرویدہ ہو جائیں گے۔

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر شمارہ مختص کرا لیں

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

کی پسند، ناپسند مجھ سے چھپی ہوئی نہیں۔ وہ ریاض احمد کے بیٹے ثاقب کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اس نے اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار بھی کر دیا تھا۔ آفتاب کے معاملے میں اس نے کبھی شدید ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ آفتاب سے شادی پر دل سے راضی ہے اور...... آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ قیصر میں دلچسپی رکھتی تھی۔ تھانے دار صاحب! آپ کی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی......"

"ہضم تو ابھی تک مجھے بھی نہیں ہوئی اسی لیے تو کہا ہے کہ کل شام تک انتظار کرو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب تک میں لاہور میں قیصر کو چیک نہیں کروا لیتا، حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چونکہ تم نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ میں نے اب تک شانی کی تلاش کے سلسلے میں کیا کیا ہے...... تو میں نے تمہیں اپنی کارکردگی سے آگاہ کرنا ضروری جانا۔ باقی کل شام تک سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا۔"

"دیکھیں جی، اللہ پاک کو کیا منظور ہے۔" وہ بے چارگی سے بولا۔ "ہم تو شانی کی گمشدگی کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان ہیں۔ اللہ خیر کرے۔ وہ زندہ ہو......"

"صفدر! اللہ تعالیٰ تو بندے کا خیر خواہ ہی ہے۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ "کاش بندہ اس کی مصلحتوں کو سمجھنے کے قابل ہوجائے۔ پھر ساری فکریں اور پریشانیاں خود بخود ہی ختم ہوجائیں گی۔"

صفدر تو پہلے ہی بہت زیادہ الجھا ہوا تھا۔ [illegible] نے قیصر کا ذکر کر کے اس کی الجھن میں [illegible] اضافہ کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسی جوان بہن کا بھائی تھا جو ایک روز پہلے اچانک کہیں غائب ہوگئی تھی۔ میں اس کی جذباتی مجبوریوں کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا، کاش وہ بھی میری محکمہ جاتی مجبوریوں کو محسوس کرلیتا۔ میں نے بڑے جامع انداز میں صورتِ حال سے اسے آگاہ کر دیا تھا۔ میں فی الحال اس سے زیادہ کھل کر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

وہ جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا تو میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "صفدر! پریشان ہونے سے کبھی مسئلے حل نہیں ہوا کرتے۔ تم اس امید کے ساتھ یہاں سے جاؤ کہ میں تمہاری بہن کو بہت جلد بازیاب کرلوں گا۔"

"ٹھیک ہے جی......" وہ بڑی بے چارگی سے بولا۔ "ایک آپ ہی تو ہماری آخری امید ہیں تھانے دار صاحب۔"

"بس، تو پھر چپ چاپ مجھ سے تعاون کرتے جاؤ۔" میں نے اس کے ٹوٹے ہوئے حوصلے کی مرمت کرتے ہوئے کہا۔ "میں انشاء اللہ! تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔"

"آپ جو کہیں گے، میں وہی کروں گا۔" وہ اطاعت بھرے لہجے میں بولا۔

"فی الحال تم نے اپنی زبان کو قابو میں رکھنا ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی میں نے تم سے قیصر کے حوالے سے جتنی بھی باتیں کی ہیں، ادھر گاؤں میں حتیٰ کہ اپنے گھر میں بھی اس کا چرچا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"سمجھ گیا جناب!" وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے تسلی تشفی دے کر اسے رخصت کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کانسٹیبل قادر علی تھانے پہنچ گیا اور میرے کمرے میں آکر سیلوٹ کرنے کے بعد پُرجوش انداز میں بولا۔

"ملک صاحب! سمجھ لیں، شانی کی گمشدگی کا مسئلہ حل ہوگیا۔"

"ایسے کیسے سمجھ لوں قادر علی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب تک تم اپنے منہ سے اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش نہیں کرو گے، میں بھلا کیا سمجھ سکتا ہوں۔"

"بتاتا ہوں جی۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

اگلے دس منٹ میں قادر علی نے مجھے جو تفصیل بتائی اسے چند جملوں میں [illegible] قیصر اور شانی کے معاملات [illegible] لوگوں کو معلوم تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ٹریفک یکطرفہ تھی یا دوطرفہ۔ چاچی خدیجہ کا دعویٰ تھا کہ دال میں کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔ اسے یقین تھا کہ دونوں اندر سے ملے ہوئے ہیں اور اس کا بھی یہی خیال تھا کہ شانی، قیصر کے ساتھ ہی کہیں چلی گئی ہے۔ قادر علی کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق قیصر گزشتہ روز پانچ بجے یہاں سے روانہ ہوا تھا۔ یہ کم و بیش وہی وقت تھا جب شانی اپنی سہیلی چھیماں کے ہمراہ مزار پر موجود تھی۔ اگر شانی اور قیصر واقعتاً اندر سے ملے ہوئے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شانی نے اپنی سہیلی چھیماں کو مکمل طور پر اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ وہ چھیماں کے ساتھ اپنی گلی تک گئی۔ پھر جب چھیماں اپنے گھر کی جانب بڑھ گئی تو شانی، پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق قیصر سے ملنے سڑک کی طرف چلی گئی۔ مرید حسین نے مغرب سے تھوڑی دیر پہلے ان دونوں کو سڑک کے کنارے کھڑے دیکھا تھا۔ اگر سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا نظر آرہا تھا تو پھر اس امر میں کسی شک و شبہے کی

گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ شانی، قیصر کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔

قادر علی نے مزید بتایا کہ قیصر کی رہائش لاہور کے ایک گنجان آباد علاقے "اچھرہ" میں تھی۔ اچھرہ ہی کے ایک پرائمری اسکول میں وہ پڑھاتا تھا۔ اس نے میٹرک کر رکھا تھا اور اپنے حلقے میں اس کی بہت عزت تھی۔ اس زمانے میں میٹرک پاس انسان کو بہت پڑھا لکھا، عالم و فاضل اور قابل سمجھا جاتا تھا اور حقیقتاً ایسا تھا بھی۔

قادر علی نے یہ پتا بھی چلا لیا تھا کہ قیصر کا باپ فیروز دین اچھرہ موڑ پر کپڑے کی دکان چلاتا تھا۔ ان لوگوں کی رہائش ذیلدار روڈ پر تھی۔ ذیلدار روڈ اچھرہ کا وسطی حصہ ہے۔ قادر علی، فیروز دین کے مکان کا مکمل ایڈریس بھی لے آیا تھا۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے ایک انکشاف بھی کیا۔

"ملک صاحب! میں شانی اور قیصر کے تعلقات کا ایک گواہ بھی اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

اس کے پراسرار انداز کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک نام چمکا۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ "چاچی خدیجہ......!"

"نہیں سر جی۔" وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "میں چاچا لیاقت کی بات کر رہا ہوں۔"

"اس چاچے کو تم کہاں سے نکال لائے ہو قادر علی۔" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "اور شانی [illegible] وہ کیا جانتا [illegible] گواہ کا لفظ کیوں استعمال کیا؟"

"میں چاچا لیاقت کو کہیں سے نکال کر نہیں لایا ملک صاحب۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیاقت کی رہائش بھی منڈی کاموکی ہی میں ہے۔ وہ شانی اور قیصر کی محبت کی کہانی کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا البتہ اس نے کل شام جو کچھ دیکھا وہ نہایت ہی اہم اور قابلِ توجہ ہے جناب۔"

"چاچا لیاقت نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے؟" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ٹھہریں جی، میں چاچا لیاقت کو آپ کے پاس لے کر آتا ہوں۔" وہ میرے کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولا۔ "آپ خود اس سے سوال جواب کرلیں۔ میں نے اسے باہر برآمدے میں بٹھا رکھا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد چاچا لیاقت نامی وہ شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ لیاقت کے بیان کے مطابق اسی نے گزشتہ شام شانی اور قیصر کو سڑک کے کنارے ایک ساتھ کھڑے دیکھا تھا۔

یہی بات پیر سائیں مرید حسین نے بھی مجھے بتائی تھی۔ لیاقت کی گواہی کے بعد تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی کہ شانی اور قیصر میں گہرا ربط ضبط تھا جسے شانی نے بڑی مہارت اور چالاکی سے چھپا رکھا تھا حتیٰ کہ اس کی راز دار سہیلی چھیماں بھی شانی کی محبت کے اس انداز کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس بے چاری، ملک صفدر حیات کی منہ بولی لاڈو کو صرف اتنا ہی پتا تھا کہ شانی بری طرح قیصر کی محبت میں گرفتار ہے مگر وہ سنگ دل انسان، شانی کی محبت کی قدر نہیں کرتا۔

میں چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے چاچا لیاقت کو گھورتا رہا، پھر وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ "لیاقت! شانی کی گمشدگی موضع کاموکی کا ایک حساس معاملہ ہے لہٰذا جو کچھ بھی بولو، بہت سوچ سمجھ کر بولنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی غلط بیانی کے نتیجے میں تم خود کسی مصیبت میں گرفتار ہوجاؤ۔"

"تھانے دار صاحب! مجھے بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ "میں نے قادر علی کو وہی بتایا ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور آپ کے سامنے بھی وہی کہوں گا جو حقیقت ہے۔"

"تو تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ کل شام میں تم نے شانی اور قیصر کو سڑک کے کنارے ایک ساتھ کھڑے دیکھا تھا؟" میں نے ان کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

"جی، پکا یقین ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔"

"تم اس وقت ادھر سڑک پر کیا کر رہے تھے؟"

"میں تو جناب بس سے اترا تھا۔" اس نے بتایا۔ "میں گوجرانوالہ سے آیا تھا۔"

"تم گوجرانوالہ سے واپس اپنے گھر آئے اور جب تم کاموکی کے اسٹاپ پر بس سے نیچے اترے تو تم نے شانی اور قیصر کو جی ٹی روڈ کے کنارے کھڑے دیکھا۔" میں نے مسلسل اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "وہ جی ٹی روڈ (جنرل ٹرنک روڈ) کے کس کنارے پر کھڑے تھے؟"

"جس طرف میں بس سے اترا تھا، اسی کنارے پر۔" اس نے جواب دیا۔

"تم گوجرانوالہ سے بس پر سوار ہو کر کاموکی تک

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

آئے تھے۔'' میں نے اپنی مرضی کی معلومات تک رسائی حاصل کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا وہ بس کامونکی تک ہی کی تھی یا اسے آگے بھی کہیں جانا تھا؟''

''جناب! میں جس بس سے اترا تھا وہ سیدھی لاہور جارہی تھی۔'' چاچا لیاقت نے جواب دیا۔

''وہ دونوں سڑک کی جس سائڈ پر کھڑے تھے اس سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ بھی لاہور ہی کی جانب سفر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تمہیں کیا لگتا ہے......؟''

''تھانے دار صاحب! میں دعوے کے ساتھ تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔'' وہ بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ان کا سڑک کے کنارے کھڑا ہونا تو یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ کہیں جانے والے ہیں۔ وہ کامونکی سے سیدھے لاہور گئے ہیں یا راستے میں کہیں اتر گئے ہیں، اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ کامونکی سے لاہور کی سمت سفر کرتے ہوئے راستے میں مریدکے اور شاہدرہ کے اسٹاپ بھی آتے ہیں۔''

''اور ''کالا شاہ کاکو'' بھی آتا ہے۔'' میں نے کہا پھر ایک نہایت ہی اہم سوال پوچھا۔ ''کیا وہ دونوں تمہارے سامنے لاہور جانے والی بس پر سوار ہو گئے تھے؟''

اس زمانے میں آج کل کی طرح جی ٹی روڈ پر ٹرانسپورٹ کی بہتات نہیں ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں کامونکی سے لاہور کی سمت سفر کرنے کے لیے [illegible] کے بعد آپ کو کوئی نہ کوئی بس یا ویگن [illegible] لیکن جس دور کا یہ واقعہ ہے تب یہ سہولت میسر نہیں تھی۔ اپنی مرضی اور ضرورت کی بس کے لیے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس تناظر میں اگر شانی اور قیصر کو لاہور جانا تھا تو پھر انہیں اس بس کو ہرگز مس نہیں کرنا چاہیے تھا جس میں سے چاچا لیاقت اترا تھا۔

لیاقت نے میری توقع کے خلاف جواب دیا۔ ''نہیں جی۔ وہ اس بس میں تو نہیں بیٹھے تھے۔''

''اوہ......'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا اور پوچھا۔ ''کیا ان لوگوں سے تمہاری کوئی بات چیت بھی ہوئی تھی؟''

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل نہیں جناب۔''

''کیا ان دونوں نے یا ان میں سے کسی ایک نے تمہیں بس سے اترتے دیکھ لیا تھا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''میرا خیال ہے، نہیں دیکھا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ دونوں بات چیت میں اس قدر مشغول تھے کہ انہیں اپنے گردونواح کی خبر نہیں تھی۔ میں نے بھی ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔''

میں نے چاچا لیاقت کو فارغ کر دیا۔ وہ جتنا جانتا تھا، مجھے بتا چکا تھا۔ اس سے زیادہ اس کے اندر سے کچھ نہیں نکالا جاسکتا تھا۔ میں نے اسے زبان بند رکھنے کی تاکید کی اور تھانے سے جانے کی اجازت دے دی۔

کانسٹیبل قادر علی کو میں نے اب تک پیر سائیں کی فراہم کردہ اطلاعات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ چاچا لیاقت کے جانے کے بعد میں نے اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کیا اور حتمی لہجے میں کہا۔

''قادر علی! وہ دونوں لاہور ہی گئے ہیں۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے سر جی۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''بس تو پھر تم کمر کس لو قادر علی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آج کی طرح کل کا پورا دن بھی تمہیں بے پناہ مصروفیت میں گزارنا ہے۔''

''آپ کا ساتھ ہو سر جی تو پھر وقت گزرنے کا پتا چلتا ہے اور نہ ہی تھکن کا احساس ہوتا ہے۔'' وہ بڑے عزم سے بولا۔ ''آپ حکم کریں۔ میں ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہوں۔''

''شاباش!'' میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''لیکن ایک بات ذہن [illegible] ساری محنت [illegible] میرے [illegible]''

''اوہ......'' [illegible] انداز [illegible] ہوئے ایک گہری سانس خارج کی پھر شٹولنے والے لہجے میں بولا۔ ''اگر میں غلط نہیں سوچ رہا تو آپ نے صبح لاہور جانے کا ارادہ کر لیا ہے......؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک ساتھ کام کرتے ہوئے جب انسان، دوسرے انسان سے کلوز ہو جاتا ہے اور اس کلوزنیس میں خلوص اور دیانت داری بھی شامل ہوتی ہے تو پھر انسان کا ذہن خود بخود ٹیلی پیتھی کا ماہر بھی ہو جاتا ہے۔ ساتھی کی سوچ اور ارادے تک بہ آسانی رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔ کانسٹیبل قادر علی کے ساتھ بھی میرا اسی نوعیت کا گہرا تعلق قائم ہو چکا تھا جبھی اس نے میرے لاہور جانے والے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ تھانے کے عملے میں قادر علی سے زیادہ سینئر بھی کئی افراد موجود تھے لیکن مجھے قادر علی کے ساتھ کام کرنے کا جو مزہ آتا تھا وہ کسی دوسرے کی ہمراہی میں نہیں تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ

http://urdutubes.com/

ہماری فریکوئنسی زبردست میچ کرتی تھی۔

"میری کل کی مصروفیت کے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے سرجی؟" اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"تم کل کا پورا دن کھوجی کی معیت میں گزارو گے۔" میں نے جواب دیا۔ "شانی کے دروازے سے پیر فرید حسین کے مزار تک، مذکورہ مزار سے شانی کی گلی تک، پھر شانی کی گلی سے سڑک کے اس کنارے تک جہاں شانی اور قیصر کھڑے دیکھے گئے ہیں...... ان تمام مقامات کے مابین تم نے شانی کا کھرا تلاش کرنا ہے اور یہ پتا چلانے کی کوشش کرنا ہے کہ سڑک کے اس کنارے کے بعد ان دونوں نے کہاں کا قصد کیا۔"

"سمجھ گیا سرجی!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "بلکہ میں شانی کے علاوہ قیصر کا کھرا اٹھانے کی بھی پوری کوشش کروں گا تاکہ یہ پتا چلایا جاسکے کہ اپنے تایا نواب دین کے گھر سے روانہ ہونے سے سڑک کے کنارے پہنچنے تک کے دوران میں اس نے کہاں کہاں جھک ماری تھی...... !"

"شاباش!" میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "قادر علی! مجھے تم سے ایسی ہی عقل مندی کے مظاہرے کی امید تھی۔ ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا۔"

"کون سی بات ملک صاحب؟" وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا۔

"نواب دین اور اس کے گھر والوں کو یہ [illegible] ہونا چاہیے کہ ہم کس رخ پر تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "فی الحال ہمارے عزائم کا ان لوگوں کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

"سمجھ گیا جناب۔" وہ پُرسوچ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"کھوجی کی ٹیکنیکل سپورٹ کے علاوہ اگر تمہیں مزید کسی اہلکار کی ضرورت پیش آئے تو میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔" میں نے کہا۔ "تم جس کسی کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہو، لے جانا۔"

"سرجی! اول تو اللہ کے حکم سے اور آپ کی دعا سے مجھے ایسی کسی معاونت کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "بفرضِ محال، اگر ایسی کوئی نوبت آ بھی گئی تو آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔"

میں نے ضروری ہدایات دے کر قادر علی کو فارغ کردیا۔

☆☆☆

شانی پچیس جون کی شام لاپتا ہوئی تھی اور چھبیس جون کی صبح میرے پاس اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی تھی۔ یہ پورا دن میں کڑی دھوپ اور مسلسل دوڑ میں گزارا تھا۔ اس دن کی کارگزاری کے نتیجے میں جو زمینی حقائق سامنے آئے تھے ان کی روشنی میں، میں ستائیس جون کی صبح لاہور کے لیے روانہ ہوگیا۔

میرا تھانہ موضع کاموکی کے نزدیک ہی جی ٹی روڈ کے کنارے واقع تھا۔ میں جیسے ہی تھانے سے نکل کر سڑک پر آیا، ریاض احمد ایک گول مٹول پستہ قامت لڑکے کے ساتھ میری جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ میرے قریب آنے پر اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا تو اس نے مذکورہ لڑکے سے کہا۔

"ثاقب پتر! تھانے دار صاحب نوں سلام کر......"

میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ لفظ "ثاقب" نے مجھے کچھ یاد دلا دیا تھا اور وہ "کچھ" سولہ آنے درست تھا۔ شانی کی گمشدگی کی اطلاع دیتے وقت کل صبح جیلہ بی بی نے ثاقب کے حوالے سے ایک چبھتی ہوئی بات کی تھی۔ بعدازاں چھیماں نے اس امر کی تصدیق بھی کردی تھی۔ ثاقب نامی وہ لڑکا ریاض احمد کا وہی بیٹا تھا جس کے لیے اس نے جیلہ بی بی سے شانی کا ہاتھ مانگا تھا اور جیلہ نے بڑے طریقے سے اسے انکار کر دیا تھا۔ جیلہ بی بی نے ثاقب کے لیے "کوڑھ" [illegible] کیا تھا اور [illegible] سامنے [illegible] ریاض احمد کا وہ لڑکا جیلہ کے دیے ہوئے نام کے مطابق "اسم بامسمیٰ" سمجھ لیں۔

ثاقب نامی اس فرزند ریاض کی عمر بیس اور پچیس کے درمیان رہی ہوگی تاہم اس کا قد کسی آٹھ دس سالہ بچے کے جتنا تھا۔ اس قامت پر وہ حد درجہ موٹا بھی تھا۔ اس کی فربہ اندامی میں بے ڈھنگا پن بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ وہ چلتا پھرتا اور تھل تھل کرتا گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹیلا نظر آتا تھا۔ اس کی ہیئت خاصی مضحکہ خیز تھی۔ جب وہ بولا تو اس کے "بونگے پن" پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی۔ اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ لگا کر تخنی سی، سریلی چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔

"سلام تھانے دار صاحب......!"

اپنے والد محترم کے حکم کی بجا آوری کے بعد وہ جھک کر اپنی پنڈلی کو کھجانے میں مصروف ہوگیا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے جیلہ بی بی کو دیکھتے ہوئے تحسین بھرے انداز میں بہ زبانِ خاموشی کہا۔ "بی بی! سلام تمہاری عقل کو۔ تم نے شانی کے رشتے کے حوالے سے ریاض کو انکار کیا...... بہت

اچھا کیا۔

ثاقب تو مجھے سیلوٹ مارنے کے بعد اپنی پنڈلی کے ساتھ اتنے انہماک سے مشغول ہوگیا تھا جیسے "کھجی کھجی" کھیلنا اس کا پسندیدہ کھیل ہو۔ بیٹے کی اس حرکت کو مطلق نظر انداز کرتے ہوئے ریاض احمد نے انکشاف انگیز لہجے میں مجھ سے کہا۔

"ملک صاحب! میرا رب مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ وہ ہمیشہ مجھے بڑے نقصان سے بچا لیتا ہے۔"

میں تو یہی توقع کر رہا تھا کہ وہ چھوٹتے ہی مجھ سے شانی کے بارے میں سوال کرے گا مگر وہ تو کسی اور ہی موڈ میں نظر آتا تھا۔ میں نے بھی ثاقب بونگا کو اپنی نگاہ کے فریم سے آؤٹ کیا اور تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"ریاض احمد! تم کس نقصان کی بات کر رہے ہو۔ سب خیریت تو ہے نا؟"

"میں ثاقب کی شادی کا ذکر کر رہا ہوں جناب۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں اس کی بات کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا لہٰذا کریدنے والے انداز میں پوچھ لیا۔ "کیا تم نے اپنے بیٹے کا کہیں رشتہ پکا کردیا ہے؟"

"رشتہ بھی ہو ہی جائے گا سرکار۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ [illegible] اس رشتے کے نہ ہونے [illegible] ہو جانے پر میں [illegible] دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"

"تمہارا اشارہ غالباً شانی کے رشتے کی طرف ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ جیلہ بی بی نے شانی کے لیے ثاقب کے رشتے سے چٹا انکار کر دیا تھا۔"

"غالباً نہیں، یقیناً جناب۔ میں اسی رشتے کے نہ ہونے پر اپنے رب کا شکر ادا کر رہا ہوں۔" وہ زور دیتے ہوئے بولا۔ "جب جیلہ نے اس رشتے سے انکار کیا تو اس وقت مجھے بہت برا لگا تھا لیکن میرا ظرف دیکھیں کہ میں ہر ناراضی کو بھلا کر شانی کی تلاش کے سلسلے میں دن رات جیلہ سے تعاون کر رہا ہوں لیکن اب ایک بات سمجھ میں آ رہی ہے......" لمحاتی توقف کر کے اس نے آسمان کی طرف دیکھا پھر خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"واہ ربا...... تیریاں توں ای جانیں......!"

"ریاض احمد! انسان کو تو ہر حال میں اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔" میں نے قدرے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "لیکن ابھی تک ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جیلہ کے انکار میں تمہاری کون سی بھلائی پوشیدہ تھی۔ اگر وہ شانی کے لیے ثاقب کا رشتہ قبول کر لیتی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی...... تم اپنے کس نقصان کا حوالہ دے رہے ہو؟"

"وہی قیامت ملک صاحب جو اس وقت منڈی کاموکی پر ٹوٹی ہوئی ہے۔" وہ بڑے زہریلے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اگر شانی میری بہو بن چکی ہوتی تو یہ قیامت سیدھی میری عزت پر ٹوٹتی، میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ آپ تک بھی یہ خبر پہنچ ہی چکی ہوگی کہ شانی، نواب دین کے بھتیجے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ ایسی منہ کالک کو میرے گھر کی بہو نہ بنانے پر میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں۔ اب تو میری بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی......!"

اس کے آخری سوالیہ جملے میں بے پناہ طنز بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کے لہجے کی کڑواہٹ کو بڑے حوصلے کے ساتھ اپنی ساعت میں اتارا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"ریاض احمد! تمہاری بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی البتہ اس معاملے کے حوالے سے تمہاری رائے مجھ تک پہنچ گئی ہے اور...... اب تم ایک بات میری بھی کان کھول کر سن لو......"

میں نے دانستہ توقف کیا تو وہ جلدی سے بولا۔ "کون سی بات ملک صاحب؟"

"حالات وواقعات کی حقیقت کے مطابق جیلہ بی بی کی شانی اچانک گم ہوگئی ہے۔" میں نے اس کے کانوں کے [illegible] جھاڑتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک کسی کے پاس ایسا کوئی بھی ٹھوس ثبوت نہیں ہے جس کی بنا پر کہا جاسکتا ہو کہ شانی گھر سے بھاگ گئی ہے یا نواب دین کا بھتیجا قیصر اسے اپنے ساتھ بھگا لے گیا ہے۔ کسی کی ماں، بہن اور بیٹی کے لیے بنا ثبوت اس نوعیت کی رائے قائم کرنا شرفا کو زیب نہیں دیتا اور میں ابھی تک تمہیں ایک شریف انسان سمجھتا ہوں ریاض احمد۔ تم اپنی سوچ پر اگر اختیار نہیں رکھتے تو اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ تم شانی کے پھوپا اور دو بیٹیوں کے باپ بھی ہو۔ اگر کوئی اسی قسم کی باتیں تمہاری بیٹی خالدہ یا عابدہ کے بارے میں کرے تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا، بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں ایسی بکواس کرنے والے کی زبان کھینچ لوں گا۔"

"طیش میں آنے کی ضرورت نہیں ریاض احمد۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "شانی رشتے میں تمہاری بھتیجی لگتی ہے۔ بھتیجی بھی بیٹی ہی ہوتی ہے۔ اگر لوگ شانی کے حوالے سے ایسی بات کر بھی

http://urdutubes.com/

رہے ہیں تو تمہیں اپنا ذہن صاف رکھنا چاہیے۔ تم تو الٹا ان کی ہمنوائی کر رہے ہو۔ تمہارا یہ رویہ میری نظر میں مثبت اور صحت مند نہیں ہے۔"

"میں بھی کیا کروں جناب......" میری لتاڑ کے بعد وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے جھنجلا کر بولا۔ "میں لوگوں کی زبان تو نہیں پکڑ سکتا نا......"

"ایک منٹ ریاض احمد!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی ایک منٹ پہلے تو تم نے غضب ناک ہو کر کہا تھا۔ "میں ایسی بات کرنے والے کی زبان کھینچ لوں گا......" ...."اگر تم کسی کی زبان پکڑ نہیں سکتے تو پھر کھینچو گے کیسے؟ کیا میں سمجھ لوں کہ سیانے بالکل سچ کہہ گئے ہیں......؟"

اس نے جھینپ آمیز سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "سیانے کیا کہہ گئے ہیں تھانے دار صاحب؟"

"زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے والوں اور انسانی نفسیات پر گہری نگاہ رکھنے والے تجربہ کار بزرگوں کا فرمان ہے کہ......" میں نے ریاض احمد کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "ہماری غیرت صرف اپنی اولاد کے معاملات کے لیے جوش مارتی ہے، دیگر...... افراد کے معاملات ہمارے لیے ایک کھیل تماشے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے......" اتنی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس لی پھر چبھتے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔

"ریاض احمد! کیا تم بھی شانی کی گمشدگی سے لطف اندوز ہو رہے ہو؟"

"ایسی بات نہیں ہے تھانے دار صاحب!......" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے ترت پوچھا۔ "پھر کیسی بات ہے؟"

"وہ کیا کہتے ہیں جناب کہ...... عوام الناس کی آواز کو اللہ کا حکم سمجھنا چاہیے۔" وہ انتہائی احمقانہ انداز میں بولا۔ "پورا گاؤں شانی کے بارے میں ایک ہی بات کر رہا ہے کہ وہ قیصر کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

"وہ یہ کہتے ہیں کہ...... آوازِ خلق کو نقارۂ خدا جانو۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "لیکن موجودہ صورت حال میں اس کہاوت کا اطلاق بالکل نہیں ہوتا۔ پورا کاموں کی ہرگز یہ نہیں کہہ رہا کہ شانی قیصر کے ساتھ کہیں بھاگ گئی ہے۔ یہ چند لوگوں کا قیاس پر مبنی اندازہ ہے اور چند افراد میں سے دو سے تو میں بھی مل چکا ہوں۔ مطلب، پیر مرید حسین شاہ اور لیاقت۔ باقی تو سب قصے اور کہانیاں ہی سنا رہے ہیں۔ صرف یہی افراد چشم دید گواہ ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دونوں نے وقوعہ کی شام شانی اور قیصر کو سڑک کے کنارے ایک ساتھ کھڑے تو دیکھا ہے لیکن ان دونوں میں سے کسی نے بھی انہیں کسی بس یا کسی دوسری سواری پر سوار ہوتے نہیں دیکھا۔"

"اوہ......" وہ متاسفانہ انداز میں بولا۔ "آپ نے تو اس کیس کے بارے میں اچھی خاصی تحقیق کر لی ہے۔"

"میں نے پولیس کا محکمہ ریوڑیاں، بھنے ہوئے چنے اور کھیل بیچنے کے لیے جوائن نہیں کیا تھا ریاض احمد۔" میں نے اس کے دماغ کی کھڑکیاں اور دروازے کھولتے ہوئے کہا۔ "تم فکر نہ کرو، میں نے اب تک جو بھی تحقیق کی ہے اسے تکمیل تک پہنچانے کے لیے لاہور جا رہا ہوں۔"

"اچھا......" اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور ٹٹول بھرے لہجے میں بولا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ قیصر کو گرفتار کرنے لاہور جا رہے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ میں ریاض احمد کے سوال کے جواب میں کچھ کہتا، "نیو خان بس سروس" کی بس آ گئی۔ ریاض احمد کے سوال سے زیادہ ضروری تھا بس پر سوار ہونا لہٰذا میں گمشدہ شانی کے، گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے پھوپا کو نظر انداز کر کے بس کے اندر داخل ہو گیا۔

[illegible]

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے میں نے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر لاہور میں حاضری لگائی۔ انہیں اپنی لاہور آمد کی غرض وغایت سے آگاہ کیا پھر اچھرہ سے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ مذکورہ تھانے کے انچارج صاحب کو میں نے اپنے مقصد کے بارے میں بتایا تو اس نے اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہوئے میرے ساتھ اپنے عملے کے ایک آدمی کو لگا دیا اور ہم تھانے سے نکل کر اچھرہ موڑ کی جانب روانہ ہو گئے۔

میں نے یہاں پر جس طریقہ کار کو بیان کیا ہے وہ ایک طے شدہ لیگل پروسس ہے۔ جب ایک تھانے کی پولیس کو کسی دوسرے تھانے کی حدود میں کوئی کارروائی کرنا مقصود ہو تو اسی لیگل پروسس کو اڈاپٹ یا فالو کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں تھانے ایک ضلع کے بھی ہو سکتے ہیں اور دو مختلف اضلاع کے بھی۔ ہر تھانے کی ایک حدود طے ہوتی ہے اور اس حدود میں ان/آؤٹ کے لیے متعلقہ تھانہ انچارج کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔

اچھرہ موڑ پر مڑنے کے لیے ہمیں مین فیروز پور روڈ

کو خیرباد کہنا پڑا۔ چند قدموں کے فاصلے پر دائیں جانب تیسری یا چوتھی دکان فیروز دین کی تھی۔ فیروز دین کی عمر پچپن کے اریب قریب تھی۔ وہ اس وقت اپنی کپڑے کی دکان پر موجود تھا۔ دو باوردی پولیس والوں کو دکان کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام......" فیروز دین نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

میرے ساتھ آئے ہوئے پولیس اہلکار نے میرا تعارف کراتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "فیروز دین! یہ ملک صفدر حیات صاحب ہیں۔ یہ ادھر منڈی کاموں کی کے تھانہ انچارج ہیں۔ ملک صاحب تم سے ایک خاص معاملے میں تھوڑی پوچھ تاچھ کرنے آئے ہیں۔"

"کس معاملے میں......" فیروز دین کے چہرے پر فکرمندی ابھر آئی۔ "اُدھر بھائی نواب دین تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا......؟" اس نے اضطراری لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ فیروز دین۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پھر بات کرتے ہیں۔ تمہارا بھائی نواب دین اور اس کے گھر کے تمام افراد خیر خیریت [illegible] کاموں کی سے یہاں تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"آخر ہوا کیا ہے، کچھ پتا تو چلے جناب......" وہ بے حد پریشان لہجے میں بولا پھر اپنی دکان کے سامنے والی فروٹ، جوس اور کولڈ ڈرنکس کی دکان کے مالک کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے صدا لگائی۔ "سراج دین! چھیتی نال ٹھنڈے دودھ کی دو بوتلیں دے جا۔"

میں نے فیروز دین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "پرسوں پچیس جون کی شام تمہارا بیٹا قیصر منڈی کاموں کی سے روانہ ہوا تھا۔ کیا وہ خیریت سے گھر پہنچ گیا تھا؟"

"جی۔ بالکل پہنچ گیا تھا۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "کیسر (قیصر) اس وقت بھی گھر پر موجود ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ میرے بیٹے کے بارے میں کس قسم کی تفتیش کرتے پھر رہے ہیں؟"

اسی دوران میں سراج دین نامی وہ شخص بادام والے ٹھنڈے دودھ کی دو بوتلیں مجھے اور میرے ساتھی پولیس اہلکار کو تھما گیا تھا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے فیروز دین سے کہا۔

"فیروز دین! میری بات دھیان سے سنو۔ جس وقت قیصر منڈی کاموں کی سے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ شانی نامی ایک لڑکی کو بھی دیکھا گیا تھا۔ قیصر تو لاہور میں اپنے گھر پہنچ گیا مگر شانی ابھی تک لاپتا ہے۔ میں شانی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔"

"لیکن میرے کیسر کا کسی شانی سے کیا لینا دینا؟" اس نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

"شانی تمہارے بھائی نواب دین کے پڑوس میں رہنے والی جمیلہ بی بی کی بیٹی ہے۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے پتا چلا ہے کہ قیصر، شانی کے ساتھ پیار کی پینگیں چڑھا اور بڑھا رہا تھا۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کیسر، شانی کو اپنے ساتھ بھگا کر لاہور لے آیا ہے؟" اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

"حالات اور واقعات تو اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں فیروز دین!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرے پاس ایسے چشم دید گواہ موجود ہیں جنہوں نے پچیس جون کی شام شانی اور قیصر کو مین جی ٹی روڈ پر کھڑے دیکھا تھا۔"

ریئل اسٹیٹ ایڈوائزر
DHA. KARACHI
DHA. City Karachi
BAHRIA TOWN KARACHI
میں خرید و فروخت کے لیے مستند نام
ریاض حسین
ایڈریس: راحت کمرشل لین 2
DHA PHASE 6 KARACHI
فون نمبر: 0300-3658964

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

”یہ نہیں ہوسکتا تھانے دار صاحب۔“ وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

”کیا نہیں ہوسکتا!“ میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ”فیروز دین! کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ پچیس جون کی شام تمہارا بیٹا شانی کے ساتھ منڈی کا موٹکی کی جی ٹی روڈ پر نہیں کھڑا تھا؟“

”اوہ نہیں جناب! میرا مطلب کچھ اور تھا۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

”فیروز دین! ذرا اپنے مطلب کی وضاحت بھی کردو۔“

”میں یہ کہہ رہا تھا تھانے دار صاحب......“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیسر میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا انسان ہے۔ میں نے بڑی توجہ سے اس کی تربیت کی ہے۔ پڑھا لکھا کر اسے برسرِ روزگار کیا ہے۔ میں اگر چاہتا تو اسے اپنے ساتھ دکان کے کام پر لگا سکتا تھا۔ وہ میرا ہاتھ بٹاتا تو میرے لیے کافی آسانی پیدا ہوجاتی لیکن میں نے اسے اسکول ماسٹر بنایا ہے تاکہ وہ علم کی روشنی کو دور دور تک پھیلا سکے۔“

”تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ایک تعلیم یافتہ انسان پیار محبت کے معاملات میں نہیں پڑسکتا؟“ میں نے فیروز دین کی وضاحت کے تناظر میں سوال کیا۔

”میں تمام تعلیم یافتہ افراد کی نہیں، صرف اپنے بیٹے کی بات کررہا ہوں تھانے دار صاحب۔“ وہ ورد ... بولا۔ ”کیسر ہرگز ایسا نہیں کرسکتا۔“

”اس کا کوئی خاص سبب؟“

”اوہ جناب! کیسر (قیصر) ایک سال سے منگنی شدہ ہے۔“ وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔ ”چھ ماہ یعنی دسمبر کے آخر میں تو اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کی منگیتر رخسانہ بھی اسکول ٹیچر ہے۔ دونوں اس رشتے سے بہت خوش ہیں۔ لڑکی والوں کی ضد تھی کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں شادی نمٹائی جائے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں ناکہ جون جولائی میں گرمی نے کس طرح لوگوں کی مت ماری ہوئی ہے۔ میں نے اسی لیے موسم سرما کی دسمبر والی چھٹیوں میں ان کی شادی کی تاریخ طے کی ہے۔“

فیروز دین کی اس وضاحت نے کئی ایک سوالات کے جوابات دے دیے تھے۔ قیصر، شانی کی محبت کا جواب محبت سے کیوں نہیں دے رہا تھا، یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی تھی۔ قیصر کے اس طرزِ عمل سے یہ بھی واضح ہوگیا تھا کہ وہ ایک شریف النفس انسان تھا ورنہ ایک مرد کی عمومی نفسیات کے مطابق منگنی شدہ ہونے کے باوجود بھی وہ شانی کے ساتھ ہلکا پھلکا افیئر تو چلا ہی سکتا تھا۔ اس کہانی سے یہ بات بھی سمجھ میں آرہی تھی کہ قیصر نے شانی کو اپنی منگنی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا ہوگا ورنہ شانی اتنی بڑی بات کا ذکر اپنی سہیلی جمیاں سے ضرور کرتی۔ ایک بات یہ بھی ظاہر تھی کہ شانی نے اپنی محبت کے معاملے کو نواب دین اینڈ کمپنی سے بالکل چھپا کر رکھا تھا۔ اگر وہ کھل مل کر نواب دین کے گھر والوں سے قیصر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی تو یقیناً اسے اس حقیقت کا علم ہوجاتا کہ قیصر منگنی شدہ تھا اور پانچ چھ ماہ بعد اس کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ شانی کی یکطرفہ محبت نے مجھے گہری الجھن میں ڈال دیا تھا اور فوری طور پر یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اچانک کہاں غائب ہوگئی......؟

یہ تمام تر خیالات لمحے بھر میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے حتمی لہجے میں فیروز دین سے کہا۔ ”میں تمہارے بیٹے قیصر سے ملنا چاہتا ہوں...... ابھی اور اسی وقت!“

”ٹھیک ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”میں ابھی کسی کو بھیج کر کیسر کو دکان پر بلا لیتا ہوں۔ میرا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

”اسے دکان پر بلانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ”بلکہ تم تھوڑی دیر کے لیے دکان بند کروا [illegible] ہمیں اپنے [illegible] چلو [illegible] سے جا [illegible] معاملے میں کسی بھی طور ملوث ہے تو منڈی کا موٹکی کے تھانہ انچارج کا نام سنتے ہی اس کے کان کھڑے ہوجائیں گے اور پھر وہ میرے ہاتھ نہیں لگ سکے گا۔ میں اس حوالے سے کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے جناب!“ فیروز دین نے تعاون آمیز انداز میں کہا۔ ”جو آپ کا حکم۔ میں دکان بند کرکے آپ کو اپنے گھر لیے چلتا ہوں۔“

فیروز دین کی رہائش ذیلدار روڈ پر تھی۔ ہم اچھرہ کے مین بازار میں پیدل ہی چلتے ہوئے دس منٹ میں اس کے گھر پہنچ گئے۔

جیسا کہ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ قیصر، فیروز دین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس وقت گھر میں فیروز دین کی بیوی صغیرہ اور قیصر دونوں موجود تھے۔ صغیرہ ایک پستہ قامت، مائل بہ فربہی جسم کی مالک گھریلو عورت تھی۔ قیصر گندمی رنگت اور متناسب قدوقامت والا ایک وجیہہ و شکیل جوان تھا۔ اس

خوب صورت و پُراثر کہانیوں سے مرصع مارچ 2019ء کا پُربہار شمارہ

ماہنامہ پاکیزہ

افشاں آفریدی اور سحر ساجد کے دلکش ناول کی نئی اقساط

شمع ھدایت میں اخلاقی و روحانی بیماری ”ظلم“ پر اختر شجاعت کی چشم کشا تحریر

صفحہ...... دردانہ نوشین خان کے موثر قلم سے نکلی روحانیت سے بھرپور تحریر

طیبہ عنصر مغل کی دل پذیر کاوش...... طوافِ آرزو

نادیہ احمد، رفاقت جاوید، ایلیا علی غفار کی خوب صورت تحریریں

[illegible]

شگفتہ بھٹی

نے بخشی پاکیزہ بزم کو رونق

عورت کہانی میں پڑھیے فرحین اظفر کے موثر قلم کا حسین شاہکار...... ع عورت ڈ سے ڈھال

ان کے علاوہ

افشین نعیم، ایما نور رضوان، آسیہ عامر، شایا نعیم،

ھاجرہ ریحان، کشف بلوچ کے قلم کے شاہکار خوب صورت افسانے

ان کے ساتھ ساتھ مثبت معلومات و تفریحی عناصر سے پُرمزید ار مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اپنے باپ کے ساتھ دو باوردی پولیس والوں کو دیکھ کر قیصر کے چہرے پر الجھن نمودار ہو گئی تھی تاہم اس الجھن میں کسی قسم کی فکر مندی یا ڈر و خوف نہیں پایا جاتا تھا جبکہ اس صورتِ حال نے فیروز دین کی بیوہ صغیرہ کو یکا یک پریشان کر دیا تھا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''اللہ خیر کرے...... پولیس ہمارے گھر کیا لینے آئی ہے؟''

فیروز دین نے کمال بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں اپنے گھر کی بیٹھک میں بٹھایا۔ قیصر اور صغیرہ کو بھی اس نے بیٹھک میں موجود رہنے کو کہا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اس حساس معاملے کو سب کے سامنے ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔ فیروز دین نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں قیصر کو میری لاہور آمد کے مقصد سے آگاہ کیا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''کیسر پتر! میں نے رزقِ حلال سے تمہاری پرورش کی ہے اور ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین کی ہے۔ تھانے دار صاحب جو بھی پوچھیں اس کا سولہ آنے صحیح جواب دینا۔''

''ابا جی! آج تک میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس سے آپ کو شرمندگی اٹھانا پڑی ہو۔'' وہ ٹھہرے ہوئے اور شائستہ لہجے میں بولا۔ ''آج بھی انشااللہ! میں آپ کی آنکھیں اور گردن جھکنے نہیں دوں گا......'' جذباتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! مجھے شانی کی گمشدگی کا سن کر سخت افسوس ہوا ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے غیاب میں میرا کوئی ہاتھ ہے اور نہ ہی میں اس بارے میں کچھ جانتا ہوں۔ مجھے تو اس بات پر شدید حیرت ہوئی تھی کہ وہ مجھ سے ملنے گاؤں سے نکل کر جی ٹی روڈ تک چلی آئی تھی اور وہ بھی ایک عجیب و غریب کہانی کے ساتھ......''

''کون سی عجیب و غریب کہانی؟'' میں قیصر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ بیٹھا۔

''شانی جب سڑک کے کنارے مجھ سے ملنے آئی تو اس کی مٹھی میں ایک تہ شدہ کاغذ تھا۔'' قیصر وضاحت کرتے ہوئے معتدل انداز میں بتانے لگا۔ ''اس نے مجھے بتایا کہ کسی بندے نے اسے وہ کاغذ دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ کاغذ شہری بابو نے دیا ہے۔ وہ آج شام میں واپس لاہور جا رہا ہے۔ تم سڑک کے کنارے اس سے جا کر ملو۔ میں نے شانی سے کوئی بات کرنے سے پہلے اس تہ شدہ کاغذ کو کھول کر دیکھا۔ وہاں پر صرف ایک مختصر سا جملہ لکھا ہوا تھا...... میں سڑک کے کنارے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ قیصر۔''

میں نے ماسٹر صاحب کی بیان کردہ کہانی میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا وہ رقعہ تمہارے پاس محفوظ ہے یا تم نے اسے ضائع کر دیا؟''

''پہلے تو میرے ذہن میں یہی آیا تھا کہ اسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔ پھر کسی خیال کے تحت میں نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔'' قیصر نے بتایا۔ ''وہ اب بھی میری کتابوں کے بیچ کہیں پڑا ہوگا۔ ٹھہریں، میں آپ کو لا کر دکھاتا ہوں......''

میں ٹھہر گیا اور اسے روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ شانی کی گمشدگی کے حوالے سے مجھے کوئی ثبوت فراہم کرنے والا تھا۔ دو منٹ کے بعد وہ واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں اس کاغذ کے علاوہ تین چار کاپیاں اور ایک ڈائری بھی تھی پھر متذکرہ بالا اس کاغذ کو میری جانب بڑھاتے ہوئے مہذب انداز میں بولا۔

''لیں جناب! آپ بھی اس کاغذ کو دیکھ لیں۔''

میں نے دیکھا۔ قیصر نے اس رقعے کی تحریر کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا تھا اس میں کوئی کمی یا بیشی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ جملہ بہت ہی کچی تحریر کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کم از کم وہ تحریر کسی جماعت پنجم کو پڑھانے والے استاد کی تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ میں [illegible] دیکھ رہا تھا۔ [illegible] لیا تم مجھے اپنی تحریر کا کوئی [illegible] دکھا سکتے ہو۔

''یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی کہ آپ اس رقعے کا میری تحریر سے موازنہ کرنے کی کوشش کریں گے۔'' وہ مذکورہ کاپیاں اور ڈائری میری سمت بڑھاتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اسی لیے میں یہ سب اٹھا لایا ہوں۔ آپ چیک کر لیں جناب۔''

میں نے ستائشی نظر سے قیصر کی طرف دیکھا پھر وہ چیزیں اس کے ہاتھ سے لے لیں۔ کاپیوں اور ڈائری کے بغور جائزے نے مجھے بتا دیا کہ شانی کا فراہم کردہ وہ رقعہ قیصر کا تحریر کردہ نہیں تھا۔ قیصر کی تحریر بڑی پکی اور کسی خوش نویس کی تحریر کے مانند جوڑ و پیوند کے لحاظ سے خاصی پرفیکٹ تھی۔ میں نے یک جملوی اس رقعے کو تہ کر کے دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا اور قیصر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''تم نے شانی سے اس بندے کے بارے میں نہیں پوچھا جس نے یہ رقعہ شانی تک پہنچایا تھا؟''

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بس، میں نے اپنی پوزیشن صاف کرتے ہوئے شانی کو بتا دیا تھا کہ یہ کام میں نے نہیں کیا۔ پھر میری بس آ گئی اور میں بس پر سوار ہو گیا۔''

''تمہارے بس پر سوار ہونے کے بعد کیا شانی ادھر سڑک کے کنارے ہی کھڑی رہی تھی یا واپس چلی گئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھانے دار صاحب۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ بس پر سوار ہونے کے بعد میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا ہی نہیں تھا۔''

''جب تم نے شانی کو بتایا کہ وہ رقعہ تم نے نہیں بھیجا تو اس نے کیسا ردِعمل ظاہر کیا تھا؟'' میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''وہ بجھ سی گئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ شانی تمہارے لیے اپنے دل میں کس قسم کے جذبات رکھتی تھی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی...... کسی حد تک......'' اس نے رک رک کر جواب دیا۔

''[illegible] کس حد تک؟'' میں نے مسکراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

[illegible] وہ جھینپ بھری نظر سے اپنے والدین کو [illegible] میں سمجھ گیا کہ... ان لمحات میں وہ کس نوعیت کی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اس کی مشکل کو آسان کرتے ہوئے مشفقانہ انداز میں کہا۔

''برخوردار! تمہارا باپ بہت ہی سمجھ دار انسان ہے اسی لیے اس نے تمام افراد کو ایک ہی جگہ پر جمع کر رکھا ہے لہٰذا میں جو بھی سوال کروں اس کا کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دو۔ ایک بات کا اطمینان رکھو کہ اس پوچھ تاچھ کے بعد نہ تو میں تمہیں اپنے ساتھ منڈی کاموں کی لے کر جاؤں گا اور نہ ہی دوبارہ تفتیش کے حوالے سے ادھر کا رخ کروں گا۔ میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ شانی کی گمشدگی میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں۔ اب تم بھی میری پیشہ ورانہ ذمے داریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو تاکہ میں جلد از جلد شانی کا سراغ لگانے کی کوشش کر سکوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی سمجھ گیا۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے شانی کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات دیکھے تھے مگر میں نے اس معاملے میں کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی کیونکہ میں ایک منگنی شدہ شخص ہوں اور عنقریب میری شادی بھی ہونے والی ہے۔''

''کیا تم نے اس حقیقت سے شانی کو آگاہ کر دیا تھا؟''

''جی کر دیا تھا مگر بہت دیر بعد۔''

''دیر بعد......'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا قیصر؟''

''جب وہ جی ٹی روڈ پر مجھ سے ملنے آئی تھی اور اس نے مجھے یہ رقعہ دکھایا تھا تو میں نے اس کا ذہن صاف کرنے کے لیے اپنے بارے میں اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔'' قیصر نے جواب دیا۔ ''اس کے بعد وہ خاصی مایوس ہو گئی تھی۔ ان لمحات میں میرے پاس شانی سے ہمدردی کے دو بول بولنے کا وقت بھی نہیں تھا کیونکہ اسی وقت میری بس آ گئی تھی اور یہ لاہور جانے والی آخری بس تھی۔ اگر میں شانی کے ساتھ بات چیت میں لگ جاتا تو پھر اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا تھا چنانچہ میں شانی کو سڑک کے کنارے چھوڑ کر اپنی بس پر سوار ہو گیا تھا۔''

قیصر نے جو کچھ کیا وہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ یہ اس کے دماغ کا فیصلہ تھا۔ شانی نے جو کچھ کیا وہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ یہ اس کے دل کا فیصلہ تھا۔ میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''[illegible]!'' میں نے ماسٹر جی کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''میری طرف سے تمہیں شادی کی ایڈوانس مبارک ہو!''

''بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب۔'' وہ تشکرانہ انداز میں بولا۔

''اپنی خوشی کی گھڑیوں میں شانی کی سلامتی اور بازیابی کے لیے دعا گو رہنا۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے دل میں محبت کا چراغ روشن ہوتا ہے اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کے لیے کسی کے دل میں سچی چاہت پیدا ہو جاتی ہے۔ میری نظر میں تم دونوں سے قدرت راضی ہے۔ شانی تمہیں تو نہیں پا سکی لیکن میری خواہش ہے کہ جلد از جلد اس محبت کی ماری کو ڈھونڈ نکالوں۔ پتا نہیں کیوں، شانی کے حوالے سے میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

''اللہ خیر کرے گا تھانے دار صاحب!'' فیروز دین نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

صغیرہ بولی۔ ''میں شانی کے لیے دعا کروں گی۔ اللہ

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

"اسے حیاتی دے۔"

قیصر کچھ نہیں بولا۔ وہ تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ شانی کی اچانک اور پراسرار گمشدگی نے اسے خاصا اداس اور ملول کر دیا تھا۔ میں اپنے ہمراہ پولیس اہلکار کے ساتھ اس بوجھل فضا سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

جب میں تھانے پہنچا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ راستے بھر میں اس نامعلوم پراسرار بندے کے بارے میں سوچتا رہا تھا جس کے دیے ہوئے رقعے کو پا کر شانی، قیصر سے ملنے سڑک کے کنارے پہنچ گئی تھی۔ قیصر اس مشکوک شخص کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ چھیماں نے بھی طویل گفتگو کے دوران میں مجھ سے ایسے کسی شخص یا اس کے دیے ہوئے رقعے کا ذکر نہیں کیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میری منہ بولی لاڈو نے مجھ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ مذکورہ رقعہ شانی کو اس وقت تھمایا گیا تھا جب چھیماں اسے اس کی گلی کے نکڑ پر پہنچا کر اپنے گھر کی جانب چلی گئی تھی اور بفرضِ محال، اگر اس سے پہلے رقعہ شانی تک پہنچ چکا تھا تو پھر یہی سوچا جا سکتا تھا کہ شانی نے دانستہ چھیماں کو اس رقعے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس حکمتِ عملی کے پیچھے شانی کا کیا ارادہ تھا اس کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ میرا ذہن مسلسل اس نکتے پر غور کر رہا تھا کہ وہ مشکوک شخص کون تھا جو چاہتا تھا کہ شانی، قیصر سے ملنے ٹی روڈ کے کنارے پہنچے......؟

یہ ایک ایسا سوال تھا کہ جس پر سوچتے ہوئے ذہن بری طرح الجھ رہا تھا۔ انہی سوچوں کے بیچ ایک خوفناک خیال کسی زہریلے ناگ کے مانند میرے احساس کو ڈس رہا تھا کہ...... کہیں شانی نے محبت میں ناکامی سے دل گرفتہ ہو کر اپنی جان تو نہیں لے لی......!

میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا تو ایک سنسنی خیز صورتِ حال نے میرا استقبال کیا۔ کانسٹیبل قادر علی فوراً میرے پاس چلا آیا۔ اس کے چہرے پر مجھے دبا دبا سا جوش دکھائی دیا جیسے وہ کوئی اہم بات بتانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ ایک ساتھ کام کرتے ہوئے میں اس کی ایک ایک رگ اور ایک ایک نس سے واقف ہو چکا تھا۔

"ہاں بھئی قادر علی!" میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا خبریں ہیں؟"

"خبریں بڑی چونکا دینے والی ہیں سر جی۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"وہ تو تمہاری آنکھوں ہی سے جھلک رہا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا تم نے شانی کا سراغ لگا لیا ہے؟"

"شانی کا تو نہیں لیکن ہم نے اس کے سراغ کا سراغ ضرور لگا لیا ہے۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "انشاء اللہ! کل ہم اس سراغ کو پکڑ کر شانی کو بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "مجھے مکمل رپورٹ دو......!"

آئندہ دس منٹ میں قادر علی نے مجھے اپنی اور کھوجی نظام حسین عرف نظامو کی کارگزاری کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا...... شانی فرید حسن شاہ کے مزار سے چھیماں کے ساتھ نکلی تھی۔ پھر وہ دونوں شانی کی گلی کے نکڑ تک ایک ساتھ پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے پہنچی تھیں۔ یہاں سے چھیماں اپنے گھر چلی گئی تھی لیکن شانی اپنی گلی میں چند قدم چلنے کے بعد واپس پلٹ گئی تھی۔ اپنے گھر کی جانب بڑھنے کے بجائے وہ اس راستے پر چل پڑی تھی جو سیدھا جی ٹی روڈ کی طرف جاتا تھا۔ ایک مقام پر سڑک کے کنارے شانی اور قیصر کے قدموں کے نشانات مل گئے تھے۔ نظامو نے نواب دین کے گھر سے سڑک تک قیصر کے قدموں کا کھرا پہلے ہی نکال لیا تھا۔ جس مقام پر شانی اور قیصر ایک ساتھ کھڑے دیکھے گئے تھے اس کے بعد قیصر کا [illegible] مطابق یہاں سے شانی کا کھرا واپس گھر جانے کے بجائے کھیتوں کی سمت بڑھ گیا تھا اور دلچسپ امر یہ کہ شانی کے کھرے کے ساتھ ہی بھاری قدموں والے کسی قوی الجثہ مرد کا کھرا کھیتوں کی جانب سفر کرتا پایا گیا تھا......

"مجھے بڑی شدت سے اس مرد کی تلاش ہے۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "یقیناً اسی خبیث نے شانی کو وہ رقعہ تھمایا ہو گا۔"

"آپ کس مرد کی بات کر رہے ہیں سر جی؟" قادر علی حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ "اور یہ رقعے کا کیا ماجرا ہے؟"

میں نے ابھی تک قادر علی کو اپنے دورۂ لاہور کا قصہ نہیں سنایا تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے قیصر اینڈ کمپنی سے ہونے والی اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا اور آخر میں کہا۔

"تم نے ابھی جس بھاری بھرکم بندے کے کھرے کا ذکر کیا ہے، مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ اسی نے شانی کو

قیصر کا ایک نقلی پیغام پہنچا کر جی ٹی روڈ کی جانب جانے کی ترغیب دی تھی۔ مجھے بتاؤ، کھیتوں میں وہ دونوں کس طرف گئے تھے؟"

"ملک صاحب! ابھی میں نے اپنی کہانی مکمل نہیں کی تھی کہ آپ نے سوال کر دیا اس لیے مجبوراً اپنی بات ادھوری چھوڑنا پڑی۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "مجھے بھی وہ بھاری قدموں والا بندہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ اب آپ نے جو کچھ بتایا ہے اس کی روشنی میں مجھے شانی کی گمشدگی کا ذمے دار وہی لگ رہا ہے۔"

"بولتے جاؤ......" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "میں پوری توجہ سے تمہاری بات سن رہا ہوں۔"

"ملک صاحب! شانی اور اس مشکوک بندے کا کھرا کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے اس متروک کمرے تک جا پہنچا جو کافی عرصے سے کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔" قادر علی نے بتایا۔ "ہم مذکورہ کمرے تک پہنچ گئے اور وہاں ہمیں شانی تک پہنچانے والا ایک سراغ مل گیا۔"

"کیسا سراغ قادر علی؟" میں نے سراسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

قادر علی نے جس متروک کمرے کا ذکر کیا وہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ مذکورہ کمرا سڑک سے تھوڑا ہٹ کر کھیتوں کے بیچ بنا ہوا تھا۔ کسی زمانے میں شاید اسے اناج ذخیرہ کرنے کے [illegible] بھی موجود نہیں تھا۔ شانی کا کسی نامعلوم شخص کے ساتھ اور وہ بھی شام کے وقت مذکورہ کمرے کی جانب بڑھ جانا مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر گیا تھا۔

"سر جی!" میرے سوال کے جواب میں قادر علی نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ "اس کمرے کے اندر سے ہمیں شانی کی چپل کا ایک پاؤں مل گیا ہے...... میں نے ابھی اسی سراغ کا ذکر کیا تھا۔"

میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "اور شانی......؟"

"شانی اس کمرے میں موجود نہیں تھی۔" قادر علی نے بوجھل لہجے میں جواب دیا۔

"نظامو اس بارے میں کیا کہتا ہے؟" میں نے بے قراری سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔ "اس کی سراغ رسانی کی مہارت کس نتیجے پر پہنچی ہے قادر علی؟"

"نظامو کا علم تو خاصے خوفناک نتائج کا اعلان کر رہا ہے ملک صاحب۔" قادر علی گہری سنجیدگی سے وضاحت

عیادت ناگزیر

کُلّے ہاتھوں، عیادت کرنے والوں کی ایک قسم کا تعارف کرا دوں۔ یہ حضرات جدید طریق کار برتتے اور نفسیات کا ہر اصول داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد پوچھتے ہیں کہ افاقہ ہوا یا نہیں؟ گویا مریض سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ عالمِ نزع میں بھی ان کی معلوماتِ عامہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے "رننگ کمنٹری" کرتا رہے گا۔ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح مریض پر ثابت کر دیں کہ وہ محض انتقاماً بیمار ہے یا وہم میں مبتلا ہے اور کسی سنگین غلط فہمی کی بنا پر اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ ان کی مثال اس روزہ خور کی سی ہے جو انتہائی نیک نیتی سے کسی روزہ دار کا روزہ لطیفوں سے بہلانا چاہتا ہو۔ مکالمے کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ملاقاتی۔ "ماشاءاللہ! آج منہ پر بڑی رونق ہے۔"

مریض۔ "جی ہاں! آج شیو نہیں کیا ہے۔"

ملاقاتی۔ "آواز میں بھی کرارا پن ہے۔"

مریض کی بیوی۔ "ڈاکٹر نے صبح سے ساگودانہ بھی بند کر دیا ہے۔"

[illegible] "(اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر) بیگما! [illegible] جائیں تو ذرا انہیں میری پتھری دکھانا جو تم نے چار سال سے اسپرٹ کی بوتل میں رکھ چھوڑی ہے۔" (مریض سے مخاطب ہو کر) "صاحب! یوں تو ہر مریض کو اپنی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر معلوم ہوتا ہے، مگر یقین جانیے، آپ کا شگاف تو بس دو تین انگل لمبا ہوگا، میرا تو پورا ایک بالشت ہے۔ بالکل کنکھجورا معلوم ہوتا ہے۔"

مریض۔ "(کراہتے ہوئے) مگر میں ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہوں۔"

ملاقاتی۔ "(ایکا ایکی پینترا بدل کر) یہ سب آپ کا وہم ہے۔ آپ کو صرف ملیریا ہے۔"

مریض۔ "یہ پاس والی چارپائی جو اب خالی پڑی ہے، اس کا مریض بھی اسی وہم میں مبتلا تھا۔"

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "چراغ تلے" سے اقتباس

مرسلہ: یاسمین خان، کوئٹہ

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

کرتے ہوئے بولا۔ "نظامو کے مطابق، شانی اور اس نامعلوم بندے کا کھرا متروک کمرے کے اندر تک پہنچا ہے مگر کمرے سے باہر صرف اس بندے کا کھرا ہی نکلا ہے۔ شانی کے قدموں کے نشانات کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ بندہ کوئی جادو وغیرہ جانتا ہے۔ اس نے کسی منتر کے زور پر شانی کو اس کمرے کے اندر غائب کیا پھر کہیں چلا گیا؟"

"نہیں جناب......" قادر علی نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ "اس کمرے کے اندر ہمیں ایسے آثار بھی ملے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ شانی اور اس نامعلوم بندے میں ہاتھا پائی اور چھینا جھپٹی بھی ہوئی ہے جس کے نتیجے میں شانی یا تو بے ہوش ہوگئی تھی یا پھر اس کی زندگی کے دن پورے ہوگئے تھے......"

"ایک منٹ قادر علی!" میں نے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ "ان دونوں صورتوں میں شانی زندہ یا مردہ حالت میں اس کمرے میں پائی جانا چاہیے لیکن تم بتا رہے ہو کہ جب تم لوگ وہاں پہنچے تو کمرا خالی تھا؟"

"جی سر جی۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "کمرا اس لیے خالی تھا کہ وہ بندہ بے ہوش یا مردہ شانی کو اپنے کندھے پر لاد کر وہاں سے لے گیا تھا۔ نظامو نے کمرے سے واپسی والا اس بند[illegible] کھرا نکالا [illegible] کے مطابق مذکورہ بندے نے کم از [illegible] رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کے قدموں کے نشانات میں بڑی نمایاں تبدیلی آگئی تھی اور یہ کھرا پہلے والے کھرے سے کافی مختلف تھا۔"

"او مائی گاڈ......!" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ "لگ بھگ ایک من بوجھ اٹھائے وہ بندہ کس طرف گیا تھا؟"

"اس کا پتا صبح چلایا جائے گا۔" قادر علی ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "جب ہم نے اس بندے کی کمرے سے واپسی کا کھرا پکڑا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ قدموں کے نشانات کا مزید سراغ لگانا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ ہم نے ایک جگہ پر بڑے سے پتھر کی نشانی رکھی اور واپس تھانے آگئے۔ باقی ماندہ کام انشاء اللہ صبح سویرے شروع کردیں گے۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے نظامو تھانے پہنچ جائے گا۔"

قادر علی کی فراہم کردہ اطلاعات نے میرے دل و دماغ میں کھلبلی مچادی تھی۔ شانی کی گمشدگی والی کہانی کا انجام مجھے بڑا بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے من میں شانی کی سلامتی کی دعا کرتے ہوئے قادر علی سے پوچھا۔

"کمرے سے نکلنے کے بعد وہ مردود کس سمت گیا تھا۔ واپس گاؤں کی جانب یا کھیتوں کی طرف؟"

"اس کا رخ کھیتوں کی جانب تھا ملک صاحب!" قادر علی نے جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔

☆☆☆

انسان زمینی حقائق کی بنا پر اپنے انداز میں سوچتا ہے اور قدرت نے اپنی سوچ کو آسمانی حقائق میں ظہور پذیر کرنے کا ارادہ کر رکھا ہوتا ہے۔ قدرت کا فیصلہ یقیناً انسانی عمل سے زیادہ موثر اور موزوں ہوتا ہے۔ ستائیس جون کی رات میں اس اطمینان کے ساتھ سویا تھا کہ اگلی صبح میں شانی کا سراغ لگانے میں کما حقہ، کامیابی حاصل کرلوں گا لیکن اٹھائیس جون کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی میرے عزم کی دھجیاں بکھر گئیں۔ قدرت کے ایک اشارے نے میرے پروگرام کو تہس نہس کرکے رکھ دیا تھا۔

وہ ایک گرم اور حبس زدہ رات تھی۔ ان دنوں میں کوارٹر کے صحن میں چارپائی بچھایا کرتا تھا۔ مچھروں کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے میں نے اپنی چارپائی پر مچھردانی بھی لگا رکھی تھی۔ [illegible] سبب تھا اچانک شروع ہوجانے والی بارش جو دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی شکل اختیار کرگئی تھی۔ رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تھا تو آسمان پر بارش کے امکانی آثار کا کہیں وجود نظر نہیں آتا تھا مگر یہ ماننا پڑے گا کہ قدرت کو اپنے عمل کے لیے کسی امکان یا آثار کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ تو "کن فیکون" کے فارمولے کے تحت کام کرتی ہے۔

میں نے آنا فانا میں مچھردانی سمیت چارپائی کو گھسیٹ کر اپنے کوارٹر کے برآمدے میں پہنچایا۔ اگر اس کام میں مجھے ذرا سی تاخیر بھی ہوجاتی تو پھر مجھے اور میری چارپائی کو غسل نصف شب سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اگرچہ مچھردانی کی ڈنڈیوں کے ساتھ اس طرح چارپائی کو گھسیٹنا کوئی آسان کام نہیں لیکن میں نے "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق یہ مشکل کام چند سیکنڈ میں انجام دے لیا اور اب میں برآمدے میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ بارش کو بھی آج رات ہی آنا تھا......!

اچانک شروع ہونے والی بارش نے دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش کا روپ دھار لیا۔ اسی دوران میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے بادل بھی خوف ناک انداز میں گرج رہے تھے۔ یہ اس امر کا اعلان تھا کہ آج آسمان کھل کر برسے گا۔ بجلی بھی کڑک رہی تھی۔ بجلی کی چمک سے لمحے بھر کے لیے ماحول روشن ہوجاتا اور پھر وہی تاریک رات اور دھواں دھار بارش۔ ایک مرتبہ تو بجلی اتنی زور سے ہیبت ناک آواز کے ساتھ کڑکی کہ میرا دل دہل کر رہ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے کوارٹر کے قرب وجوار میں کہیں آسمانی بجلی گری ہے۔

موسلا دھار بارش نے جو بدامنی پھیلائی تھی اس کے بعد میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکا۔ فجر کی نماز کے بعد میں نے ناشتا کیا اور بھاری دل کے ساتھ یہ سوچنے لگا کہ گزشتہ روز قادر علی اور نظامو نے کھرے کے ذیل میں دن بھر جو کڑی محنت کی تھی وہ اکارت گئی۔ اس طوفانی بارش نے اس کھرے کا ستیاناس مار دیا تھا۔ شانی تک پہنچنے اور اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی جان کاری حاصل کرنے کے لیے جو کھرے کی کرن نمودار ہوئی تھی وہ یکایک بجھ گئی تھی اور میں ایک بار پھر گھپ اندھیرے میں کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے چونک کر بیرونی دروازے کی جانب دیکھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "الٰہی! اتنی صبح کس کو میری [illegible] پیش آ[illegible]؟"

[illegible] ایک مرتبہ پھر دستک [illegible] جو پہلے کی نسبت زیادہ شدید تھی۔ اب بارش رک چکی تھی البتہ بوندا باندی کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ میں نے صحن عبور کرکے اپنے کوارٹر کا دروازہ کھولا تو مجھے قادر علی کا چہرہ دکھائی دیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"سر جی! چلیں۔ آپ کا بلاوا آیا ہے۔"

"کہاں چلوں......؟" میں نے الجھن بھری نظر سے اسے دیکھا۔ "یہ صبح صبح میرا بلاوا کہاں سے آگیا۔ کیا ایس پی علاقہ تشریف لائے ہیں؟"

"کوئی یہاں تشریف نہیں لایا سر جی۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "بلکہ آپ کو وہاں تشریف لے کر جانا ہے۔ آئیں میرے ساتھ۔" میں وردی پہنے بغیر قادر علی کے ساتھ ہولیا اور پوچھا۔ "مجھے کہاں تشریف لے کر جانا ہے؟"

"ادھر کھیتوں میں۔" اس نے میرے ساتھ چلتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "جہاں ہم نے رات کھرے کا کام ادھورا چھوڑ کر نشانی کے طور پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا تھا۔"

"وہاں پر ایسا کیا ہے جو تم...... مجھے دکھانا چاہتے ہو؟" قادر علی کی معنی خیز گفتگو نے میرے ذہن کو مزید الجھا دیا تھا۔ "تم نے میرے کسی بلاوے کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ سب کیا چکر ہے قادر علی؟"

"سر جی! رات کو دلاور پر آسمانی بجلی گری ہے، ادھر کھیتوں میں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ آدھے سے زیادہ زمین میں دھنسا ہوا ہے۔ اس کی حالت بڑی نازک ہے۔ اس کی زبان پر ایک ہی فریاد ہے...... تھانے دار کو بلاؤ، تھانے دار کو بلاؤ!"

"بجلی گرنے کی مہیب آواز تو میں نے بھی سنی تھی۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مگر یہ دلاور ہے کون اور وہ مجھے کیوں پکار رہا ہے؟"

"دلاور کا تعلق منڈی کاموکی ہی سے ہے ملک صاحب۔" اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "وہ ریاض احمد زمیندار کا خاص بندہ ہے اور مجھے لگتا ہے یہ بھاری جثے والا وہی بندہ ہے جس کے پاؤں کا کھرا ہم نے شانی کے پاؤں کے کھرے کے ساتھ دیکھا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بدبخت اپنے کالے کرتوت کی پردہ پوشی کرنے کے لیے ہماری محنت پر پانی پھیرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن قدرت نے اسے موقع نہیں دیا۔ قبل اس کے کہ وہ کھرے کو غائب کرتا، اس پر آسمانی بجلی گر گئی۔"

"کھرے کی تو ویسے بھی اس بارش نے ایسی کم تیسی کرکے رکھ دی ہے۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم جائے وقوعہ یعنی اس متروک کمرے کے نزدیک پہنچ گئے جس کے اندر سے قادر علی کو شانی کے پاؤں کی ایک چپل پڑی ملی تھی۔ مذکورہ کمرے سے چند قدموں کے فاصلے پر درجن بھر افراد جمع تھے اور ان کی توجہ کا مرکز دلاور نامی وہی شخص تھا جس کا ذکر راستے میں قادر علی نے کیا تھا۔

دلاور کی حالت بڑی نازک تھی۔ آسمانی بجلی نے اس کے جسم کے بیشتر حصے کو بری طرح جلا ڈالا تھا اور اس کے دھڑ کا زیریں حصہ زمین کے اندر دھنسا ہوا تھا۔ جو حصہ زمین کے اوپر تھا اس کی خستہ حالت کو دیکھ کر بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چند لمحوں کا مہمان ہے۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ چلایا۔ "تھانے دار صاحب......!"

میں لوگوں کو ہٹا کر دلاور کے نزدیک پہنچ گیا پھر سخت

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

لہجے میں کہا۔ ''ہاں بولو...... مجھے کیوں یاد کر رہے ہو؟ کیا اپنے کسی سنگین جرم کا اقرار کرنے کا ارادہ ہے؟''

''ج...ج...... جی......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر لکنت زدہ انداز میں بولا۔ ''میں نے...... ریاض احمد کے حکم پر...... ایک جعلی رقعے کے ذریعے...... شانی کو سڑک تک جانے کے لیے ورغلایا...... پھر قیصر کے بس میں بیٹھ...... جانے کے بعد میں شانی کو بہلا پھسلا کر...... اس کمرے میں لے آیا اور...... پھر میں نے گلا دبا کر اس کی جان لے لی...... شانی کی لاش کو میں نے اس کھیت میں دبایا ہے...... اس کھیت میں......'' بات کے اختتام پر اس نے ایک نزدیکی کھیت کی سمت اشارہ بھی کر دیا۔

اس سے پہلے کہ میں اس شیطان صفت دلاور سے کوئی اور سوال کرتا، اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ جہنم کا ایندھن بننے کے لیے اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہو گیا تھا۔ آسمانی بجلی نے دلاور کو ایسے ہیبت ناک انداز میں جلا ڈالا تھا کہ اسے دیکھ کر بدن جھرجھری لینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ شاید قدرت نے دلاور کو ابھی تک اس لیے زندہ رکھا ہوا تھا کہ وہ میرے سامنے اقبالِ جرم کر لے۔

دلاور نے اقبالِ جرم درجن بھر افراد کے سامنے کیا تھا لہٰذا اگلے ایک گھنٹے میں، میں شانی کے چچا پار ریاض احمد کو گرفتار کر کے اپنے تھانے کی حوالات میں پہنچا چکا تھا۔ ابتدائی پوچھ گچھ پر اس نے خود کو اس معاملے سے غیر متعلق ثابت کرنے پر زور لگایا لیکن مجھے اس کے مجرم ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ اپنی آخری سانسوں میں کوئی بھی شخص جھوٹ نہیں بولتا اسی لیے مرنے والے کے آخری الفاظ کو عدالت میں بھی بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ میں نے ریاض احمد کی زبان کھلوانے کے لیے جب اسے اپنے تھانے کے ''ڈرائنگ روم'' میں پہنچا کر شاہانہ ''خاطر داری'' کا اہتمام کیا تو اس کے سارے کس بل نکل گئے اور وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔

''ہاں...... میں نے ہی شانی کو ختم کرایا ہے۔ میرا ثاقب اسے بونگا لگتا تھا اور وہ لاہور سے آئے ہوئے ایک پردیسی کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ بس، میری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا اور کسی بڑی بدنامی سے پہلے میں نے اس منہ کالک شانی کا قصہ تمام کر دیا۔ مجھے اپنے کیے پر نہ تو کوئی شرمندگی ہے اور نہ ہی کسی قسم کا افسوس......!''

''ریاض احمد!'' اس کے فلمی ڈائیلاگز کو میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا۔ ''اگر تمہیں اپنے کیے پر پشیمانی کے بجائے فخر ہے تو میں تمہیں اس کامیابی کا ''جشن'' منانے کا پورا موقع فراہم کروں گا۔'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اب تمہاری باقی کی ساری زندگی جیل کی دیواروں کے پیچھے گزرنا ہے۔ تم پر منحصر ہے کہ اپنی کوٹھری کے اندر کامیابی کا جشن مناؤ یا اپنے کالے کرتوتوں کا ماتم کرو۔ ایک بات کا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا انجام دلاور سے بھی زیادہ بھیانک ہوگا۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور وہ معاندانہ انداز میں مجھے گھورنے لگا۔

☆☆☆

اس واقعے کے چند روز بعد چھیماں سے میرا سامنا ہوا۔ میں نے اس کا حال احوال پوچھنے کے بعد نرمی سے کہا۔ ''لاڈو! شانی کے ساتھ جو کچھ ہوا، مجھے اس کا افسوس ہے۔''

''جو سوہنے رب دی مرضی۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر افسردہ لہجے میں بولی۔

''لاڈو! تم نے دیکھا ہے نا، میں نے شانی کی موت کے اصل ذمے دار ریاض احمد کے زندگی بھر جیل میں سڑنے کا بندوبست کر دیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

اس بار بھی اس نے گردن نہیں اٹھائی اور بوجھل آواز میں بولی۔ ''جی، میں نے دیکھا ہے۔''

''لاڈو! اب تم کسی [illegible] میں [illegible] بنواؤں گا۔ تم ایک دم پولیس والی لگو گی پھر میں...... میں پورے کاموکی کو بتاؤں گا کہ تم میری لاڈو ہو۔''

اب کی بار اس نے گردن اٹھا کر جگر پاش نظر سے مجھے دیکھا۔ ''مجھے پولیس والی نظر آنے کا کوئی شوق نہیں انکل۔'' اس نے شاکی لہجے میں کہا۔ ''ایسی پولیس کا کیا فائدہ جو میری عزیز از جان سہیلی کو نہ بچا سکی۔ مجھے نہیں بننا پولیس والی۔ میں دانے بھوننے والی چھیماں ہی ٹھیک ہوں۔''

چھیماں کا لہجہ مجروح اور آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے معصوم شکوے کے جواب میں، میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن میں اپنے اندر، الفاظ کو زحمت دینے کی ہمت نہ پیدا کر سکا۔ میں نے چھیماں سے کچھ نہ کہا اور خاموشی کے ساتھ گردن جھکا لی۔

کیونکہ آسمانی فیصلوں کے سامنے گردن جھکانے میں ہی عافیت ہے!

(تحریر: حسام بٹ)

http://urdutubes.com/

ہرجائی

علی اختر

پچھلے وقتوں میں ایثار اور قربانی کی بہت اہمیت ہوا کرتی تھی جو دوسروں کی خاطر دی جاتی تھی بالخصوص محبت میں مگر اب... صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچا جاتا ہے... اگر ساتھ مل گیا تو ٹھیک ورنہ ناکامی کی صورت میں چاہنے والے کو ہی تباہ و برباد کر کے دلی سکون حاصل کر لیا جاتا ہے... اس نے بھی کچھ ایسا ہی کارنامہ انجام دیا۔ جو اسے نہ مل سکا وہ پھر کسی کا نہ ہو سکا۔

ایک ہرجائی فطرت عاشق کی سزا

اور وفا کا انوکھا قصہ

جزیرہ ہوائی کے ہوٹل ریڈونڈو (Redondo) کو صبح سے ہی رنگ برنگی جھنڈیوں اور غباروں سے سجایا گیا تھا۔ دیکھنے والوں میں خوبصورت لباس پہنے عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ ہوٹل والوں نے یہاں آنے والوں کے لیے انواع و اقسام کے کھانوں اور دوسری اشیا کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ 1975ء کی انتہائی خوشگوار صبح کا ذکر ہے، ہوٹل ریڈونڈو البیلی اور شرارتی لہروں کو جنم دینے والے دریا کے کنارے واقع ہے جہاں انہی لہروں کی طرح، منچلی لڑکیوں کے درمیان سرف رائیڈنگ (Surf Riding) کا پہلی بار مقابلہ ہونے والا تھا۔ مقامی انتظامیہ اور ہوٹل انتظامیہ کے اشتراک سے ہونے والے اس مقابلے میں دور و نزدیک کے ملکوں اور ریاستوں کی خواتین اور لڑکیاں

یہاں آرہی تھیں۔ رنگ رنگ کے کھلاڑیوں والے لباس پہنے کھلاڑی لڑکیاں بھی اس ہجوم میں پھرتی نظر آرہی تھیں۔

میلے میں آنے والے ناظرین کی سہولت کے لیے ایک ہفتہ پہلے سے مختلف کھلاڑی لڑکیوں کے کھیل کا مظاہرہ دن میں دو مرتبہ دکھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس مقابلے میں شرکت کرنے کے لیے جہاں دوسری ریاستوں سے کھلاڑی لڑکیاں آرہی تھیں، وہیں امریکا کی ایک ریاست نارفاک (Nor Falk) کی نیوی کی ٹیم بھی حصہ لے رہی تھی۔ ابھی مقابلہ شروع ہونے میں دو روز باقی تھے۔ جب اس کی دورکنی ٹیم جزیرہ ہوائی میں آئی۔ کھلاڑی لڑکی کی عمر بہ مشکل بیس یا پچیس سال کے درمیان ہوگی۔ لڑکی کے بال سرخ اور کٹے ہوئے تھے۔ اس نے شوخ رنگ کا سبز لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کا قد پستہ تھا۔ پاؤں میں کھلاڑیوں کے سفید جوتے اور ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے تھی۔ اس کی سبز آنکھوں سے چمک اور تیز طراری اس کے شوخ اور کسی بھی چیز کو جھپٹ لینے کا سا انداز جھلک رہا تھا۔ اس کا ساتھی مرد اسے بنی کہہ کر پکارتا تھا۔

اس کا ساتھی مرد گھٹے گھٹے جسم اور گھنگرالے بالوں، اچھے قد کاٹھ اور مضبوط جسامت والا عمر میں اس سے بڑا دکھائی دیتا تھا۔ لڑکی اسے لاری کہتی تھی۔ وہ دونوں اپنے سامان کے ساتھ استقبالیہ پر پہنچے تو مرد نے آگے بڑھ کر اپنے کوائف کا اندراج کرواتے ہوئے [illegible] عرف ڈیکر بنی لکھوایا۔ جبکہ اپنا نام [illegible] اور اپنی ریاست کی جانب سے اجازت نامہ بھی دکھایا۔ انہیں ہوٹل میں ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ بنی کے انداز واطوار سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک آزاد خیال لڑکی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت جمی ہوئی سرخی کی ہلکی سی تہ اسے اور بھی دلکش بنائے ہوئے تھی۔

استقبالیہ سے فارغ ہو کر انہوں نے اپنا سامان الاٹ شدہ کمرے میں رکھا اور پھر ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ مقابلہ دیکھنے والوں کی تعداد میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔

"کتنا خوبصورت ماحول ہے۔" بنی نے اپنے ہونٹوں کو سکوڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... اور ادھر دیکھو...... دریا کی منچلی شرارتی لہروں کو...... جھاگ اڑاتی تین چار فٹ اونچی تو ہوں گی۔" لاری نے اندازہ لگایا۔

"سنا ہے جب ہوائیں چلتی ہیں تو یہ لہریں بیس فٹ تک بلند ہوجاتی ہیں۔" بنی نے جواب دیا۔

ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ بنی کے پیچھے سے کسی منچلے مرد کی آواز میں بے ہودہ فقرہ اچھالا گیا۔

"کیا کہا اس نے......" لاری نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جو تم نے بھی سن لیا ہے۔" بنی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"معاف کرنا...... میں کیلی فورنیا سے کیتھی ہوں......"

ایک عام سے نقوش والی لڑکی نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بنی سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"ہائے...... بڑی خوشی ہوئی۔ میں بنی ہوں...... بونیٹا ڈیکر...... امریکا سے......"

"مجھے بھی سرفنگ کا بہت شوق ہے۔ کچھ اس کے متعلق بتائیں گی۔" اس نے بڑے دلنشین انداز میں پوچھا۔

"کیوں نہیں...... مگر اب تو سرفنگ سکھانے کے اسکول کھل گئے ہیں۔ آپ ان میں سے کسی ایک میں داخلہ لے لیں۔ آپ کو علم ہوجائے گا۔"

"مگر تب تک......" کیتھی نے فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کونسا بورڈنگ استعمال کرتی ہیں۔"

"میں ایک بڑے تختے پر کھڑے ہو کر سرفنگ کرتی ہوں۔ اسے آپ اسٹینڈنگ اپ سرفنگ کہہ سکتی ہیں۔ مگر دوسری قسم کی بورڈنگ بھی کرسکتی ہوں اور کیلی فورنیا کے ساحلوں پر تو یہ کھیل کافی عرصے سے ہو رہا ہے۔ کمال ہے، تم اس سے ابھی تک لاعلم ہو۔"

"لاعلم نہیں ہوں [illegible]

[illegible] سا سوچ [illegible]

"یہ تو دریا اور سمندر کی قدرتی لہروں پر سرفنگ کا مقابلہ ہے مگر آج کل تو مصنوعی سرفنگ بھی کی جاتی ہے لیکن مجھے موجوں کے قدرتی جھاگ سے کھیلنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔" بنی اسے تفصیل سے بتانے پر تلی ہوئی تھی۔ "سرفنگ کے لیے بورڈ آج کل مصنوعی شیشے سے بھی بنائے جاتے ہیں۔ جن کے اوپر پاؤں میں پھنسانے کے لیے مصنوعی ریشے یا لکڑی کی تنیاں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ آج کل کاربن (سیسے) کے بورڈز بھی بنائے جاتے ہیں۔"

"شکریہ......" کیتھی نے اس کی بات کو روکتے ہوئے کہا اور دوسری طرف چلی گئی۔

"لگتا ہے کہ وہ تمہارے لیکچر سے خاصی بوریت محسوس کرنے لگی تھی۔ اس قدر تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" لاری نے کہا۔

"میں نے اس کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے بتانے کی کوشش کی تھی۔" بنی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ہوں، دلچسپی...... محض وقت گزاری کو تم دلچسپی نہیں کہہ سکتیں۔" لاری نے کہا۔

"جس طرح تم میرے ساتھ وقت گزاری کر رہے ہو......" بنی نے موضوع بدل کر لاری پر چوٹ کی۔

"اس سے تمہارا مطلب......؟" لاری نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں تو...... میں سوچ رہی ہوں کہ اتنے دنوں باہر رہنے کے بعد جب تم گھر جاؤ گے تو وہ تمہاری چہیتی بیوی تمہیں معاف کردے گی۔" بنی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اسے پتا ہے کہ میں اپنے محکمے کے کسی کام سے باہر گیا ہوا ہوں۔"

"ایک موٹر کشتیاں بنانے والے کو باہر کیا کام ہوسکتا ہے۔" بنی اسی انداز میں بولی۔

"دیکھو بنی...... تم میرا مذاق اڑا رہی ہو۔ میں اس مقابلے میں تمہاری سرفنگ کے لیے اپنی موٹر لانچ لے کر آیا ہوں اور مت بھولو...... کہ اس کے رسے کے ساتھ تم بندھی ہو...... تمہیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ میں نے کتنی مشکلوں کے ساتھ یہ ڈیوٹی حاصل کی ہے، صرف...... اور صرف تمہارے لیے......"

"لاری...... تم کچھ زیادہ ہی محسوس کر گئے ہو۔ چلو چھوڑو...... آؤ دریا کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اس کے بازو میں اپنا بازو پھنسا کر [illegible] ہوئے [illegible]

☆☆☆

لارنس ولسن عرف لاری نیوی کے اس شعبے سے وابستہ تھا جہاں موٹر بوٹس ڈیزائن کی جاتی تھیں۔ اسے بچپن سے ہی کشتیاں بنانے کا شوق تھا۔ اس کے کمرے میں بھی دیواروں پر کاغذ سے بنائی گئی کشتیوں کے مختلف ڈیزائن آویزاں تھے۔ آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ وہ اس ہنر میں طاق ہوتا گیا۔ پھر اس نے نیوی میں درخواست دے ڈالی اور اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اس جگہ ملازمت ملنے میں کسی قسم کی سفارش یا تگ و دو کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ملازمت ملنے کے بعد کشتیاں بنانے کا شوق اور بھی تقویت پکڑ گیا۔ اب اس کے کمرے میں موجود دیواروں پر کشتیوں اور بجروں کی تصاویر اور خاکے بے ترتیبی سے لٹک رہے تھے۔ کونے میں پڑی ہوئی میز پر بھی کسی کشتی کے خاکے تھے جو تکمیل کے منتظر تھے۔

لاری اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد تقریباً تنہا رہ گیا تھا۔ کشتیاں بنانے کا شوق اسے بچپن سے ہی تھا۔ اس کے اس شوق میں اس کے بچپن کی دوست بونیٹا ڈیکر بھی شامل تھی۔ لاری کو اچھی طرح وہ دن بھی یاد تھے جب وہ دونوں علی الصباح قریبی دریا کے کنارے کاغذ و قلم لے کر بیٹھ جاتے تھے اور گھنٹوں کشتیوں کے نئے نئے ڈیزائن بناتے رہتے تھے۔ بنی اس کے قریب ہی پڑوس میں رہتی تھی۔ وہ بچپن سے ہی بہت تیز طرار اور شوخ تھی لیکن لاری کے ساتھ ہمیشہ سنجیدگی سے پیش آتی تھی۔ جب بھی وہ لاری سے سوال کرتی کہ اسے کشتیاں بنانے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے تو وہ بتاتا کہ اگر کبھی اس نے مضبوط ریس بوٹ بنالی اور کشتیوں کی دوڑ میں مختلف کشتیوں کو شکست دے کر جیت گیا تو اس کی ہر طرف شہرت ہوجائے گی۔ وہ اسے یہ بھی یقین دلاتا تھا کہ جب وہ مشہور ہوجائے گا تو اس کے ساتھ شادی کرلے گا۔

اسی وجہ سے بنی اس کے ساتھ ہمیشہ جڑے رہنے کو ترجیح دیتی تھی۔ پھر ایک روز جب دونوں نے مل کر ایک ایسی کشتی کا ڈیزائن بنایا جو ان کے نزدیک پہلے سے موجود کشتیوں میں سب سے منفرد اور مختلف تھا۔ لاری اور بنی دونوں اپنے اس ڈیزائن پر بہت خوش تھے۔ انہوں نے اپنی اس کشتی کا نام "مسٹرال" رکھا۔ ڈیزائن بننے کے بعد اب اگلا مرحلہ اسے عملی شکل دینے کا تھا جس کے لیے بہت سا میٹریل چاہیے تھا۔ ایک ایسی لکڑی کا انتخاب جو پانی کی سطح کو اپنے جسم سے مس ہونے کی اجازت تو دے مگر اس کے بدن پر بغیر رگڑ کھائے تیزی سے بھاگ سکے۔ ایک مستول والی کشتی جس کا سائز تقریباً 30 فٹ تھا۔ لاری اپنی استطاعت کے مطابق آہستہ آہستہ مطلوبہ سامان جمع کرنے لگا تھا۔ اس کام میں بنی بھی اس کی حصہ دار تھی۔

"دیکھنا...... بہت جلد ہماری یہ کوشش ایک تہلکہ مچا دے گی۔" لاری نے مسٹرال پر کام کرتے ہوئے ایک روز بنی کو کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو......" بنی نے جواب دیا۔

بنی اب تیز طرار بچی سے ایک خوبصورت نوجوان لڑکی کا روپ دھار چکی تھی۔ اس کے جسمانی خدوخال میں بھی نمایاں تبدیلی آچکی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی سوچوں کے موسم بھی تبدیل ہوچکے تھے۔

لاری اب اسے ایک ایسا نوجوان لگنے لگا تھا جس کا کوئی مستقبل نہ ہو۔ چنانچہ اب وہ اس سے اجتناب برتنے لگی تھی۔ اپنی نوجوانی میں ہی اس نے ڈیٹنگ شروع کردی تھی۔ وہ اپنے سے بڑے یا پھر ہم عمر ایسے اشخاص کو سونگھتی پھرنے لگی تھی جو دولت مند اور عیاش ہوں۔ لاری کو اس کی حرکتوں کا لمحہ

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

بہ لحہ علم ہونے لگا تھا۔ اسے بے حد دکھ ہوتا تھا جب اس کے کانوں کو ایسی کہانیوں کی بازگشت سنائی دیتی۔

لاری کو یاد ہے، ایک ایسی ہی شام کو اسے اطلاع ملی تھی کہ بنی نے اپنی ذاتی حفاظت کے لیے رکھے ہوئے پستول سے ایک ایسے شخص کو قتل کر ڈالا ہے جو امیر اور عیاش ہونے کے ساتھ ساتھ اکیلا تھا اور اس کے اردگرد اس کا کوئی رشتے دار موجود نہ تھا۔ گولیاں اس کے دل کے قریب سینے میں ماری گئی تھیں۔ اس اقدام کے بعد بنی منظر سے غائب ہو گئی تھی۔

لاری بے روزگاری سے تنگ آچکا تھا۔ اس لیے اب اس کی زیادہ تر کوشش نوکری کا حصول تھی پھر اچانک اسے خبر ملی کہ نیوی میں ایک ایسا شعبہ بھی ہے جس میں نہ صرف نت نئی کشتیوں کو ڈیزائن کیا جاتا ہے بلکہ انہیں بنا کر مارکیٹ میں بھی فروخت کیا جاتا ہے اور دوسری ریاستوں میں بحریہ کو بھی سپلائی کیا جاتا ہے جن سے وہ نہ صرف جاسوسی کا کام لیتے ہیں بلکہ ملک دشمن کارروائیوں کی روک تھام کے لیے بھی انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔ لاری نے وہاں درخواست دی اور اپنے تجربے سے بھی آگاہ کیا تو اسے فوراً ملازمت مل گئی...... لاری نیوی کے کوارٹر میں شفٹ ہو گیا اور اس نے اپنی آبائی رہائش ترک کر دی۔

لاری کے لیے اب اپنے شوق کو پورا کرنے کے پورے مواقع موجود تھے۔ اس [illegible] نے نیوی کے لیے خوبصورت اور ہلکی پھلکی کشتیاں بنانا شروع کر دیں۔ [illegible] ہلکے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایسی کشتیاں بنانے لگا [illegible] کی مانگ میں دن بہ دن اضافہ ہونے لگا تھا۔ انہی دنوں ایک روز نیوی کے دوسرے آفس میں جب لاری کسی کام سے گیا تو اچانک اس کی ملاقات بنی سے ہو گئی، جسے دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا۔

''تم...... بنی...... یہ تم ہی ہو......؟'' لاری نے اس کا راستہ روکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... میں ہوں لاری...... مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' بنی نے بھی حیرانی سے پوچھا۔

''میں یہاں کشتیاں بنانے کے شعبے میں ہوں اور تم......؟'' لاری نے دوبارہ سوال کیا۔

''میں یہاں انٹیلی جنس کے شعبے سے وابستہ ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''بڑے خبطی ہو...... آخر اپنے شوق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا موقع تمہیں مل ہی گیا اور وہ مستر ال کا کیا بنا؟''

''وہ اسی طرح ادھوری پڑی ہے۔ تمہارے روپوش ہونے کے بعد میں بہت دلبرداشتہ ہو گیا تھا اور اسے ادھورا چھوڑ کر ملازمت کے حصول کی کوششوں میں مصروف ہو گیا جو میرے جینے کے لیے بہت ضروری تھا......'' لاری نے دھیرے دھیرے بتایا۔

''ٹھیک ہے پھر ملیں گے...... بلکہ اب تو ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔'' بنی یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

اس ملاقات کو ہفتے اور مہینے گزر گئے۔ لاری نے اپنے طور پر اس سے ملاقات کے لیے بڑی کوشش کی مگر اسے پتا چلا کہ وہ کسی خفیہ مشن پر گئی ہوئی ہے۔ لاری کو ایک بار پھر سے تنہائی کاٹنے لگی تھی۔ ان ہی دنوں لاری کی ملاقات ایک محفل میں ایک نہایت سنجیدہ مگر باوقار سی خاتون الزبتھ سے ہوئی۔ الزبتھ کا تعلق ایک امیر کبیر خاندان سے تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اگر وہ تمام عمر بھی اکیلی رہ کر گزار دے تو اسے فکر معاش نہیں ہوگی۔ نیول ہیڈ کوارٹر سے ہٹ کر تھوڑی دور اس کا اپنا آبائی مکان تھا۔

مکان اس قدر بڑا اور خوبصورت بنا ہوا تھا کہ پہلی نظر میں مالکِ مکان پر رشک آنے لگتا تھا۔ الزبتھ کو اس کے ملنے والے پیار سے لزی کہہ کر پکارتے تھے۔

''لاری! تم سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔'' لزی نے ایک ملاقات میں کہا۔

''تم ایک اچھی اور باوقار خاتون ہو...... میں چاہوں گا کہ ہم ایک دوسرے [illegible] ملتے رہیں۔'' لاری نے [illegible] کراتے ہوئے جواب دیا۔

''یقیناً ایسا ہو سکتا ہے۔ تم کسی دن ہمارے گھر کیوں نہیں آجاتے۔'' لزی نے خوش دلی سے کہتے ہوئے لاری کو اپنے گھر بلایا۔

اس طرح لاری اور لزی ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے کہ ایک روز لزی نے تجویز پیش کی۔ ''کیوں نہ ہم شادی کرلیں......''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر جب تک میں اپنا مکان نہیں بنا لیتا، تب تک یہ ممکن نہیں......'' لاری نے جواب دیا۔

''میرا یہ مکان جو ہے...... اتنا بڑا مکان...... کیا ہم دونوں کے لیے کافی نہ ہوگا......؟'' لزی نے تجویز پیش کی۔

☆☆☆

الزبتھ اور لاری کی شادی کے دعوتی کارڈز کیا چھپے اس کے ملنے جلنے والوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی کہ ایک انتہائی صاحبِ ثروت عورت ایک معمولی درجے کے ملازم کے ساتھ

کس طرح شادی کر سکتی ہے۔ یہ خبر بنی تک پہنچی تو ایک روز وہ انتہائی بپھرے ہوئے انداز میں لاری کو ڈھونڈتی ہوئی اس کے شعبے میں آگئی۔ لاری اس وقت اپنے ڈیپارٹمنٹ میں نہ تھا۔ وہ واپسی کے لیے مڑی ہی تھی کہ لاری اسے مل گیا۔

''ہیلو لاری! کب ہو رہی ہے تمہاری شادی......؟'' اس نے چھوٹتے ہی سوال داغا۔

''اگلے ہفتے...... میں تمہیں کارڈ دینے گیا تھا مگر تم اپنے شعبے میں ملی ہی نہیں۔ کہاں گئی ہوئی تھیں......؟'' لاری نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''جہنم میں...... مجھے تم یہ بتاؤ، تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم کسی اور سے شادی کرو۔ میں کیا مر گئی تھی؟'' وہ چیخی۔

''اوہ مجھے تو آج پتا چلا کہ تم بھی میری امیدوار تھیں، میں تو تمہیں آج تک ایک دوست کی حیثیت ہی دیتا رہا۔ وہ تمہارے کیپٹن کا کیا بنا جس کے ساتھ تم آج کل پینگیں بڑھا رہی ہو؟'' لاری نے بھی طنز کیا۔

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے لاری۔ میں اس کی جان لے لوں گی...... جس نے تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کی۔ بنی کسی دوسرے کے ساتھ تمہیں کبھی دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ بس......!'' اس نے گویا اپنا آخری فیصلہ سنا ڈالا تھا۔

''اپنے سابقہ [illegible] کو دیکھو۔ تم نے کہاں...... کہاں مجھے [illegible] یا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ [illegible] کا راز [illegible] تمہارا [illegible] اپنے جذبات کی تسکین کے لیے پینترے اور کھونٹے بدلتی رہتی ہو۔'' لاری نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ مجھ پر الزام ہے۔ اچھا تم ایک بات یاد رکھنا۔ بنی کبھی اپنی شکست نہیں مانتی۔ میں ہر وقت سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گی... اور یہ بات ثابت کروں گی کہ میں ہی تم سے محبت کرتی ہوں۔ باقی سب جھوٹ ہے...... سنا ہے، تمہاری بنائی ہوئی موٹر لانچ آج سمندر میں اتاری جانے والی ہے؟ میں شپ یارڈ میں نہیں گئی۔ ذرا ادھر تک میرے ساتھ چلو گے؟'' بنی نے پوچھا۔

''مجھے وہاں جانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' لاری نے جواب دیا تو بنی کے لہجے میں چاپلوسی اتر آئی۔

''لاری! ابھی تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی لیکن تمہارے انداز کس قدر بدل گئے ہیں، تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ ہم نے اپنا بچپن ایک ساتھ گزارا ہے۔ وہ وقت یاد کرو، جب ہم دن بھر کشتیوں کے مختلف ڈیزائن بناتے تھے اور میں اس میں تمہارا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔'' بنی بولی... تو لاری اس کے ساتھ چپ چاپ شپ یارڈ کی طرف چلا گیا۔ راستے بھر بنی اسے اپنی محبت کا یقین دلاتی رہی۔

''لاری! میں نے سوچا ہے کہ تم ٹھیک کہتے ہو، محبت میں پالینا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ میں اس کے باوجود کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے، شادی کے بعد بھی تم سے اسی قدر پیار کرتی رہوں گی جیسے پہلے کرتی تھی۔''

شپ یارڈ پر کتنی ہی کشتیوں اور لانچوں کو بھاری اور موٹی زنجیروں کے ساتھ ساحلِ سمندر پر باندھ رکھا تھا تاکہ ہوا کی تندی یا لہروں کا زور انہیں ساحل سے دور نہ لے جائے۔ ''یہ کشتیاں اور لانچیں بھی کس قدر کمزور ہیں، ان کی بے بسی دیکھو۔ اپنے بھاری بھرکم وجود رکھنے کے باوجود یہ بےبسی سے اپنے کھولنے والوں کی منتظر رہتی ہیں۔ بالکل میری اور تمہاری محبت کی طرح......'' وہ لاری کو لے کر ایک ایسی جگہ آگئی... جہاں مکمل طور پر تنہائی تھی...... اچانک اس نے اپنی کمر کے گرد باندھی ہوئی باریک لیکن خوبصورت زنجیر کے نیچے سے پستول نکالا اور اسے لاری کی طرف کرتے ہوئے بڑے سفاک انداز میں بولی۔

''اسے دیکھ رہے ہو لاری؟'' پھر دوسرے ہاتھ میں تھامے سائلنسر کو اس کی نال پر چڑھاتے ہوئے اس کا انداز کسی خطرناک عادی مجرم کی طرح ہو چکا تھا۔

''ادھر دیکھو لاری! اس میں موجود گولیاں کسی بھی زندہ جسم میں اترنے کے لیے بے چین رہتی ہیں۔ بڑے دنوں سے میں یہ سوچ رہی تھی کہ تم نے جب بھی مجھ سے نفرت کا اظہار کیا تو میں یہ گولیاں تمہارے بدن میں اتار دوں گی۔'' اس نے آہستہ آہستہ اس پر انکشاف کیا۔

''ٹھہرو بنی...... گولی چلانے سے پہلے میری بات بھی سن لو۔ مجھے تمہارے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم کیا کرتی رہی ہو، یہ تمہارا ذاتی فعل ہے۔ ہرجائی پن تمہاری فطرت میں لکھا گیا ہے۔ یقین کرو، مجھے تم آج بھی وہی جذباتی سی لڑکی لگتی ہو، جس کی محبت اور جس کے پیار کی چنگاری میرے دماغ میں آج بھی موجود ہے، کبھی بجھی نہیں...... یہ الگ بات ہے کہ اب ہماری راہیں جدا ہو چکی ہیں لیکن میں آج بھی تمہاری چاہت اور تمہاری محبت میں اسی طرح بندھا ہوا ہوں جیسے یہ تمام کشتیاں اور لانچیں ساحلِ سمندر پر بندھی ہوئی ہیں۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میں مرنے سے پہلے تمہاری سچی محبت کا اعتراف کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہا ہوں۔''

لاری کا یہ اعتراف سن کر بنی نے پستول کو دوبارہ اپنی قمیص کے نیچے بندھے ہولسٹر میں رکھا اور دوڑ کر لاری کے سینے سے چمٹ

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

گئی۔ رونے کے انداز میں بولی۔ ''مجھے معاف کردو لاری...... میں جذباتی ہو چکی تھی۔ یاد رکھو...... کسی بھی لڑکی کے لیے ٹھکرائے جانے کا احساس اس قدر انتقام پرور ہوتا ہے کہ یہ سوچتے ہی تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر اس کے سینے کو بھینچ کر اپنا سر اس پر ٹکا دیا۔

ان ہی دنوں جب لاری لزی کے ساتھ شادی کر چکا تھا اس کا رویہ پہلے کی طرح منتقمانہ نہ رہا بلکہ شادی کے روز دلہن بنی ہوئی لزی کے گلے سے ملتے ہوئے اس نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ ''خوبصورت چڑیل کو لاری مبارک ہو مگر ایک بات کا دھیان رکھنا۔ بنی اپنی محبت کو کبھی فراموش نہیں کرے گی اور اس کی ہر حال میں حفاظت کرے گی۔ تم اس کی اکیلی مالک نہیں رہو گی۔ یہ بنی کی چاہت ہے جسے وہ امانتاً تمہارے سپرد کررہی ہے۔''

لزی نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ ایک چھوٹے اور پستہ قد کی خوبصورت لڑکی اسے کیسی دھمکی دے رہی ہے مگر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی وحشت اور اپنی پسندیدہ چیز کو چھین لینے کی چمک دیکھ کر خوفزدہ ہو کر رہ گئی۔

شادی کے کچھ عرصے بعد جزیرہ ہوائی میں جب پہلی بار عورتوں کا سرف رائیڈنگ مقابلے کا اعلان ہوا تو امریکا نے بھی اس میں اپنی طرف سے ٹیم بھجوانے کا اعلان [illegible] شرکاء کھلاڑیوں کو یہ چھوٹ دی گئی تھی کہ اس [illegible] کے ساتھ موٹر بوٹ کو چلانے والا ڈرائیور چاہے تو اپنا لے آئے یا پھر مقابلے کی انتظامیہ موٹر بوٹ کے ساتھ مہیا کرے گی۔ اس شرط کا جب لاری کو علم ہوا تو اس نے فوراً بنی سے رابطہ کیا کیونکہ اسے علم ہو چکا تھا کہ کھلاڑی کا قرعہ بنی کے نام نکل آیا ہے۔

پھر بنی اور لاری کی مشترکہ تگ و دو سے لاری کو اس لانچ کا ڈرائیور بنا کر بھیجا گیا جس نے بنی کو جھاگ کی لہروں پر سواری کر کے اسے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے میں مدد دینا تھی۔

''مجھے لگتا ہے...... بنی یقیناً تم یہ مقابلہ بڑی آسانی سے جیت لو گی۔'' مقابلے سے ایک روز قبل لاری نے اس کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو...... مجھے بھی اپنے سے بہتر ابھی تک کوئی کھلاڑی نظر نہیں آیا۔'' بنی نے جواب دیا۔

مقابلے کے روز ساحل کے ساتھ ساتھ ایک بڑے سے بانس پر جھنڈی لگا کر دوڑ کا اسٹارٹنگ پوائنٹ بنا دیا گیا تھا۔ ''ہوائیں بہت تیز چل رہی ہیں۔ ذرا دھیان سے رائیڈنگ کرنا۔ دماغ کو کنٹرول میں رکھتے ہوئے۔'' لاری نے بنی کو کہا۔

''تم بھی لہروں کی زد میں آنے سے لانچ کو بچا کر چلانا۔'' بنی نے بھی اسے نصیحت کی پھر وہ وقت آ پہنچا جب مقابلہ شروع ہو گیا۔

بنی بھی کبھی اسٹینڈنگ بورڈ پر کھڑی ہو جاتی۔ کبھی جھکاؤ دے کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی اور کبھی اپنے لانگ بورڈ پر جسم کے بل لیٹ جاتی۔ لہریں ہوا کے زور سے اونچی سے اونچی ہوتی جارہی تھیں اور ان سے اڑنے والے جھاگ کے سینے پر کتنی ہی لڑکیوں اور جوان عورتوں کے کرتب دیکھنے والوں کے جوش و جذبے اور ان کی ہیجانی سیٹیوں کے ساتھ چیخوں میں ڈوبے جارہے تھے۔

ایک مخصوص وقت کے بعد مقابلے کے خاتمے کا اعلان ہوا تو اونچے ٹاور پر بیٹھے ہوئے منصفین اپنا نتیجہ لے کر نیچے اترے۔ تمام کھلاڑی اپنی موٹر لانچوں کو چھوڑ کر ہوٹل کے وسیع لان میں جمع ہو چکی تھیں۔ بڑے ہی جان لیوا انتظار کے بعد بالآخر نتیجے کا اعلان ہوا۔ مارگو ادبرگ اس زنانہ مقابلے میں پہلے نمبر پر آئی اور دوسرا نمبر بنی کے حصے میں آیا۔ اس طرح اس پہلی پیشہ ورانہ سرف رائیڈنگ کا اختتام ہوا۔ اتنی بڑی کامیابی کی خوشی ابھی ماند نہ پڑی تھی۔ جب ایک روز لاری کو اس کے محکمے کی جانب سے نوٹس ملا کہ اس کے محکمے کو اب مزید اس کی [illegible] ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ ایک ملک اور قوم دشمن آدمی کو اتنے بڑے حساس ادارے میں ملازم رکھنا بجائے خود ان کی بدنامی ہے۔ اس لیے اسے ملازمت سے آج ہی فارغ کیا جاتا ہے۔

لاری اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔ اس پر الزام ہی اس قدر سنگین تھا کہ اس کی صفائی بھی اس کے لیے ممکن نہ تھی...... چنانچہ وہ ملازمت چھوڑ کر گھر آ گیا اور ایک بار پھر کشتیوں کے ڈیزائن بنانے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

گیس اسٹیشن سے اپنی نئی نویلی کار میں وہ گیس بھروا کر باہر نکلا۔ رات آہستہ آہستہ اپنا تسلط پھیلا رہی تھی۔ جب وہ بڑی تیزی کے ساتھ سڑک پر اپنی گاڑی کو اڑائے چلا جارہا تھا۔ دور دور تک اس کے آگے پیچھے کوئی اور گاڑی نظر نہیں آرہی تھی کہ اچانک کار کی ہیڈ لائٹس میں اسے ایک تنہا شخص کھڑا نظر آیا جو اپنے ہاتھ کے انگوٹھے سے لفٹ لینے کا اشارہ کررہا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کا سفری بیگ رکھا ہوا تھا۔

کار فراٹے بھرتی ہوئی جارہی تھی اور لفٹ مانگنے والے کو کتنا ہی پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ یکایک پوری قوت کے ساتھ بریک لگنے سے کار کے پہیے چرچرائے۔ کار کی بیک لائٹس سے اسے اندازہ ہوا کہ کار کو روک لیا گیا ہے۔

اشارہ کرنے والا شخص اپنا سفری بیگ اٹھا کر بھاگتا ہوا کار تک پہنچا تو ڈرائیور اپنی سیٹ کے ساتھ والا دروازہ پہلے سے کھول کر اس کا انتظار کررہا تھا۔ وہ فوراً کار میں بیٹھا۔ اس نے اپنا بیگ اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ لیا تھا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ڈرائیور نے کوئی بات کیے بغیر کار کو پوری اسپیڈ کے ساتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ کار کے سامنے والے شیشے سے بڑی لائٹس سے روشن سڑک کو دیکھنے لگا جس پر کار بڑی تیزی سے بھاگتی جارہی تھی۔

اسے اپنی زندگی میں تیز رفتاری کبھی بھی پسند نہ رہی تھی۔ جب کار نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''بگانی کاروں میں خیراتی سیاحت کے مزے لوٹ رہے ہو لیفٹیننٹ!'' کار کا ڈرائیور اچانک بولا۔

''مجھے صبح نارتھ لینڈ کے شہر نارفاک میں ڈیوٹی پر حاضر ہونا ہے...... تمہارا شکریہ...... تم نے میرے لیے تکلیف اٹھائی۔'' وہ بولا۔

''اس میں بھی [illegible] کیا بات ہے۔ انسان [illegible] کے کام آتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اس کی طرف [illegible] آنکھوں سے دیکھا۔ کار کے اندر کی ناکافی روشنی میں بھی وہ اس کا چہرہ واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ امریکن کاؤبوائے کی طرح ہیٹ اس کے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھا۔

''کیا تمہیں ڈر نہیں لگا کہ ایک اکیلا شخص رات کی تنہائی اور سناٹے میں کھڑا تم سے لفٹ مانگ رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ایک لمحے کے لیے خوف ضرور محسوس ہوا تھا مگر تمہارے بدن پر نیوی کی وردی اور اس پر لگے ہوئے بیج اور بٹن بھی تو دور سے چمک رہے تھے۔ سر پر رینک کے بیج سے سجی ٹوپی...... میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم کوئی سرکاری آدمی ہو جو نہ جانے کس ایمرجنسی میں یہاں کھڑا کسی سواری کا انتظار کررہا ہے۔'' ڈرائیور نے اپنائیت سے جواب دیا۔

''میرا نام ڈیوڈ ینگ ہے۔ تم مجھے ڈیوڈ کہہ سکتے ہو۔ میں نارفاک میں نیوی کی ڈیوٹی پر جارہا ہوں۔''

''کیا تم پنشن پر تھے لیفٹیننٹ؟''

''نہیں...... میں نے انجینئرنگ کا امتحان دینے کے لیے طویل چھٹیاں لے رکھی تھیں۔ جونہی امتحان سے فارغ ہوا تو اپنی ڈیوٹی دوبارہ جوائن کرنے جارہا ہوں۔'' ڈیوڈ نے بتایا۔

''اتنی رات گئے گھر سے نکلنے پر تمہارے گھر والے تو پریشان ہوئے ہوں گے؟''

''دراصل مجھے ہنگامی بنیادوں پر دوبارہ طلب کرلیا گیا ہے اور پھر میرے اردگرد کوئی بھی ایسا نہیں جو میرے لیے پریشان ہوگا۔'' ڈیوڈ نے وضاحت کی۔

''اوہ...... میں اپنا تعارف کروانا تو بھول ہی گیا۔ میرا نام لارنس ولسن ہے۔ تمہاری طرح میرا بھی ایک چھوٹا نام لاری ہے۔ میں بھی بہت عرصہ پہلے نیوی میں تھا۔ کشتیاں بنانے کا شوق دراصل مجھے بچپن سے ہی تھا۔ میرے اس شوق میں میری ہی ہم عمر ایک قریبی لڑکی بونیٹا ڈیکر جسے ڈیکر بنی...... یا صرف بنی کہہ کر پکارا جاتا تھا شامل تھی۔ بڑی ہی پیاری اور بے انتہا محبت کرنے والی...... تم اسے دیکھو تو خود تم بھی اس کو دیکھ کر اس سے محبت کرنے لگو...... ٹھہرو...... میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔ بونے سے قد کی خوبصورت جسم رکھنے والی بنی......''

یہ کہہ کر اس نے...... دوسرے ہاتھ سے اپنے کوٹ کی جیب سے پرس نکالا۔ اسے کھول کر اس کی جیب سے ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر نکالی۔ بنی بلاشبہ ایک خوبصورت اور [illegible] تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک تو تصویر میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ڈیوڈ نے تصویر دیکھ کر اسے پلٹا...... تو تصویر کی پشت پر سرخی سے جمے ہوئے ہونٹوں کا بوسہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے نیچے لکھا تھا۔

''اپنی محبت اور چاہت کے لیے ترستا ہوا ایک بوسہ لاری کے نام۔''

اور اس تحریر کے نیچے بنی کے نام کے دستخط تھے۔ ڈیوڈ نے تصویر کو کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا۔

''یہ بنی ہے...... ہم بچپن میں کشتی رانی کا اکٹھے لطف اٹھایا کرتے تھے۔ یہی وہ ہے جس نے میری ملازمت چھوٹنے پر بھی میرا ساتھ دیا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اسے اپنی زندگی کا پارٹنر نہیں بنا سکا اور میری شادی الزبتھ سے ہوگئی۔ تمہارے پاس نارفاک تک پہنچنے کے لیے ریل کا کرایہ تو ہوگا؟'' لاری نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''شاید نہیں...... کیونکہ میں نے جو کچھ میرے پاس تھا، وہ جوئے اور شراب میں ختم کر ڈالا ہے۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''اوہ...... یہ تو بہت برا ہوا۔ ٹھہرو...... میں تمہارے لیے کچھ کرتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنے پرس کو دوبارہ کھولا اور

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

اس میں سے دس ڈالر نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ دراصل میں نے یہ رقم الزبتھ کو دینے کے لیے رکھی تھی۔ اب تم لے لو۔'' لاری نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''تم بہت اچھے انسان ہو۔ دوسروں کے کام آنے والے......'' ڈیوڈ نے اس کی تعریف کی۔

''یقیناً تمہیں بھوک بھی لگی ہوگی۔ گیس اسٹیشن کی ٹک شاپ سے... میں نے آلوؤں کے فرنچ فرائز خریدے تھے۔ میں تمہیں دیتا ہوں کیونکہ ابھی کوئی کھانے کی بہتر جگہ آنے میں کافی دیر ہے۔ اتنی دیر تک تم ان سے اپنی بھوک کو مٹانے کی کوشش کرو۔'' یہ کہہ کر لاری نے ڈیش بورڈ پر پڑا لفافہ اس کی طرف بڑھایا جو پہلے سے کھلا ہوا تھا۔

نہ جانے وہ مزے دار تھے یا ڈیوڈ کو بھوک زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ کب ختم ہو گئے ہیں۔ نیند کے ساتھ اب اس کے پپوٹے بھاری ہونے لگے تھے۔ آخری بار اسے دور سے دھندلا سا ایک بورڈ نظر آیا۔ نیند آہستہ آہستہ اس پر غلبہ جما رہی تھی۔ ایک جگہ پر ڈیوڈ نے کہا۔

''یہاں شمال کی طرف چوک کے قریب مجھے اتار دینا۔''

''یہاں سے پھر تم کس طرح آگے جا سکو گے؟ میں نے سوچا کہ میرے دیے ہوئے دس ڈالر تمہیں نارفاک تک نہیں پہنچا سکیں گے اور پھر یہاں سے کوئی سواری بھی تمہیں نہیں ملے گی۔ بہتر ہے کہ میں تمہیں واشنگٹن تک چھوڑ آؤں۔ وہاں سے تم ریل میں بیٹھ کر نارفاک چلے جانا۔'' یہ کہہ کر لاری نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔

ڈیوڈ اپنی آنکھوں پر پورا زور ڈال کر انہیں کھولے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے اور آنکھیں تو جیسے جل رہی تھیں۔ اس نے پوری کوشش کر کے باہر دیکھا۔ باہر راستے کا ادراک دینے والا بورڈ لگا تھا جس پر لکھے ہوئے الفاظ آخری بار اسے نظر آئے۔

''راجرز ٹاؤن میری لینڈ 7000

رفتار 25 میل فی گھنٹا

واشنگٹن......''

پھر اچانک اسے اپنے سر پر کسی گہری چوٹ کا احساس ہوا اور وہ بے ہوشی کی گہرائی میں بہت تیزی کے ساتھ ڈوب گیا۔

☆☆☆

''بہت ہی خطرناک حادثہ تھا، یقیناً تمہیں نئی زندگی ملی ہے جس کی مبارکباد قبول کرو......''

جب گہری غنودگی کے بعد آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں کھلیں اور اس کے حواس نے کام کرنا شروع کیا تو اس نے پہلی آواز یہی سنی تھی۔

اس نے ہلنے کی کوشش کی تو وہی آواز دوبارہ آئی۔

''دیکھو...... ہلنے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ زخموں کے ٹانکے کھل جائیں گے۔''

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم اسپتال میں ہو مسٹر لارنس......'' نرس نے پوچھا۔ ''شاید تمہیں یاد نہیں۔ وہ ایک انتہائی خطرناک حادثہ تھا۔ شاید تمہاری کار کے بریک فیل ہو گئے تھے۔ وہ تو درخت سے ٹکراتے ہوئے تمہاری کار کا دروازہ کھل گیا مگر کار بری طرح چکنا چور ہونے کے بعد آگ پکڑ گئی اور تم انتہائی زخمی حالت میں کار سے دور باہر گر پڑے...... اگر دروازہ نہ کھلتا تو یقیناً تم اس کے اندر ہی جل کر کوئلہ بن گئے ہوتے۔ حادثے کے بعد تمہاری تلاشی کے دوران جو پرس ملا تھا، اس میں لکھے ایک فون نمبر پر اطلاع دے دی گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری منگیتر بھی تمہاری مزاج پرسی کرنے اسپتال آئی تھی۔ تمہیں تو کوئی راہ گیر یہاں چھوڑ گیا تھا۔ تمہارے چہرے پر خاصی چوٹیں آئی ہیں۔ تمہارے چہرے پر جا بجا پٹیاں کی گئی ہیں جن کی وجہ سے تمہاری اصل شناخت تقریباً معدوم ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر پھر بھی تمہاری منگیتر شاید اس نے اپنا نام بی ڈیکر...... یا ڈیکر بی بتایا تھا تمہاری وجہ سے خاصی پریشان تھی۔''

''میری وردی [illegible]''

''شاید [illegible] ہے۔ تمہارے جسم پر کوئی وردی نہ تھی اور نہ ہی کوئی ٹوپی ہمیں ملی۔ البتہ تمہارے ٹاپ کوٹ کی جیب سے جو چیزیں ملی ہیں' ان میں دس ڈالر کا نوٹ تھا۔ تمہارا شناختی کارڈ اور ایڈریس۔ ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر...... اور چند دوسرے کاغذات تھے۔ کہو تو میں ابھی تمہیں لا دیتی ہوں۔ وہ انچارج ڈاکٹر کے پاس محفوظ پڑے ہیں۔ ہم نے اسی تصویر سے اندازہ لگایا تھا کہ آنے والی لڑکی تمہاری منگیتر ہی ہو سکتی ہے۔ وہ واقعی بہت پریشان تھی۔ لو اب تم میڈیسن لے لو......'' اس نے چند گولیاں اس کے منہ میں ڈالیں اور ذرا سا سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ پانی کا گلاس دیا۔ جب وہ گولیاں نگل چکا تو اس کے بازو میں ایک انجکشن لگا کر چلی گئی۔

''تو کیا وہ ڈیوڈ ینگ نہیں...... لارنس ولسن ہے......؟''

یہ اس کے جاگنے کی پہلی اور آخری سوچ تھی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ اگلے دن جب اسے دوبارہ ہوش آیا تو اسے بتایا گیا کہ اس کی ناک کی ہڈی اس حادثے میں ٹوٹ گئی

تھی اور اس کی کھوپڑی پر 25 ٹانکے لگے ہیں۔ پسلی کی ہڈیوں کو بھی شدید نقصان پہنچا ہے۔ اس لیے اسے ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔

ڈاکٹرز بڑی تندہی سے اس کے علاج میں مصروف تھے کہ ایک روز اسے نرس نے بتایا کہ آج ایک اور معزز خاتون اس کا پتا کرنے آئی تھی۔ شاید آج دوپہر کو وہ پھر آئے...... اسے دوپہر کو ہوش آیا تو اس نے سوچا وہ اب تندرست ہوتا جا رہا ہے تو کیوں نہ وہ ڈاکٹر کو اپنی اصل حقیقت بتا دے کہ جسے وہ لارنس ولسن سمجھ رہے ہیں، وہ نہیں ہے بلکہ وہ ڈیوڈ ینگ ہے۔ جب دوپہر کو ڈاکٹر وزٹ پر آیا تو وہ مکمل طور پر ہوش و حواس میں تھا۔

''کیسے ہو لارنس؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''سر! میں لارنس ولسن نہیں ہوں......'' ابھی اس نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ اندر ....آنے والی معزز خاتون...... جو میک اپ کے بغیر بھی خوبصورت نظر آ رہی تھی...... اس نے ڈیوڈ کی بات کاٹتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

''ڈاکٹر! لگتا ہے، ابھی دماغی چوٹ ٹھیک نہیں ہوئی۔ شاید یہ اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہے۔''

''ہوں...... میرا بھی یہی خیال ہے مگر جس قدر [illegible] ان کی صحت بحال ہوتی رہی تو انہیں آپ گھر لے جائیں۔ مگر آپ کون ہیں...... اور ان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟''

''میں ان کی بیوی الزبتھ ہوں، کیوں لاری؟'' اس نے لاری کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تو لاری نے بھی جواب میں سر کو ہلا دیا۔ ''مجھے اس حادثے کی خبر دیر سے ملی...... میں اس کے بے ہوش ہونے والے لمحات میں بھی آئی تھی مگر آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میں اتنی شاندار شخصیت کی ملاقات سے محروم رہا۔'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ انہیں لے جانا چاہیں تو میں آج ہی انہیں چھٹی دے دیتا ہوں۔ ان کے چہرے کے زخم بھی آہستہ آہستہ مندمل ہونے لگے ہیں۔ دو چار دن میں ان کے چہرے کی پٹیاں اتار دی جائیں گی۔''

''تو ٹھیک ہے۔ ہم انہیں گھر ہی شفٹ کر لیتے ہیں۔ کیوں لاری...... گھر پر تم اسپتال سے بہتر محسوس نہ کرو گے؟'' لزی نے پوچھا۔

''جیسے تمہاری مرضی!'' لاری نے جواب دیا۔

''گڈ...... تو ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر آپ اسے فارغ کر دیں۔'' لزی نے کہا۔

ڈاکٹر یہ سن کر چلا گیا اور کچھ دیر بعد اسپتال کے واجبات کی ادائیگی کر دی گئی۔ اس حادثے کے وقت ملنے والے کاغذات بھی اسے دے دیے گئے۔ جن میں اس کا شناختی کارڈ...... بی کی تصویر، دوسرے کاغذات کے علاوہ ایک کاغذ ایسا بھی تھا جس پر بڑے عجیب و غریب علامتی انداز میں کچھ فقرے لکھے ہوئے تھے۔ لاری کا وہی ٹاپ کوٹ...... اور دوسری چیزیں جب اس کے حوالے کی گئیں تو اسے یقین ہو گیا کہ اب شاید اسے کبھی بھی ڈیوڈ کی شناخت نہ ملے اور بقیہ ساری زندگی اسے لارنس بن کر گزارنی پڑے۔

لزی کے گھر کی زمینی منزل پر اس کا بستر لگا دیا گیا تھا جس کی کھڑکی باہر گھنے درختوں کی جانب کھلتی تھی۔ ان درختوں سے پرے دریا کا ساحل موجود تھا جس کی لہروں کا شور اسے کبھی کبھی اندر ہی سنائی دیتا تھا۔

''خدا کا شکر ہے لاری کہ تم زندہ سلامت گھر لوٹ آئے ہو۔'' لزی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یقین کرو۔ جب میں نے حادثے کے فوراً بعد تمہیں دیکھا تھا تو تم انتہائی نگہداشت کے کمرے میں پڑے تھے اور ڈاکٹرز زخموں کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ اس وقت کی تمہاری حالت دیکھ کر تو میں تمہاری زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ تمہیں نئی زندگی ملی ہے۔''

اس کا جی چاہا کہ وہ اس کو بتا دے کہ وہ لاری نہیں ڈیوڈ ہے۔ آخر یہ لوگ سمجھ کیوں نہیں جاتے۔ خود بھی اندھیرے میں رہنے کو ترجیح دے رہے ہیں اور مجھے بھی عجیب مخمصے میں ڈال رکھا ہے۔ اس کی آواز...... اس کے چہرے کے نقوش...... سب ہی تو لارنس سے مختلف ہیں۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ لزی نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے لیے سوپ منگواتی ہوں......''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم میرے پاس بیٹھو۔ میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔'' ڈیوڈ نے آہستگی سے کہا۔

''لیکن ٹھہرو...... میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر اٹھ گئی۔ ڈیوڈ کے چہرے کے زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو چکے تھے اور ان پر کی گئی پٹیاں بھی اتار لی گئی تھیں۔ اس طرح چہرے کا ایک بڑا حصہ نمایاں اور واضح ہو گیا تھا۔ ٹانگوں پر چڑھایا ہوا پلاستر بھی اتارا جا چکا تھا۔ گو ابھی وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوا

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

تھا لیکن پھر بھی آہستہ آہستہ سہارا لے کر چل سکتا تھا۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ وہ ان لوگوں سے جان چھڑا لے جو اسے کسی صورت ڈیوڈ ماننے کو تیار نہ تھے۔ ابھی وہ یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ باہر ایک کار رکنے کی آواز آئی۔ لزی نے اس آواز کو سنتے ہی فوراً باہر کا دروازہ کھولا۔ تھوڑی دیر بعد ہی کسی عورت کی اونچی آواز میں گفتگو اسے سنائی دینے لگی۔

''میں کہتی ہوں منحوس عورت میرا راستہ چھوڑ دو۔ میں اپنے لاری کو دیکھنے آئی ہوں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اب اس کی طبیعت کیسی ہے۔ ہٹو ایک طرف......'' آنے والی اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

''وہ اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ ابھی ابھی ڈاکٹر اسے غنودگی کا انجکشن دے کر گیا ہے اور وہ اب سو رہا ہے۔ میری بات کا یقین کرو...... وہ بہت بہتر ہے اور تیزی سے صحت یاب ہو رہا ہے۔'' لزی کے لہجے میں نرمی اور معذرت تھی۔

''ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔ مگر آئندہ جب آئی تو اس سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔ وہ اٹھے تو اسے بتا دینا بنی آئی تھی۔''

اس کے جانے کے بعد باہر کا دروازہ پھر سے بند ہونے کی آواز آئی اور ساتھ ہی کار اسٹارٹ ہو گئی۔

''اُف...... یہ بلا تو لگتا ہے، میری جان لے کر ہی میرا پیچھا چھوڑے گی۔'' لزی دوبارہ اس کے قریب آ کر بولی۔

''کون تھی؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''وہی تمہاری چہیتی لاری...... نک چڑھی بولی...... بنی...... میری زندگی تو عذاب بن گئی ہے۔ اگر تم اس کو چاہتے تھے تو پھر اس کے ساتھ شادی کر لی ہوتی۔ مجھے کیوں عذاب میں ڈال دیا۔''

''بیٹھو...... میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں...... رات میں بڑی گہری نیند سویا ہوا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرے چہرے پر جھکا ہوا ہے۔ اس کی تیز سانسوں کی حدت میں اپنے چہرے پر بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ فوراً میری آنکھیں کھلیں تو دیکھا، ایک آدمی میرے چہرے پر جھکا ہوا ہے اور اس کے دونوں ہاتھ میرا گلا دبوچنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ میں نے چیخنا چاہا اور جلدی سے کسمسا کر کروٹ بدلی تو وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کھلی کھڑکی سے باہر کود گیا۔''

''کون تھا وہ......؟'' لزی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں نہیں جانتا...... لیکن میں جب سے یہاں لایا گیا ہوں، ہر روز رات کو کوئی شخص میرے اردگرد چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے وہ اس مکان کی حفاظت کرنے کے لیے چکر کاٹتا ہے یا پھر وہ مجھے قتل کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں ہے۔'' ڈیوڈ نے آہستہ آہستہ کہا۔

''ارے نہیں لاری...... یہاں ایسا کوئی نہیں ہے جو تمہارا دشمن ہو اور تمہاری جان لینا چاہتا ہو۔ یہ صرف تمہارا وہم ہے۔'' لزی نے دلار سے اس کی بات رد کر دی۔

''ایک اور بات جو میں کتنے دنوں سے تمہیں کہنا چاہتا تھا۔ وہ یہ کہ کیا تمہیں یہ بات محسوس نہیں ہو رہی...... میری آواز، میرے چہرے کے نقوش لاری سے نہیں ملتے...... اب تو میرے چہرے کی خاصی پٹیاں بھی اتر چکی ہیں اور میرے خدوخال بھی واضح ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی تم لوگوں کو مجھ پر لاری کا گمان ہو رہا ہے۔'' ڈیوڈ نے بالآخر اپنی بات کہہ ہی ڈالی۔ کچھ دیر کے توقف بعد وہ بولی۔

''ہاں...... میں جانتی ہوں کہ تم لاری نہیں ہو...... ڈیوڈ ینگ ہو...... مگر پھر بھی میں تمہیں لاری ہی کہہ کر پکارتی رہی ہوں اور تمہارے لباس سے جو چیزیں ملی ہیں، ان کے حساب سے بھی تم لاری ہی ہو۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں کوئی دوسرا شخص جان کر لاری کے قتل کا الزام مجھ پر لگ جائے اور اس کی چھان بین کا الگ سے عذاب جھیلوں......'' لزی نے آہستگی سے بتایا۔

''تو کیا لاری [illegible] ہے [illegible]'' ڈیوڈ نے [illegible] سے پوچھا۔

''ہاں، وہ بھی یہی کہتا ہے کہ لاری کو قتل کرنے میں میرا بھی ہاتھ ہے۔'' لزی نرمی سے بولی۔ آواز اس کے حلق سے پھنس پھنس کر نکل رہی تھی۔

''وہ کون؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''ہے ایک بوڑھا کھڑوس......'' لزی نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''کمال ہے...... یہاں ہر شخص الجھا ہوا ہے۔'' ڈیوڈ نے حیرانی سے کہا۔

''تمہیں آہستہ آہستہ پتا چل جائے گا۔'' لزی نے بتایا اور اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔

☆☆☆

اس سے اگلی رات وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی تو اسے لگا جیسے کوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہو۔ اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کوئی اس کے قتل کا منصوبہ بنا رہا ہو۔ وہ آہستگی سے اپنے بستر کو چھوڑ کر اس طرف بڑھا۔ آوازیں لزی کے کمرے سے آ رہی تھیں۔ لگ رہا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے کسی بات پر اس کا لزی کے ساتھ جھگڑا ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اور آگے بڑھتا، کسی چیز سے اس کی ٹھوکر لگنے سے آواز پیدا ہوئی تو وہ شخص فوراً لزی کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر فرار ہو گیا۔

اسی دوپہر جب لزی اس کے کمرے میں آئی تو وہ ٹکٹکی باندھے لیٹا ہوا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ آج وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ آتے ہی بڑے پیار سے بولی۔

''تمہارے چہرے کے نقوش کتنے خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا ہے، انہیں چوم لوں۔''

''تمہیں روکا کس نے ہے۔ تنہائی بھی ہے۔'' ڈیوڈ نے ہنس کر کہا۔

اس پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

''اچھا یہ بتاؤ...... رات لاری آیا تھا۔'' ڈیوڈ بولا۔

''نہیں تو...... وہ بھلا کیسے آ سکتا ہے؟'' لزی نے جواب دیا۔

''تم کہتی ہو کہ تم نے خود اسے اپنے ہاتھوں قتل کیا ہے مگر مجھے شک ہے کہ وہ لاری ہی ہے جو راتوں کو گھومتا پھرتا ہے اور مجھے ایک بار پھر قتل کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا ہے اگر وہ لاری نہیں تھا تو رات تمہارے کمرے میں تم سے کون ملنے آیا تھا؟'' ڈیوڈ نے قدرے غصے سے پوچھا۔

''وہی [illegible] آواز [illegible] قد کا [illegible] مجھے یقین [illegible] تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تمہارا اندازہ ہے کہ [illegible] ہے جبکہ میرا یقین ہے کہ وہ زندہ ہے اور راتوں کو وہی اس مکان کے اردگرد چکر لگاتا ہے۔'' ڈیوڈ نے توقف کے بعد بھی اپنی گفتگو جاری رکھی۔

''میں جانتی ہوں تمہیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے اور یہ غلط فہمی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک تمہیں سارے واقعے کا علم نہ ہو...... تو سنو ڈیوڈ...... لاری سے میری شادی ہوئی۔ میں اس کے کردار سے واقف نہ تھی۔ شادی کے فوراً بعد مجھے پتا چلا کہ وہ ایک انتہائی عیاش اور ہرجائی قسم کا شخص ہے۔ اس کے کئی لڑکیوں سے معاشقے تھے اور ڈینگیں مارنا اس کی عادت میں شامل تھا۔ اس کے جاننے والے اسے پلے بوائے کہتے تھے۔ بنی بھی اس کی داشتاؤں میں شامل تھی۔ میں جب اسے منع کرتی تو آگے سے وہ ہمیشہ جواب دیتا کہ تم کونسا پاک صاف لڑکی ہو۔ ان باتوں کے علاوہ مجھے بلیک میل بھی کرتا تھا۔ میں اس کی ان حرکتوں سے اتنی تنگ آ چکی تھی کہ کئی بار میں سوچتی تھی کہ اسے خود اپنے ہاتھوں قتل کر دوں...... مگر رسوائی کے خوف سے خاموش رہتی......

''بنی کے ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی ملاقاتیں اور مراسم مجھے بے حد کھٹکتے تھے کیونکہ بنی تو بذات خود ایک فاحشہ تھی۔ میں نے اپنی ایک بہترین دوست سے مشورہ کیا تو اس نے بھی میری سوچ کے مطابق مجھے ایک نئی راہ سجھائی کہ اگر میں واقعی لاری سے جان چھڑانا چاہتی ہوں تو اسے کرائے کے قاتلوں سے مروا دوں...... اس کے بتائے ہوئے نمبر پر میں نے کال کی تو میرا وہاں باب ہنشا نامی شخص سے رابطہ ہوا جس نے مجھے ملاقات کا وقت دیا۔

''باب ہنشا تقریباً 65...... سال کا لیکن گٹھے ہوئے جسم کا مالک ہے۔ جو اگر اپنی عمر نہ بتائے تو بمشکل 40 یا 45 سال کا لگتا ہے۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو اس نے ایک بھاری معاوضے کا مطالبہ کرتے ہوئے یہ کام کرنے کی ہامی بھر لی۔ میں نے اس کی مطلوبہ آدھی رقم فوری ادا کر دی اور آدھی کام کے بعد کر دینے کا وعدہ کر لیا۔ لاری کی تصویر بھی اسے دے دی اور اس کے ٹائمنگ شیڈول سے بھی آگاہ کر دیا۔

''ہمارے درمیان یہ بات طے تھی۔ جب لاری اپنی ایک نئی داشتہ کو لے کر گھر آیا، میں نے تمہیں شاید یہ نہیں بتایا کہ وہ نہ صرف اپنے ذاتی کردار میں عیاش تھا بلکہ ملکی معاملات میں وطن دشمن بھی تھا۔ بے شمار ایسے لوگوں سے اس [illegible] رہتا تھا جو ملک دشمن سرگرمیوں میں پیش پیش ہیں۔ [illegible] پر اسے ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق اس کی مخبری بھی بنی نے کی تھی اور اسی کی رپورٹ پر اسے اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ تم نے بھی تو وہ کاغذ دیکھا تھا اور اس بارے پوچھا بھی تھا۔'' لزی نے اس سے دریافت کیا۔

''ہاں، مجھے بھی یاد آ گیا۔ وہ کاغذ لاری کے پرس میں اب بھی موجود ہے۔'' ڈیوڈ نے بتایا۔

''ایسی کتنی ہی مسافر بردار کشتیاں تخریبی سرگرمیوں میں ملوث رہی ہیں۔ جب مجھے لاری کی ان مذموم حرکات کا علم ہوا تو میں نے فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن کو اطلاع بھی دی مگر ان کی طرف سے اس پر ہاتھ نہ ڈالا گیا پھر تو مجھے لاری سے اور بھی نفرت ہو گئی۔ ایک ایسا مرد جو اپنے سے کہیں کم عمر کی عورت کو انتہائی حدوں تک چاہنے کے بعد اسے قتل کی طرف راغب کرنے کے لیے استعمال کرے، وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کس طرح وفاداری کر سکتا ہے۔

''طے شدہ پروگرام کے مطابق باب ہنشا نے مکان سے نکلتے ہی لاری کو گولی مار کر قتل کر دینا تھا۔ جس رات وہ اپنی

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

داشتہ کو لے کر گھر آیا۔ میں اسے دیکھتے ہی سیخ پا ہوگئی تھی اور وحشت زدہ ہوکر اس پر جھپٹی تو وہ چیختے ہوئے باہر کو دوڑی۔ میں نے واپس مڑ کر اپنے سرہانے سے پستول اٹھایا اور لاری پر فائر کردیا۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس نے جھکائی دے کر خود کو بچالیا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہونے کے بجائے اس کے بازو میں لگی تو وہ بھی ہڑبڑا کر باہر کو بھاگا۔ باہر اس کی بدقسمتی کہہ لیں ہنشا ابھی ابھی وہاں پہنچا تھا۔ جس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اس پر گولی چلادی اور لاری وہیں پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کی داشتہ بچ نکلی۔

"لاری قتل تو ہوگیا تھا مگر اب اس کی لاش کا مسئلہ تھا۔ ہنشا اسے قتل کرنے کے بعد گھر میں داخل ہوا اور مجھ سے اپنے معاوضے کا تقاضا کرنے لگا۔

"معاوضہ تو تمہیں مل جائے گا مگر اس لاش کو بھی ٹھکانے لگانے کا مسئلہ ہے۔" میں نے اس کو یاد دلایا۔

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے لزی ڈارلنگ۔ ہمارا معاملہ صرف قتل تک کا تھا۔ لاش کو ٹھکانے لگانا اس میں شامل نہیں تھا......" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر میں اب اکیلی اس سے کس طرح نمٹوں گی؟" میں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"اگر ایسا ہے تو اس کے لیے الگ سے معاوضہ طے کرلیتے ہیں۔" باب ہنشا مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ ایک بار پھر نیا معاہدہ ہوا جس کے تحت مجھے لاری کی لاش کو ٹھکانے لگوانا پڑا۔ باب ہنشا نے فون کے ذریعے اپنے دوسرے ساتھی کو بلایا۔ دونوں نے مل کر شپ یارڈ میں کھڑی لانچوں اور کشتیوں کو باندھنے والی ایک موٹے لوہے کی زنجیر کو کاٹا...... جو کہ خاصی وزنی تھی پھر اسے لاکر لاری کی لاش کے گرد لپیٹا اور اسے سمندر میں گہری جگہ لے جاکر پھینک دیا۔ یہ سب میری آنکھوں کے سامنے اور میرے ایما پر ہوا تھا۔ پھر میں کیسے یقین کرلوں کہ لاری ابھی زندہ ہے؟" لزی نے تفصیل سے بتایا۔

"لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ سب جعل سازی پر مبنی ہو۔ لاری دراصل قتل نہ ہوا ہو، محض زخمی ہوا ہو...... اور تندرست ہوکر تمہارے اردگرد راتوں کو محض اس لیے پہرا دینے لگا ہو کہ وہ تمہارے ہرجائی پن کو ثابت کرکے تم سے کوئی اور گھناؤنا کام لے سکے اور کچھ نہ ہو تو وہ قدم قدم پر تمہیں بلیک میل کرکے ہراساں تو کرسکتا ہے۔ مجھے لاری کے زندہ ہونے کا یقین اس لیے ہے کہ میں نے جو آواز سنی تھی، اس سے مشابہ آواز میں تمہارے کمرے میں کسی کی سن چکا ہوں۔

کوئی تو ایسا ہے جو راتوں کو گھوم پھر کر اس موقعے کی تلاش میں ہے کہ وہ مجھے قتل کرسکے۔ میری سماعت اس کی آواز آشنا ہے۔" ڈیوڈ بولا۔

"باب ہنشا اپنے پیشے سے بے وفا نہیں ہوسکتا۔ وہ اصولوں کا پکا آدمی ہے۔"

☆☆☆

"اگر پولیس کو علم ہوجائے کہ لاری کا قتل ہوچکا ہے اور اس کو اس کی چہیتی بیوی نے قتل کیا ہے تو کیا ہو......"

ایک روز لزی کو ایک کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف سے کال کرنے والے نے چھوٹتے ہی یہ سوال کیا تو لزی پورے جی جان سے کانپ گئی۔

"تم...... کون ہو...... اور کیسے یہ کہہ سکتے ہو؟" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں کوئی بھی ہوں، ایک وعدہ معاف گواہ بھی ہوسکتا ہوں۔" دوبارہ کہا گیا۔

"مگر لاری کو میں نے قتل نہیں کیا۔" وہ دوبارہ بولی۔

"تم اس میں برابر کی شریک تو ہو...... گولی تمہارے پستول سے بھی چلائی گئی تھی۔ کیا ہوا وہ قتل نہیں صرف لاری کو زخمی ہی کر پائی تھی...... لیکن اسی رات وہ قتل تو ہوگیا۔ ممکن ہے پہلی گولی کے بعد دوسری گولی جان لیوا ثابت ہوئی ہو......" اس نے لہجے کو سخت بناتے ہوئے کہا۔

"[illegible]"

"[illegible] ضرورت نہیں کہ جب تم میری ہوجاؤ گی تو دولت بھی میری ہوجائے گی۔ میں تمہارا چاہنے والا باب ہنشا ہوں...... ایک اجرتی قاتل...... جو لاری کے قتل میں تمہارا شریک کار تھا۔" ہنشا نے دھیمے انداز میں کہا۔

لاری کے بعد لزی بھی تنہائی کا شکار ہوگئی تھی۔ اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی باب کی بلیک میلنگ کا شکار ہوتی چلی گئی۔ وہ جب بھی لزی کے پاس آتا، کسی نہ کسی طریقے سے اپنا مقصد پورا کرکے ہی جاتا۔

"تمہارا ماضی بڑا شاندار رہا ہے۔" ایک روز باب نے کہا۔ "میں تمہارے ایک ایک معاشقے کو جانتا ہوں۔ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر تم بھی کیا خوب شکار کرتی رہی ہو مگر کسی سے بھی تم نے وفا نہیں کی۔ البتہ لاری سے شادی کے بعد تمہاری زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آگیا تھا لیکن وہ بھی کتنی دیر...... تم نے عادت سے مجبور ہوکر اسے بھی میرے ذریعے ٹھکانے لگوادیا۔" باب نے اسے تنگ کرنے کے لیے کہا۔

"مگر یہی تمہاری غلط فہمی ہے۔ لارنس ابھی زندہ ہے۔" لزی نے مضبوط لہجے میں بتایا۔

"کون کہتا ہے؟ اسے میں نے خود بھاری آہنی زنجیر باندھ کر پانی میں گرایا تھا۔" باب نے متفکر لہجے میں جواب دیا۔ "وہ زندہ ہو...... یا نہ ہو...... اب مجھے اس سے غرض نہیں۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم میری داشتہ بننا پسند کرو گی یا مجھ سے شادی کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں نے ابھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔" لزی نے جواب دیا۔ وہ دوبارہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ "دیکھو...... اب فون بند کرو۔ مجھے ابھی جاکر یہ دیکھنا ہے کہ لارنس کہیں جاگ تو نہیں گیا۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ تم کہتی ہو لارنس زندہ ہے اور زندہ لارنس اپنے گھر کے کمرے میں پٹیوں میں جکڑا پڑا ہے لیکن میرا یقین ہے کہ وہ مرچکا ہے۔ بہرحال، یہ تمہارا معاملہ ہے۔ میرا مسئلہ صرف اور صرف تمہارا حصول ہے۔" یہ کہہ کر باب نے فون بند کردیا۔

وہ تیزی سے ڈیوڈ کے کمرے میں آئی تو وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ وہ اس کے نزدیک ہوتے ہوئے بولی۔ "دیکھو ڈیوڈ! میں ذرا مارکیٹ تک جارہی ہوں۔ اکیلے میں گھبرانا نہیں......" یہ کہہ کر وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اس وقت [illegible] کا چہرہ پٹیوں سے آزاد تھا۔ [illegible] کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئیں تو اس نے دیکھا۔ کونے پر موجود جھاڑیوں میں سے ایک آدمی نکلا۔ اس نے چند کنکر اٹھائے اور کھڑکی کی طرف اچھال دیے۔ کھڑکی سے کنکر ٹکرانے کی آواز آئی تو ڈیوڈ پوری قوت سے چلایا۔

"لارنس! میں تمہیں پہچان چکا ہوں۔ چھپنے کی کوشش مت کرو، سامنے آؤ......" ڈیوڈ کھڑکی کے پاس کھڑا اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ اس شخص نے ٹاپ کوٹ اور ہیٹ پہن رکھا تھا اور ہیٹ کو اپنے چہرے پر اس طرح ترچھا کر رکھا تھا جیسے پہچانے جانے کا ڈر ہو۔ ڈیوڈ کو یہی لگا جیسے یہ وہی آدمی ہو جس کے متعلق اسے بتایا گیا ہے کہ وہ مرچکا ہے۔

ڈیوڈ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول سے فائر کیا تو وہ شخص فوراً بھاگ گیا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا انتظار کرتا رہا پھر دوبارہ کمرے میں واپس آگیا۔ وہ باورچی خانے میں چلا گیا۔ اسے اب لزی کی یاد ستا رہی تھی۔ اس نے فریج...... کھولا تو اس میں انڈے پڑے تھے۔ وہ انڈے نکال کر ابھی

پھینٹ ہی رہا تھا کہ اسے باہر کار رکنے کی آواز سنائی دی جو اس کے مکان کے عین سامنے آکر رکی تھی۔

کچھ دیر بعد اسے پیچھے سے آواز سنائی دی۔ "اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

آواز پہچان کر وہ پیچھے مڑا تو اس نے دیکھا بونیٹا ڈیکر اس کے پیچھے اعشاریہ دو دو کا آٹومیٹک پستول لیے کھڑی تھی۔ اس نے نیلی اور سفید دھاری والی جرسی، ہلکے نیلے رنگ کی جینز کی پتلون اور سر پر سفید پی کیپ پہن رکھی تھی۔ پستول پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کا استعمال بھی جانتی ہے۔

"یہ آٹومیٹک ٹارگٹ پستول ہے جو ایک انچ سے لے کر پچیس گز تک مار کرسکتا ہے۔" اس کے چہرے کو دیکھ کر وہ بولی۔ "تو تم نے پٹیاں اتار پھینکی ہیں۔ واؤ...... کس قدر خوبصورت چہرہ ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو......"

ڈیوڈ ڈرے ڈرے انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ ڈیوڈ اب اپنے آپ پر قابو پاچکا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے تفریحی انداز میں واپس باورچی خانے کی طرف مڑا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بھی اس کے پیچھے خودبخود چلی آئے گی اور ہوا بھی یہی...... وہ آہستگی سے باورچی خانے کے دروازے کو دھکیلتے ہوئے بولی۔

"بہت نڈر بنتے ہو!"

"میں جانتا ہوں جب تک میں تم پر حملہ نہیں کروں گا، تم مجھ پر ہرگز گولی نہیں چلاؤ گی۔ اس لیے کہ تم یہاں قتل کرنے نہیں، ولسن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آئی ہو۔ تم ابھی تک یقین اور بے یقینی کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہو۔" ڈیوڈ بولا۔

"میں جلد ہی ساری معلومات حاصل کرلوں گی۔ صرف مجھے اتنا یقین ہوجائے کہ لاری......" اس نے اپنی زبان روک لی۔

"تمہیں شاید اس میں کافی زحمت اٹھانا پڑے۔ اس لیے میں خود ہی بتائے دیتا ہوں۔ میرا نام لیفٹیننٹ ڈیوڈ ینگ ہے۔ میں ریاست کے ریزرو بحری اسٹاف میں سے ہوں اور میرا سیریل نمبر 210934 ہے۔ مجھے ڈیوٹی پر حاضر ہونے میں چند دن کی تاخیر ہوگئی ہے جو میرے خیال میں نیوی کے قوانین کے تحت فرار نہیں تاخیر ہی سمجھی جائے گی۔" اس نے بتایا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ "آج صبح تمہارے پاس پستول تھا۔ وہ اب کہاں ہے؟"

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

''وہ تمہارے دائیں ہاتھ کی میز کی دراز میں رکھا ہے۔'' بنی نے آگے بڑھ کر پستول نکال لیا اور دوبارہ بولی۔

''الزبتھ کہاں ہے......؟''

''وہ مارکیٹ کا کہہ کر گئی ہے۔'' ڈیوڈ نے بتایا۔

''مجھے لگتا ہے، وہ تمہیں چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔''

''نہیں وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ میں اسے کافی حد تک جان چکا ہوں۔'' ڈیوڈ بولا۔

''مجھے یہ علم ہوا ہے کہ لارنس ولسن کے قتل میں تم بھی شریک ہو۔'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تو کیا لاری قتل ہو چکا ہے؟ اگر ایسا ہے، تو وہ یقیناً اس کا بھوت ہوگا جس نے آدھ گھنٹا پہلے الزبتھ کے کمرے کی کھڑکی پر پتھر پھینکے تھے۔''

''تم نے اسے دیکھا ہے؟'' بونیٹا نے پوچھا۔

''ہاں......'' ڈیوڈ نے جواب دیا تو وہ چپ کھڑی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

''تمہیں یقین نہیں آتا کہ وہ یہاں آیا تھا تو پھر وہ قتل کیسے ہو گیا؟ کیا تم مفروضہ قائم کیے بیٹھی ہو کہ اسے کہیں اور قتل کیا گیا ہے؟''

''شپ یارڈ میں کھڑی لانچوں اور کشتیوں میں سے ایک کشتی کی زنجیر غائب ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو اسے چھپنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے کون سا جرم کیا ہے۔'' وہ بولی۔

''نیوی کے محکمے نے جب [illegible] تو ان کا خیال نہیں تھا کہ وہ بے قصور [illegible] نیوی کا محکمہ کسی ایسے شخص کو کوئی اہم عہدہ نہیں دے سکتا۔ جس کے متعلق یہ شبہ ہو کہ وہ تخریب کاروں سے ملا ہوا ہے۔'' ڈیوڈ نے تفصیلاً بتایا۔

''وہ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ چلائی۔

''میں اسے نرم دل نہیں سمجھتا۔ اگر نرم دل سمجھوں تو ان زخموں کا کیا کروں جو اس نے میرے چہرے پر لگائے۔ مجھے پتا ہے کہ تمہیں میری بات کا یقین نہیں آئے گا مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ ولسن اور الزبتھ میں ناچاقی ہوئی تو الزبتھ نے اسے گولی مار دی۔'' ڈیوڈ بتاتے بتاتے جب ذرا خاموش ہوا تو وہ بولی۔

''کیا واقعی اسے الزبتھ نے گولی ماری تھی؟''

''ہاں...... جب باب اسے ڈبونے کے لیے سمندر کی جانب لے گیا تو ولسن کو ہوش آ گیا کیونکہ الزبتھ کی گولی نے اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے ڈرا دھمکا کر باب کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے بچ جانے کا کسی سے ذکر نہیں کرے گا۔ ولسن کے بدن پر میری وردی تھی۔ بچ جانے کی صورت میں اس نے وردی کو جلا دیا تھا۔'' ڈیوڈ نے مزید بتایا۔

''مجھے تمہاری اس کہانی پر یقین نہیں آتا۔'' بونیٹا بولی۔

''وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اسے پتا تھا کہ تم اس کی مذموم کارروائیوں میں اس کی حصے دار نہیں بنو گی۔ اس لیے وہ سیدھا الزبتھ کے پاس آیا۔ اگرچہ اسے پرانی واقفیت کی بنا پر تم پر اعتبار کرنا چاہیے تھا۔ الزبتھ سے اس کی ناچاقی کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اسے سازشی اور غداری کے کاموں میں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہی ان کے درمیان وجہ تنازعہ بنی...... ایک بات پوچھوں؟'' اس نے توقف کے بعد کہا۔

''ہاں پوچھو......''

''تم ولسن کے لیے اس قدر پریشان کیوں رہتی ہو......؟''

''اس لیے کہ وہ بہت اچھا دوست ہے۔ میرا باپ جب جنگ میں مارا گیا تو اس نے مجھے ہر موقع پر سہارا دیا۔ اس نے ہر لمحہ میرا دل بہلایا۔ اس نے تو میری کم سنی کا فائدہ بھی نہیں اٹھایا۔ اس نے بڑے خوبصورت طریقے سے مجھے سمجھایا کہ عمر کے لحاظ سے ہم دونوں کا جوڑ غیر موزوں اور غلط رہے گا۔ حالانکہ میں نے اپنی کم سنی کی وجہ سے اسے غلط رنگ دینے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ تو اتنا نرم دل تھا کہ مظلوم، بے چاری اور بے سہارا الزبتھ کے ساتھ شادی کر لی، جس کے بارے میں اسے بعد [illegible] [illegible] میرے ساتھ شپ یارڈ کی طرف۔ میں تمہیں دکھاؤں...... وہ کشتی جس کی زنجیر کاٹی گئی تھی۔''

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جب شپ یارڈ پہنچے تو دو آدمی پہلے سے وہاں ان کی گھات میں بیٹھے تھے۔ دونوں نے اچانک حملہ کر کے انہیں قابو کر لیا۔ ایک قد آور شخص نے ریوالور سے ان دونوں کو ایک کشتی کے کیبن میں جانے کا اشارہ کیا۔

جب وہ کیبن میں داخل ہوئے تو وہاں دو آدمی اور بھی تھے۔ الزبتھ دیوار کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ ڈیوڈ کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سارا لباس کیچڑ سے لتھڑا ہوا تھا۔ اس کا پھٹا ہوا سوئٹر ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہوگی۔ الزبتھ کے سوجے ہوئے منہ پر جابجا خراشیں ابھری ہوئی تھیں۔

''ڈیوڈ...... پیارے ڈیوڈ...... مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ نہ کر سکی۔'' الزبتھ یہ کہہ کر ڈیوڈ کے بازوؤں میں آ گری۔

ڈیوڈ کو اس کے اظہارِ افسوس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ وہ اس وقت ایک شخص کو لڑکی کے پیچھے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس شخص نے ہلکا ٹاپ کوٹ اور ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اس شخص نے ریوالور سے ڈیوڈ کا نشانہ لیتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنا ہیٹ یوں اتارا جیسے وہ اپنی شناخت کو ڈیوڈ کے لیے آسان بنا رہا ہو اور بتانے جا رہا ہو کہ وہ ولسن نہیں ہے۔ اس کی اس حرکت نے اس کے گنجے سر کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ اسے دیکھ کر الزبتھ چیخ اٹھی......

''بوڑھے یہ تم ہو......''

''میں اس کشتی پر لیفٹیننٹ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔'' باب نے اپنی کامیابی کے تاثرات میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

الزبتھ کہے جا رہی تھی۔ ''میں کچھ نہ کر سکی۔ اس نے مجھے مارا پیٹا، باندھ کر رکھا اور سب کچھ بتانے پر مجبور کر دیا کہ تم کہاں ہو۔''

باب نے اپنے آدمیوں کو احکامات دیے، اتنے میں بونیٹا نے سرگوشی میں ڈیوڈ سے کہا۔

''تم تو کہتے تھے کہ لاری زندہ ہے۔''

ابھی ڈیوڈ نے کوئی جواب نہ دیا تھا اور وہ اپنی غلط فہمی پر گم تھا کہ باب نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔

''مس ڈیکر! میں ہی لاری ہوں۔ میرے سوا لیفٹیننٹ [illegible] تھا، اس کی اشیا کا استعمال کر رہا تھا اور جس نے لارنس ولسن کے طور پر اپنے آپ کو متعارف کروایا، اسے شروع سے لے کر آخر تک لارنس ولسن ہی سمجھا گیا۔ یہ مجھے لاری کے روپ میں دیکھ کر لاری ہی سمجھتا رہا۔

''یہ انسانی فطرت ہے کہ ایک خوف جو انسانی ذہن میں گھر کر لیتا ہے تو پھر اس کے ہیولے اس کے اردگرد ناچتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جب بھی کسی کو ٹاپ کوٹ اور ہیٹ پہنے ہوئے دیکھتا، اس کے ذہن میں فوراً لاری کا دھیان آ جاتا۔ وہی لاری...... جس نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

''میں اسی رات گھر کے باہر اندھیرے میں الزبتھ سے ملاقات کا انتظار کر رہا تھا۔ دروازے پر اچانک ڈیوڈ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہچانے جانے کے خوف سے میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ پر گولی چلا دی۔ پھر یہ جان کر مجھے اطمینان ہوا کہ ڈیوڈ نے مجھے لارنس ولسن سمجھا ہے۔ چنانچہ میں نے اس غلط فہمی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تا کہ ڈیوڈ سمجھے کہ ان تمام مصیبتوں کے پیچھے لارنس ولسن کا ہاتھ ہے۔''

''تم تو کہہ رہے تھے کہ تم لاری کی گاڑی چلا رہے تھے تو پھر لاری کہاں ہے؟'' بونیٹا چند لمحے اپنے ہونٹوں کو چباتی رہی پھر بولی۔

''لاری وہیں ہے۔ جہاں اس شام اسے دریا کی تہ میں اتارا گیا تھا۔ اسے بھاری بھرکم زنجیروں میں باندھ کر مردہ حالت میں پانی میں اتارا گیا تھا تا کہ وہ دوبارہ پانی کی سطح پر نہ آ سکے۔''

بونیٹا کھلے منہ کے ساتھ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اچانک ہی تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازے پر کھڑے باب کے ایک ساتھی نے اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیا جسے باب نے گیند کی طرح دبوچ لیا۔

''باقی سارا سامان تو رکھ لیا ہے نا؟'' اس نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

ڈیوڈ کو بونیٹا کی حالت دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا۔ الزبتھ کی آنکھوں میں بھی خوف و ہراس کی جھلک نمایاں تھی مگر یہ دو عورتیں تھیں جنہوں نے مردوں کو دھوکا دیا تھا۔ باب باہر اپنے دوسرے ساتھی سے بات کر رہا تھا۔ ''تم فکر نہ کرو، مارتھ کے عملے کو ہر حال میں قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ ان کی توجہ اس وقت [illegible] آئی لینڈ پر مرکوز ہے۔ اس لیے تمہیں خلیج عبور کرتے ہوئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' باب نے اپنے دیگر ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اب واشنگٹن روانہ ہو جاؤ۔''

وہ دونوں سر ہلا کر کیبن سے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد باب نے ڈیوڈ کو کیبن میں کنٹرول بورڈ کی طرف جانے کو کہا۔ ''لیفٹیننٹ چلو...... اسے چلاؤ......''

مجبوراً ڈیوڈ کو کنٹرول بورڈ پر بیٹھنا پڑا۔ اگنیشن میں چابی لگانے سے موٹر گھر گھرانے لگی۔

''ساری بتیاں بجھا دو۔ ہم اندھیرے میں سفر کریں گے۔ کشتی کو دریا کے بیچ لے چلو اور پھر سمندر کا رخ کرو۔''

ڈیوڈ تقریباً چھ سال بعد کشتی کے کنٹرول بورڈ پر بیٹھا تھا پھر اس وقت اس کے دماغ میں منتشر خیالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ پچھلے تمام واقعات کسی فلم کی طرح ذہن میں چل رہے تھے۔ اس کے اعصاب نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ پھر اسے اتنا یاد ہے کہ وہ دریا کے دہانے سے نکل کر سمندر میں داخل ہو رہے تھے۔

کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا۔ کنٹرول

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

بورڈ کو الزبتھ نے سنبھالا ہوا تھا اور بونیتا فکرمند نظروں سے ڈیوڈ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بڑے کمزور اعصاب کا مالک ہے۔ اس پر اعصابی دورہ پڑا تھا۔ اب ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے مس ڈیکر اب تم کشتی سنبھال لو۔ الزبتھ کافی تھک چکی ہے۔" ڈیوڈ کے ذہن نے کام کرنا شروع کیا تو ایک بار پھر اسے باب سے چھٹکارے کا خیال آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ باب سے ریوالور چھین کر اسے گولی مار دے۔ نیم تاریکی میں آنکھیں کھول کر تکتے ہوئے اس کی نظریں گیسولین کے ایک گیلن پر مرکوز ہو گئیں۔ یہ ڈبا اس کے پاؤں کے نزدیک دیوار کے پاس پڑا تھا تاکہ بوقتِ ضرورت اسے لینے کے لیے کیبن سے باہر نہ جانا پڑے۔

الزبتھ نے سرد آہ بھری۔ "ڈیوڈ......"

"ہوں......" ڈیوڈ نے جواب دیا۔

"یہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟"

"اسی سے پوچھو......" ڈیوڈ نے روکھے انداز میں جواب دیا۔

الزبتھ نے ہنشا کی طرف دیکھا اور کانپتی آواز سے بولی۔

"باب...... باب ڈیئر۔ تم جانتے ہو کہ میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ میں تمہیں یہ ساری باتیں بتا چکی ہوں۔ میں سچ مچ بھاگ نہیں رہی تھی بلکہ تم سے ملنے کے لیے تمہاری طرف آنے والی تھی۔"

باب کے جواب دینے سے پہلے ڈیوڈ نے کہا۔

"الزبتھ! خاموش ہو جاؤ۔" اسی اثنا میں باب اٹھا اور بونیتا کے کندھوں پر جھک کر کشتی کا راستہ دیکھنے لگا۔ بونیتا نے خلافِ توقع بڑی پرجوش آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"باب! تمہاری ان سرگرمیوں کا کیا مقصد ہے؟"

"کیا تم واقعی نہیں جانتیں۔ بہت خوب...... حالانکہ پچھلی ساری گرمیاں تم ہماری انہی سرگرمیوں کی ٹوہ لیتی رہی ہو......"

☆☆☆

"پچھلی جنگ کے اختتام سے کچھ عرصہ پہلے جاپان کی کشتیاں بحرالکاہل میں جاسوسی کرتی رہی تھیں۔ بظاہر وہ ماہی گیر کشتیاں ہوتی تھیں جو بھٹک کر اہم بحری اڈوں کے قریب چلی جایا کرتی تھیں۔ ان کشتیوں کو چلانے والے تو بظاہر ماہی گیر ہوتے تھے مگر اصل میں وہ تعلیم یافتہ افسر ہوتے تھے اور ان کے پاس بے حد قیمتی کیمرے ہوا کرتے تھے۔ جن سے وہ اہم خفیہ اڈوں کی تصاویر لیا کرتے تھے۔ ان میں سے چند کشتیاں پکڑی گئیں اور ان کی تشہیر بھی کی گئی۔" بات کرتے کرتے وہ کچھ دیر کو رکا اور پھر بولا۔

"مجھ سمیت چند دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ جاپانیوں کے اس طریق میں چند تبدیلیاں لا کر زیادہ مفید نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ سو ہم نے ماہی گیر کشتیوں کے بجائے ایسی کشتیاں بنانے کا فیصلہ کیا جو تفریحی دوروں یا نجی طور پر استعمال کی جائیں لیکن ان کا کام اہم فوجی اور بحری اڈوں کی تصاویر حاصل کرنا ہو۔ ایسی کشتیاں ساحلی گارڈز کی نظروں میں آئے بغیر آسانی سے اپنا کام سرانجام دے سکیں گی۔

"لارنس ولسن کو کشتیاں بنانے کا بچپن سے شوق تھا۔ اس لیے اس کی خدمات کسی نہ کسی طرح حاصل کر لی گئیں۔ کشتیاں بننے لگیں تو کسی ایسے مقام کی تلاش شروع ہوئی جو ساحلِ سمندر کے قریب ہو اور جسے ہیڈکوارٹر کے طور پر استعمال کیا جا سکے جہاں کشتیوں کے رکھنے پر کسی کو شک بھی نہ گزرے۔ ایسا مقام لارنس ولسن کی بیوی الزبتھ کا مکان تھا چنانچہ اسے بھی اپنے گروہ کا آلۂ کار بنانے کی ترغیب دینے کی کوششیں کی گئیں۔ ہمارے کارکنوں نے ولسن خاندان کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ ولسن کی بیوی اپنے شوہر سے بے حد نالاں ہے۔ اسے آلۂ کار بنانا چنداں مشکل نہ ہوگا۔"

الزبتھ اپنے چہرے کو ہاتھوں میں لیے خاموش بیٹھی تھی۔ کشتی کا سفر جاری رہا۔ باب نے کمپاس پر نگاہ ڈالی اور کھنکھار کر بولا۔ [illegible] [illegible] سے بچ کر نکلنا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بونیتا کا کان پکڑ کر اسے زور سے مروڑا کہ اس کی سسکی نکل گئی۔ اس نے جلدی سے کشتی کا رخ موڑ دیا۔

"مگر لاری کو قتل کیوں کیا گیا؟" بونیتا نے انتہائی کرب میں پوچھا۔

"کیونکہ اس کے پاس ہماری کارکن کشتیوں کی ایک فہرست تھی۔ یہ وہ کشتیاں تھیں جو پچھلی گرمیوں سے ہمارے لیے کام کر رہی تھیں۔ میرے علم میں یہ بات بھی لائی گئی تھی کہ لارنس ولسن ڈبل ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ وہ یہ لسٹیں اس لیے حاصل کر رہا ہے تاکہ اسے حکومت کے حوالے کیا جا سکے۔ چنانچہ اسے راہ سے ہٹانا ضروری ہو گیا تھا۔ جب مجھے یہ یقین ہو گیا کہ لارنس ولسن اور الزبتھ میں ناچاقی بہت بڑھ چکی ہے تو اسے قتل کروانے کی سوچ الزبتھ کے ذہن میں ڈال دی گئی۔

"عورت کتنی بھی بہادر ہو مگر بنیادی طور پر وہ کمزور

رہتی ہے۔ یہ الگ بات کہ اشتعال میں آ کر کوئی بڑا قدم نہ اٹھالے۔ لارنس ولسن کو وہ اکیلی قتل نہیں کر سکتی تھی۔ اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ یہ کام کسی اجرتی قاتل سے لے سکتی ہے۔ چنانچہ میں ایک اجرتی قاتل کی حیثیت سے اس سے ملا۔ ایک مقررہ دن جب میں ان کے گھر پہنچا تو میرے جانے سے پہلے لاری قتل ہوا پڑا تھا۔"

"یہ بالکل جھوٹ ہے۔ لاری کو میں نے قتل نہیں کیا اور نہ ہی میں اسے قتل کرنا چاہتی تھی۔" الزبتھ چیخی۔

"ہو سکتا ہے کہ تم اسے قتل کرنا نہ چاہتی ہو مگر جب میں پہنچا......" الزبتھ نے چیختے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

"باب تم بوڑھے ہو، بھول رہے ہو۔ میری گولی سے وہ شخص زخمی ہوا تھا۔ تمہاری گولی سے وہ وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔"

"کیوں نہ ہوتا...... وہ ہماری ٹوہ لیتا پھرتا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح ماربتھ کے ملاح کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ملاح سے لیا ہوا پارسل وہ گھر لے گیا تھا۔ اگر وہ پارسل حکومت کے ہاتھ لگ جاتا تو ہمارے سب کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ اس پارسل میں بم تھا جو کسی دوسری ریاست میں تخریب کاری کے لیے پہنچانا تھا۔ چنانچہ اس کا قتل ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی کار سے چھٹکارے کا کام تھا۔

"میں نے لارنس ولسن کا روپ بھرا اور نیویارک سے واشنگٹن جانے والی [illegible] سڑک پر میں نے ایک گیس اسٹیشن [illegible] [illegible] کار میں سفر کے بعد [illegible] نے لفٹ مانگی۔ ہائی وے پرو[illegible] زندہ اور موجود ہونے کی اس سے بڑی گواہی اور کون ہو سکتا تھا۔ سو میں نے اسے لفٹ دی اور اپنے آپ کو غدار اور وطن دشمن کے طور پر متعارف کروایا۔ یہ جان کر مجھے بہت مایوسی ہوئی کہ وہ نارفاک جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ولسن کی شناخت ممکن نہ تھی۔ اس کی قد و قامت اور جسامت دیکھ کر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر اسے ولسن کے کپڑے پہنا کر حادثے کا شکار کر دیا جائے تو اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ولسن کی لاش کا بھوت تمہارا پیچھا کر رہا تھا اور تم خوفزدہ تھے......" بونیتا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

ہنشا کے لیے یہ طنز ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے ریوالور سے بونیتا کو ٹہوکا دیا۔ اس پر وہ دوبارہ بولی۔

"اپنی کشتی کے عملے کو ناکارہ کر کے کشتی خود چلانا پڑے گی۔ سوچ لو......!"

"اپنی زبان بند رکھو اور کشتی چلاؤ......" اس نے تنبیہ کی۔

ڈیوڈ اس اثنا میں گیسولین کے ڈبے کو اپنے پاؤں کی مدد سے اپنے قریب کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ پھر اس نے آہستگی سے اس کا ڈھکنا اتارا...... اور یہ سوچ کر اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا کہ جونہی آتش گیر گیسولین چلتی ہوئی کشتی کے سلنڈروں تک پہنچی تو کشتی ایک دھماکے سے اڑ جائے گی۔

ڈیوڈ نے گیسولین کا ڈبا اٹھا کر باب پر کھینچ مارا۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ ڈبے کی چوٹ نے اسے بوکھلا دیا۔

"بنی! فوراً انجن بند کر کے سمندر میں کود جاؤ۔ باب اب گولی نہیں چلا سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو کشتی کو آگ لگ جائے گی۔ جلدی کرو۔"

بونیتا نے فوراً انجن بند کیا اور کنٹرول بورڈ سے اٹھ گئی۔ باب گرتے ہوئے گیسولین کے ڈبے کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا جو کہ آدھے سے زیادہ خالی ہو چکا تھا۔ اسے چھوڑ کر اس نے بائیں ہاتھ کا مکا ڈیوڈ کی پسلیوں پر مارا۔ زخمی سینے پر مکا کھا کر ڈیوڈ اچھلا اور الزبتھ کے پاؤں سے الجھ کر باہر کشتی کے عرشے پر جا گرا۔ اتنے میں بونیتا تیزی سے سمندر میں کود گئی۔ باب جلدی سے ڈیوڈ کی طرف مڑا اور ریوالور اس کی طرف دکھا کر چیخا۔

"چلو کشتی چلاؤ......"

"گیسولین اب کشتی کے انجن تک پہنچ چکی ہے۔ انجن چلتے ہی کشتی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ اب تمہارا ریوالور بیکار ہے۔ اس کے دھماکے سے بھی کشتی آگ پکڑ لے گی اور [illegible] ساتھ تم بھی ختم ہو جاؤ گے۔" اس کے باوجود باب نے ریوالور اس کی طرف سیدھا کر لیا۔ الزبتھ تیزی سے اٹھی اور دوڑتے ہوئے باب اور ڈیوڈ کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت ریوالور نے گولی اگلی۔ شعلہ چمکا...... ریوالور کی گولی نکلتے ہی ایک اور دھماکا ہوا۔ ڈیوڈ کو اتنا یاد ہے کہ الزبتھ گولی کھا کر دہری ہو رہی تھی۔ اس کے بعد اسے لگا ایک زلزلہ آیا اور ڈیوڈ نے خود کو گہری تاریکیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔

ڈیوڈ کے ارد گرد سمندر میں آگ کے شعلے ناچ رہے تھے۔ ڈیوڈ نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ پھر بھی بے ہوش ہونے سے پہلے ایک سرکاری کشتی سے آتی سرچ لائٹ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ دوسرے دن اسپتال کے ایک کمرے میں جب اس کی آنکھ کھلی تو بونیتا ڈیکر اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی اور اپنا ہاتھ اس کے چہرے پر پھیرتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

محفلِ شعروسخن

❁ نازیہ مختار......گجرانوالہ
نفرتوں کے حبس میں گھٹنے لگا ہے اب تو دم
چاہتوں کی اب تلک موجِ صبا گزری نہیں

❁ زریان سلطان......کراچی
اکیلے لمبی مسافت کا سامنا ہے ہمیں
کسی کی یاد ہی اب اپنی ہم سفر ہوگی
عذاب سارے ہی خود جاں پہ جھیلنے ہوں گے
ہمارے مٹنے کی اس کو نہ کچھ خبر ہوگی

❁ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
ہر اک چہرہ کئی چہروں کا حامل
تو پھر کیسے نظر دھوکا نہ کھائے

❁ ریاض بٹ......حسن ابدال
بے نور ہوچکی ہے شہر کی فضا
تاریک راستوں میں کہیں کھو نہ جائیں ہم
اس کے بغیر آج بہت جی اداس ہے
جالب چلو کہیں سے اسے ڈھونڈ لائیں ہم

❁ چلبلی ہیر......جھنگ سٹی
جس نے ادا سیکھ لی غم میں مسکرانے کی
اسے کیا مٹائیں گی گردشیں زمانے کی

❁ انیلا رشید سیال......خیرپور (میرس)
گر چاہوں تو اک نگاہ میں خرید لوں اُس کو
جس کو ناز ہے بہت کہ بکتا نہیں ہوں میں

❁ وزیر محمد خان......بل ہزارہ
بڑے خلوص سے مانگی تھی روشنی کی دعا
بڑھا کچھ اور اندھیرا چراغ جلنے سے

❁ عبدالجبار رومی انصاری......بورے والا
ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں

❁ محمد شہباز اکرم نوئی......پاک پتن شریف
بچھڑ گیا جو بے چینیوں کے موسم میں
اسے کہو کہ زمانے اسے بلاتے ہیں

❁ جاوید اختر رانا......حیدرآباد
اشکوں سے تر ہے پھول کی ہر اک پنکھڑی
رویا ہے کون تھام کے دامن بہار کا

❁ ناہید یوسف......اسلام آباد
آجاؤ کہ اس کے بعد نہ آئے گا پھر کبھی
اس بے خودی کے ساتھ یہ موسم بہار کا

❁ عائشہ ناز......کوئٹہ
اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کردیا
تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کردیا

❁ آصف علی......میرپور خاص
انہی قدموں نے تمہارے انہی قدموں کی قسم
خاک میں اتنے ملائے ہیں کہ جی جانتا ہے

❁ غلام عباس......نواب شاہ
دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

❁ یوسف خان......پشاور
یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے صنم اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

❁ صبا سحر......کراچی
تیری گلی سے عاشقِ زار اٹھ کے رہ گیا
اٹھا تھا ناتواں سا غبار اٹھ کے رہ گیا
دنیا میں اک جہاں کو بہا سیلِ اشک سے
پہلو میں میرے جوش سا یار اٹھ کے رہ گیا

❁ شاہین تبسم......پنڈی گھیپ
نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے

کوئی بھی حادثہ نہ بنا میری بے بسی
میں آج بھی ہوں زندہ بڑے حوصلے کے ساتھ
زخموں سے چُور، آبلہ پائی کے باوجود
بڑھتے رہے ہیں میرے قدم قافلے کے ساتھ

❁ محمد ضوریز ملک......کراچی
جو دل سے تیر کوئی پار بھی ہوا تو کیا
تڑپ رہا ہوں ابھی تک تری نظر کے لیے

❁ زبیر خان......لیہ
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

❁ وردہ جنید......کراچی
آزمائش میں ہزاروں ہی مراحل آئے
بپھری موجیں بھی ملیں سیکڑوں ساحل آئے
تیرے فیضانِ نظر، تیری عنایت کے طفیل
ہم ترے شہر سے پابندِ سلاسل آئے

❁ شاہینہ علی......چنیوٹ
بہلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

❁ انعم محمود......ملتان
اجنبیت کو پھر سے اپنا کر
توڑ دیں آؤ سارے رشتوں کو
بارِ شرمندگی سے بچ جائیں
بھول جائیں وفا کی قدروں کو

❁ مہوش......حیدرآباد
زندگی کشتِ بے ثمر ہی سہی
آرزو میں تو پھر بھی بوتے ہیں
یوں تو غم ہی ہیں زندگی کی اساس
ان میں کچھ یادگار ہوتے ہیں

❁ محمد آذین رضوان......کراچی
دیتا ہے محبت کے اشارے وہ ہمیں بھی
پر روئے سخن رکھتا ہے اغیار کی جانب
دولت ہوئی توقیر کا معیار مقرر
اٹھتی ہے نظر کب کوئی کردار کی جانب

❁ شکور احمد......چیچہ وطنی
کیا ہوگیا ارباب جنوں کو
جانے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد
مرنے کی ادا یاد

❁ رضا علی......چنیوٹ
اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی، ان سے آہ بھی نہ ہوئی

❁ پرویز خان......رحیم یار خان
امیدِ وفا ترکِ جفا ان سے ہے بے سود
اور لطف و کرم کے بھی خواہاں نہ ہوئے ہم

❁ زینب......نارتھ کراچی، کراچی
سارے دکھ درد مرے اُس کے عطا کردہ ہیں
وہ نہیں مانتا اس بات کی حیرانی ہے
میری بربادی کا خواہاں تھا وہ خود شدت سے
یہ دکھلاوے کی جو اس کو پریشانی ہے

❁ عمران شیروانی......حیدرآباد
اب وقت کے فرعون نے سب چھین لی خوشیاں
ایسے میں کوئی جشن مناؤں بھی تو کیسے

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

❄ثمر علی.....سکھر
اَٹ گئے گردِ غم سے جان و جگر
کرب کے آسماں سے گزرے ہیں

❄زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
جبکہ مرے افکار پہ، ہونٹوں پہ ہوں پہرے
سچ بات زباں اپنی پہ لاؤں بھی تو کیسے

❄منیبہ احمد.....بہاولپور
سمجھ نہ اُن کو تُو دیوار اپنے رستے کی
کہ سنگِ راہ ہی تو سنگ میل ہوتے ہیں

❄نواز خان.....سیالکوٹ
نہ آزمائے مرے جذبۂ جنوں کو کوئی
یہ رنگ لائے گا پہلے سے بھی سوا ہوکر

❄نبیلہ.....کراچی
نہ ہوگی نام کو حسرت نہ سکے گا کوئی ارماں
حصولِ آرزو کے پھر زمانے لوٹ آئیں گے

❄بریرہ.....کراچی
لہجے کی کاٹ کو وہ سمجھتا تھا امتیاز
باتوں میں اپنے پیدا حلاوت نہ کرسکا

❄نورین ایوب.....بہاولنگر
سادگی اور ضبط سے میرے ... قرار
آئے گا ہوکر پشیماں وہ ... کمانے کے لیے

❄منیر شگفتہ.....وہاڑی
پاگل دل کو کیا سمجھاؤں مانتا ہے کب میری
آج بھی سارے خواب ہیں اس کے اس کا ہی شیدائی

❄محمد طلحہٰ.....کراچی
یہ حسنِ ظن ہے تمہارا کہ بدگمان ہو تم
لطیف جذبوں کا حامل ہے دل برا تو نہیں

❄امبرین علی.....مری
شاید اس کو بھی تھا جہان عزیز
ترکِ الفت بلاجواز نہ تھا

❄زرین خان آفریدی.....حیدرآباد
دیارِ دل میں تو رونق اسی کے نام سے ہے
کبھی ہمیں وہ سلام وپیام دے کہ نہ دے

❄مہتاب احمد.....حیدرآباد
بے لوث وبے بدل ہیں محبت کے ضابطے
شکوہ فضول ہے کہ محبت میں کیا ملا

❄سکندر علی.....کراچی
قائل ہیں ان کے حسن تدبر کے دل سے ہم
ڈھاتے ہیں وہ ستم بھی بڑے اہتمام سے

❄عالیہ خان.....لاہور
ادھورا باب رہی اب نہ زندگی میری
جو پڑھنا چاہوں تو پڑھ لوں کتاب چہرے سے

❄وقاص خان.....روہڑی
ہیں یوں تو سب ہی جہاں میں وفا کے متلاشی
مگر خلوص سے محروم دوستی ٹھہری

❄امجد علی.....جھنگ سٹی
زندگی کا تو اک تصور ہے
لاش اپنی اٹھائے پھرتا ہوں

❄ندیم احمد.....چنیوٹ
دل ... داغ داغ اور ...
بکھرا ...

❄شیزا خان.....فیصل آباد
میں اپنی ذات کو خود ہی فریب دیتا رہا
ملال کیسا اگر کوئی غم گسار نہیں

❄عاشی.....راولپنڈی
اب دوسروں سے کوئی کروں بھی گلہ تو کیا
جب میری ذات خود کی نقشے بدل گئی

❄عاصم خان.....اسلام آباد
غیر انجان تھے ان سے تو شکایت بے سود
میرے تو اپنے مرے درد سے انجان ملے

کوپن
برائے
شمارہ
مئی
2019

مُحفلِ شعروسخن

نام : ....
پتا : ....

http://urdutubes.com/

حق بجانب

شاہ زین رضوان

اگر کوئی کسی کے خوابوں کو بکھیر دے تو آنکھوں میں چبھن گھر کر لیتی ہے اور پھر یہی تکلیف دھیرے دھیرے انسان کی بصارت بھی متاثر کردیتی ہے۔ وہ بھی جسِ اذیت میں مبتلا تھی اس نے تقریباً اسے اندھا کردیا تھا... اسے ہر طرف سے صرف انتقام کی صدا سنائی دے رہی تھی اور پھر اس نے اس صدائوں پر کان دھر لیا کیونکہ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھی۔

❄ بچپن کے خوابوں کو توڑنے کی سزا پانے والوں کا انجام

جیری شین اور میں آرمی نیوی کلب کے ایگل گرل میں بیٹھے تھے جو فیرو گٹ اسکوائر پر واقع تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس بار بھی مجھے کسی مشن پر بھیجنا چاہ رہا تھا۔ اس مرتبہ مجھے اپنے ایک سابق ساتھی سے ملنے کے لیے سوئٹزرلینڈ جانا تھا۔ ابھی صُرف دوپہر کا ایک بجا تھا لیکن لنچ کے لیے آنے والے لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔

میں جیری شین سے پہلی بار دو سال پہلے برلن میں ملا تھا۔ اس وقت تک دیوار برلن نہیں گری تھی۔ اس وقت وہ

Digitized by Google

برلن کے فضائی اڈے ٹیمپل ہوف پر انٹیلی جنس آفیسر کے طور پر کام کر رہا تھا لیکن اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور اب وہ نیشنل سیکیورٹی کونسل میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔

بیئر کا گھونٹ لینے کے بعد اس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ اس کا چہرہ گول اور سرخ تھا۔ بال بھی فوجی انداز میں کٹے ہوئے تھے۔

''تم اور پرسیل ایک ساتھ کام کرتے تھے بلکہ تمہاری میزیں بھی ایک ہی کمرے میں برابر برابر تھیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟'' جیری نے کہا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''تم دونوں میں کافی دوستی تھی لیکن یہ تب کی بات ہے جب اس کی ذاتی مشکلات شروع نہیں ہوئی تھیں۔ تم جانتے ہو کہ میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں۔''

''پرسیل خفیہ راز بیچنے کے الزام میں گرفتار ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

''تم اس شخص کو ذاتی طور پر جانتے ہو مگر اہم...... کم از کم دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ۔''

اس کا اشارہ اس حقیقت کی جانب تھا کہ میں اور پرسیل، برلن کے سوویت ایسٹ یوروپین ڈویژن میں ایک ساتھ کام کر رہے تھے جو سرد جنگ [illegible] میں ہمارے ملک کا ایک اہم مرکز تھا۔

اس نے ایک بار پھر میرے چہرے پر نظریں جمائیں اور بولا۔ ''مجھے تمہارا خیال اس لیے آیا کہ ہمارے پاس تم جیسے لوگوں کی بہت کمی ہے۔''

''تم مجھ سے کیا کام لینا چاہ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''پرسیل سے بات کرو۔ وہ اب بھی میونخ میں رہتا ہے لیکن سال میں دو ہفتے سوئٹزرلینڈ کے قصبے بیڈر ریگز، میں گزارتا ہے جو معدنی چشموں کے لیے مشہور ہے۔ ان دنوں وہ وہیں ٹھہرا ہوا ہے اور اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم بھی دو مرتبہ وہاں جا چکے ہو۔''

جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''تم نے اس پر یہی ظاہر کرنا ہے کہ یہ ایک اتفاقی ملاقات ہے۔ اس سے جو کچھ معلوم کر سکتے ہو...... اس کی موجودہ مصروفیات کوئی ایڈونچر وغیرہ۔ میں حیران ہوں کہ وہ ابھی تک گریگوروف کے ساتھ الجھا ہوا ہے۔''

''کیا مجھے سوئٹزرلینڈ جانا ہوگا؟''

''تم ریٹائر ہو چکے ہو۔ تمہارا وہاں جانا اور اس سے ملنا بالکل فطری ہوگا۔ ریٹائر ہونے کے بعد لوگ یہی کرتے ہیں یعنی گھومنا پھرنا اور دوستوں سے ملنا اور تمہارے پاس تو ایک اچھا بہانہ ہے کہ تم معدنی چشموں سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں آئے ہو۔''

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اب بھی گریگوروف کے ساتھ منسلک ہو۔''

''جب سوویت یونین ٹوٹا تو روسیوں کی ایک بڑی تعداد اچانک ہی ارب پتی بن گئی۔ گریگوروف بھی انہی میں سے ایک ہے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ شخص کچھ بھی کر سکتا ہے اس لیے ہر کوئی اس سے خوفزدہ رہتا تھا۔ اب وہ مر چکا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اسے کس نے قتل کیا۔ میں نے اس کے بارے میں آخری خبر یہ سنی تھی کہ نیویارک پولیس ابھی تک اس قتل کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی۔''

سرد جنگ کے زمانے میں گریگوروف کے جی بی کے سیکنڈ ڈائریکٹوریٹ کا انچارج تھا اور بڑے موثر انداز میں جاسوسی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ یہاں تک کہ اس نے پرسیل کو بھی روس کے لیے جاسوسی کرنے پر آمادہ کر لیا۔ جب سوویت یونین کا خاتمہ ہوا تو وہ وقتی طور پر پس منظر میں چلا گیا۔ ایک سال بعد جب وہ دوبارہ منظرِ عام پر آیا تو اب [illegible] بن چکا تھا۔ [illegible] کاروبار [illegible] میں پھیلا ہوا تھا۔ [illegible] دولت اکٹھی نہیں کر سکا ہوگا۔ یقیناً اس نے ملازمت کے زمانے میں اپنی حیثیت اور اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے پیسا بنایا ہوگا۔

''بہرحال دو ہفتے قبل اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ وہ ہوور ٹاورز میں ٹھہرا ہوا تھا جو نیویارک کے بہترین ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔'' جیری نے کہا۔ ''یہ ایک ہائی پروفائل کیس ہے۔ پریس نے اس پر ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ پہلے انہوں نے نیویارک پولیس اور ایف بی آئی کو نشانہ بنایا اور اب ہم پر انگلیاں اٹھ رہی ہیں لیکن اب تک ہم میں سے کوئی بھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکا۔ گریگوروف کا کاروبار یورپ کے کئی ملکوں میں ہے اور اس حوالے سے ہر جگہ اس کے دوست و دشمن ہوں گے لیکن اس کا قتل ہماری سرزمین پر ہوا ہے اس لیے قاتل کو پکڑنا ہماری ذمے داری ہے۔ حکومت میں بیٹھے ہوئے افراد بھی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون تھا جس نے اسے اس بے دردی سے قتل کیا اور اپنا کوئی نشان تک نہ چھوڑا۔''

گوکہ اس کا کاروبار یورپ کے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا تھا لیکن وہ امریکی مارکیٹ سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے یہاں بھی اپنے قدم جمانا شروع کر دیے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ دو دفاعی صنعتی کارپوریشنوں میں خاموش پارٹنر تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسی ایک وجہ سے اس کے کچھ کاروباری حریف گھبرا گئے ہوں گے۔ انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے راستے سے ہٹا دینے میں ہی ان کی بقا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بے حد مغرور تھا اور اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھتا تھا۔ اسے اپنی صلاحیتوں پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے ایک پریس کانفرنس کے دوران اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے فخریہ کہا تھا۔ ''میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

ممکن ہے کہ یہ سن کر کچھ لوگ خوفزدہ ہو گئے ہوں اور انہوں نے اسے اپنے لیے ایک خطرہ سمجھا ہو۔ شاید وہ سوچ رہے ہوں گے کہ اس پودے کو تناور درخت بننے سے پہلے ہی جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ اگر یہ زندہ رہا تو واقعی کچھ بھی کر سکتا ہے۔

''وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا۔'' جیری نے کہا۔ ''ابھی تک ہم یہ بھی معلوم نہیں کر سکے کہ وہ مرد تھا یا عورت۔ وہ اسے قتل کرنے کے بعد [illegible] ہوٹل سے باہر [illegible] ہو گیا۔''

''کیا وہاں سیکیورٹی کیمرے نصب نہیں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ وہاں تو قدم قدم پر کیمرے لگے ہوئے ہیں لیکن وہ ان کے ذریعے کسی مخصوص شخص کی نشاندہی نہیں کر سکے۔''

ایک ریٹائرڈ آفیسر ہوتے ہوئے مجھے اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ میں نے ساری زندگی لوگوں کی جاسوسی کرنے میں گزاری تھی اور یہ میرے آرام کے دن تھے پھر یہ معاملہ ایک ہائی پروفائل شخصیت کا تھا اور اسے قتل کرنے والے بھی کچھ کم خطرناک نہ ہوں گے۔ اس لیے اس معاملے سے دور رہنا ہی میرے لیے بہتر تھا لیکن جیری نے مجھے قائل کر ہی لیا پھر اس نے جو پیشکش کی وہ بھی کافی پرکشش تھی۔

''میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے یہ کیس تمہاری جھولی میں ڈال دیا ہے۔'' میں نے جیری کو ایک لفافہ اپنی جانب کھسکاتے ہوئے دیکھا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ بولا۔ ''اس میں تمہارا ہوائی جہاز کا ٹکٹ ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے لیے گرانڈ ریزورٹ ہوٹل میں کمرا بھی بک کروا دیا گیا ہے اور اس لفافے میں تمہارے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم بھی رکھ دی گئی ہے لیکن سب پیسے جوئے میں مت اڑا دینا۔ یہاں سے تم براہِ راست زیورچ جاؤ گے پھر بیڈر ریگز، تک سڑک کے راستے جانا ہوگا۔''

''مجھے کب روانہ ہونا ہے؟''

''کل شام۔''

☆☆☆

''ایک شادی شدہ شخص صرف ایک بار اپنی بیوی کی سالگرہ کا دن بھولتا ہے۔'' گل پرسیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایسا ہو جائے تو وہ اس بات کو یقینی بنا دیتی ہے کہ دوبارہ ایسی نوبت نہ آئے۔ دراصل یہاں آنا میری طرف سے اس کی سالگرہ کا تحفہ ہے۔ اسے اسی طرح کے انوکھے تحفے پسند ہیں۔''

اس کی ظاہری شخصیت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ سوائے اس کے کہ اس کا چہرہ تھوڑا سا گول اور بال آہستہ آہستہ سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سب سے بڑی تبدیلی اس کے طور طریقوں میں آئی تھی۔ ممکن ہے کہ میرا [illegible] رہا تھا لیکن وہ مجھے پہلے سے بالکل مختلف دکھائی دے رہا [illegible] صاف لگ رہا تھا کہ اس نے اپنی بہت سی عادات ترک کر دی ہیں اور آہستہ آہستہ مجھ پر بہت کچھ واضح ہوتا گیا۔

ایک درجن دوسرے لوگوں کے ساتھ میں اور پرسیل گرم پانی میں کندھوں تک ڈوبے ہوئے نہانے کا مزہ لے رہے تھے۔ یہ باتھ روم ایک بڑے کمرے کے برابر تھا جس میں تیس فٹ کی اونچائی پر لگی ہوئی کھڑکیوں سے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ یہی کشش ساری دنیا کے لوگوں کو کھینچ کر اس قصبے تک لاتی تھی جو اپنے معدنی چشموں کی وجہ سے مشہور تھا۔

''دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح مجھے بھی اس معدنی پانی میں نہا کر بہت سکون ملتا ہے۔'' پرسیل نے کہا۔ ''تمہیں ہوٹل میں دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہوئی۔'' وہ گزشتہ شب ہوٹل کے لاؤنج میں ہونے والی اتفاقیہ ملاقات کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ہم نے ساتھ بیٹھ کر ایک ایک گلاس مشروب پیا اور آج یہاں ملنے پر متفق ہو گئے۔

میں نے بھی اس کی دیکھا دیکھی پانی میں تیرنے کی

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

کوشش کی اور کہا۔

''تم نے بتایا تھا کہ انجیلا بھی تمہارے ساتھ آئی ہے۔''

''تم جانتے ہو کہ ان عورتوں کو شاپنگ کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ چاہے ضرورت ہو یا نہیں لیکن یہ خریداری کے لیے نکل پڑتی ہیں۔ وہ بھی بازار گئی ہوئی ہے۔''

ہم دونوں پانی میں بیس منٹ تک تیرتے رہے۔ اس دوران میں ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں لیکن دونوں ہی جانتے تھے کہ ہم اصل موضوع یعنی گریگوروف کی حالیہ موت پر گفتگو کرنے سے کترا رہے ہیں۔ یہی شخص گل پرسیل کو ساڑھے پانچ سال کے لیے جیل بھیجنے کا براہ راست ذمے دار تھا۔ میں جانتا تھا کہ جلد یا بدیر مجھے یہ موضوع چھیڑنا ہوگا۔ اس لیے میں نے مزید تاخیر مناسب نہ سمجھی اور کہا۔

''گریگوروف کو جس پراسرار طریقے سے قتل کیا گیا، اس پر تم کیا کہو گے؟''

''اچھا...... تو تم اس لیے یہاں آئے ہو۔'' اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ بول اٹھا۔ ''کسی نے مجھے کریدنے کے لیے تمہیں بھیجا ہے تاکہ معلوم کرسکو کہ کیا میں نے ہی اسے قتل کیا ہے۔''

اچانک ہی اس کا لہجہ تلخ ہوگیا اور وہ رکھائی سے بولا۔ ''یہی بات ہے نا؟''

''لوگ اس بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ تم اس کے لیے انہیں الزام نہیں دے سکتے۔ اگر تمہارا اس معاملے سے تعلق نہیں تو تمہیں اس پر ناراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''میرا اندازہ ہے کہ وہ شخص ناقابلِ تسخیر نہیں تھا۔ جب امریکا کے صدر کو گولی ماری جاسکتی ہے تو اس کی کیا حقیقت تھی۔ تم یہ بات اپنے آقاؤں کو بتا دینا۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی اور میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا بلکہ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ کوئی بھی کچھ نہیں بتا سکتا۔''

جب وہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''کچھ اندازہ ہے کہ اس کے پاس کتنی دولت ہوگی؟''

''شاید اسے خود بھی معلوم نہیں ہوگا۔ دس کروڑ، بیس کروڑ یا ایک ارب؟'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''جب سرد جنگ کا خاتمہ ہوا، تب بھی وہ کے جی بی میں تھا۔ اس کی وہاں بہت اچھی پوزیشن تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خوب مال بنایا ہوگا۔''

میرا بھی یہی خیال تھا۔ اس لیے میں نے اس بارے میں کوئی بحث نہیں کی۔ یہ تو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ کے جی بی چھوڑنے کے صرف ایک سال بعد وہ اتنی دولت نہیں کما سکتا۔

''اس نے دورانِ ملازمت بھی کئی دشمن بنائے ہوں گے؟''

''اس فیلڈ میں دشمنوں کا شمار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اس کے قاتل کا پتا لگانا آسان نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ... میں کسی کو الزام نہیں دے سکتا اور نہ ہی مجھے اس سے کوئی غرض ہے کہ وہ کون تھا اور اس نے ایسا کیوں کیا۔''

میرا اندازہ تھا کہ وہ کئی وجوہات کی بنا پر گریگوروف سے ناراض تھا۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ ایک پُرکشش عورت وہاں آئی جس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ جب گریگوروف کا قتل ہوا تو تم اس وقت میونخ میں تھے۔''

''ہاں۔ میں وہیں تھا جبکہ انجی سوئٹزرلینڈ آئی تھی۔ اسے اسکیٹنگ کرنے کا بہت شوق ہے۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''لیکن لوگوں کو پرانی باتیں یاد رہیں۔ اس واقعے کے چند روز بعد ہماری پرانی ایجنسی کے دو ساتھی مجھ سے ملنے آئے۔ وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ جب اس کا قتل ہوا تو میں کہاں تھا۔ کیا تم یقین کرو گے کہ ان [illegible] سوچ رہا تھا کہ [illegible] ہوجاؤں۔''

''وہ تم سے کچھ اگلوانا چاہ رہے تھے؟''

''میں نے ان سے کہہ دیا کہ بالکل بھی پریشان نہیں ہوں، وہ مجھ سے بحث کرنے لگے لیکن میں نے ان کی باتوں پر توجہ نہیں دی تاہم انہوں نے جو کچھ پوچھا، میں اس کے لیے انہیں الزام نہیں دوں گا۔''

''کیوں؟''

''یقیناً میرے پاس اسے قتل کرنے کا محرک تھا لیکن زندگی بہت مختصر ہے۔ جیل میں گزارے ہوئے پانچ سالوں کے دوران میرے پاس سوچنے کے لیے بہت وقت تھا۔ میں نے اپنا ذہن بنا لیا کہ آئندہ کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس کی وجہ سے مجھے دوبارہ جیل کا منہ دیکھنا پڑے۔''

یہ کہہ کر اس نے تالاب کے آخری سرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ وقت ایکسرسائز روم میں گزاروں گا۔ اس کے بعد سوانا چلا جاؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''کل میرا یہاں آخری دن ہے۔ میں سڑک کے راستے زیورچ جاؤں گا پھر وہاں سے گھر کے لیے پرواز پکڑوں گا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج شام تم دونوں کی کوئی مصروفیت تو نہیں ہے۔ میں تمہیں ڈنر پر مدعو کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''کب اور کہاں؟''

''ڈاؤنولائنز ساؤنڈ، کیسا رہے گا؟ ساڑھے سات بجے۔''

''انجی کو وہ جگہ پسند ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ تم سے مل کر خوش ہوگی۔ ٹھیک ہے، رات کو ملاقات ہوگی۔'' وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھا پھر اس نے پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ ''لیکن میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ کل رات تم سے ملنا محض ایک اتفاق تھا۔''

☆☆☆

''گل کا خیال ہے کہ کسی نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔'' انجیلا پرسیل نے کہا۔ گو کہ میں نے اسے کافی عرصے سے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اپنے سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں کی بدولت ہمیشہ کی طرح پرکشش لگ رہی تھی۔ ''اور وہ اس وجہ سے بالکل خوش نہیں ہے۔'' اس نے ایک منٹ پہلے کہا جب ہم ڈنر کے بعد اپنے پسندیدہ مشروب کا آرڈر دے [illegible]

[illegible] کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال [illegible] کے لیے یہی بہتر ہے کہ تم مجھ سے تعاون کرو۔'' انجیلا نے کہا۔ ''میں اس سے اتفاق کرتی ہوں۔ تم ایلیکس کو پوری بات کیوں نہیں بتا دیتے؟''

گل نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میں انٹیلی جنس میں کام کرکے اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ یہ میری توقع سے بالکل مختلف تھا۔ جب اس میں بہت زیادہ یکسانیت آگئی تو میں نے دوسری باتوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ میں اپنا کاروبار شروع کرنا چاہ رہا تھا۔ میری اس سوچ کو پروان چڑھانے میں انجیلا کے مشغلے کو بڑا دخل تھا۔ وہ ملبوسات کے ڈیزائن تیار کیا کرتی تھی۔''

''پھر ہم نے فیصلہ کرلیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔'' انجیلا بولی۔ ''ہم عورتوں کے لیے ملبوسات ڈیزائن کرکے فروخت کریں گے۔''

''اور اس طرح ہمارا امیر بننے کا خواب پورا ہوجائے گا۔'' گل نے قہقہہ لگایا پھر ایک دم ہی اس کے

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔
المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

http://urdutubes.com/

چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے مشروب کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''یہ میری زندگی کی سب سے بڑی ناکامی تھی کہ یہ خواب پورا نہ ہوسکا۔''

انجیلا نے کہا۔ ''میری ایک آنٹی کا انتقال ہوگیا۔ ان کے ترکے میں سے مجھے چار لاکھ مارک ملے۔ اس کے علاوہ ہم نے اپنا اپارٹمنٹ گروی رکھ کر قرضہ لیا۔''

''تم یقین نہیں کرسکتے کہ اس کاروبار کے لیے رقم اکٹھی کرنے میں کتنی مشکلات پیش آئیں۔'' گل نے کہا۔

''اگلے ڈیڑھ سال تک ہم نے بہت زیادہ محنت کی۔ اس سے پہلے ہم نے کبھی اتنا زیادہ کام نہیں کیا تھا۔''

''ہم نے ڈیزائننگ مکمل کی اور ہانگ کانگ میں ملبوسات کی تیاری کا انتظام کیا۔ اس کے لیے ضروری کاغذی کارروائی کے علاوہ وہاں کے کئی چکر بھی لگانا پڑے۔ ہم نے یورپ کے تمام ڈیپارٹمنٹل اسٹور اور بوتیک کو اپنے سیمپل بھیجے اور وہ اس کی بنیاد پر ہمارا مال رکھنے پر تیار ہوگئے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا۔ ہمارا سامان ہانگ کانگ کے بارڈر پر روک لیا گیا اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہوئی کہ کچھ یوروپین بارڈر پر بھی یہی کیا گیا۔''

''اس میں عجیب بات کیا تھی؟''

''کیونکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہم نے تمام انتظامات پیشگی کرلیے تھے۔ اس سامان کی ڈیوٹی ادا کردی گئی تھی اور تمام کاغذات بھی مکمل تھے۔''

''ہانگ کانگ میں ہماری نمائندگی کرنے کے لیے کوئی نہیں تھا لیکن ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔'' گل نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم مزید کچھ سننا چاہتے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''میں بات کو مختصر کرتا ہوں۔ ہم نے بھاگ دوڑ کرکے کسٹم سے سامان چھڑایا لیکن سب چیزیں اسٹوروں پر دیر سے پہنچیں جبکہ ہمارے حریف تین ہفتے پہلے ہی اپنا سامان اسٹوروں پر لے آئے تھے۔ فیشن کے کاروبار میں دو دن کی تاخیر بھی بہت نقصان دہ ہوتی ہے۔ ہماری ساری تشہیری مہم بیکار گئی اور ہمارا سامان فروخت نہ ہوسکا۔ اس کے بعد بلوں کی ادائیگی کا وقت آ گیا۔''

''ہم اپنا سب کچھ کاروبار میں لگا چکے تھے اور ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی جبکہ بلوں کی ادائیگی کے لیے دو لاکھ ڈالرز کی فوری ضرورت تھی۔ میرا کھانا پینا...... نیند سب اڑ گئی۔''

''میرا بھی یہی حال تھا۔'' انجیلا نے کہا۔ ''مجھے تو یہ سوچ کر ہی شرم آرہی تھی کہ میں نے آنٹی سے ملنے والی رقم ضائع کردی۔ اگر میں اسے کہیں انویسٹ کردیتی تو ہر مہینے اچھا خاصا منافع ملتا رہتا۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہی وہ وقت تھا جب گریگوروف نے تم سے رابطہ کیا۔''

گل نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل گئے۔ ''جب اس نے دیکھا کہ میدان صاف ہے تو اس نے مجھے پچاس ہزار ڈالرز دینے کی پیشکش کی بشرطیکہ میں اسے اپنے ایک جاسوسی سیارے تک رسائی کا طریقہ بتادوں۔ وہ میرے کام کی نوعیت سے واقف تھا لیکن میں نے ہامی نہیں بھری اور مذاق میں کہہ دیا کہ یہ رقم ناکافی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس کے بعد معاملہ ختم ہوجائے گا۔''

''میں بھی یہی سمجھ رہی تھی۔'' انجیلا بولی۔

''چند روز بعد وہ اس ٹینس کورٹ میں آیا جہاں میں کھیلنے جاتا تھا۔ میچ ختم ہونے کے بعد اس نے مجھے اشارہ کیا اور ایک الگ تھلگ [illegible] پر...... مجھے [illegible] میں کہا۔ میں نے اس مرتبہ بھی اس کی بات مذاق میں ٹال دی اور کہا کہ وہ اپنی پیشکش دگنی کردے۔ میرا خیال تھا کہ اس کے لیے یہ مطالبہ پورا کرنا مشکل ہوگا اور اس طرح میری جان چھوٹ جائے گی۔''

انجیلا نے میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد ہورہا تھا۔

''بالآخر میں نے ایک بار پھر اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا کہ وہ اپنی پرانی پیشکش کو تین گنا کردے......''

''تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔'' انجیلا بولی۔ ''تم تو مذاق کررہے تھے اور وہ......''

''لیکن وہ بالکل سنجیدہ تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس وقت میں یہ کہہ کر پیچھے ہٹ سکتا تھا کہ یہ سب مذاق تھا۔ اس لیے میں نے اس سے ہاتھ نہیں ملایا لیکن اس نے یوں ظاہر کیا کہ جیسے ہمارے درمیان معاملہ طے پا گیا ہو۔ اگلی بار وہ آیا تو اس نے منہ مانگی رقم پکڑا دی جو مارک اور ڈالرز میں تھی۔''

''کیا وہ اتنی رقم تھی کہ اس سے تمہارے قرضے ادا ہوجاتے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جانتا ہوں کہ مجھے وہ رقم نہیں لینی چاہیے تھی لیکن جب میں نے بل دیکھے تو اپنے آپ کو کہہ کر سمجھا لیا کہ یہ صرف ایک دفعہ کی بات ہے لیکن میں غلطی پر تھا۔ جب میں نے اسے مطلوبہ مواد دے دیا تو اس نے مطالبہ کیا کہ میں آئندہ بھی یہ چیزیں انہیں دیتا رہوں۔''

''بلکہ وہ تو یہ بھی چاہ رہا تھا کہ تم دوبارہ ایجنسی میں شمولیت اختیار کرلو۔'' انجیلا نے کہا۔

گل کا منہ بن گیا۔ ''میں جانتا تھا کہ مجھے اس سے تعلق ختم کرنا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے ہی تم پکڑے گئے۔''

''ہاں۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھے وہ رقم نہیں لینی چاہیے تھی۔ جب میں نے اس کا مطالبہ پورا نہیں کیا...... تم جانتے ہو کہ اس کے بعد کیا ہوا؟''

''کسی نے ہمارے آدمیوں کو بتادیا جو کچھ تم نے کیا تھا۔ کیا وہ گریگوروف تھا؟ تم نے اس کی بات نہیں مانی جس پر اس نے یہ انتقامی کارروائی کی۔''

''میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھا۔ ممکن ہے کہ [illegible] گریگوروف ہی ہو۔ [illegible] میں یہ جانتا [illegible] امریکا [illegible] بلایا گیا۔ مجھ پر مقدمہ چلا [illegible] اپنے جرم کا اعتراف کرلیا کیونکہ میرے خلاف واضح ثبوت موجود تھے۔ اس لیے صحت جرم سے انکار نہ کرسکا۔ مجھے آٹھ سال کی سزا سنائی گئی لیکن پانچ سال قید کاٹنے کے بعد رہا کردیا گیا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ میری خوش قسمتی تھی یا کوئی قانونی گنجائش۔ بہرحال انجی، میونخ میں میرا انتظار کررہی تھی۔ میں نے اپنی زندگی کے بکھرے ہوئے ٹکڑے سمیٹے اور نئے سرے سے سفر کا آغاز کیا۔ انجی پہلے ہی اپنا بوتیک چلا رہی تھی۔ میں ادھر اُدھر پارٹ ٹائم جاب کرکے چار پیسے کمانے لگا۔''

''ہمیں اس کے قتل کی خبر سن کر بہت حیرانی ہوئی۔'' انجیلا نے کہا۔ ''وہ کے جی بی کے ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد بھی اپنے قدم زمین پر مضبوطی سے جمائے رکھے بلکہ میں یہ کہوں گی کہ اس نے ہر جگہ اپنی ٹانگ پھنسائی ہوئی تھی اور وہ ایک کامیاب زندگی گزار رہا تھا۔''

''کیا اس نے تم سے کبھی رابطہ کرنے کی کوشش کی؟''

''تمہارا مطلب ہے سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انجیلا اور گل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلادیا۔ ''وہ ایسا کیوں کرتا؟'' گل نے کہا۔

اس کے بعد چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ میں نے ویٹرس کو بل لانے کے لیے اشارہ کیا۔

انجیلا ہمیں شب بخیر کہہ کر اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ میں اور گل ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھے مے نوشی کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ گل کے دماغ میں کچھ چل رہا ہے جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند لمحوں بعد وہ بول اٹھا۔

''جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو ایلیکس! انجیلا کئی سالوں سے سارا بوجھ خود اٹھا رہی ہے۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جیسی بیوی ملی۔''

''تم دونوں کی ملاقات کیسے ہوئی؟''

''مجھے جرمنی آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ ایک دن میں ایک بڑے ریستوران کے میلے میں گیا۔ وہاں میں نے اس خوبصورت، پُرکشش نوجوان عورت کو دیکھا تو بے تاب دل مچل گیا اور اسے رقص کی دعوت دے دی...... جسے اس نے مسکراتے ہوئے قبول کرلیا۔ جب وہ میری بانہوں میں آئی تو یوں لگا جیسے میں فضاؤں میں تیر رہا ہوں اور میرے دائیں بائیں اور نیچے بادلوں کا سایہ ہے۔''

''وہ مشرقی باویریا کے ایک گاؤں ریم ڈورف سے آئی تھی جو چیکوسلواکیہ کی سرحد کے قریب ہی ہے۔ میری طرح اسے بھی میونخ آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔''

''اس کے علاوہ بھی تم دونوں میں کوئی بات مشترک تھی؟''

''بہت کم۔ بہرحال ہماری ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور جلد ہی میں یہ محسوس کرنے لگا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا اور ایک حسین شام میں نے اسے شادی کی پیشکش کردی جسے اس نے مسکراتے ہوئے قبول کرلیا اور یوں ہم شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا پھر اس نے پنیر کا ٹکڑا کاٹا اور اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں جیل میں پانچ سال رہا۔ یہ عرصہ مجھ سے زیادہ اس کے لیے پریشان کن تھا لیکن اس نے بڑی ہمت سے حالات کا مقابلہ کیا اور اپنا چھوٹا سا بوتیک چلا کر حالات کا مقابلہ کرتی رہی۔ وہ بہت

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

ہی بہادر، حوصلہ مند اور باہمت عورت ہے۔ اسی نے مجھے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دی۔''

اب وہ کچھ مضطرب نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور بولا۔ ''تم جانتے ہو ایلیکس...... مجھے یقین نہیں آتا کہ ہمارا یہاں ملنا محض ایک اتفاق ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، اس نے کہا۔ ''تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟''

''تمہیں معلوم ہے کہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں اور کسی کے لیے کام نہیں کر رہا۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص مجھے قصوروار سمجھ رہا ہے۔ کوئی ہے جو مجھے اس قتل میں ملوث کرنا چاہتا ہے جو ابھی تک نہیں بھولا کہ میں نے سرکاری راز بیچے تھے۔''

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور بولا۔ ''میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس سے پہلے میری ایجنسی کے دو پرانے ساتھی بھی یہی ٹوہ لینے آئے تھے۔''

''اگر کوئی یہ جاننا چاہ رہا ہے کہ گریگوروف کو کس نے قتل کیا تو تم صرف اس لیے اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ فرض کرو اگر پولیس تم سے پوچھ گچھ کرنے آئے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تمہیں ملزم سمجھ رہے ہیں۔ وہ دوسروں کے لیے پریشانی پیدا کرنے والا بدنام زمانہ شخص تھا۔ اسی لیے لوگوں کو حیرت ہو رہی ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔''

''ایسے درجنوں لوگ ہوں گے جو [illegible] کرتے تھے اور اسے قتل کرنا چاہتے ہوں گے لیکن تم لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔''

''کسی نے تم پر کوئی الزام نہیں لگایا۔ تم غیر ضروری ردعمل ظاہر کر رہے ہو۔''

''ممکن ہے کہ میں بہت سادہ لوح ہوں یا مجھ سے سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے لیکن میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا دوست سمجھا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے ایک جرم سرزد ہوا اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے کبھی بات کرنا پسند نہیں کریں گے لیکن میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو۔''

''جیسا کہ میں نے کہا گل کہ تم غیر ضروری ردعمل کا اظہار کر رہے ہو۔'' میرا دماغ تیزی سے چل رہا تھا اور میں کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ گل پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہے کہ کس طرح اس ملاقات کا ہی نہیں بلکہ دوستی کا بھی خاتمہ کرنا ہے۔

اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''شب بخیر ایلیکس اور خدا حافظ۔''

☆☆☆

میں اس معاملے کو اسی جگہ ختم کر سکتا تھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ گل شاید ٹھیک کہہ رہا ہے۔ واشنگٹن ڈی سی میں اس کے کچھ دشمن ہیں۔ ایسے لوگ جو اس بات پر ناخوش ہوں گے کہ اس نے جیل میں صرف پانچ سال کیوں گزارے اور یہ کہ وہ یورپ میں ایک پُرسکون زندگی کیسے گزار رہا ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جیری شین بھی اسے گریگوروف کے قتل میں پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس امکان کو یکسر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ گل کے دشمن اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس کیس کے سلسلے میں مزید لوگوں سے بھی بات کرنی چاہیے۔

☆☆☆

''تمام کیمرے بالکل ٹھیک حالت میں ہیں اور کام کر رہے ہیں۔'' وہ ہوور ٹاورز ہوٹل کا سیکیورٹی ڈائریکٹر تھا۔ یہ وہی ہوٹل تھا جس میں گریگوروف ٹھہرا ہوا تھا اور وہیں اس کا قتل ہوا۔ وہ حلیے کے اعتبار سے کسی طرح بھی ڈائریکٹر نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے آدھی آستین کی قمیص اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے ہوٹل کا کوئی [illegible] لگا۔ [illegible] اس [illegible] کا [illegible] ہے۔ ہم اس کے دفتر میں بیٹھے اس کی کمپیوٹر اسکرین پر ہوٹل کے مختلف کیمروں سے لی گئی تصویریں دیکھ رہے تھے۔

ایک تصویر میں پینٹ سوٹ میں ملبوس عورت ایک سوئٹ سے لانڈری کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی باہر آرہی تھی۔ ''یہ گریگوروف کا سوئٹ ہے۔'' میزو نے بتایا۔ ''اور یہ عورت گریٹا جونز اس ہوٹل کی ایگزیکٹو ہاؤس کیپر ہے۔'' ہم نے دیکھا کہ ایک خادمہ وہاں آئی اور ہاؤس کیپر نے اسے راہداری کے آخری سرے پر بھیج دیا۔

ہم بیس منٹ تک مختلف تصویریں دیکھتے رہے جو ہوٹل کی آٹھویں منزل پر نصب مختلف کیمروں سے لی گئی تھیں لیکن ان میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ البتہ ایک تصویر کچھ مختلف نظر آئی جس میں گریگوروف کا محافظ دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ایک منٹ بعد وہ سوئٹ سے باہر آیا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے راہداری میں بھاگنے لگا۔

''یہی وہ شخص ہے جس نے آکر بتایا کہ گریگوروف کا

قتل ہو گیا ہے۔'' میزو نے کہا اور کمپیوٹر بند کر دیا۔ ''اس کے علاوہ میں تمہیں کیا دکھا سکتا ہوں؟ تم نے جن لوگوں کو راہداری میں دیکھا، ان میں خادمائیں، دو محافظ اور ہاؤس کیپر شامل تھی۔''

میں نے کہا۔ ''اس عورت کے بارے میں کیا کہو گے جو اس سے ملنے آئی تھی؟''

میزو نے اس خیال کو مسترد کر دیا اور بولا۔ ''پہلے میں نے بھی اس کے بارے میں سوچا تھا۔ تقریباً ہر رات کوئی نہ کوئی عورت اس کے کمرے میں ہوتی تھی لیکن اس عورت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ صبح چھ بج کر اٹھائیس منٹ پر چلی گئی تھی اور اس کے بعد سات بجنے میں دس منٹ پر گریگوروف نے ناشتے کے لیے فون کیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ اس وقت زندہ تھا جب وہ عورت گئی؟''

''اس لیے وہ عورت قاتلہ نہیں ہو سکتی۔ میرے علاوہ پولیس نے بھی اس سے پوچھ گچھ کی تھی۔ وہ رات کو ساڑھے دس بجے اس کے پاس آئی تھی اور وہ جتنی دیر اس کے کمرے میں رہی، اس نے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ''میں ایک بات اور بتانا چاہتا ہوں۔ گریگوروف کے محافظ ان عورتوں کو اوپر لے کر [illegible] چاہتے تھے کہ وہ ہوٹل کی لابی [illegible] گولف کے ذریعے اوپر جاتی تھیں۔''

''اس میں کیا مصلحت تھی؟''

''لابی میں ہر طرف کیمرے لگے ہوتے ہیں۔ لوگ انہیں دیکھ سکتے تھے۔''

''کیا کار گولف میں کیمرا نہیں ہے؟''

''باڈی گارڈ اسے بند کر دیا کرتا تھا۔''

یہ کہہ کر میزو نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں پھر سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''اوہ ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ کیوں نہ میں تمہیں سب لوگوں کے کوائف دکھا دوں تاکہ تمہاری تسلی ہو جائے۔'' یہ کہہ کر اس نے فائل کیبنٹ سے ایک فولڈر نکالا اور میں ان لوگوں کے کوائف دیکھنے لگا جن کی ڈیوٹی اس روز آٹھویں منزل پر تھی۔

''یہ مسز ایموس ہے۔'' میزو نے کہا۔ ''وہ دراز قد سیاہ بالوں والی خادمہ یہاں دس سال سے کام کر رہی تھی۔ یہ مسز کلیری ہے۔ اس کا تعلق آئرلینڈ سے ہے اور یہ بھی بہت اچھا کام کرتی ہے۔ یہ مسز جینی ہے۔ یہاں آنے سے پہلے جارجیا کے ہوٹل میں کام کرتی تھی۔'' میں نے سب کے کوائف غور سے دیکھے۔ ان میں مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ سب سے آخر میں میزو نے مجھے مسز جونز کے بارے میں بتایا۔

''یہ یہاں پر ایگزیکٹو ہاؤس کیپر ہے۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے بیس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ بہت تجربہ کار اور تمام معاملات کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک کامیاب منتظم ہے جو جانتی ہے کہ چیزوں کو کس طرح ٹھیک کیا جاتا ہے۔''

''ایگزیکٹو ہاؤس کیپر کی حیثیت سے یہ اس کی ذمے داری ہے کہ تمام کمرے درست حالت میں ہوں اور کہیں کوئی بے ترتیبی نظر نہ آئے۔'' میں نے کہا تو میزو نے سر ہلا دیا۔ میں نے ایک بار پھر گریٹا جونز کے کوائف غور سے دیکھے اور تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ جرمنی سے ہجرت کر کے امریکا آئی تھی اور باویریا کے ایک چھوٹے سے قصبے کی رہنے والی تھی۔

اس شام میں نے اسے فون کیا اور کہا کہ میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں تو اس نے جواب دیا۔ ''کل میں سارا دن مصروف رہوں گی۔'' وہ جرمن لہجے میں روانی سے انگریزی بول رہی تھی۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں [illegible] لیکن میں چار بجے ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد تم سے مل سکتی ہوں۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے کہا۔

اگلے روز جب وہ چار بجے کے بعد ہوٹل سے باہر آئی تو میں داخلی دروازے کے بالکل سامنے سڑک کے دوسری جانب ایک نیوز اسٹینڈ کے پاس کھڑا تھا۔ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

''میرا نام ایلیکس گراہم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟''

''میں شہر کے بالائی حصے میں رہتی ہوں اور مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے۔''

میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ دو بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے تجویز پیش کی کہ کہیں بیٹھ کر ایک پیالی چائے پی جائے لیکن اس نے انکار کر دیا، تب مجھے کہنا پڑا۔ ''میں تم سے گریگوروف کے قتل کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے کندھے اچکائے اور بولی۔ ''ٹھیک ہے۔''

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

ہم ایک کیفے کے عقبی حصے میں بیٹھ گئے۔ جب ویٹرس چائے رکھ کر چلی گئی تو گریٹا نے پوچھا۔ ''کیا تمہارا تعلق ایف بی آئی سے ہے؟ میں پہلے ہی سب کچھ بتا چکی ہوں۔''

''نہیں۔ میرا ایف بی آئی یا پولیس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں گل پرسیل اور انجیلا کا دوست ہوں۔''

اس کی بھویں تن گئیں تو میں نے کہا۔ ''کیا تم انجیلا پرسیل کو نہیں جانتیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں...... میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔''

مجھے اس پر بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ وہ ٹال مٹول کر رہی ہے تاہم اس کے جواب سے مجھے یقین ہو گیا کہ میرے شبہات درست تھے۔

''تم باویریا کے قصبے ریم ڈورف کی رہنے والی ہو اور انجیلا کا تعلق بھی اسی قصبے سے ہے۔''

''مجھے وہ جگہ چھوڑے ہوئے پچیس بلکہ تیس برس ہونے والے ہیں۔ میں وہاں رہنے والے ہر فرد کو تو یاد نہیں رکھ سکتی۔''

''لیکن تمہیں انجیلا کو تو یاد رکھنا چاہیے۔ تم نے اسے چند ہفتے پہلے ہی دیکھا ہے۔''

گریٹا کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے دونوں بازو سینے پر رکھ لیے جیسے وہ کپکپا رہی ہو۔ میں نے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں کون ہوں۔ ایک بار پھر بتا رہا ہوں کہ میں انجیلا کے شوہر کا سابق ساتھی ہوں۔ اب تمہارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اگر تم یہی کہتی رہیں کہ انجیلا کو نہیں جانتیں تو مجھے پولیس سے بات کرنا ہوگی اور میں انہیں بتاؤں گا کہ مجھے کیا شبہ ہے۔''

اس نے تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''کیسا شک؟''

''یہی کہ انجیلا نے گریگوروف کو قتل کیا ہے۔ میں انہیں یہ بھی بتاؤں گا کہ میرے خیال میں تم نے اس کی مدد کی تھی اور یہ واقعہ کس طرح پیش آیا۔ اس کے بجائے میں تم سے بات کرنا......''

''پھر بھی تم پولیس کو بتاؤ گے؟''

''میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں انجیلا اور اس کے شوہر کا دوست ہوں۔'' میں نے ''دوست'' پر زیادہ زور دیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ انجیلا کے پاس گریگوروف کو قتل کرنے کی کوئی معقول وجہ ہوگی۔''

گریٹا نے ٹھنڈی سانس بھری اور آہستہ سے بولی۔

''انجیلا کی ماں میرے باپ کی بہن ہے۔ اس رشتے سے وہ میری کزن ہے۔ بہت سے لوگ گریگوروف کو قتل کرنا چاہتے ہوں گے لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی انجیلا سے بہتر وجہ نہیں ہوگی۔''

''تم نے اسے ممکن بنا دیا۔ ہوٹل کی ایگزیکٹو ہاؤس کیپر ہونے کی وجہ سے تم جانتی تھیں کہ یہ کام کس طرح ہوگا۔ تم اپنے اسٹاف کی نقل و حرکت کو کنٹرول کرتی ہو۔ تم نے ایسا بندوبست کر دیا کہ وہ سیکیورٹی کیمروں سے بچ کر آٹھویں منزل تک پہنچ جائے۔''

''اگر سیکیورٹی کیمروں کی پوزیشن معلوم ہو تو ان سے بچ نکلنا آسان ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے کام زیادہ مشکل تھے۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً گریگوروف کے سوئٹ میں داخل ہونا۔ میں اسے رات کو ہی لے آئی تھی۔ جب اس کے سیکیورٹی گارڈز چلے گئے تو وہ الماری میں چھپ گئی۔''

''یعنی وہ رات بھر الماری میں چھپی رہی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''جب دوسری عورت چلی گئی تو انجیلا نے گریگوروف کو گولی مار دی لیکن وہ کیمرے کی نظر سے بچ کر سوئٹ سے باہر کیسے آئی؟''

''[illegible] میں پہنچا دی تھی۔ انجیلا چادروں اور کمبلوں کے نیچے چھپ گئی۔ گریگوروف پہلے ہی مر چکا تھا۔ میں نے خادمہ سے کہا کہ وہ دوسرا کمرا تیار کرے۔''

''اور تم ٹرالی دھکیلتی ہوئی راہداری میں لے گئیں؟''

''ہاں۔ ایک خادمہ کو میں نے کام پر لگا دیا اور دوسری بریک پر گئی تھی۔ وہاں میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ میں کارگو لفٹ کے ذریعے ٹرالی نیچے لے کر آئی کیونکہ انجیلا کو تہ خانے تک لے جانا ضروری تھا۔''

''کیوں؟''

''لابی میں کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ اگر وہ وہاں سے گزرتی تو کوئی اسے دیکھ سکتا تھا۔ ایک کیمرا تو تہ خانے میں بھی ہے لیکن گریگوروف کے محافظ نے اسے عارضی طور پر بند کر دیا تھا تاکہ گریگوروف کے پاس آنے والی دوسری عورت کسی کی نظروں میں نہ آئے۔ تہ خانے کا دروازہ اور باہر کا گیٹ کھلا ہوا تھا کیونکہ مزدور کچرے کے خالی ڈرم

لے کر آ رہے تھے۔ کسی نے بھی ہم پر توجہ نہیں دی۔ وہ بیس منٹ میں ہوٹل سے باہر چلی گئی جبکہ لاش دو گھنٹے بعد دریافت ہوئی۔''

''ہاں میں نے وہ تصویر دیکھی تھی جس میں ایک محافظ کمرے سے دوڑتا ہوا باہر آ رہا تھا۔ آلۂ قتل کہاں گیا؟''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے فرضی نام سے وہ گن نیوجرسی کی ایک نمائش میں خریدی تھی۔ اسے چلانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ ہوٹل سے نکل کر انجیلا فیری بوٹ میں سوار ہو گئی اور اس نے وہ ہتھیار پانی میں پھینک دیا۔''

اس قتل کے لیے جو منصوبہ بندی کی گئی تھی، میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس کا سہرا گریٹا کے سر تھا کیونکہ وہ ایک اچھی منتظم تھی۔

''شاید مجھے انجیلا کی مدد نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''وہ تمہاری کزن تھی۔ میرا خیال ہے اس لیے......''

''اس سے بھی بڑھ کر ایک اور وجہ تھی۔ اگر تم اس کے شوہر کے دوست ہو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ گریگوروف نے اس کے ساتھ کیا چالاکی کی تھی؟''

جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔

''صرف گریگوروف کی وجہ سے انجیلا اپنے شوہر سے پانچ سال دور رہی۔ جب وہ جیل سے واپس آیا تو اس کی ساکھ تباہ ہو چکی [illegible] جانتے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا [illegible] اب وہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ بہت سے لوگ اس [illegible] ہو گئے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' مجھے اس سے اپنی آخری ملاقات یاد آ گئی۔

''جب اس کا شوہر جیل میں تھا تو گریگوروف نے انجیلا کو ورغلانے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ خاندانی رئیس ہے۔''

''جبکہ سرد جنگ کے خاتمے پر اس کے پاس دولت آئی تھی۔''

''ہاں پھر اس نے شیخی بگھارتے ہوئے انجیلا کو بتایا کہ کس طرح اس نے ان کا کاروبار تباہ کیا۔ اس نے صرف انجیلا کے شوہر کو ہی برباد نہیں کیا بلکہ انجیلا کے خواب بھی چکنا چور کر دیے جو وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی کہ وہ خود ملبوسات کی ڈیزائننگ کرے گی۔ اس کا اپنا کاروبار ہوگا۔ اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ یہاں تک کہ آنٹی سے ملنے والی ساری رقم بھی جس کا اسے بہت افسوس تھا۔''

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔ وہ ان کا بزنس کیسے تباہ کر سکتا تھا؟''

''یہ شروع سے ہی اس کے منصوبے میں شامل تھا۔ کے جی بی میں کرنل کے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے پرسیل کو نشانہ بنایا۔ اس کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور دوسرے ملکوں میں بھی اس کی جان پہچان کے لوگ تھے۔ چنانچہ اس نے کچھ ایسا بندوبست کیا کہ ہانگ کانگ اور یورپی ممالک کی سرحدوں پر ان کا سامان رک جائے۔ اس تاخیر کی وجہ سے ان کے ڈیزائن بے وقعت ہو گئے۔ اس طرح اس نے ان کے کاروبار کو شدید نقصان پہنچایا اور انجیلا کا شوہر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا لیکن بعد میں وہ اس سے ناراض ہو گیا تھا، جب گل نے اس کے لیے مزید کام کرنے سے انکار کر دیا۔''

''چنانچہ اس نے گل کو پھنسوا دیا اور وہ جیل چلا گیا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں۔ انجیلا کا کہنا تھا کہ وہ ان کی زندگی تباہ کر کے بہت فخر محسوس کر رہا تھا۔ شاید تمہارے علم میں ہو کہ اس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور ہر ایک نے اس کی بات کا یقین کر لیا۔'' وہ لمحہ بھر کو رکی پھر اس نے کہا۔ ''لیکن وہ ایک کام نہیں کر سکا۔''

''وہ کیا؟''

''وہ اپنی موت کو نہیں روک سکا۔''

☆☆☆

چار مہینے بعد میں چھٹیاں منانے ایک بار پھر سوئٹزرلینڈ کے اسی قصبے میں آیا جو اپنے معدنی چشموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ دراصل میں نے جوئے میں ایک بڑی رقم جیتی تھی اور میں تھکن اتارنے کے لیے گرم پانی سے غسل کرنے آیا تھا۔ میں نے ایک شخص کو اپنا گاؤن اتارتے اور تالاب میں غوطہ لگاتے دیکھا۔ وہ گل پرسیل تھا گو کہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن سر سے خفیف سا اشارہ کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس کے پیچھے انجیلا تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور اس نے گرمجوشی سے ہاتھ ہلایا۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اس کی کزن نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے اور اسے اطمینان ہے کہ اس کا راز میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔ جو بات اس کے شوہر اور ساری دنیا کو معلوم نہیں...... اسے میں کیسے زبان پر لا سکتا ہوں۔ ویسے بھی اس نے گریگوروف کے ساتھ جو کیا، وہ اس میں حق بجانب تھی۔ ایسے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

http://urdutubes.com/

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے [illegible] وجود [illegible] وقت [illegible] بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

Digitized by Google

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ”علی“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹا میگڈالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقتِ رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی ٹفنی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا۔ یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے [illegible] میں واقع ”سرکل اے“ نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ”سرکل اے“ میں گھس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو فی نکس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ”وِنی لاؤنج“ نامی ایک ریسٹورنٹ میں ہسپانوی دوشیزہ شارو دا اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس نے علی کے دردل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات وِنی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔ اس مارا ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر رخصت ہو گئی...... اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ وِنی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز شارو کو لیونارڈو نے اغوا کر لیا۔ علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا۔ بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیبلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ علی نے طیش کے عالم میں پیبلو کو قتل کر دیا۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت [illegible] انکل [illegible] کو صورت [illegible] ہوسٹن پہنچ گیا۔ اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے [illegible] لینے کا فیصلہ کیا۔ [illegible] ہوئے پر ڈیلفینا [illegible] بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے علی کو پیبلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال...... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہوسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی...... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے بنگلے میں پراسرار شخصیات ربی آئزک بارُوخ لاؤ اور ایمل بام سے علی کی ملاقات بھی کروا دی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک جیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ”اسکل اینڈ بونز“ سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے؟ جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ”اسکل اینڈ بونز“ کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے سٹی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی

مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ علی نے تیاری کی اور ہوسٹن سے کراچی آ گیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہو گئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے وزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دی۔ کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کر کے علی کی والدہ کو قتل کر دیا۔ علی نے تہیہ کر لیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔ علی نے تمام حقیقت بینا کو بھی بتا دی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور ہمراز بن گئی تھی۔ علی کو اس کی رہائش گاہ کے پتے پر ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا اعتراف کیا گیا تھا۔ علی نے نادر شاہ کو چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ نادر شاہ کو اغوا کر کے اس سے سچ اگلوایا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادر شاہ کو اغوا کرایا۔ تاہم ان میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کر کے بتایا کہ ان کے آدمیوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادر شاہ اور اغوا کنندگان پولیس کی تحویل میں پہنچ گئے تھے۔ علی نے فوری طور پر بنگلا چھوڑ دیا اور بینا کے ہمراہ اس کے فلیٹ پر آ گیا۔ علی نے بنگلے پر جمشید کو چھوڑا تھا اور خاص نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ علی کو دو جرمن شیفرڈ کی مدد سے تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس کے درپردہ ڈیلفینا کا ہی ہاتھ تھا۔ علی نے نادر شاہ کو سبق سکھانے کے لیے اسے قابو کیا اور بدترین تشدد کر کے اسے محتاجی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا اور اپنی ماں کے بنگلے کو نذرِ آتش کر دیا۔ علی کو ایک عورت کی مدد سے ٹریس کر لیا گیا اور نامعلوم جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں ایک شخص ملا جس نے علی کو بتایا کہ وہ راس آئی لینڈ پر ہے جہاں اسے چالیس دن گزارنے تھے۔ وہیں اسے ایک لڑکی مل گئی جس سے دوستی ہونے پر اس نے بتایا کہ وہ اسکل اینڈ بونز کے لیے کام کرتی ہے اور اسے جان بوجھ کر وہاں بھیجا گیا ہے۔ بعد میں پیڈرو نامی شخص آیا جسے علی نے پہچان لیا کہ وہ چنگیز خان ہے۔ علی نے اسے اذیت ناک موت دی اور اپنے انتقام کی آگ بجھائی۔ کایا نے علی کو اشارہ دیا کہ وہ بھی اپنے دشمن کو اسی طرح اذیت دے کر مارنا چاہتی ہے۔ علی کے اس استفسار پر اس نے بتایا کہ سوسائٹی کے ممبر آسکر نے اس کے بھائی کو قتل کیا ہے اور وہ اس سے بھیانک انتقام لینا چاہتی ہے۔ پروگرام کے مطابق جب آسکر کایا کو لینے آیا تو علی کی مدد سے اسے قابو کر لیا گیا اور کایا نے اسے بھیانک موت دی۔ علی نے آسکر کا روپ دھار لیا اور کایا اور وہ بذریعہ جہاز کرائسٹ چرچ ائرپورٹ پر لینڈ کر گئے۔ علی اور کایا ایک ولا میں پہنچ گئے، مگر اسکل اینڈ بونز نے انہیں ٹریس کر لیا۔ وہ دونوں وہاں سے نکلے اور کافی مارا ماری ہوئی۔ تاہم وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہے۔ وہ دونوں ایک موٹل میں ٹھہرے جہاں [illegible] کایا کو اغوا کر لیا گیا۔ علی اس کی مدد کے لیے گیا، [illegible] جی ایم سر نے علی کو آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے [illegible] بینک ڈپوکس نکلوا دی۔ جی ایم سر چلے گئے مگر علی کو آئندہ کا لائحہ عمل بتا گئے۔ علی کو جہاز میں ایک لڑکی روماٹل ملی۔ اس نے ایک جگہ فائرنگ کر کے کسی کو جان سے مارنا چاہا۔ نتیجے میں کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے۔ علی نے بھی اس کا تعاقب کیا اور روماٹل کا تعاقب کرنے والوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ کافی مارا ماری کے بعد وہاں سے بھاگ نکلا۔ راستے میں اس نے ایڈتھ نامی لڑکی کی مدد کی اور اس کے ہمراہ میونخ آ گیا۔ وہاں ہوٹل میں ویٹر نے علی کو کسی عورت کی آمد کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ علی تجسس میں نیچے پہنچا تو وہاں روماٹل تو ریز موجود تھی۔ اچانک وہاں زوردار دھماکا ہوا اور روماٹل علی کو لے کر ہوٹل سے نکل گئی۔ وہ دونوں ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ روماٹل نے علی کی اصلیت کھوج لی اور کہا کہ اسے ایک مشن میں علی کی مدد درکار ہے۔ سوئے اتفاق وہ جس مشن پر جا رہی تھی وہیں شارو بھی موجود تھی، اسے سائنس داں فریڈرک کی تجربہ گاہ سے کچھ فائلیں چرانا تھیں۔ علی اور وہ وہاں پہنچے۔ روماٹل نے وہاں کارروائی کی اور شارو کے ہمراہ نکل گئی۔ علی وہاں سے فوکسی کار میں نکلا تو ریڈاول اس کے تعاقب میں تھی۔ علی نے اس میں سینئر بونز مین رابرٹ کو دیکھا۔ علی نے راستے میں رابرٹ کو قابو کر لیا اور اس کے ساتھ عبرتناک تشدد کر کے اسے زندہ چھوڑ دیا تاکہ سوسائٹی والوں کو عبرت ہو۔ اس کے بعد علی اومسک دینارا کے اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔ اپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی اس کی کھوپڑی سے سرد نال آ لگی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جو اپارٹمنٹ شارو کے لیے کسی مضبوط قلعے کی حیثیت کا حامل تھا، وہ میرے لیے ایک چوہے دان ثابت ہوگا۔ میں دینارا کے اپارٹمنٹ کو جائے امان سمجھ کر بلاخوف و خطر اندر داخل ہو گیا تھا اور پھر عقب سے ایک گن کی ٹھنڈی ٹھار نال میری کھوپڑی سے آ لگی تھی۔ میں اس غیر متوقع صورتِ حال کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بے رحم نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

http://urdutubes.com/

"دونوں ہاتھ اوپر......!"

تحکمانہ انداز میں بولنے والی اس عورت نے انگلش کا سہارا لیا تھا اور لب و لہجے سے وہ کسی اہلِ زبان کی طرح انگریزی کی ماہر لگتی تھی۔ میرے پاس سرِدست اس کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ میں اس رشین اپارٹمنٹ میں "تھرڈ ورلڈ وار" لڑنے نہیں آیا تھا۔ یہ دو منزلہ مکان ایک مہربان اور میری خیرخواہ عورت کی رہائش گاہ تھی۔ میزبان کے جذبات کا احترام ہر مہمان پر لازم ہے لہٰذا میں نے بیگ کو ڈراپ کیا اور بے چون و چرا "ہینڈز اپ" ہوگیا۔

میرے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند ہوتے ہی مجھے... بہ دستور گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تمہاری جس امریکی لیفٹیننٹ دوست نے تمہیں یہاں بھیجا ہے، اس کی رشین آئی ڈی بتاؤ؟"

اس کے استفسار پر میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس اپارٹمنٹ (ڈبل اسٹوری مکان) میں صرف دو عورتیں موجود تھیں۔ ایک شارو اور دوسری دینارا۔ مجھ سے ہم کلام وہ عورت شارو تو ہرگز نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بلاشک و شبہ وہ دینارا تھی۔ اس تفتیشی عمل کے ذریعے وہ مجھے اپنی تسلی کے [illegible] مراحل سے گزار رہی تھی۔

"اگافونیکا......!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "فرام اومسک۔"

اگلے ہی لمحے دینارا نے گن کو میری کنپٹی سے ہٹالیا اور میرے سامنے آگئی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں موجود سائیلنسر لگی گن پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور بازو نیچے گرا کر کندھے اچکا دیے۔

"مسٹر علی! آئی ایم رئیلی ویری سوری۔" دینارا نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "تم دونوں کی حفاظت کے پیشِ نظر یہ سب بہت ضروری تھا۔ تم اسے سیکیورٹی چیک سمجھ لو۔"

بات کے اختتام پر دینارا نے دوستانہ انداز میں مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"اِٹس او کے!" میں نے سرسری انداز میں کہا اور اس کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کو گرمجوشی سے تھام لیا۔

"میرا نام دینارا ہے۔" وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی۔ "یہ ڈبل اسٹوری اپارٹمنٹ میری ذاتی ملکیت ہے۔ تمہاری دوست شارو بالائی منزل پر ہے۔ آؤ، میں تمہیں اس کے پاس لے چلتی ہوں۔"

بات کے اختتام پر وہ بالائی منزل کی جانب جانے والے زینے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے فرش پر سے اپنا بیگ اٹھایا اور دینارا کی تقلید میں زینے کی سمت قدم اٹھانے لگا۔

میری نظر میں دینارا کی اقامت گاہ ایک ڈبل اسٹوری مکان تھا لیکن پہلے جیسیکا نے اور پھر دینارا نے اس گھر کے لیے "اپارٹمنٹ" کے الفاظ استعمال کیے تھے لہٰذا میں نے اسے اپارٹمنٹ ہی سمجھنے کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ کرلیا۔

دینارا ایک خوش شکل، دراز قامت عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے چالیس اور پچاس کے درمیان قائم کیا۔ وہ ایک چاق و چوبند اور تر و تازہ روسی عورت تھی۔ دینارا نے جس مہارت کے ساتھ مجھے گن پوائنٹ پر رکھا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آتشیں اسلحے کے استعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔

اس سوکالڈ اپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی مجھے جس نوعیت کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس میں میری یادداشت نے میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ ایلپن روز نامی اس قدیم روایتی گیسٹ ہاؤس سے (Munchen) ایروکلب کی جانب سفر کے دوران [illegible] مجھے [illegible] ڈیز کے بارے میں بتایا تھا جن میں ان کی ایک آئی ڈی رشین بھی تھی۔ اس آئی ڈی کے مطابق وہ اومسک (رشیا) میں رہنے والی ایک شہری اگافونیکا تھی۔ جیسیکا کے الفاظ میری یادداشت میں چپک کر رہ گئے تھے جو اس وقت میرے بہت کام آئے تھے۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے زینے طے کرکے اپارٹمنٹ کی بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ دو سو مربع گز پر بنا ہوا ایک پرانی طرزِ تعمیر کا حامل دو منزلہ مکان تھا۔ مکانیت کے لحاظ سے بالائی منزل پر دو بیڈ روم، ایک لیونگ روم (ڈرائنگ روم) اور ٹی وی لاؤنج بنا ہوا تھا۔ دونوں بیڈ روم اٹیچڈ باتھ نہیں تھے۔ ایک کشادہ واش روم الگ سے بنا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں اپارٹمنٹ کا کچن بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔ تمام کمرے خاصے کھلے ڈلے اور ہوادار تھے۔

دینارا مجھے اپارٹمنٹ کی بالائی منزل پر پہنچا کر واپس چلی گئی۔ جاتے ہوئے اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے

ایک لفافہ نکال کر میری جانب بڑھا دیا تھا۔ میں نے چپ چاپ وہ لفافہ لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ مذکورہ لفافہ لیفٹیننٹ جیسیکا کی طرف سے تھا۔

شارو لیونگ روم میں موجود تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر بے تابی سے میری سمت بڑھی۔ میں بھی اضطراری قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔ اگلے ہی لمحے ہم دونوں اومسک کی ٹھنڈی ٹھار مگر خوشگوار فضا میں دو قالب یک جان ہوچکے تھے۔

موسمِ سرما یعنی جنوری فروری میں اومسک کا درجۂ حرارت منفی تیرہ ڈگری سینٹی گریڈ تک چلا جاتا ہے۔ آج کل چونکہ موسمِ گرما یعنی ماہ اگست چل رہا تھا لہٰذا اومسک کا ٹمپریچر بیس ڈگری سینٹی گریڈ کے آس پاس منڈلاتا پھرتا تھا۔ پروفیسر فریڈرک کے ریسرچ سینٹر پر ہمیں زیادہ دیر تک ملاقات کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن اس اپارٹمنٹ پر کسی نوعیت کی ہنگامی صورتِ حال نہیں تھی اس لیے ہم کافی دیر تک دل کھول کر ایک دوسرے کو اپنے اندر اتارتے رہے۔

جب جذبات کا منہ زور طوفان گزر گیا اور ہم اپنی [illegible] اور دوسرے کو سننے کے قابل ہوئے تو لیونگ روم میں [illegible] صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے بالائی [illegible] بارے میں سب کچھ بتانے کے بعد ایک نظر [illegible] چہرے پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بویرین ایلپن سے اومسک تک آنے میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"علی!" اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "ٹرین کے ذریعے اتنا طویل سفر کرنا اگرچہ کوئی خوشگوار تجربہ نہیں لیکن یہ تکلیف ان صعوبتوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو میں نے اب تک تمہارے فراق میں برداشت کی ہیں۔"

بات کے اختتام پر شارو کا چہرہ تھکن، تکدر اور بیزاری کے ملے جلے تاثرات سے سج گیا تھا۔ میں اس کی اذیت اور تکلیف کو بہ آسانی سمجھ سکتا تھا۔ میں نے برلن سے ماسکو تک ٹرین میں سفر کیا تھا اور اس مسافرت نے میرا جوڑ جوڑ تھکا کر رکھ دیا تھا۔ شارو نے تو ماسکو سے اومسک تک بھی بہ ذریعہ ٹرین ہی سفر کیا تھا۔

"ہمارے بیچ حائل تمام رکاوٹیں ہٹ گئی ہیں شارو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس بات کا یقین کرلو کہ ہم مل چکے ہیں اور مالک کے کرم سے اب ہم ملے ہی رہیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتی۔"

"کاش ایسا ہی ہو علی!" وہ بولی۔

"تمہیں کس بات کا ڈر ہے شارو؟"

"علی! تم نے مجھے جن لوگوں کے قبضے سے چھڑایا ہے، وہ بہت طاقتور ہیں۔" وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ "میں نے ان کے اختیارات کے مظاہرے کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ وہ تمہیں سکون سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔"

"جہاں تک ہمارے سکون سے کہیں بیٹھنے کی بات ہے تو اس کے لیے تمہیں فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں نے ہمارے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ کا بندوبست کرلیا ہے۔ ایک ایسی جگہ جہاں ہمارے دشمن غلطی سے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ باقی......" میں نے لمحے بھر کو توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں...... میں نے کیا بلکہ جیسیکا نے تمہیں پروفیسر فریڈرک کے ریسرچ سینٹر سے آزاد کرا کے رشیا کے [illegible] شہر اومسک تک پہنچایا ہے۔ کیا تم پروفیسر کے اختیار اور طاقت کی بات کررہی ہو؟"

"نہیں......" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "پروفیسر فریڈرک تو ایک مشفق، مہربان اور عظیم انسان ہیں۔ ان کے ریسرچ سینٹر پر تو میں نے بہت اچھا وقت گزارا ہے......"

"پھر تم کن لوگوں کی طاقت اور اختیار کا ذکر کررہی ہو؟" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سوال کردیا۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ شارو مجھ سے کیا کہنا چاہ رہی تھی لیکن میں اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"میں تمہارے ان دوست نما دشمنوں کی بات کررہی ہوں جو اس کرۂ ارض کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ وہ تمہیں بھی اپنی سوسائٹی کا حصہ بنانا چاہتے ہیں۔ وہ خود کو زمینی خدا کہتے ہیں۔ ان کے اشارے پر اس دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ بدل جاتا ہے۔"

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''کیا میرا فکرمند ہونا بے معنی ہے......؟''

''نہیں!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تم نے ''اسکل اینڈ بونز'' کا بالکل درست تجزیہ پیش کیا ہے۔ میں جانتا ہوں، یہ شیطان کے سچے پیروکاروں کی سوسائٹی ہے۔ یہ لوگ ابلیس کی پوجا کرتے ہیں اور شیطان کی علامت، ایک مخصوص سینگوں والے، بکرے سے مشابہ جانور بیفومے (Baphomet) کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں لیکن میں ان کی اصلیت سے بخوبی آگاہ ہوں اس لیے کسی بھی قیمت پر میں ان کے بچھائے ہوئے جال میں نہیں پھنس سکتا۔ تمہیں بالکل اندازہ نہیں ہے کہ میں نے ''اسکل اینڈ بونز'' کو اب تک کتنا ٹف ٹائم دے رکھا ہے......''

''ہاں واقعی......'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''تم مجھ سے بچھڑنے کے بعد کیا کیا کرتے پھر رہے ہو، مجھے اس کا بالکل اندازہ نہیں ہے۔''

بات کے اختتام پر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ شارو میری زبان سے بیتے ہوئے دنوں کا احوال سننے کی متمنی تھی۔

میں اگرچہ اسے اپنے حالات کے حوالے سے کافی کچھ بتا چکا تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے [illegible] ہو۔ چنانچہ اب کی بار میں نے نہایت [illegible] الفاظ مگر جامع انداز میں اسے اپنی اب تک کی کارگزاری سے آگاہ کر دیا۔ اس آگاہی میں ڈیلفینا، بینا، کایا، جیسیکا اور رابرٹ کا ذکر خاص طور پر آیا۔ میں نے شارو کو یہ بھی بتایا کہ چند روز قبل میں نے بویرین ایلپس کے برف پوش پہاڑوں میں رابرٹ کے ساتھ کون سا ''شاندار'' سلوک کیا ہے۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ شارو پروفیسر فریڈرک کے لیے اپنے دل و دماغ میں اچھے جذبات رکھتی تھی۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر اس نے صرف اپنے مطلب کا سوال کیا۔

''بینا، کایا اور جیسیکا کے علاوہ اور کس کس سے تمہاری دوستیاں چل رہی ہیں؟''

میں سوچ کی نگری میں اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔ ''اور کسی سے نہیں۔'' میں نے اس کی تشفی کی خاطر وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''کایا کے حسرت ناک انجام کے بارے میں، میں نے تمہیں تفصیلاً آگاہ کر دیا ہے۔ بینا اس وقت ایس این بی کے قبضے میں ہے۔ ان لوگوں نے میری معلومات کے مطابق بینا کو اسرائیل میں کہیں رکھا ہوا ہے اور ہاں......''

میں نے رک کر ایسی نظر سے شارو کو دیکھا جیسے اچانک مجھے کچھ یاد آ گیا ہو۔

''کیا ہوا علی۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ''تم بولتے بولتے رک کیوں گئے؟''

''میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ ایک اور عورت بھی چند روز تک میری دوست رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا نام ایڈتھ تھا۔ وہ تازہ تازہ بیوہ ہوئی تھی اور نئی زندگی شروع کرنے کے لیے وہ بار سلونا سے میرے ساتھ ہی میونخ پہنچی تھی پھر میں تمہاری تلاش میں زگرپٹ زے کی جانب بڑھ گیا تھا اور ایڈتھ اس وقت کہاں ہو گی، مجھے اس کا علم نہیں۔''

شارو نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی پھر کریدنے والے انداز میں بولی۔ ''تم ایڈتھ کے علاوہ ایک اور ہستی کے بارے میں بھی مجھے بتانا بھول گئے ہو۔''

''کون ہستی؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں جیسیکا کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ بہ دستور شک زدہ نظر سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جو روما تل توریز کی حیثیت سے تمہاری زندگی میں آئی، پھر ڈاکٹر برجت [illegible] ریسرچ سینٹر پہنچی [illegible]''

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں جیسیکا کی موجودہ لوکیشن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ٹھہرو...... میں کوشش کرتا ہوں۔''

''کیسی کوشش؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے شارو کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنی جیب میں سے وہ لفافہ نکال لیا جو تھوڑی دیر پہلے دینارا نے مجھے دیا تھا، میں نے مذکورہ لفافے کو کھول کر دیکھا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ خط جیسیکا کی طرف سے تھا۔

میں نے شارو کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دومنٹ پلیز......''

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں جیسیکا کا خط پڑھنے لگا۔ اس نے اب کی بار مجھے میرے اصلی نام سے مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''علی! جیسا کہ پچھلے خط میں، میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نے لینگلی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر رشین دوستوں کو جوائن کر لیا ہے۔ مجھے اس امر میں ذرا سا بھی شبہ نہیں تھا کہ لینگلی والے اس مشن کے اختتام پر مجھے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے۔ میں لینگلی کی سفاکی اور کینہ پروری کو اچھی طرح جانتی ہوں لہٰذا میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ حتمی فیصلہ کیا ہے۔ اب زندگی کی آخری سانس تک میری تمام تر خدمات ''ایس وی آر'' کے لیے ہیں۔ لینگلی والے تو یہی سمجھ رہے تھے کہ میں ان کے لیے پروفیسر فریڈرک کے ریسرچ سینٹر پر ایک اہم تحقیقاتی فائل چرانے جا رہی ہوں لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں نے یہ کام رشیا کی ایک خفیہ ایجنسی ایس وی آر (SVR) کے لیے کیا ہے۔ اس مشن میں دراصل میں SVR ہی کے پینل پر تھی۔ میں نے لینگلی کی بے مروتی اور احسان فراموشی سے بددل ہو کر اپنی جان کی حفاظت کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے۔ R22 ہیلی کاپٹر کے ذریعے میں ریسرچ سینٹر سے منشن (Munchen) ایروکلب نہیں گئی تھی بلکہ راستے ہی میں ایک مقام پر میرے رشین دوستوں نے مجھے پک کر لیا تھا۔ میں نے وہاں R22 کو چھوڑا اور اپنے نئے دوستوں کے ساتھ چلی گئی۔ مذکورہ ہیلی کاپٹر کو ادھر برف پوش پہاڑوں کے بیچ ہی میں بلاسٹ کر دیا گیا تھا تاکہ وہ کوئی حادثہ نظر آئے اور لینگلی والوں کا دل اپنے تو [illegible] جیسیکا انتہائی [illegible] ملک عدم ہو چکی...... علی! [illegible] دوست شارو کو ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اس وقت تم بھی یقیناً شارو کے آس پاس ہی موجود ہو۔ تمہارا جب تک دل چاہے اس اپارٹمنٹ میں اسٹے کر سکتے ہو اور جب من چاہے، رخصت ہو سکتے ہو۔ تم پر کسی نوعیت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ دینارا کے اس اپارٹمنٹ پر تمہیں کوئی تکلیف یا پریشانی نہیں ہو گی۔ میں نے تمہیں بہت اچھی طرح یاد رکھا ہوا ہے اور میری کوشش ہو گی کہ زندگی کے کسی موڑ پر تم سے دوبارہ ملاقات ہو۔ کب اور کہاں؟...... اس بارے میں، میں نہ تو کچھ جانتی ہوں اور نہ ہی بتا سکتی ہوں......!''

میں نے جیسیکا کا وہ خط شارو کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو، تم خود پڑھ لو...... اور جیسیکا کے بارے میں سب کچھ جان لو۔''

شارو نے میرے ہاتھ سے وہ خط لے لیا تو میں سوچنے لگا کہ جیسیکا کا یہ فیصلہ درست تھا یا غلط۔ زندگی بعض اوقات انسان کو ایسے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے کہ فیصلہ کرنے کے لیے اس کے پاس صرف دو ہی آپشن ہوتے ہیں۔ نمبر ایک کنواں، نمبر دو کھائی۔ جیسیکا بھی ان لمحات میں کچھ اسی نوعیت کی صورتِ حال سے دوچار تھی۔ اس نے موت کے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کے بجائے زندگی کی کھائی میں کودنے کو ترجیح دی تھی۔

ایس وی آر (فارن انٹیلی جنس سروس، رشیا فیڈریشن) بڑی فعال ایجنسی ہے۔ یہ KGB کے متوازی کام کرتی ہے اور KGB ہی اس کے وجود کی ذمے دار بھی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم (1939-46) کے بعد دنیا کی دو بڑی طاقتوں امریکا اور رشیا کے درمیان لگ بھگ چوالیس سال (1947-91) تک سرد جنگ (Cold war) جاری رہی تھی۔ اسی دوران میں رشیا فیڈریشن میں SVR نے جنم لیا تھا۔

شارو نے جیسیکا کا وہ خط تسلی سے پڑھ لیا تو ہمارے بیچ کچھ دیر تک جیسیکا کے حوالے سے بات ہوتی رہی۔ شارو نے اس گفتگو کے اختتام پر مجھ سے کہا۔

''علی! تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ ہمارے مستقبل کے حوالے سے تم نے ایک محفوظ پناہ گاہ کا انتظام کر لیا ہے۔ یہ تو میرے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ میں اس کی تفصیل جاننا چاہتی ہوں۔''

قبل اس کے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، دینارا نے [illegible] زراد پر پہنچا دیا۔ کھانے کے دوران میں، میں نے شارو [illegible] جبرالٹر والے اپنے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کے بارے میں بتایا اور آخر میں کہا۔

''اگرچہ وہ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ ہے لیکن ہماری ضرورت کے لیے کافی ہے۔''

''علی! میری کائنات تو تم ہو۔'' وہ بڑی بھرپور نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''گھر چھوٹا ہو یا بڑا یا پھر سرے سے گھر ہو ہی نہ...... تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر تم میرے ساتھ ہو تو پھر مجھے کسی کمی کی پروا نہیں، کسی دکھ یا پریشانی کا احساس نہیں۔ تم مجھے جہاں بھی رکھو گے، میری جنت وہیں پر ہے۔''

''تم فکر نہ کرو شارو۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''ہم دونوں مل کر اپنی محبت سے اس اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کو تاج محل بنا دیں گے۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بڑی فدائی نظر سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ اس کی یہ پراسرار خاموشی بڑی معنی خیز تھی۔

ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو میں نے اس کے

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

JBD

جہانگیر بکس — نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 550/-
اندھیری رات کے مسافر 475/-
ثقافت کی تلاش 300/-
قیصر و کسریٰ 625/-
اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-
گمشدہ قافلے 500/-
داستانِ مجاہد 300/-
پردیسی درخت 450/-
یوسف بن تاشفین 500/-
معظم علی 475/-
خاک اور خون 550/-
کلیسا اور آگ 450/-
قافلۂ حجاز 599/-
محمد بن قاسم 425/-
پورس کے ہاتھی 300/-
انسان اور دیوتا 450/-
پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-
آخری چٹان 450/-
سو سال بعد 225/-
سفید جزیرہ 325/-
شاہین 475/-

سبق آموز کتب سلسلہ

اقوال حضرت علی المرتضیٰ 165
اقوال آئمہ کرام 165
حکایات گلستان سعدی 195
اقوال شیخ سعدی 140
حکایات رومی 160
دلچسپ و عجیب حقائق 170
حکایات بوستان سعدی 199
150
180
165

اردو لغت (جامع ترین)

جہانگیر بک ڈپو
042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

چہرے کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''شارو! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''کیا ہوا ہے میری حالت کو......!'' وہ اپنے چہرے کو چھوتے ہوئے الجھن زدہ انداز میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''میں نے جب تمہیں پروفیسر کے ریسرچ سینٹر پر دیکھا تھا تو تم بڑی تر و تازہ اور چاق و چوبند نظر آئی تھیں اور اب تمہارا چہرہ اترا ہوا ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے بھی نظر آ رہے ہیں۔ کیا اتنے دنوں تم نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا یا مسلسل جاگتی چلی آ رہی ہو؟''

''ہاں، یہ دوسری بات ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کھانا تو میں برابر کھا رہی ہوں لیکن میں جب سے ریسرچ سینٹر سے نکلی ہوں، ایک لمحے کے لیے بھی میری آنکھ نہیں لگی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کیوں نہیں سو پائی ہو؟ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے......؟''

''وہ بات یہ ہے علی کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس ریسرچ سینٹر پر موجود ہم دس کی دس لڑکیوں کو رات کو سونے سے پہلے باری باری پروفیسر ایک مخصوص دم کیا کرتا تھا جس سے ہم گہری نیند میں چلی جایا کرتی تھیں۔ اب چونکہ پروفیسر وہ مخصوص دم کرنے کے لیے موجود نہیں ہے، اس لیے [illegible] آ رہی۔''

شارو کے جواب نے میری تشویش میں گہری فکرمندی بھی شامل کر دی۔ گویا وہ پچھلے چار پانچ روز سے مسلسل جاگ رہی تھی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ اس سوچ بچار کے دوران میں، میں یک ٹک اسے تکتا چلا جا رہا تھا۔ میری محویت کے پیشِ نظر اس نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو......؟''

''آں...... کچھ نہیں!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

جب پروفیسر فریڈرک کے ریسرچ سینٹر کے کمرا نمبر سات میں شارو نے مجھے پروفیسر کے دم کرنے کے بارے میں بتایا تھا تو میرا ذہن اسی وقت الجھن کا شکار ہو گیا تھا اور فوراً سے پیشتر میرا دھیان ہپناٹزم کی طرف گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق پروفیسر شارو سمیت ان دس لڑکیوں کو فرداً فرداً تنویمی نیند سلاتا تھا۔ پروفیسر کے اس عمل کو شارو نے دم کا نام دیا تھا۔ شارو نے مجھے بتایا تھا کہ جب وہ لوگ سونے کے لیے آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتی تھیں تو پروفیسر کسی نامانوس زبان میں کچھ پڑھتا رہتا تھا جس کے اثر سے وہ گہری نیند میں چلی جاتی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ پروفیسر ہپناٹزم کے ذریعے انہیں مخصوص سجیشنز دیا کرتا تھا۔ ایسی سجیشنز اسی وقت دی جاتی ہیں جب معمول کے ذہن میں کسی بات کو فیڈ کرنا ہو۔ ہپناٹزم کے عمل کے دوران میں آبجیکٹ (معمول) کا تحت الشعور مکمل طور پر سبجیکٹ (عامل) کے قبضے میں ہوتا ہے۔ ہپناٹزم کا ماہر مخصوص سجیشنز (ترغیبات) کے ذریعے اپنے معمول کے تحت الشعور میں جو بھی بات بٹھا دیتا ہے نیند سے بیدار ہونے کے بعد معمول ان احکامات کی پابندی کرتا ہے، بالکل ایک بے دام کے غلام کے مانند...... میں چونکہ علم نفسیات کا طالب علم ہوں اس لیے پروفیسر فریڈرک کی ''کارستانی'' کے ذیل میں، میں نے یہ تفصیل بیان کر دی ہے۔ میرے جواب پر شارو نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''کچھ نہیں...... کا کیا مطلب ہوا؟''

''میں سوچ رہا تھا کہ پروفیسر فریڈرک تو یہاں موجود نہیں ہے۔'' میں نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا میں ہی تمہاری نیند کا بندوبست کر دیتا ہوں۔''

''اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔'' وہ خوش [illegible] ہوئے بولی۔ [illegible] ہے کہ تم مجھے سلانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔''

''تو تم تیار ہو......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

جب سے میں شارو سے ملا تھا، دماغ کے کسی حصے میں موجود اور سر اٹھاتی ایک خطرناک سوچ بار بار مجھے تنگ کر رہی تھی۔ میں نے اپنی اسی الجھن کے پیشِ نظر کہا۔

''شارو! تمہیں نیند کی وادی میں پہنچانے سے پہلے میں تمہارے ساتھ کچھ کرنا چاہتا ہوں...... اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو......؟''

''میں تمہارے کسی بھی عمل پر اعتراض کر سکتی ہوں اور نہ ہی تمہاری کسی بات سے انکار۔'' وہ الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس وقت تم مجھ سے کیا چاہتے ہو......؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے اپنے خدشے کی روشنی

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

میں نہایت ہی نرمی سے کہا۔ ''میں تمہاری مکمل باڈی سرچ کرنا چاہتا ہوں۔''

''باڈی سرچ!'' اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا تمہیں شک ہے کہ میں نے اپنے لباس میں کوئی خطرناک ہتھیار چھپا رکھا ہے؟''

''نہیں!'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں کسی بھی حال میں تم پر شک نہیں کرسکتا۔ تم میری زندگی ہو۔ اگر تمہارے پاس کوئی آتشیں اسلحہ ہے بھی تو وہ تم نے اپنی حفاظت کے پیشِ نظر کیری کر رکھا ہوگا۔ تمہاری حفاظت کا مطلب ہے...... میری حفاظت!''

''تو پھر......'' اس کی الجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ ''اس باڈی سرچ کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے؟''

''میں اپنا ایک شک رفع کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیسا شک علی؟'' وہ متعجب نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''میں پوری تفصیل کے ساتھ تمہیں بتا چکا ہوں کہ کراچی سے مجھے قابو کرنے کے بعد سوسائٹی والوں نے ایک مائنر آپریشن کر کے میرے پیٹ کے زیریں حصے میں ایک ننھی سی ٹریکنگ ڈیوائس چھپا دی تھی جو انہیں پل پل میری لوکیشن کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اندیشہ ہے کہ ان لوگوں نے تمہارے وجود میں بھی کوئی ٹریکنگ ڈیوائس نہ چھپا رکھی ہو۔''

''ہاں، تم نے مجھے اس بارے میں [illegible] ہے۔'' وہ اپنی گردن کو اثباتی جنبش [illegible] بولی ''تمہارے ایک روحانی پیشوا بی ایم سر نے تمہیں اس ٹریکنگ ڈیوائس سے نجات دلائی تھی لیکن میں سمجھتی ہوں......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''سوسائٹی والوں نے میرے ساتھ ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہوگی۔ اگر واقعتاً میری بے ہوشی کے دوران میں کبھی انہوں نے ایسا کچھ کیا ہوتا یعنی اس وقت اگر میرے اندر کوئی ٹریکنگ ڈیوائس موجود ہوتی تو اب تک وہ لوگ میری موجودہ لوکیشن کے بارے میں جان چکے ہوتے۔ پھر مجھ تک رسائی حاصل کرنے سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا تھا، یہ بات تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے شارو۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''کیا ذہن کے اطمینان اور دل کی تسلی کے لیے اگر میں تمہارے بدن کا تفصیلی معائنہ کرلوں تو اس میں کوئی حرج ہے؟''

''کوئی حرج نہیں۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''میں حاضر ہوں۔ تم جس طرح مناسب سمجھو، مطمئن ہوسکتے ہو۔''

آیندہ دس پندرہ منٹ میں، میں نے نہایت ہی توجہ کے ساتھ شارو کے ایک ایک انگ کو پوری تسلی کے ساتھ چیک کرلیا۔ اس کے بدن کے کسی بھی حصے پر مجھے کسی کٹ یا چوٹ کا نشان دکھائی نہیں دیا جس سے میرا دل مطمئن ہوگیا کہ سوسائٹی کی کسٹڈی میں، شارو کی بے خبری میں انہوں نے اس کے جسم میں کوئی ٹریکنگ ڈیوائس نہیں چھپائی تھی۔

''علی! کیا اب تم مطمئن ہو؟'' وہ لباس پہننے کے بعد مجھ سے مستفسر ہوئی۔ ''یا کوئی اور ٹیسٹ کرنا چاہو گے......!''

''نہیں!'' میں نے پوری قطعیت سے کہا۔ ''میں نے اچھی طرح سے اپنا اطمینان کرلیا ہے۔ آؤ، اب میں تمہیں سلا دیتا ہوں۔''

میرے ''آؤ'' کہنے پر وہ کھنچی چلی آئی۔ میں اسے بستر پر لے آیا پھر اسے چت دراز ہونے کے لیے کہا۔ اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں بیڈ کے نزدیک ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اپنی آنکھوں کو بند کر کے بدن کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس [illegible] میں [illegible] زبان میں تم پر دم کیا کرتا تھا جس کے بعد تمہیں گہری نیند آجاتی تھی؟''

''ہاں بالکل۔ ایسا ہی ہوتا تھا۔'' اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

''میں بھی ایک نامانوس زبان میں تم پر دم کرنے جا رہا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں جو کچھ بھی کہوں گا، وہ یقیناً تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا لیکن ان الفاظ کی تاثیر سے تم گہری نیند میں چلی جاؤ گی۔''

''ٹھیک ہے......!'' اس نے کہا۔

''جب تک میں تمہیں تمہارے نام سے نہ پکاروں، تم جواب میں کچھ نہیں کہو گی۔ صرف میں بولوں گا اور تم توجہ سے سنو گی۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں جو کچھ بھی کہوں گا، تم اس کے مطابق عمل کرو گی۔''

''او کے علی!'' وہ بہ آہستگی بولی۔

''نہیں۔ ابھی میں نے تمہارا نام پکار کر بات نہیں کی

لہٰذا تمہیں جواب دینے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''امید ہے، اب تم میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوگی۔''

اب کی بار اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ چت پڑی رہی۔ گویا وہ میری بات کی تہ میں پہنچ گئی تھی۔ میں نے جیسیکا کی مہربانی سے رشین زبان کے جتنے الفاظ رٹے تھے، انہیں تاثر انگیز آواز میں آگے پیچھے جوڑ کر شارو کی سماعت تک پہنچانے لگا۔

''کریسنی وورابی! آنکھیں کھول دو۔''

شارو نے یکا یک اپنی آنکھیں کھول دیں اور بغیر پلکیں جھکائے بیڈروم کی چھت کو دیکھنے لگی۔ میں نے تنویمی عمل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''زولوتوئی اوریل! تمہاری پلکیں بوجھل ہو رہی ہیں نا...''

میں رشین الفاظ میں اسپینش اور انگلش کا بگھار بھی لگاتا جا رہا تھا اور یہی میری اصل سچویشن بھی تھیں جنہیں میں اردو میں لکھ رہا ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ شارو کی پلکوں میں اضطراری جنبش پیدا ہوئی جیسے واقعتاً اس کی پلکوں کا وزن معمول سے بڑھ گیا ہو۔

''تم اپنی پلکوں کے بوجھ کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرسکتی ہو۔'' میں نے [illegible] دار آواز میں کہا۔ ''[illegible] تمہاری آنکھیں بند ہو رہی ہیں... ہاں... تمہاری [illegible] بند ہو چکی ہیں......''

میں نے دیکھا، شارو کی آنکھیں مکمل طور پر بند ہوگئی تھیں اور اس کے سینے کا زیر و بم بہت ہلکی، بہت دھیمی سانس کے چلنے کا اعلان کر رہا تھا۔ میں نے رشین الفاظ کی آمیزش کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔

''خراشو...... تمہیں نیند آرہی ہے...... تمہاری نیند رفتہ رفتہ گہری ہوتی چلی جا رہی ہے لیکن اس نیند کے دوران میں بھی تم میری آواز کو واضح طور پر سن رہی ہو۔ میں تم سے جو کچھ بھی کہوں گا وہ تمہارے لاشعور پر نقش ہوجائے گا اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد تم میری ہدایات پر عمل کرو گی...... عمل کرو گی نا؟''

شارو کا ردعمل دیکھنے کے لیے آخری جملہ میں نے سوالیہ انداز میں ادا کیا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور بے حس و حرکت پڑی رہی۔ گویا وہ میری ہدایات کو یاد رکھے ہوئے تھی۔ میں نے کاؤنٹر چیک کرتے ہوئے کہا۔

''شارو! جواب دو۔ میری ہدایات پر عمل کرو گی نا؟''

''ہاں۔ میں عمل کروں گی۔'' وہ بوجھل آواز میں بولی۔

''خراشو!'' میں نے اسے شاباشی دیتے ہوئے کہا۔ ''پروفیسر فریڈرک نے اپنے دم کے دوران میں، تمہارے علم میں لائے بغیر تمہارے ذہن میں جو کچھ بھی اسٹور کیا ہے، نیند سے بیدار ہونے کے بعد تم ان تمام ترغیبات کو فراموش کردو گی۔ ان کی جگہ تم صرف میری کہی ہوئی باتوں کو یاد رکھو گی اور ان کے مطابق ہی عمل کرو گی۔''

اس مرتبہ میں نے چونکہ شارو کو مخاطب کر کے سچویشن نہیں دی تھیں لہٰذا وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے تنویمی عمل کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری نیند رفتہ رفتہ گہری ہو رہی ہے۔ میں تین تک کاؤنٹ ڈاؤن کروں گا۔ اس کے بعد تم نیند کی حسین وادیوں میں کھو جاؤ گی۔ تھری...... تم اپنے ماحول سے مکمل طور پر غافل ہوچکی ہو...... تم گہری نیند میں جا چکی ہو...... ٹو...... جب تک تمہاری نیند پوری نہیں ہوجائے گی اور تمہاری تھکن مکمل طور پر اتر نہیں جائے گی، تم اسی طرح میٹھی، گہری اور پُرسکون نیند سوتی رہو گی۔ ون...... بیداری کے بعد تم خود کو چاق و چوبند اور ہشاش بشاش محسوس کرو گی [illegible] جاؤ گی کہ تم کئی دنوں سے سو نہیں سکی تھیں......''

مجھے یقین تھا کہ اگر میں دو تین راتوں تک شارو کو مسلسل اس تنویمی عمل سے گزارتا رہا تو اس کے لاشعوری اور تحت الشعوری اوراق پر سے پروفیسر فریڈرک کی لکھی ہوئی ترغیباتی تحریر مٹ جائے گی اور اس کی جگہ میری کہی ہوئی باتیں نقش ہوجائیں گی۔

میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور ایک بھرپور نظر شارو پر ڈالی۔ حالتِ نیند میں وہ مجھے بہت معصوم، بہت ہی پیاری لگی۔ میرا دل بے اختیار اس کی جانب کھنچنے لگا لیکن ان لمحات میں کسی مستی کی گنجائش نہیں تھی۔ شارو چار پانچ دن کے رت جگے کے بعد بے خبر نیند سوئی تھی۔ اسے ڈسٹرب کرنا مجھے مناسب نہیں لگا اور میں نے اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے صرف ایک بوسے پر کمپرومائز کرلیا۔

☆☆☆

میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ رات کو سونے سے پہلے میں اپنے دماغ کو مخصوص ہدایات ضرور دیتا ہوں جس میں ایک خاص وقت تک میری گہری اور میٹھی نیند کے

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

علاوہ یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ اگر اس گھر کی چاردیواری کے اندر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کے حالات پیدا ہوجائیں تو وقتِ مقررہ سے پہلے ہی فی الفور میری آنکھ کھل جائے گی۔

اس رات کے آخری پہر میری آنکھ کھل گئی حالانکہ میں نے اپنے دماغ میں بیداری کے لیے اگلی صبح کا ''الارم'' لگایا تھا۔ اس خلافِ توقع بیداری نے مجھے تشویش میں مبتلا کردیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت صبح کے تین بج رہے تھے۔

شارو میرے پہلو میں بڑے سکون سے محوِ استراحت تھی۔ میں بھی بفضلِ مالک صحیح سلامت تھا۔ میں بستر سے نیچے اتر آیا اور بیڈروم کی کھڑکیاں اور دروازے کو چیک کیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا رات سونے سے پہلے میں نے چھوڑا تھا۔ میں نے اپنی سماعت کو بیڈروم سے باہر کے ماحول پر مرکوز کر کے وہاں کی خیر خبر لینے کی کوشش کی تو ہر طرف مجھے آرام اور سکون ہی محسوس ہوا۔ میں بیڈروم سے باہر نکل آیا اور اس اپارٹمنٹ کی زیریں منزل کی بن گن لی۔ اس جانب بھی امن وامان کا راج تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ہماری میزبان دینارا ابھی عافیت سے ہے۔ جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا تو پھر میری آنکھ وقتِ مقررہ سے پہلے کیوں کھل گئی تھی؟

یہ ایک ایسا سوال تھا کہ اس کا فوری [illegible] ناگزیر ہوگیا تھا۔ میں واپس بیڈروم [illegible] میں ڈوب کر حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران میں وقفے وقفے سے میری نگاہ شارو کی سمت بھی اٹھ جاتی تھی۔ وہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اسے میری ذہنی کیفیت کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ان لمحات میں، میں کس الجھن میں گھرا ہوا ہوں اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں شارو کو اپنی اس پریشانی کے بارے میں بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ بے چاری چار پانچ روز کے بعد آج اپنی نیند سو سکی تھی......اور......!

اس کے بعد میری سوچ کو بریک لگ گئے۔ جب خیالات کی گاڑی یکایک رکی تو میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور روشنی کے ایک تیز جھماکے نے صورتِ حال مجھ پر عیاں کردی۔ میں اپنی الجھن کی تہ میں اتر گیا اور یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آگئی کہ میں طے شدہ وقت سے پہلے کیوں بیدار ہوگیا تھا۔ ان لمحات میں ٹرین کا وہ منظر میرے ذہن میں تازہ ہوگیا جب میں نے اپنی فیلنگو کا اسٹیئرنگ شارو کی جانب گھما دیا تھا۔

ٹرین جیسے ہی برلن کے الیکوینڈر پلاٹز ریلوے اسٹیشن سے نکلی تھی، میں نے آنکھیں بند کر کے اپنی فیلنگو کو شارو پر مرکوز کردیا تھا پھر شارو کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں نے اپنے تخیل کی نگاہ سے شارو کو ایک آرام دہ بیڈ پر محوِ خواب دیکھا تھا۔ محوِ خواب ہونے کا سیدھا سیدھا مطلب تھا گہری نیند......لیکن شارو کا بیان تھا کہ اس نے پچھلے چار پانچ روز سے ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ نہیں لگائی تھی۔ اگر وہ اس رات حالتِ نیند میں نہیں تھی تو پھر وہ مجھے سوتی ہوئی دکھائی کیوں دی......؟

چند لمحے پہلے جس سوال نے میرے ذہن کو منتشر کررکھا تھا، اب وہ سوال پوری آب وتاب کے ساتھ میرے سامنے چمک اٹھا تھا۔ میں شارو کے بیان کو جھٹلا سکتا تھا اور نہ ہی اپنی فیلنگو کو کوئی الزام دے سکتا تھا لیکن یہ بھی طے ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور موجود تھی ورنہ یوں خلافِ پروگرام میری آنکھ کبھی نہ کھلتی۔ جب کافی دیر تک مجھے اس تضاد کا کوئی سبب سمجھ میں نہ آیا تو میں نے اس ایشو کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

اس بے وقت کی بیداری کے باعث میری نیند اڑ چکی تھی۔ شارو ہنوز پُرسکون نیند کو انجوائے کررہی تھی۔ بیڈروم [illegible] وٹی اور [illegible] فاصلے پر ایک کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں آنکھیں بند کر کے روحانی ریاضت میں مصروف ہوگیا۔

رات، تنہائی اور گہرے سکوت نے میری منزل آسان کردی۔ مجھے اپنی فیلنگو کو فوکس کیے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ میں نے خود کو فضا میں پرواز کرتا محسوس کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے مادی وجود کے اندر سے کوئی روحانی بدن بہ آہستگی باہر نکل کر ایک جانب اڑ گیا ہو۔ جیسے کوئی پرندہ، پنجرے سے نکل کر پھُر سے اڑ جاتا ہے۔ میں نے خود کو ایک عجیب سی کیفیت میں پایا۔ میرے احساسات بہت لطیف ہوگئے تھے۔ میں خود کو رنگ ونور کا ایک مجموعہ محسوس کررہا تھا جو ناقابلِ بیان تیز رفتاری سے کسی سمت اڑا چلا جارہا تھا۔ اس سفر کے دوران میں مجھے اپنے وجود کے وزن کا بالکل احساس نہیں ہورہا تھا۔ میری حیثیت روئی کے گالوں ایسی ہوگئی تھی۔ میں گریوٹی (کششِ ثقل) سے آزاد، بے سمت اور بے مہار آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ ہر گزرتے

لمحے کے ساتھ میری رفتار میں اضافہ ہورہا تھا۔ اس عمل کے دوران میں میرے جسم کا درجۂ حرارت خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا۔ میں خود کو پگھلتا ہوا محسوس کررہا تھا۔ اچانک مجھے ایک خوف ناک جھٹکا لگا اور میں نے خود کو ایک نامانوس ماحول میں پایا۔

وہ صدیوں پہلے کا زمانہ تھا۔ ہزاروں سال قبل مسیح کا کوئی دور۔ میں نے اس نوعیت کا ماحول ہالی وڈ کی ایک سپرہٹ فلم ''ون ملین ایئرز بی سی'' میں دیکھا تھا جب انسان جانوروں کے انداز میں انتہائی سادہ اور تکلیف دہ زندگی گزارا کرتا تھا۔ گویا میں نے وقت کے سفر میں ہزاروں، لاکھوں سال پہلے کے دور میں چھلانگ لگا دی تھی۔ میں صحیح طور پر نہیں بتا سکتا کہ وہ کون سا سن اور کون سا دور تھا۔ بس، مجھے ایک بات کا اندازہ تھا کہ وہ ماضی بعید کا کوئی عہد تھا۔

میں اس ماحول کو ابھی پوری طرح سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ واپسی کا سفر شروع ہوگیا ہے۔ ان لمحات میں، میں روشنی کی رفتار (تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ) سے محوِ پرواز تھا لہٰذا چند سیکنڈ میں... میں کہیں سے کہیں نکل گیا۔ جب میں نے وقت کے ساتھ سفر کرتے ہوئے کہیں ''لینڈ'' کیا تو پتا چلا کہ میں ماضی بعید سے چھلانگ لگا کر مستقبل بعید میں جا پہنچا تھا۔ اس دور میں انسان نے بہت زیادہ ترقی کرلی تھی اور کاریں سڑک پر چلنے کے بجائے فضا میں اڑ رہی [illegible] ناقابلِ یقین مناظر کو دیکھ کر [illegible] ان [illegible] ہوا اور میں یک بیک اپنے ماحول میں واپس آگیا۔ یعنی میں اوسک والے، دینارا کے اپارٹمنٹ کی بالائی منزل کے بیڈروم میں حاضر ہوگیا۔

اس ٹھنڈی ٹھار رات کے آخری پہر میرا پورا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ اس وقت بیڈروم کا درجۂ حرارت دس ڈگری سینٹی گریڈ کے آس پاس تھا لیکن میں گویا پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اپنی موجودہ حالت کو دیکھ کر مجھے وہ رات یاد آگئی جب کراچی کے ساحلی علاقے میں واقع بینا کے لگژری اپارٹمنٹ میں، میں شدید ترین گرمی کے موسم میں کمرا بند کر کے ایکسرسائز کررہا تھا۔ اس وقت میں ارادتاً اپنے جسم سے زیادہ سے زیادہ پسینا خارج کر کے لباس میں جذب کررہا تھا تاکہ ڈیلفینا کے سراغ رساں جرمن شیفرڈ کتوں کو گمراہ کرسکوں لیکن اس وقت جو کچھ بھی ہوا تھا اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ یہ اس گہرے استغراق کا نتیجہ تھا جس میں میری حیثیت ایک ''ٹائم ٹریولر'' ایسی تھی۔ اس کے حد درجہ بڑھ جانے والے ٹمپریچر کا مجھے دو تین مرتبہ پہلے بھی تجربہ ہوچکا تھا لیکن حالیہ سٹنگ میں، میں نے ایک بڑی کامیابی بھی حاصل کرلی تھی۔ اگرچہ میں دعوے کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے ماضی اور مستقبل کے کس کس عہد کی سیر کی تھی تاہم اس امر میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ میں نے ٹائم اینڈ اسپیس کی قید سے آزادی حاصل کرنے کی سائنس میں کسی حد تک مہارت ضرور حاصل کرلی تھی۔

ایک بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ خطرناک حد تک بڑھ جانے والا جسمانی درجۂ حرارت بھی اس روحانی پرواز کی راہ کی ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ ان تجربات میں جب بھی میرا ارتکاز ٹوٹا تو اس کا سبب یہی آؤٹ آف کنٹرول ٹمپریچر ہی تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا میں اپنے بدن کے اس تیزی سے بڑھتے ہوئے درجۂ حرارت کے معاملے پر کیسے قابو پاؤں......؟

ان لمحات میں میرے دل کے نہاں خانوں میں بڑی شدت سے یہ خواہش جاگی۔ ''کاش......اس وقت جی ایم سر میرے پاس ہوتے تو میں اپنی مشکل ان کے سامنے رکھتا۔ وہ میرے اس مسئلے کو لازمی حل کردیتے......!''

''آپ کا تو مجھے معلوم نہیں لیکن میں ''قبولیت کی گھڑی'' پر کامل یقین رکھتا ہوں کیونکہ زندگی میں بارہا میرا اس سے واسطہ پڑچکا ہے۔ ان لمحات میں بھی ایسا ہی ہوا [illegible] تھاہ گہرائی سے جی ایم سر کو یاد کیا تھا اور [illegible] سامنے والی دیوار کے اندر سے نکل کر میرے روبرو کھڑے ہوگئے تھے۔ مجھے یونہی محسوس ہوا تھا جیسے دیواروں جیسی کوئی رکاوٹ ان کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔ وہ خراماں خراماں چلتے ہوئے مجھ تک پہنچے تھے۔ یہ تو میرا احساس تھا کہ وہ دیوار کے اندر سے نمودار ہوئے ہیں ورنہ ان کی چال سے ایسا کچھ نہیں جھلکتا تھا۔

جی ایم سر کو اپنے سامنے پاکر میں یکلخت اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ مجھے کھڑا ہوتے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا اور اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

''اسد صاحب! آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔''

''سر! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کھڑے ہوں اور میں آپ کے سامنے بیٹھ جاؤں۔'' میں نے ارادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ میرے مینٹور ہیں۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپ کا احترام مجھ پر واجب ہے۔''

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

''احترام اور محبت کا تعلق اٹھ کر کھڑے ہوتے یا بیٹھے رہنے سے نہیں ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''آپ جس کو واجب الاحترام سمجھتے ہیں اس کی دی ہوئی تعلیمات پر عمل کریں اور آپ جس سے محبت کے دعویدار ہیں اس کے جذبات کی قدر کریں۔ بس تعلق کی پائیداری اور پاسداری کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

''سر! میں نے ہمیشہ آپ کو محترم سمجھا ہے اور آپ کی تعلیمات پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرتا رہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ پُرمعنی انداز میں بولے۔ ''اور آپ نے اس کوشش کے نتیجے میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل کرلی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے ماضی بعید اور مستقبل بعید میں جو دو چھلانگیں لگائی ہیں، میں اس پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مالک کرے زورِ تخیل اور زیادہ!''

''سر! آپ تشریف رکھیں نا۔'' میں نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے......''

''مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''جو بھی پوچھنا ہے، آپ کھڑے کھڑے پوچھ سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں، آپ کو باڈی ٹمپریچر نے پریشان کررکھا ہے۔''

میں نے چونک کر ان کی طرف [illegible] گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی! [illegible]''

میں نے اب تک جی ایم سر کے ساتھ جتنا وقت گزارا تھا اور ان کی ذات کے جو جو پہلو میرے سامنے عیاں ہوئے تھے، ان کی جن جن ذہنی صلاحیتوں سے مجھے آگاہی حاصل ہوئی تھی اور میں نے ان کے جس جس روحانی تصرف کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا، اس کے بعد اس نوعیت کے سوالات پوچھنے کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی کہ...... سر! آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟

جی ایم سر یعنی غلام مصطفیٰ سر سچے عاشق رسولؐ تھے اسی لیے انہوں نے خود اپنا نام غلام مصطفیٰ رکھ لیا تھا جس کا مخفف ''جی ایم'' بنتا تھا۔

''ایک طویل سفر طے کر کے میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنے آیا ہوں تاکہ آپ کے ذہن کی الجھنیں دور ہوجائیں۔'' وہ معتدل انداز میں بولے۔ ''جس میں سرفہرست مسئلہ آپ کے باڈی ٹمپریچر کا ہے۔ آپ اس کی وجہ سے کافی پریشان ہیں۔''

میں کچھ نہیں بولا اور ہمہ تن گوش ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کو اپنے اندر اتارتا چلا گیا۔ وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں مجھے بتانے لگے۔

''روحانی پرواز کے دوران میں انسانی جسم کا درجۂ حرارت یقیناً بڑھ جاتا ہے لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں کہ آس پاس موجود لوگوں کو یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ جہنم کی دیوار سے لگے بیٹھے ہیں۔ آپ کے ساتھ یہ معاملہ ایک خاص وجہ سے ہے۔ جب تک میں اس اہم نکتے کی وضاحت نہیں کروں، بات آپ کی سمجھ میں نہیں آسکے گی......''

انہوں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری اور بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

''اسد صاحب! جب آپ اپنی والدہ کے پیٹ میں تشریف لانے کے بعد زندگی سے ہمکنار ہو چکے تھے تو وہ وقت آپ کی والدہ کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ آپ کے والد کو ان کے دشمنوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور وہ شقی القلب لوگ آپ کی والدہ کی تلاش میں تھے تاکہ ڈھونڈ کر انہیں بھی اپنی دشمنی کی بھینٹ چڑھادیں اور آپ کی والدہ آپ کی حفاظت کی خاطر جگہ جگہ چھپتی پھرتی تھیں۔ آپ ان کے اندر موجود تھے اسی لیے وہ کسی بھی قیمت پر دشمنوں کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتی تھیں۔''

[illegible]

میرے والد صاحب کو قتل کرادیا تھا۔ وہ کمینہ شخص میری ماں کا بھی قصہ تمام کرنا چاہتا تھا لیکن قدرت نے ماں کا ساتھ دیا اور انہوں نے بحفاظت مجھے جنم دیا پھر میری سلامتی کے پیشِ نظر ماں نے ایک سال کی عمر میں مجھے امریکا بھجوادیا تھا۔

''میں سائنس کی بعض پیچیدہ اصطلاحات اور مختلف چیزوں کے نام استعمال کرنے پر مجبور ہوں اسد صاحب۔'' وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''اگرچہ ان میں سے بعض باتیں آپ کو بہت ثقیل محسوس ہوں گی لیکن آپ نے پوری توجہ سے انہیں سننا اور اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا ہے کیونکہ ان ثقیل باتوں کو سمجھے بغیر آپ اپنے معاملات کی حقیقت سے آگاہی حاصل نہیں کرسکیں گے......''

انہوں نے لمحاتی توقف کیا تو میں نے فرماں برداری سے کہا۔ ''سر! میں آپ کی زبان سے ادا ہونے والے ایک

ایک لفظ کو اپنے اندر اتار رہا ہوں۔ میرے لیے کچھ بھی ثقیل یا بور نہیں ہے۔ آپ ارشاد فرمائیں۔''

''حمل کے بعد پہلے چھ ماہ میں، ماں کے یوٹریس میں قدرتی طور پر ایک مخصوص انزائم (Enzyme) پیدا ہوتا ہے جو ''کاربو آکسی ٹیٹرا ہائیڈروٹیرن سینتھیز'' کہلاتا ہے جسے میڈیکل کی زبان میں ''سی پی ایچ فور'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انزائم CPH4 ایک خاص قسم کا مالیکیول بناتا ہے جسے کیوواسین (Queuosine) کہتے ہیں۔ کیوواسین مالیکیول شکم مادر میں کسی گلو کی طرح کام کرتا ہے۔ یہ [illegible] مضبوطی سے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر رکھتا ہے خصوصاً بونز سیلز کو کیونکہ انزائم CPH4 فولک ایسڈ (Folic Acid) کے اشتراک سے درحقیقت بچے کی ہڈیوں کی تشکیل کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ گویا یہ دونوں کسی بچے کی زندگی کے ابتدائی دنوں کے لیے ایک اکسیر ثابت [illegible] انزائم CPH4 انسان کی ذہانت کو بھی کنٹرول کرتا ہے اور یہ براہ راست ایک ہارمون (Hormone) کے [illegible] ہے۔ اس ہارمون کو میلاٹونن (Melatonin) کہا جاتا ہے۔ یہ ہارمون ایک گلینڈ سے خارج ہوتا ہے جو پنیل (Pineal) کہلاتا ہے۔ پنیل گلینڈ دماغ کے ایک دور [illegible] جسے اپی تھیلامس (Epithalamus) میں واقع [illegible]

[illegible] آپ کی سمجھ میں آرہی ہے نا......؟''

انہوں نے تھوڑی دیر کو رک کر سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا تو میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''جی سر......!''

''دماغ پر بوجھ تو محسوس نہیں ہورہا......؟''

''بالکل نہیں سر۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ان میں سے اکثر باتیں مجھے پہلے سے معلوم ہیں۔''

''ویری گڈ!'' انہوں نے ستائشی انداز میں مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''جب کوئی حاملہ عورت اپنے پیٹ میں موجود ''زندگی'' کے حوالے سے بہت زیادہ خطرات میں گھری ہوئی ہو تو اس کے ذہن کے خدشات، اندیشے اور واہمے غیر محسوس انداز میں پنیل گلینڈ کو معمول سے زیادہ متحرک کردیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اس کے یوٹریس میں انزائم CPH4 زیادہ مقدار میں پیدا ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ عام بچوں کی بہ نسبت مذکورہ بچے کی ہڈیوں کی تشکیل اور مضبوطی کہیں زیادہ ہوتی ہے اور وہ ذہانت میں بھی

بے مثال ہوتا ہے، جیسا کہ آپ کے معاملے میں ہوا۔ آپ ایک غیر معمولی انسان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم کوشش کر کے آپ نے ''ٹائم اینڈ اسپیس'' کے معاملے میں بہت زیادہ کامیابی حاصل کرلی ہے کیونکہ شکم مادر میں آپ کو CPH4 انزائم کافی زیادہ مقدار میں ملا ہے اور یہی سبب ہے، باڈی ٹمپریچر کے بے قابو ہونے کا......''

انہوں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا۔ میں صرف ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ وہ بتانے لگے۔

''ایک عام انسان زندگی میں اپنے دماغ کا دس سے بیس فیصد تک ہی استعمال کر پاتا ہے۔ آئن اسٹائن، نیوٹن اور انہی کے جیسے عبقری بیس سے چھبیس فیصد...... بس!''

''سر! میں اپنے باڈی ٹمپریچر کو کیسے کنٹرول کروں؟'' میں نے جی ایم سر کو رکتے دیکھ کر فوراً سوال کرڈالا۔

''میں اسی طرف آرہا ہوں۔'' وہ بڑی رسان سے بولے۔ ''لوگ اپنی باطنی آنکھ کو کھولنے، مطلب پنیل گلینڈ کو ایکٹویٹ کرنے کے لیے مختلف قسم کی مشقیں، روحانی مراقبے، عبادتیں، ریاضتیں اور طرح طرح کے جتن کرتے ہیں اور آپ کو یہ سب کچھ بائی برتھ مل گیا ہے۔ انسانی دماغ بہت پیچیدہ شے ہے۔ جدید میڈیکل ریسرچ کے مطابق [illegible] سوا ارب نیورانز (اعصابی سیلز) پر مشتمل ہے اور [illegible] ون [illegible] ڈریڈ بلین نیورانز (Neurons) ہر وقت مصروف کار رہتی ہیں۔ آپ کے نروس سسٹم میں چونکہ انزائم CPH4 کی مقدار ایک عام انسان کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے، اس لیے یہ مسئلہ پیدا ہورہا ہے۔ جب تک آپ نے ''ٹائم اینڈ اسپیس'' کے شعبے میں قدم نہیں رکھا تھا، سب کچھ نارمل چل رہا تھا۔''

''تو کیا سر، اس حد درجہ بڑھ جانے والے باڈی ٹمپریچر کو کنٹرول کرنے کا بھی کوئی طریقہ ہے؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''بالکل ہے...... لیکن۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولے۔

''لیکن یہ کہ...... آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''آپ صرف ایک چھوٹا سا کام پابندی کے ساتھ جاری رکھیں۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔''

''سر! میں سمجھا نہیں۔'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''مجھے کون سا کام کرنا ہے اور آپ کیا سنبھال لیں

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

گے؟''

جی ایم سر کی بات نے مجھے گھما دیا تھا۔ وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔

''میں نے آپ کو جو روحانی مشقیں بتائی ہیں، آپ انہیں نہایت پابندی کے ساتھ جاری رکھتے ہوئے روزانہ دو لونگ اچھی طرح چبا کر کھالیا کریں۔ آپ کا کام ختم۔ مجھے جو کچھ کرنا ہوگا، وہ آپ کی نیند کے دوران میں کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ بہت جلد آپ کا باڈی ٹمپریچر والا مسئلہ حل ہوجائے گا۔''

''سر! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھوں؟'' میں نے احترام بھرے لہجے میں کہا۔

انہوں نے مشفقانہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولے۔

''ہاں، پوچھیں۔''

''سر! کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟''

''ہاں...... میں زندہ ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔ ''لیکن آپ نے ٹرین کے سفر کے دوران میں ''ٹائم اینڈ اسپیس'' کے حوالے سے مستقبل قریب میں مجھ سے ویلنگٹن میں ملاقات اور روماتل کے ہمراہ سفر کے بارے میں جو کچھ بھی سوچا تھا، ان خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیں۔ میں نے مستقبل قریب کے اکاؤنٹ میں سے چھ ماہ کا عرصہ [illegible] آپ [illegible] دیا تاکہ آپ اپنے دشمنوں سے محفوظ رہ کر ان سے نمٹنے کے لیے خوب اچھی طرح تیاری کرلیں، لہٰذا آپ اس سلسلے میں اپنے ذہن کو نہ تھکائیں۔ میں نے روماتل کی ہمراہی میں آپ کے فضائی سفر اور کرائسٹ چرچ سے ویلنگٹن کے ساحلی ہٹ تک پیش آنے والے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو مستقبل کی ہسٹری سے ڈیلیٹ کردیا ہے۔''

''اوہ......'' میں نے حیرت بھری نظر سے ان کی طرف دیکھا اور بے تابی سے پوچھا۔ ''سر! کیا ایسا ممکن ہے کہ انسان مستقبل یا ماضی کا کچھ وقت چرالے اور پھر وقت کی ہسٹری میں سے اسے ڈیلیٹ بھی کردے؟''

''کیا آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آیا؟'' ان کی آنکھوں میں سوال ابھر آیا۔ ''میں نے جو کچھ کہا کیا آپ کو اس کی صحت پر کوئی شک ہے؟''

''ہرگز نہیں سر......'' میں نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''میں نے محض اپنی معلومات میں اضافے کے لیے یہ سوال کیا ہے۔''

''تو پھر آپ معلومات کے خانے میں یہ نکتہ درج کرلیں کہ ایسا کرنا عین ممکن ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''بس شرط یہ ہے کہ کوئی کرنے والا ہونا چاہیے اور...... ''ایسے کرنی والے'' اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔''

''جیسا کہ ابھی آپ مجھے نظر آرہے ہیں۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''میری ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں اسد صاحب۔'' وہ میرے کہے پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''انسان کبھی نہیں مرتا۔ موت صرف گوشت و پوست کے مادی جسم کو آتی ہے۔ انسان کی اصل شکل اس کی روح ہے جو کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی حالت میں ہمیشہ زندہ اور متحرک رہتی ہے اور جو لوگ صاحب تصرف ہوتے ہیں ان کی ارواح کچھ زیادہ ہی متحرک ہوتی ہیں۔ کیا آپ میری بات سمجھ گئے......؟''

''جی بالکل سمجھ گیا۔'' میں نے پورے تیقن سے جواب دیا۔

جی ایم سر کے چہرے پر ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے ان کے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہو۔ جب وہ بولے تو میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''آپ [illegible]

''[illegible] لینڈ اسٹریٹ سے غیر محسوس انداز میں چھ ماہ کی چھلانگ لگا کر ویلنگٹن کے ویسٹ پیک (West pac) اسٹیڈیم میں ون ڈے کرکٹ میچ دکھانے لے گئے تھے، کیا میں بھی اسی انداز میں کسی دوسرے شخص کو ماضی یا مستقبل کی یاترا پر لے جاسکتا ہوں؟'' میں نے ایک بہت ہی اہم سوال کیا۔

''بالکل...... کیوں نہیں۔'' انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن......''

''لیکن کیا سر؟'' ان کی ادھوری بات پر میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''ابھی آپ اس ہنر میں کچے ہیں۔'' انہوں نے گمبھیر انداز میں صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو انفرادی طور پر بھی وقت کے ساتھ سفر کرنے میں کافی دقت محسوس ہو رہی ہے۔ باڈی ٹمپریچر بھی آپ کے لیے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اگر آپ میری ہدایات پر پابندی سے عمل کرتے رہیں گے تو رفتہ رفتہ اس فن میں مشاق اور طاق ہوتے چلے جائیں گے۔ پہلے خود ٹائم ٹریول کا مرحلہ طے

جب اس میں آپ کو مہارت حاصل ہوجائے گی اس کے بعد آپ کسی اور کو بھی اپنے ساتھ کہیں لے جانے کے بارے میں سوچیے گا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ کو اس تکنیک پر عبور حاصل کرنے میں چھ ماہ بھی لگ سکتے ہیں اور چھ سال بھی۔ یہ سب آپ کی لگن اور مالک کی دین پر منحصر ہے۔''

''سمجھ گیا سر۔'' میں نے اطمینان سے گردن ہلائی اور کہا۔ ''سر! میں نے حالتِ خواب اور حالتِ استغراق میں دیکھا ہے کہ سوسائٹی کے کرتا دھرتا میڈم ڈیلفینا سے میری شادی کرانا چاہتے ہیں۔ کیا وہ لوگ حقیقت کی دنیا میں اپنے اس مشن میں کامیاب ہوجائیں گے؟''

''یہ ان کی خواہش ہے اور اس خواہش کے پیچھے ان کے کچھ مقاصد پوشیدہ ہیں۔'' جی ایم سر نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''لیکن اس سلسلے میں انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ آپ کی صرف ایک ہی شادی ہے اور ڈیلفینا آپ کی بیوی نہیں ہوسکتی۔''

جی ایم سر نے بہت بڑا انکشاف کر ڈالا تھا۔ میں ان سے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''سر...... میری شادی کس سے ہوگی......؟''

''مجھے بتانے کی اجازت نہیں ہے۔'' وہ دوٹوک [illegible] بولے [illegible] کیا۔ [illegible] نے اسی [illegible] کو دوسرے انداز میں [illegible] آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری دوست شارو اس وقت میرے پاس ہے۔ آپ نے نیوزی لینڈ میں مجھے بتایا تھا کہ میری دوسری ساتھی پینا کو سوسائٹی والوں نے یروشلم (اسرائیل) میں رکھا ہوا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ پینا کب تک میرے پاس آجائے گی؟''

''جہاں آپ نے اتنا کچھ یاد رکھا ہوا ہے، وہاں آپ میری اس بات کو بھی نہیں بھولے ہوں گے......''

انہوں نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔ ''میں نے کہا تھا آپ کو شارو سے محبت ہوگئی ہے اور پینا آپ کے عشق میں مبتلا ہے۔ آپ فی الحال پینا کو فراموش کرکے صرف شارو پر توجہ دیں۔ پینا خود ہی آپ کو تلاش کرلے گی۔''

''جی، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ نے کراچی میں اپنے چینل کے عقب میں واقع ایک چھپر ہوٹل کے چوبی تخت پر بیٹھ کر مجھے بتایا تھا کہ ہم تینوں مثلث کے تین زاویوں کے مانند ہیں۔ میں اپنی گمشدہ دوست شارو کے پیچھے بھاگوں گا اور یہ میڈم پینا میرے تعاقب میں رہے گی......''

''اور آپ نے اپنی گمشدہ دوست کو تو پالیا ہے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولے۔ ''باقی رہ گئی میڈم پینا تو وہ بھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی حالت میں آپ تک ضرور پہنچے گی۔''

جی ایم سر کے چہرے کے تاثرات سے میں نے بخوبی اندازہ لگالیا کہ وہ مزید گفتگو کے موڈ میں نہیں ہیں۔ یہ ان کی کوئی آفاقی مجبوری تھی یا ذاتی مرضی...... اس بارے میں، میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں جانتا تھا۔ جسے میں نے اپنے جن مسائل کے لیے انہیں بے اختیار پکارا تھا، ان کے ممکنہ حل انہوں نے مجھے بتادیے تھے۔

''رات اپنا سفر ختم کرنے والی ہے۔'' انہوں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اب آپ کو سوجانا چاہیے تاکہ آپ صبح فریش اٹھیں اور مجھے بھی حالت نیند میں آپ کے تحت الشعور کے ساتھ تھوڑی اسپرچوئل انجینئرنگ کرنے کا موقع مل جائے۔''

میں کسی معمول کے مانند کرسی سے اٹھا اور جاکر بیڈ پر لیٹ گیا پھر میں نے سونے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ جی ایم سر میرے روحانی پیشوا، میرے میجور تھے۔ ان کے احکام کی تعمیل کرنا مجھ پر واجب تھا۔ گہری نیند کی وادی میں [illegible] سے پہلے میری سماعت نے جو آخری آڈیو سگنل کیچ [illegible] جی ایم سر کی آواز تھی۔ وہ ایک قیمتی راز میری یادداشت [illegible] منتقل کرتے ہوئے الفاظ کے موتی پرو رہے تھے۔

''وقت...... اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کائنات کا سارا نظام اسی کا رہین منت ہے۔ مشرق سے مغرب، شمال سے جنوب اور تحت الثریٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک وقت ہی کا سکہ چلتا ہے۔ وقت کائنات کی اکائی ہے اور کائنات میں موجود ہر شے کو اسی اکائی کی مدد سے ناپا اور تولا جاتا ہے، پرکھا اور برتا جاتا ہے اور یہ وقت...... بادشاہوں کے بادشاہ ''اللہ بادشاہ'' کے اشارۂ ابرو کا محتاج ہے۔ جس نے وقت پر تصرف حاصل کرلیا، اس نے کائنات کو تسخیر کرلیا۔''

☆☆☆

اگلی صبح بڑی سہانی تھی۔ شارو نے ایک بھرپور گہری نیند لے لی تھی جس کے صحت افزا اثرات سے وہ تروتازہ اور نکھری نکھری دکھائی دیتی تھی۔ اس کا موڈ بھی خاصا خوشگوار تھا۔ اس کی ساری تھکن اور بے آرامی قصۂ پارینہ بن چکی

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

تھی۔ شارو کا تعلق برازیل کے شہر ''ریو ڈی جنیرو'' سے تھا اور اس کی مادری زبان ہسپانوی تھی۔ اسپینش یعنی ہسپانوی (لاطینی) زبان میں ''شارو'' کے معنی ہیں...... خوب صورت پھول۔ وہ اس وقت شبنم میں دھلا ہوا ایک دلکش گلاب ہی لگ رہی تھی۔

دینارا نے ڈنر کی طرح ہمارے لیے ناشتا بھی بالائی منزل پر ہی پہنچا دیا تھا۔ وہ ہمارے لیے اپارٹمنٹ کی زیریں منزل پر خود ہی کوکنگ کر رہی تھی یا آرڈر پر باہر سے کھانا منگوا رہی تھی، اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ بہرحال دینارا، جیسیکا کے کہنے کے عین مطابق، بہت ہی پرخلوص کیئر ٹیکر تھی۔ اس نے بڑی توجہ اور محنت سے ہمارا خاص خیال رکھا ہوا تھا۔

ناشتے کے بعد ہم لیونگ روم میں آبیٹھے اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے آپس میں بات چیت کرنے لگے۔ میں نے شارو کو ابھی تک اپنی ''ٹائم ٹریولنگ'' کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ خدانخواستہ میں اپنی زندگی کا یہ راز اس سے چھپانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ دراصل، میں چاہتا تھا کہ پہلے میں اس ہنر میں مہارت حاصل کرلوں۔ اس کے بعد شارو کو اپنی اس صلاحیت کے بارے میں بتاؤں گا ورنہ وہ اٹھتے بیٹھتے اس سے متعلق سوال پوچھ پوچھ کر میرا ناک میں دم کردیتی۔

گزشتہ رات جس [illegible] سے پہلے بیدار کردیا تھا، اس کی [illegible] میں نے شارو کو کریدنا شروع کیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

''پچھلی رات تو تم بے خبر سوئی ہو۔ کافی دنوں سے جمع شدہ نیند میں کچھ تو کمی واقع ہوئی ہوگی؟''

''مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میری تمام تر نیند پوری ہوگئی ہے۔'' اس نے توانا لہجے میں جواب دیا۔ ''اب میں خود کو ایک دم فریش فیل کر رہی ہوں۔''

''اچھا یہ بتاؤ......'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔ ''پروفیسر فریڈرک کی لیبارٹری سے نکلنے کے بعد جتنے دن تک تمہیں نیند نہیں آئی، کیا اس دوران میں تم نے اپنے تئیں سونے کی کوشش کی تھی؟''

''کوئی ایسی ویسی کوشش!'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''پروفیسر تو روزانہ رات کو سونے سے پہلے مجھ پر کسی نامانوس زبان میں ایک خاص دم کیا کرتا تھا جس کے اثر سے مجھے نیند آجاتی تھی اور میں......''

شارو یہ بات مجھے پہلے بھی تفصیلاً بتا چکی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے یہ قصہ شروع کیا تو میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے اس کے بیان کے اسٹیئرنگ کو اپنی مرضی کے مطابق گھما دیا اور کہا۔

''ہاں مجھے یاد ہے۔ پروفیسر فریڈرک تم دس لڑکیوں کو اسی طرح دم کر کے سلایا کرتا تھا۔ میں نے بھی پچھلی رات نامانوس زبان میں تم پر دم کیا تھا اور تم گہری نیند سو بھی گئی تھیں۔''

''بالکل، ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی پھر پوچھا۔ ''علی! رات مجھ پر دم کرتے ہوئے تم اسپینش اور انگلش میں کون سی زبان مکس کر رہے تھے؟''

''اس زبان کا نام ہے جناتی زبان۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''تم مجھے بنا تو نہیں رہے ہو......؟'' وہ شک زدہ انداز میں مجھے تکنے لگی۔

''میں بھلا ایسی گستاخی کیسے کرسکتا ہوں۔'' میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''تم بات کو دوسری طرف لے گئے ہو۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا اشارہ اس نامانوس زبان کی طرف [illegible] ہے؟ تم نے یہ جناتی زبان کس جن سے سیکھی ہے؟''

''میں نے سن اور پڑھ رکھا ہے کہ رنگین عورتیں اپنے حسن و جمال میں پریوں کے مانند ہوتی ہیں۔'' میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔ ''اور ظاہر ہے، جنات بھی اسی دیس میں رہیں گے جہاں پریاں موجود ہوں گی لہٰذا رنگیلا کو تم پرستان سمجھ لو اور یہاں بولی جانے والی زبان یقیناً جناتی کہلائے گی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے اس جناتی زبان کے چند الفاظ ایک امریکن جن زادی سے سیکھے ہیں۔''

شارو ایک زودفہم لڑکی تھی۔ اس نے ایک لمحہ تولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''تم جیسیکا کی بات کر رہے ہو نا......؟''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

ہم دونوں اس وقت ایک ہی، تو سیٹر صوفے کے دو

کونوں پر ایک دوسرے کی جانب رخ کیے بیٹھے تھے۔ وہ میرے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''کیا جیسیکا یاد آرہی ہے؟''

ہم دونوں کے بیچ لگ بھگ ایک فٹ کا فاصلہ حائل تھا اور اس ایریا میں شارو نے اپنا ایک ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر جماتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

''اگرچہ جیسیکا بھلا دی جانے والی ہستی تو نہیں لیکن......!''

میں نے شارو کا ری ایکشن دیکھنے کے لیے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اضطراری انداز میں مستفسر ہوئی۔

''لیکن کیا علی......؟''

''جب تم میرے پاس ہوتی ہو تو پھر کوئی بھی مجھے یاد نہیں آتا۔''

''سچ کہہ رہے ہو نا......؟'' وہ تصدیق طلب انداز میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''تمہاری قسم۔''

اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ میرے ہاتھ کے اوپر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ کر جذباتی لہجے میں بولی۔ ''علی! میں نے تمہیں پانے کے لیے بہت انتظار کیا ہے، اسی [illegible] جاؤ۔''

اس وقت میرا ہاتھ اس کے دونوں ہاتھوں میں سینڈوچ بنا ہوا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور شارو کے بدن کے انبساط انگیز لمس کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتارتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہیں میری بات کا یقین آگیا ہو تو اس سوال کا جواب دے دو جو تھوڑی دیر پہلے میں نے تم سے پوچھا تھا...... یعنی نیند کی کوشش کرنے کے بارے میں......؟''

''علی! جیسا کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ گزشتہ چار پانچ روز سے ہر رات اور بعض اوقات دن میں بارہا میں پروفیسر کے دم کے بغیر از خود بھی سونے کی کوشش کرتی رہی ہوں لیکن مجھے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اکثر تو میں ایک ایک دو دو گھنٹے آنکھیں بند کیے چپ چاپ بستر پر لیٹی رہتی تھی کہ شاید اس طرح میری آنکھ لگ جائے مگر ایسا ہو نہیں سکا۔''

میں شارو کی اس وضاحت کے بعد ایک اطمینان

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

موسم سرما کے الوداعی لمحات

اپریل کے شمارے کے منفرد دلوازمات

اولین صفحات

جذبات انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی انسان اپنے وحشیانہ جذبات کا غلام بن جاتا ہے...... حساس دلوں کو زیر کردینے والی داستانِ انتقام......

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

جھلساتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت......

عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

ایک نہیں...... دو نہیں...... لگاتار ہونے والے قتل کی سنسنی خیز وارداتیں...... سرورق کی تیز رفتار کہانی

چھوٹے چھوٹے ذہن بھی بڑے بڑے خواب دیکھتے ہیں۔ خوابوں اور خرابات کے راستوں پر چلنے والوں کا ماجرا......

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

http://urdutubes.com/

بھری گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ میرا ذہن صاف ہوگیا۔ اب وہاں کسی قسم کی کوئی الجھن باقی نہیں رہی تھی۔ جب میں نے اپنی باطنی آنکھ کی کرشمہ کاری کے طفیل شارو کو اس اپارٹمنٹ میں محو استراحت دیکھا تھا تو یہ وہی وقت تھا جب وہ سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کیے خاموشی سے بستر پر دراز ہوا کرتی تھی۔

میں نے شارو کو اپنے جبرالٹر والے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتا دیا تھا۔ ادھر ادھر کی باتوں کو ایک طرف رکھ کر وہ خاصے تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

''علی! جتنی جلدی ممکن ہو، یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ ہمیں جبرالٹر والے اپنے اپارٹمنٹ میں قیام کرنا چاہیے۔''

''یہ تو ہے کہ ہمیں بالآخر جبرالٹر ہی جانا ہے۔'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کی جانب دیکھا۔ ''لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ تم اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔ کیا اس اپارٹمنٹ میں تم اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس کر رہی ہو؟ کیا تمہارے خیال میں ہم یہاں غیر محفوظ ہیں؟''

''اس اپارٹمنٹ کے اندر تو نہیں لیکن باہر ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔'' وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ہم ہر وقت اس اپارٹمنٹ کے اندر بند ہو کر تو نہیں رہ سکتے نا!''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''شارو!'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جو بھی کہنا ہے، کھل کر واضح الفاظ میں کہو۔ مجھے بتاؤ کہ تم اومسک کی کھلی فضا میں کس نوعیت کے خطرات محسوس کر رہی ہو؟'' اس کے پراسرار انداز نے مجھے تشویش میں ڈال دیا تھا۔

''یہ شہر اومسک رشیا میں واقع ہے نا؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ہاں......'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''تو پھر؟''

''تم نے تھوڑی دیر پہلے یہ کہہ کر مجھے پریشانی میں ڈال دیا ہے کہ رشیا پریوں کا دیس ہے۔'' وہ بہ دستور فکرمندی سے بولی۔ ''مجھے ڈر ہے کہ تم پریوں کے جھرمٹ میں کہیں میری جانب سے غافل نہ ہو جاؤ......!''

میرا ایک ہاتھ شارو کے دونوں ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔ میں نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اسے شاید میری طرف سے ایسے ہی کسی اشارے کا انتظار تھا۔ وہ پکے ہوئے قندھاری انار کے مانند میری گود میں آگری۔ ہمارے درمیان جو ایک فٹ کی دوری حائل تھی، وہ گہری قربت میں بدل گئی۔

میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ شارو کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ یہ جذبات کی شدت اور احساسات کی حدت تھی جس نے اس کی ریشمیں جسم میں طوفانی ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ شارو نے خودسپردگی کے عالم میں اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اس کے وجود کا روم روم آنکھیں کھول کر میری نظرِ کرم کا انتظار کر رہا تھا۔ طلب اور عطا ایک دوسرے کے روبرو آکھڑی ہوئی تھیں۔ ان مہربان لمحات میں، میں نے کسی کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ میں نے گردن کو جھکا کر اپنے تشنہ لبوں کو شارو کے شنگرفی ہونٹوں میں پیوست کر دیا اور طلب سے زیادہ عطا کرنے میں مصروف ہوگیا۔

جب طوفان گزر گیا اور ایک جگہ تھمے ہوئے وقت نے دوبارہ اپنا سفر شروع کیا تو ہمیں سینے میں دھڑکتے دل نے زندگی کا احساس دلایا۔ شارو نے ہوش و حواس کی دنیا میں قدم رکھا تو اس کی سوئی اسی مقام پر اٹکی ہوئی تھی۔

''علی! پریوں کے اس دیس میں تم مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے؟'' اس نے [illegible] پوچھا۔

''اگر تمہیں بھلا دینا میرے اختیار میں ہوتا شارو...... تو میں اپنا یہ اختیار کب کا استعمال کر چکا ہوتا۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اپنی محبت اور میری وفا پر بھروسا کرنا چاہیے۔''

''بھروسا ہے اور...... بڑا ٹھوس بھروسا ہے۔'' وہ خاصا زور دیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن دل کا کیا کروں۔ یہ ہر وقت نوع بہ نوع اندیشوں اور خدشات میں گھرا رہتا ہے اور میں بہت جلد پریشان ہو جاتی ہوں۔''

''تمہیں اب فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں شارو۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''قدرت نے ہمیں ملا دیا ہے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکے گی۔ ٹھہرو......'' میں نے اس سے الگ ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

''تم کہاں چل دیے......؟'' وہ خود کو سمیٹتے ہوئے حیرت سے بولی۔

''تمہاری پریشانی کا قلع قمع کرنے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔

''جیسیکا نے اپنے بے پناہ ذرائع استعمال کر کے تمہیں بحفاظت بویرین ایلپس سے اومسک تک پہنچا دیا ہے۔'' میں نے اس کی الجھن دور کرنے کی غرض سے کہا۔ ''لیکن اومسک سے جبرالٹر تک پہنچانے کے لیے مجھے تمہارا کوئی مناسب بندوبست کرنا ہوگا۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھی......!'' اس نے کہا۔

''دیکھو! میں ڈاکٹر رائیل کی آئی ڈی استعمال کر رہا ہوں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن اس وقت تمہارے پاس کوئی آئی ڈی نہیں۔ میں تمہارے لیے کسی موزوں آئی ڈی کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔''

''تم یہ سب کرنے کہاں جانا چاہتے ہو؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''اور وہ بھی مجھے یہاں چھوڑ کر......!''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اپنی میزبان دینارا کے پاس۔''

ایک گہری، اطمینان بخش سانس لے کر رہ گئی۔

[illegible]

''کیا تم امریکن لیفٹیننٹ سے ابھی میری بات کرا سکتی ہو؟''

ہمارے درمیان تمام تر گفتگو انگلش میں ہوتی تھی کیونکہ میں رشین میں رواں تھا اور نہ ہی دینارا اسپینش سے واقفیت رکھتی تھی۔ ابتدائی تعارف کے لیے ہم دونوں نے کوڈ ورڈز کے طور پر ایک دوسرے کی زبان کے چند الفاظ رٹ لیے تھے۔ دینارا نے میرے سوال پر چونک کر میری طرف دیکھا اور جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے پوچھ لیا۔

''تمہیں اس سے کیا کام ہے؟''

''جس سے کام ہے، اسی کو بتاؤں گا نا......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم جان کر کیا کرو گی؟''

''ہوسکتا ہے، کچھ کر ہی لوں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''تم بتاؤ تو......''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنی ضرورت کے بارے میں بتایا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر حتمی لہجے میں بولی۔

''اتنے سے معمولی کام کے لیے تمہارا اس سے ملنا ضروری نہیں ہے۔''

وہ دانستہ جیسیکا کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس نے جیسیکا کے لیے ''اس'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ اس حکمت عملی کے پیچھے اس کا کوئی خاص مقصد پوشیدہ تھا۔

''تو پھر میرا یہ کام کون کرے گا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''میں کر دوں گی۔'' وہ بڑی رسان سے بولی۔

''مطلب یہ کہ تم شارو کے لیے کسی موزوں آئی ڈی کا بندوبست کر دو گی؟'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آف کورس!'' وہ پورے یقین سے بولی۔ ''آج شام تک تم دونوں کی آئی ڈیز تیار ہو جائیں گی۔ میں نے اس کام سے متعلق ایکسپرٹ افراد کو تمام ساز و سامان کے ساتھ یہاں بلایا ہے۔ وہ لوگ تمہاری تصاویر، فنگر پرنٹس وغیرہ لے لیں گے۔ باقی کا کام وہ اپنے سینٹر پر کریں گے۔ کل صبح تک تم دونوں کی نئی آئی ڈیز اور دیگر کاغذات ریڈی ہوں گے۔''

[illegible] ہم دونوں کی آئی ڈیز کا ذکر کیا تو میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میرے پاس تو ابھی آئی ڈی موجود ہے۔''

''مجھ سے جو کہا گیا ہے، وہ تم مجھے کرنے دو۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''اور میں تم سے جو کہہ رہی ہوں، بس تم وہ کرتے جاؤ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ از اٹ کلیئر؟''

میں نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اسے ہمارے بارے میں یہ احکامات کس نے دیے ہیں۔ وہ ہمارا بھلا سوچ رہی تھی تو میں کیوں اس کے کام میں رخنہ ڈالتا۔ یہ سوچ کر خود کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں تھی......!

''یس! آل کلیئر۔'' میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

وہ بولی۔ ''یہاں سے تم ان آئی ڈیز پر سفر کرو گے جو میں تمہیں مہیا کروں گی۔ جب تم لوگ بارسلونا پہنچ جاؤ گے تو پھر تمہاری مرضی۔ تم آئندہ اپنی ڈاکٹر رائیل والی آئی ڈی

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

استعمال کرو یا پھر تی آئی ڈی کو یہ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔"

"اوہ......" میں نے متاسفانہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تو یہ بھی طے کرلیا گیا ہے کہ ہم اومسک سے بارسلونا جارہے ہیں؟"

"ہاں۔ مجھے تمہارے ٹریولنگ اسکیجوئیل کی تفصیل فراہم کردی گئی ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "تمہاری حفاظت کا تقاضا تو یہی ہے کہ تم اس اسکیجوئیل کو فالو کرو۔ باقی میں پھر وہی کہوں گی......" لمحاتی توقف کرکے اس نے کندھے اچکائے اور بڑی ادا سے بولی۔ "آگے تمہاری مرضی!"

"اوکے!" میں نے کسی فرماں بردار بچے کے مانند جلدی سے گردن ہلائی اور کہا۔ "ہمارا ٹریولنگ میپ کس طرح سے ہے؟"

"تم لوگ جب تک چاہو، اس اپارٹمنٹ میں قیام کرسکتے ہو۔ میں تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف یا کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "جب بھی تمہارا کوچ کرنے کا ارادہ ہو، مجھے بتا دینا۔ میں طے شدہ پروگرام کے مطابق تم دونوں کا ٹکٹ کنفرم کروا دوں گی۔"

اس کے بعد دینارا نے بڑی [illegible] مجھے ہمارے سفر کی تفصیل سے آگاہ [illegible] پروگرام کے مطابق ہمیں اومسک سے بائی ائر ماسکو جانا تھا پھر ماسکو سے بائی ائر ہی برلن۔ برلن سے بذریعہ ٹرین میونخ تک پہنچنا تھا اور میونخ سے بائی ائر بارسلونا تک سفر کرنا تھا۔ اس سفری نقشے کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ دینارا کو یہ ہدایات امریکن لیفٹیننٹ جیسیکا ہی نے دی ہوں گی کیونکہ جیسیکا بڑی حد تک میرے موجودہ حالات سے واقف تھی۔ میں نے اسے جبرالٹر والے اپنے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا ورنہ وہ مجھے گھر کے دروازے تک چھوڑنے کے لیے بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرہی دیتی۔

"ٹھیک ہے!" میں نے دینارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔"

"اگر تم اس اسکیجوئیل کو فالو کروگے تو مجھے یقین ہے کہ تم دونوں بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ جاؤ گے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "جب تک تم اس اپارٹمنٹ میں ٹھہرے ہوئے ہو تو تم پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ تم دونوں اگر چاہو تو تم اس مقصد کے لیے میری گاڑی بھی استعمال کرسکتے ہو اور اگر ٹیکسی میں گھومنے پھرنے کا ارادہ ہو تو میری ایک بات ذہن میں رکھنا......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "ٹیکسی ڈرائیور کی جانب سے ہر پل اور ہر لمحہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ رشیا میں ان سے بڑا بدمعاش اور دھوکے باز اور کوئی نہیں ہے۔"

"اوہ......" میں نے تشویش بھری نظر سے دینارا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تو کیا یہاں کی پولیس کو ٹیکسی ڈرائیوروں کی اس غنڈا گردی کا علم نہیں ہے؟ وہ اس مسئلے کے حل کے لیے کوئی اقدام نہیں کرتے؟"

"وہ سب جانتے ہیں۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن رشیا کا باوا آدم نرالا ہے۔ جب بھی کسی باہر سے آئے ہوئے شخص کا کسی رشین کے ساتھ کوئی تنازع ہوجاتا ہے تو قانون عموماً مقامی کی بات کو توجہ سے سنتا ہے اور اسی کا ساتھ بھی دیتا ہے۔"

"اوہ۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"اب تم اوپر جاکر آرام کرو۔ جب وہ لوگ یہاں آجائیں گے تو میں تمہیں نیچے بلالوں گی۔"

بالائی منزل [illegible] دینار [illegible] نے پوری توجہ سے مجھے سنا اور پریشانی کے عالم میں بولی۔

"میں تو یہاں کی پریوں کے بارے میں سوچ سوچ کر ہی فکرمند ہورہی تھی۔ یہاں کے جنات بھی بدمعاشی میں کسی سے کم نہیں ہیں......!"

"جنات" کا لفظ شارو نے ٹیکسی ڈرائیورز کے لیے استعمال کیا تھا۔ میں نے اس کی دکھتی رگ کو شرارت آمیز سنجیدگی سے دباتے ہوئے کہا۔

"شارو! جنات کے شر سے محفوظ رہنے کا تو آسان سا نسخہ ہے کہ ہم جب بھی باہر نکلیں تو دینارا کی گاڑی لے جائیں لیکن پریوں کا کیا کریں گے؟"

آخری جملہ میں نے تشویش بھری معصومیت سے ادا کیا تھا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر شارو کی گھورتی ہوئی نظر بھی بہ زبان خاموشی مجھ سے یہی کہہ رہی تھی...... ان پریوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں۔ یہ خوامخواہ مجھے پریشان کررہی ہیں۔

☆☆☆

ہماری نئی آئی ڈیز کے لیے ہمارے حلیے میں بھی کچھ تبدیلیاں کرائی تھیں۔ دوپہر کے بعد جو لوگ اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچے، ان میں ایک ماہر بیوٹیشن بھی شامل تھا۔ اس نے شارو کے بالوں کو پہلے بوب کٹ دیا پھر ڈارک براؤن ڈائی کردیا۔ اس تبدیلی کے علاوہ اس کے چہرے پر سن گلاسز کا اضافہ بھی ہوگیا تھا۔ اس نئے حلیے میں وہ پہلے والی شارو بالکل نہیں لگ رہی تھی اور...... نئی آئی ڈی کے مطابق تو وہ شاید تھی بھی نہیں۔ اب اس کا نام تھا...... لوسیا اینڈرسن!

رافیل کا روپ اختیار کرتے ہوئے چہرے کی چھوٹی موٹی تبدیلیوں کے علاوہ میرے سر کے بالوں کو گھنگرالے بنا دیا گیا تھا جس سے میری عمر میں چار پانچ سال کا اضافہ ہوگیا تھا۔ میرے کرلی بالوں کو اسٹریٹ کرکے ان میں بائیں مانگ نکال دی گئی اور میرے چہرے کو بھی ایک نیا لک دے دیا گیا۔ اس نئے حلیے کی روشنی میں میرا نام لوکس کورنیلو تھا۔ لوسیا (Lucia) اور لوکس (Lucas) کا تعلق اسپین کے ایک ساحلی شہر بارسلونا سے تھا اور وہ میاں بیوی تھے۔ اس رات بھی سونے سے قبل میں شارو پر "تنویمی دم" کرنا نہیں بھولا تھا۔

[illegible] ہمارے نئے پاسپورٹس اور دیگر کاغذات تیار ہوکر [illegible] آئی ڈی [illegible] کے مطابق [illegible] کزاخستان میں واقع اسپین کے قونصلیٹ میں [illegible] میرا عہدہ ایک کمرشل قونسلر کا تھا۔ ہماری رہائش کزاخستان کے ایک قدیم شہر آلماتے میں تھی۔ آلماتے (Almaty) کسی زمانے میں کزاخستان کا کیپٹل ہوا کرتا تھا لیکن بعد میں ایک نیا شہر آستانا آباد کیا گیا اور بیشتر ملکوں کی ایمبیسیز کو آستانا (Astana) منتقل کردیا گیا۔ لوکس یعنی میں قونصلیٹ میں کام کرتا تھا لہٰذا میں اپنی بیوی لوسیا کے ساتھ آلماتے ہی میں قیام پذیر تھا۔ کزاخستان (Kazakhstan) اور اومسک کی سرحدیں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔

دینارا نے مجھے اور شارو کو ہمارے رولز اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے بعد مجھ سے پوچھا۔ "تم کب تک روانگی کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے جواب دینے سے پہلے سوالیہ نظر سے شارو کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے "آج اور ابھی" کی سلائیڈ چلتی دکھائی دی۔ یہ چونکہ مناسب اور ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے کہا۔

"تمہیں جیسے آسانی ہو۔"

"مجھے تو ہر طرح آسانی ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آج کو چھوڑ کر تم جب کا بھی کہو گے، میں اومسک سے بارسلونا تک کے تمہارے تمام ٹکٹ ترتیب وار کنفرم کرادوں گی۔"

"اوکے۔ تو اس کام کے لیے کل کا دن ٹھیک ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

دینارا نے اثبات میں گردن ہلا دی اور بولی۔ "ٹھیک ہے، ہوجائے گا۔ اگر تم لوگ اومسک کی ہلکی پھلکی سیر کرنا چاہو تو میری گاڑی لے جاؤ۔ میں دوسرے کاموں میں مصروف ہوں اس لیے تمہارے ساتھ نہیں جاسکوں گی۔"

"ہم مشورہ کرکے آپ کو بتاتے ہیں۔" شارو نے دینارا سے کہا۔

"میری گاڑی کی چابی داخلی دروازے کے ساتھ ہی دیوار پر لگی ایک کھونٹی پر لٹکی تمہیں مل جائے گی۔" دینارا نے بتایا۔ "جاتے ہوئے دروازے کو لاک کرنا نہیں بھولنا۔ واپسی پر تم پانچ بار گاڑی کا ہارن بجانا، میں تمہارے لیے دروازہ کھول دوں گی۔"

"سمجھ گیا۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

دینارا کے جانے کے بعد ہم آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ "شارو! چلو میں تمہارا ڈر نکالتا ہوں۔"

"وہ کس طرح؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے پوچھا۔ "تم بزدل نہیں ہونا؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں ہرگز بزدل نہیں۔ میرے اندر بہت ہمت ہے لیکن شاید میں وہمی ہوں۔"

"شاید نہیں، یقیناً۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا لیکن مجھے اس سنی سنائی بات پر بالکل یقین نہیں ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی۔

"میں سمجھتا ہوں، تجربہ وہم کا علاج ہے۔" میں نے کہا۔

"میں سمجھ نہیں پائی۔" اس نے الجھن زدہ نظر سے

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

مجھے دیکھا۔

"فرض کرو، تم ایک کمرے میں بند ہو اور اس .... کمرے کے دروازے کے سامنے ایک بھوکا شیر دھرنا دیے بیٹھا ہے اور اس انتظار میں ہے کہ تم کمرے سے باہر قدم نکالو اور وہ تمہیں ہڑپ کر جائے......"

"علی......" وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔ "ڈراؤ تو نہیں۔"

"میں تمہیں ڈرا نہیں رہا بلکہ تمہارا ڈر نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "پہلے تم توجہ سے میری بات سنو۔ اس کے بعد سوال کرنا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "میں سن رہی ہوں۔ تم بولتے جاؤ۔"

"اس صورتِ حال میں تمہارے پاس صرف دو ہی راستے ہیں۔" میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "نمبر ایک، تم کمرے کے اندر شیر کے خوف سے دبکی بیٹھی رہو۔ اس صورت میں اگر شیر تم پر حملہ آور نہیں بھی ہوا تو تم اپنے اندرونی ڈر سے سہم سہم کر ہی ختم ہو جاؤ گی جبکہ دوسرا راستہ اختیار کرنے میں بچت کا پہلو موجود ہے۔"

"کون سا دوسرا راستہ......؟" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"شیر سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے [illegible] اندر ہمت پیدا کرو، کمرے کے اندر [illegible] چھڑی اٹھاؤ اور مالک کا نام لے کر کمرے سے باہر نکل آؤ۔ عین ممکن ہے کہ شیر تمہارے ہاتھ میں کوئی آلۂ حرب وضرب دیکھ کر، اپنا دھرنا موقوف کر کے کسی تنگ گلی سے جنگل کی طرف نکل جائے۔"

"اور اگر شیر مجھے کھا گیا تو......!" وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

میں نے اس کی سراسیمگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر تم چپ چاپ شیر کی خوراک بن جانا۔"

"تم مذاق کر رہے ہو نا......؟" وہ بے یقینی سے بولی۔

"نہیں، میں تمہارے اندر سے خوف کو نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کمرے کے اندر گھٹ گھٹ کر حرام موت مرنے سے کہیں بہتر ہے کہ شیر کے سامنے دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہادت کی موت کو گلے لگایا جائے۔"

"اچھا چھوڑو......" وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ "جب کسی ایسی صورتِ حال سے واسطہ پڑے گا تو دیکھا جائے گا۔"

"نہیں چھوڑ سکتا شارو......" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ تم اس وقت ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہو۔" میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

"کک...... کیا......؟" وہ خوفزدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ "کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اپارٹمنٹ کے دروازے پر اس وقت کوئی بھوکا شیر بیٹھا ہوا ہے......؟"

"دروازے پر کوئی شیر تو موجود نہیں لیکن اومسک کے گلی کوچوں میں رشین بلونڈز ضرور پائی جاتی ہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر میرے حوالے سے تم نے اپنے دل کا وہم نکالنا ہے تو گھر سے باہر نکلنے کا تجربہ کرنا ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا یہ تجربہ کامیاب رہے گا۔ کوئی پری مجھ پر اپنا جادو نہیں چلا سکے گی پھر تمہیں اطمینان ہو جائے گا کہ مجھے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں صرف اور صرف تمہارا ہوں۔"

میری بات شارو کی سمجھ میں آگئی اور وہ آؤٹنگ کے لیے تیار ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں دینارا کی سیاہ ماسکوچ (Moskvich) گاڑی پر سوار [illegible] صاف ستھری سڑکوں [illegible]

جرمنی اور امریکا میں تیار ہونے والی گاڑیوں کے مقابلے میں رشین گاڑیاں تو بس ایویں سی چیز ہی لگتی ہیں مگر چند رشین برانڈ قابلِ تعریف اور رشیا میں مقبول ہیں جن میں لادا (Lada)، وولگا (Volga) اور ماسکوچ سرِفہرست ہیں۔

جیسا کہ میں نے بتایا، اومسک رشیا کا ایک قدیم شہر ہے۔ اس میں نظر آنے والی عمارتوں کا طرزِ تعمیر بھی روم، قاہرہ، ایمسٹرڈیم، میڈرڈ اور ایتھنز جیسا پرانے زمانے کا لگتا ہے۔ جگہ جگہ بڑے بڑے سنگی مجسمے بھی استادہ ہیں اور اکثر چوکوں (چوراہوں) کے عین وسط میں فوارے بھی رواں دواں ہیں۔ ان دنوں اومسک کا موسم خاصا خوشگوار تھا۔ اس وقت درجۂ حرارت اٹھارہ سے بیس ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان تھا۔ موسم سرما یعنی جنوری فروری میں جب درجۂ حرارت منفی دس ڈگری سینٹی گریڈ اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ نیچے گر جاتا ہے تو پھر یہ فوارے اپنی بہار دکھانے کے قابل نہیں رہتے کیونکہ ان کے اندر سے خارج ہونے والا پانی دھاروں کی شکل میں فضا ہی میں مائع سے ٹھوس کی حالت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بقول شخصے، شدید ٹھنڈک کے باعث ان دنوں فواروں کے پانی کی قلفی جم جاتی ہے۔

دینارا کی سیاہ ماسکوچ اگرچہ پرانے ماڈل کی گاڑی تھی لیکن چلنے کے معاملے میں بہت اچھی تھی۔ اس کا انجن خاصا دبنگ تھا۔ اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی مجھے اس کی طاقت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ میں نے سٹی سینٹر کے اندر ہی رہتے ہوئے لگ بھگ آدھے گھنٹے تک مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑائی۔ میں دانستہ دینارا کے اپارٹمنٹ سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہم اس وقت جن سنگین حالات سے گزر رہے تھے، ان کا تقاضا یہی تھا کہ ہر معاملے میں ممکنہ حد تک احتیاط کی جائے۔

شارو، لوسیا اینڈرسن کے روپ میں بوب کٹ ہیئر اسٹائل کے ساتھ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ یکایک میرے ذہن میں کایا کا سراپا روشن ہو گیا۔ زرخیز بدن کی مالک وہ پاکٹ سائز نیوزی لینڈر حسینہ میری یادداشت کا ایک قیمتی اثاثہ تھی۔ اس وقت شاید کایا کی طرف میرا دھیان اس لیے بھی چلا گیا تھا کہ میں شارو کے بوب کٹ بالوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ کایا نے بھی اپنے ڈارک براؤن بالوں کو بوب کٹ دے رکھا تھا۔ اگرچہ شارو اور کایا کے قد کاٹھ اور جسامت میں زمین آسمان کا فرق تھا تاہم دونوں کے بالوں کے رنگ اور ہیئر اسٹائل میں سرِمو فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔

کایا کے تصور کے ساتھ ہی مجھے اس کا بھائی رائن بھی

کون کہتا ہے
ہومیو پیتھک آہستہ کام کرتی ہے
مالک کے کرم سے ہم کرتے ہیں
سب سے تیز سب سے بہتر علاج
☆۔ تھیلیسیمیا ☆۔ پلیٹ لیس کی کمی
☆۔ ہیپاٹائٹس A,B,C، ☆۔ اولاد کے جرثوموں کی کمی
☆۔ امراض دل کا فوری اور تیز تر علاج
پاکستان کا ٹور پروگرام:
ہفتہ، اتوار: بہاولپور سٹریٹ ڈاکٹرلیسن شجراہ ہاؤس عباسیہ ٹاؤن ملتان روڈ بہاولپور
سوموار منگل: ملتان بہت جلد افتتاح
ہر ماہ 10-11: کراچی بہت جلد افتتاح
ہر ماہ 1 تا 7: لاہور الحافظ ہوٹل ریلوے اسٹیشن صدر لاہور
جمعہ: جلال پور پیر والا احمد پلازہ چاہ خیرے والا
ڈاکٹر ملک غلام یٰسین شجراہ
فون: 0300-0763853
Doctor_mlk@yahoo.com,
Mlkshujra@gmail.com

http://urdutubes.com/

یاد آیا۔ وہ اسکل اینڈ بونز سوسائٹی میں نفتھ ڈگری تک پہنچ گیا تھا پھر رائن کی وفاداری مشکوک ہوگئی اور سوسائٹی نے اسے موت کی سزا کا تحفہ دیا تھا۔ کایا پر بھی بے وفائی کا الزام تھا لہٰذا اسے بھی میری نگاہ کے سامنے دردناک موت سے ہمکنار کیا گیا تھا۔ کایا نے رائن کے قاتل آسکر اور میں نے کایا کی موت کے ذمے دار رابرٹ کو نمونۂ عبرت بنا کر ہی دم لیا تھا۔

''علی! تم اچانک خاموش کیوں ہوگئے۔'' شارو کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''کوئی پرابلم ہے کیا؟''

جب سے ہم ماسکوچ لے کر نکلے تھے، ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا لیکن کایا کا خیال آتے ہی میں گاڑی سے غیر حاضر ہوگیا تھا۔ جسمانی طور پر اگرچہ میں شارو کے پہلو میں بیٹھا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا لیکن ان لمحات میں میری سوچ کا محور و مرکز کایا تھی۔ شارو نے میرے ذہنی غیاب کو محسوس کرلیا تھا اسی لیے اس نے چونکے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔

''کوئی پرابلم نہیں ہے۔'' میں نے گاڑی کے اندر حاضر ہوتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے چھیڑنے والے انداز میں پوچھا۔ ''کوئی یاد آرہا ہے؟''

''ہاں......!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آرہا نہیں، آرہی ہے۔''

اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ ''کون یاد آرہی ہے؟''

''ایک دوست......''

''جیسیکا؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''نہیں۔''

''پینا......؟''

میں نے اس بار بھی نفی میں گردن ہلا دی۔

''پھر کون؟'' اس کی انکوائری میں تشویش بھی شامل ہوگئی۔

اس سے پہلے کہ وہ سوالات کی لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ جاتی، میں نے اسے سچ سچ بتا دیا۔

''کایا!''

وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئی۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں شارو کو کایا کی یاد آوری کا سبب بھی بتا دیا اور آخر میں کہا۔

''بوب کٹ تم پر بہت جچ رہا ہے۔''

''کایا سے بھی زیادہ......؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''کئی گنا زیادہ۔'' میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''ایک بات کہوں علی!''

''ایک نہیں، ایک ہزار باتیں کہو۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں سننے کے لیے ہمہ وقت تیار ہوں۔''

''میرا خیال ہے، میں غلط انداز میں سوچ رہی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''میں سمجھا نہیں۔ تم نے کیا غلط سوچ لیا شارو؟''

''میں اس فکر میں گھلی جا رہی تھی کہ تمہیں رشین پریوں سے کیسے بچاؤں......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''تو کیا تم نے ''دافع پری'' کا وظیفہ ڈھونڈ لیا ہے؟''

''نہیں۔ اگر میں ایسا کروں گی تو یہ میری دوسری غلطی ہوگی۔'' اس نے بہ دستور میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''شارو! تمہیں کیا ہوگیا ہے۔'' میں نے ماسکوچ کو سڑک کے کنارے روکتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت الجھی ہوئی باتیں کر رہی ہو۔ میرے پلے نہیں پڑ رہا کہ تم کن [illegible] کا ذکر کر رہی ہو۔''

''تم پریوں کے دیس میں رہو یا حوروں کی نگری میں اور یا پھر جنگل کے بیابان میں...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں باہر والیوں سے بچانے کے لیے تو سو جتن کرلوں گی مگر یہ جو تم نے اپنے اندر دوستوں کا جمعہ بازار لگا رکھا ہے، اس کا میں کیا کروں علی......؟''

''تو یوں کہو نا......'' اس کی جھنجلاہٹ کو دیکھ کر میں اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے کہا۔ ''نہ ڈھولا ہوسی، نہ سیاپا ہوسی!''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''پتا نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو؟''

میں نے ڈھولا (محبوب)، سیاپا (مصیبت) اور ہوسی (ہوگا) کا مفہوم آسان زبان میں بیان کرنے کے بعد اس سے کہا۔

''شارو! تم میری یادداشت میں CPH4 کا صرف ایک قطرہ ٹپکا دو۔ سمجھو، تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔''

''یہ کیا بلا ہے؟'' اس نے منہ بگاڑ کر CPH4 کے بارے میں استفسار کیا۔

''یہ ایک نہایت ہی سریع الاثر ڈرگ ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''اس کا صرف ایک گرام انسانی دماغ کو الٹانے کے لیے کافی ہے۔ اتنی قلیل مقدار میں اس ڈرگ کا استعمال انسان کے چودہ طبق گل کر دیتا ہے اور اگر اس کا ایک آدھ طبق گل ہونے سے محفوظ رہ جائے تو پھر اس کرسٹلائن ڈرگ کے عمیق اثرات اس کو ''ہیلوسی نیشن'' والی کیفیت میں لے جاتے ہیں۔ تصور کی نگاہ اور تخیل کی نظر سے اسے دن میں تارے اور رات میں سورج دکھائی دینے لگتا ہے۔''

''اُفوہ......'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ خوامخواہ میں تمہیں ہیلوسی نیٹ (Hallucinate) کروں!''

''مجھے تم سے ایسی امید بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر تم مجھے ایسا خطرناک مشورہ کیوں دے رہے ہو؟'' وہ خفگی بھرے لہجے میں بولی۔

''اس ڈرگ کا ایک اور ایفیکٹ بھی ہے۔'' میں نے بہ دستور سنجیدہ انداز میں اس سے تفریح کا عمل جاری رکھا۔ ''میں نے اسی خاص اثر کی وجہ سے تمہیں یہ مشورہ دیا [illegible]''

''[illegible] کی بات کر رہے ہو؟'' وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

''یہ ڈرگ ایک زبردست گلو بھی ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اگر تم اس کا ایک قطرہ میری یادداشت میں ٹپکا دو گی تو سمجھ لو، وہاں بسنے والی ساری چڑیلیں ادھر ہی فریز ہوجائیں گی۔ پھر ان میں سے کوئی بھی میرے حافظے سے نکل کر میرے تصور میں نہیں جھانکے گی۔''

بے اختیار اس کی ہنسی نکل گئی۔ وہ ایک توانا قہقہہ لگانے کے بعد چہک کر بولی۔ ''علی! تم مذاق بہت اچھا کرتے ہو۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسی تو میں نے بھی ایک آخری شرارت کے طور پر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس میں ایک مشکل ہے......!''

''کیسی مشکل؟'' اس کی پیشانی پر سوال ابھر آیا۔

''جس بلا کا ہم ذکر کر رہے ہیں، یہ درحقیقت ٹھوس کرسٹلز کی شکل میں پائی جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لہٰذا تمہیں اس کی ایک چٹکی میری یادداشت پر چھڑکنا پڑے گی جیسے ''ڈی ڈی ٹی'' کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔''

''اب میں اتنی بھی ظالم نہیں ہوں کہ تمہاری ان چڑیلوں پر میں جراثیم کش ادویات کا اسپرے کروں۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

''اتنی نہیں تو پھر تم کتنی ظالم ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''گھر چلو، پھر بتاتی ہوں۔'' وہ خالصتاً بیویوں والے انداز میں بولی۔ ''یہاں سڑک کے کنارے تماشا لگانا کیا اچھا لگے گا......''

''تماشا تو سڑک کے کنارے پر ہی بھلا لگتا ہے۔'' میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''چلیں، آج گھر پر ہی کرلیتے ہیں......''

وہ شکست خوردہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

☆☆☆

فرق

[illegible]

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

شارو کافی عرصہ پہلے ٹیکساس (امریکا) میں مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ میرے ایک دشمن میکسیکن غنڈے لیونارڈو نے اسے اغوا کر کے امریکا سے کیوبا پہنچا دیا تھا۔ پہنچا کیا دیا تھا بلکہ ایک ایسے گروہ کے ہاتھ فروخت کردیا تھا جو مناسب ٹریننگ کے بعد لڑکیوں کو ''اسکن بزنس'' میں ڈال دیتے تھے۔ یہ تو شارو کی خوش قسمتی تھی کہ میڈم ڈیلفینا سے میرے تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے اور اسی کے توسط سے میں شارو کو مذکورہ بدنام زمانہ گروہ کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ عصمت فروشی کی منزل پر قدم رکھنے سے پہلے ہی ڈیلفینا، شارو کو اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اس گروہ کے قبضے سے اس طرح نکال لے گئی تھی جیسے مکھن سے بال کو نکالا جاتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کے بعد سے، چند روز پہلے تک شارو...... ڈیلفینا بہ الفاظ دیگر سوسائٹی کی کسٹڈی میں رہی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ ''ایس این پی'' والوں نے شارو کو اپنے پاس ''گروی'' رکھا ہوا تھا تاکہ وہ مجھے اپنی بات ماننے کے لیے آمادہ کرسکیں۔ مالک کا شکر کہ میں جیسیکا کے توسط سے شارو کو بحفاظت سوسائٹی کی کسٹڈی سے نکال لایا تھا۔

شارو نے مجھ سے دور رہ کر بڑا کٹھن وقت گزارا تھا۔ اگرچہ سوسائٹی والوں نے ہر جگہ اسے بڑے آرام سے رکھا تھا لیکن جدائی کا ایک ایک پل کانٹوں پر بسر ہوتا ہے۔ یہ دل وجگر کو لہولہو کردیتا ہے۔ اسیری چاہے [illegible] اس دوران میں حلق سے اترنے [illegible] ہوجاتا ہے اور آزادی کی فضا میں اگر زمین پر بیٹھ کر سوکھی روٹی بھی کھائی جائے تو وہ کسی صحت بخش ٹانک سے کم نہیں ہوتی۔

میں شارو کے لیے دن رات تڑپا تھا اسی لیے مجھے بڑی شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ وہ شب ہائے فراق اور روز ہائے ہجر شارو نے کس اذیت سے گزارے ہوں گے چنانچہ میں اسے دانستہ بہت زیادہ وقت دے رہا تھا تاکہ اس کی روح کے دکھائی نہ دینے والے گھاؤ جلد از جلد بھر جائیں۔ دوڑ بھاگ اور مار دھاڑ کے لیے پوری زندگی پڑی تھی۔ فی الحال قدرت نے مجھے فرصت کی جو گھڑیاں عطا کی تھیں، ان بے فکرے لمحات میں، میں شارو کی دلجوئی اور دلداری میں لگا ہوا تھا۔

اپارٹمنٹ پر پہنچ کر میں نے دینارا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق پانچ بار ماسکوچ کا ہارن بجایا تو اس نے ہمارے لیے داخلی دروازہ کھول دیا اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر زیریں منزل کے لیونگ روم میں جا بیٹھی۔ میں نے اب تک دینارا کو بہت خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والی ایک مہربان اور مستعد لیڈی پایا تھا لیکن آج خلاف معمول اس کا انداز گھلنے ملنے والا تھا۔

''آج کا ڈنر ہم ایک ساتھ زیریں منزل پر ہی کریں گے۔'' اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے آپ کو ایک خوش خبری بھی سنانا ہے۔''

ایک ساتھ ڈنر کرنے والی بات میں کوئی خاص سنسنی خیزی نہیں تھی مگر دینارا کے آخری جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کیسی خوش خبری؟''

''تم لوگوں کے تمام ٹکٹ میں نے کنفرم کرادیے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''کل صبح ٹھیک نو بجے تمہیں OMS پہنچنا ہوگا۔''

''او ایم ایس...... مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''اومسک سینٹرا لنے ائرپورٹ۔'' اس نے بتایا۔ ''تمہاری دس بجے کی فلائٹ ہے۔ میں آٹھ بجے صبح تمہارا ناشتا اوپر پہنچا دوں گی۔''

اومسک کا انٹرنیشنل ائرپورٹ ''سینٹرا لنے'' کہلاتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''ہم وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی سینٹرا لنے پہنچ جائیں گے۔ تم ہمارے پاسپورٹ، ٹکٹ اور دیگر ضروری کاغذات ہمیں دے دو۔''

''ضرور......'' اس نے [illegible] ادی [illegible] بعد اس نے [illegible] تمام چیزیں ہمارے حوالے کردیں۔ میں نے اسی ٹکٹ اور پاسپورٹ کا بغور جائزہ لیا۔ مخصوص لوگو والے پاسپورٹ پر، اوپر سے نیچے تین سطروں میں ''او نین ایورو پیا۔ ایسپانیا۔ پاساپورتے'' کے الفاظ پرنٹ تھے۔ مطلب...... یورپین یونین۔ اسپین۔ پاسپورٹ۔ سب سے [illegible] میں اسی پاسپورٹ کا مخصوص نشان بھی بنا ہوا تھا۔

''عام پاسپورٹس کی بہ نسبت تمہارے یہ پاسپورٹ زیادہ طاقتور ہیں کیونکہ یہ ڈپلومیٹک (Diplomatic) پاسپورٹ ہیں۔ اپنے ملک کے سفارت خانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے تم ''ڈپلومیٹ'' ہو یعنی حد درجہ مراعات یافتہ لوگ۔ پوری دنیا کے ہر ائرپورٹ پر تمہارے ساتھ خصوصی برتاؤ کیا جائے گا۔ تمہیں عام مسافروں کی طرح لمبی لمبی قطاروں میں لگنا پڑے گا اور نہ ہی امیگریشن آفیسرز کے چبھتے ہوئے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تم جب چاہو اس ڈپلومیٹک پاسپورٹ پر دنیا کے ایک سو چھیاسی ممالک میں بے دھڑک آجا سکتے ہو لیکن اگر پھر بھی کہیں کوئی مشکل آن کھڑی ہو تو تم

[illegible] اس نمبر پر رابطہ کرنا۔''

بات کے اختتام پر اس نے اپنے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ وہ وزیٹنگ کارڈ کے سائز کا ایک کارڈ تھا۔ میں نے دیکھا، مذکورہ کارڈ پر ایک نام اور اس کے نیچے ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

''یہ ایدرک دمتری کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ایدرک دمتری رشین فیڈریشن کے ایک ہائی کمشنر تھے۔'' دینارا نے بتایا۔ ''یہ تمہاری ہر مشکل کو چٹکی بجاتے میں حل کردیں گے۔''

''خراشو......!'' میں نے توصیفی نظر سے دینارا کی طرف دیکھتے ہوئے توانا لہجے میں کہا پھر دل ہی دل میں خود کلامی کی۔

''یہ سارے ادرک، لہسن، آلو، ٹماٹر...... میری ہی قسمت میں لکھے ہوئے ہیں......!''

ڈنر کے دوران میں بھی دینارا مجھے مختلف ہدایات دیتی رہی جس میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہمیں اپنے موجودہ دستاویزاتی ناموں کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا ہے۔ لوسیا اینڈرسن اور لوکس گونزیلو کے کاغذات ایک میاں بیوی کی حیثیت سے تیار کیے گئے تھے جو سالانہ چھٹیوں پر اپنے اصلی گھر بارسلونا جارہے تھے۔ کزاخستان [illegible] میں ایک سفارت کار کی حیثیت سے [illegible] کونسلر تھا اور لوسیا اینڈرسن (شارو) میری بیوی تھی۔

لگ بھگ رات دس بجے ہم دینارا کو ''گڈ نائٹ'' کہہ کر بالائی منزل پر آگئے۔ میں گزشتہ دو رات سے شارو کو سونے سے پہلے ہپناٹائز کر کے اپنی مرضی کی مخصوص ہدایات دے رہا تھا تاکہ میری ترغیبات سے پروفیسر فریڈرک کے کیے ہوئے ''دم'' کے اثرات زائل ہوجائیں لیکن اس رات میں اپنے عمل کو جاری نہ رکھ سکا۔ ہم جیسے ہی بیڈ پر پہنچے، شارو میرے سینے پر سوار ہوگئی۔

''یہ کیا کررہی ہو......؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''میں نے کہا تھا نا گھر چلو، پھر میں تمہیں بتاتی ہوں کہ کتنی ظالم ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''آج میں تمہیں ''انٹرنیشنل مظلوم'' کا سرٹیفکیٹ جاری کر کے ہی دم لوں گی۔'' وہ میرے سینے کو عین دل کے مقام پر تھپتھپاتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولی۔

''بتاؤ...... یہاں تم نے کتنی چڑیلوں کو چھپا رکھا ہے؟''

قرآن فرماتا ہے

☆ مجھے یاد کرو گے تو حافظ بن جاؤ گے۔
☆ مجھے سنوار کر پڑھو گے تو قاری بن جاؤ گے۔
☆ مجھے پڑھانے بیٹھو گے تو استاد بن جاؤ گے۔
☆ میرا ترجمہ کرو گے تو عالم بن جاؤ گے۔
☆ میری تشریح کرو گے تو مفسر بن جاؤ گے۔
☆ میری تعلیمات پر تقریر کرو گے تو مبلغ بن جاؤ گے۔
☆ میری ہدایات کے مطابق فیصلے کرو گے تو قاضی بن جاؤ گے۔
☆ اور اگر مجھ پر عمل کرو گے تو ولی اللہ (اللہ کے دوست) بن جاؤ گے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدرآباد

خوشبو ہے ہر لفظ...

☆ ہر چھوڑ کر جانے والا شخص بے وفا نہیں ہوتا اور ہر ساتھ رہنے والا شخص ہمارا اپنا نہیں ہوتا۔
☆ اگر آپ کو کوئی یاد نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں، اصل چیز تو یہ ہے کہ وہ آپ کو فراموش نہ کرے۔
☆ کچھ ناتے اتنے بن جاتے ہیں جن کے سامنے خون کے رشتے بھی کمزور پڑ جاتے ہیں۔
☆ انسان اس سے زیادہ دھوکا کھاتا ہے جس سے زیادہ پیار کرتا ہے۔
☆ محبت میں یہ قباحت ہے کہ جس سے محبت ہوجائے اسے آسانی سے آزاد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسے آزاد کرنے سے دل کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔
☆ کچھ لوگ تمام عمر دنیا کو جان نہیں پاتے، ان کا حال بھیڑ میں گم ہوجانے والے بچے کے مانند ہوتا ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بفل ہزارہ

آدھی قیمت

دکان دار گاہک سے۔ ''آپ اس ریڈیو کی آدھی قیمت کیوں دینا چاہتے ہیں؟''

''اس لیے کیونکہ میں ایک کان سے سنتا ہوں۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

http://urdutubes.com/

اس کے انداز میں بڑی میٹھی جارحیت پائی جاتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''صرف ایک...... اور وہ چڑیل ہرگز نہیں ہے۔''

وہ میری جانب انگلی اٹھا کر دھمکی آمیز انداز میں بولی۔ ''ناداآمورسوکی ناداتینسن موئی!''

میں نے تھوڑی دیر پہلے ''ڈھولا اور رولا'' کے حوالے سے ایک شعر سنایا تھا۔ شارو نے اسی شعر کو کسی اسپینش چوپر میں ڈال کر اس کا بے دردی سے قیمہ بنا ڈالا تھا۔

''یومین......'' میں نے اس شعر کو ہسپانوی زبان کے قالب میں ڈھالتے ہوئے شارو سے پوچھا۔ ''سن آمانتے۔ سن پروبلیما؟''

مطلب...... ''تو لور۔ نو پرابلم!''

وہ ضدی لہجے میں بولی۔ ''یس! آئی مین اٹ۔''

''ایک کام کرو......'' میں نے کہا۔

وہ میرے سینے پر لدے لدے مستفسر ہوئی۔ ''کون سا کام؟''

اس کے سوال میں الجھن پائی جاتی تھی۔ میں نے سنجیدگی کا ناٹک کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ''تم کچن میں جاؤ اور ایک تیز دھار چھری وہاں سے اٹھا لاؤ۔ اس چھری کو میرے سینے میں گھونپ کر تربوز کی طرح شق کر ڈالو۔ تب تمہیں یقین آجائے گا کہ میرے دل کے ہر کونے کھدرے میں صرف اور صرف تم ہی چھپی بیٹھی ہو......''

وہ چند لمحات تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتی رہی۔ وہ کسی گھڑسوار کے مانند میرے اوپر سواری ڈالے بیٹھی تھی اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اس نے میرے سینے پر جما رکھا تھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز نے مجھ پر واضح کر دیا کہ وہ میری بیان کی ہوئی سچائی کو جانچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے اسے میری بات کا یقین آگیا ہو۔ اگلے ہی لمحے وہ چھپک کر کسی جونک کے مانند مجھ سے چمٹ گئی۔

میں نے بہ آہستگی اپنے بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیے۔ اس کا کندن کی طرح دہکا اور گلاب کے مانند مہکا ہوا برازیلی بدن میری بانہوں کی گرفت میں ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ یہ ان سچے جذبات کا ارتعاش تھا جو وہ اپنے دل میں میرے لیے ذخیرہ کیے بیٹھی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ جسم و جاں کی پوری توانائی صرف کر کے میرے اندر گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیف و انبساط کی اس فضا میں، میں نے گواچنے کے لیے اسے آزاد چھوڑ دیا۔ آزادی ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ میں شارو سے اس کا یہ حق کیسے چھین سکتا تھا۔

اس کی گرم سانسوں کی سرسراہٹ میرے چہرے کو تپا رہی تھی پھر میں نے اسی حدت بردار تپش کو اپنی گردن پر رینگتے ہوئے محسوس کیا تو میں یہی سمجھا کہ وہ کوئی خمار آلود سرگوشی میری سماعت میں انڈیلنے کا ارادہ رکھتی ہے مگر اگلے ہی لمحے میرے سمجھے پر پانی پھر گیا۔ اس نے میرے کان کی لَو کو اپنے گداز ہونٹوں کی گرفت میں لیا پھر دانتوں کی مدد سے درخواست کر دی۔

''ارررے......'' میں درد کی شدت سے چلا اٹھا۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟ تم نے میرے کان کی لو پر کیوں کاٹا......؟''

''میں نے تمہیں ابھی جو ''انٹرنیشنل مظلوم'' ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری کیا ہے......'' وہ شرارت بھرے اطمینان سے بولی۔ ''تصدیقی مہر کے بغیر تو وہ ادھورا رہے گا نا...... میں نے اسی لیے اسے اسٹیمپ کر دیا ہے۔''

اس وضاحت کے بعد میں بھلا شارو سے کیا کہتا۔ بعض مقامات پر ہتھیار پھینک دینے ہی میں انسان کی جیت ہوتی ہے۔ میں نے بھی شارو کو فتح کرنے کے لیے اس کے پرمحبت بھرے ظلم و ستم کے سامنے پسپائی اختیار کر لی۔ اس رات میں ایک لمحے کے لیے بھی شارو کو ہپناٹائز نہ کر سکا اور وہ ہر لمحہ مجھے گڑبڑا ناٹائز کرتی چلی گئی۔ آج وہ عامل تھی اور میں معمول تھا اسی لیے سب کچھ خلافِ معمول ہوتا چلا گیا......!

[illegible] رات میں [illegible]
میں [illegible] خود کو کوں [illegible]
ایک سڑک پر چلے جا رہے تھے اور میں بھی ان میں شامل تھا۔ ان افراد کے بیچ میں چلنے والے لوگوں نے ایک برگنڈی ریڈ کلر کا چوبی تابوت اٹھا رکھا تھا۔ ایسے تابوت کسی مُردے کو رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ گویا ہم لوگ کسی مُردے کو دفنانے جا رہے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس برگنڈی ریڈ تابوت کے اندر کس کی لاش ہے۔ بس، میں چپ چاپ ان لوگوں کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ وہ سب کے سب افسردہ اور خاموش تھے۔

تین چار گلیوں میں سے گزرنے کے بعد ہم لوگ ایک چوراہے پر پہنچ گئے۔ اس چوراہے کے عین وسط میں ایک گول سنگی حوض بنا ہوا تھا جس کی تعمیر میں سفید سنگِ مرمر استعمال کیا گیا تھا۔ مذکورہ حوض کے سینٹر میں ایک فوارہ بھی دکھائی دے رہا تھا جو اس وقت رواں تھا۔ اس فوارے میں سے نکلنے والا پانی، دھاروں کی صورت میں حوض کے اندر گر کر بڑی مدھم آواز پیدا کر رہا تھا۔

فوارے کے نزدیک پہنچ کر وہ لوگ رک گئے اور

انہوں نے تابوت کو زمین پر رکھ دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی مجھے بھی اپنے قدم روکنا پڑے۔ اسی لمحے مجھے فوارے کی منڈیر پر ایک عورت بیٹھی دکھائی دی۔ اس کا چہرہ دوسری جانب تھا لہٰذا میں اسے پہچان نہ سکا۔ جیسے ہی یہ تابوتی جنازہ رکا، اس عورت نے فوارے کی منڈیر سے اٹھ کر ایک سمت دوڑ لگا دی۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ عورت کون ہے اور اس نے جنازے کو دیکھ کر یکایک وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کیوں کی ہے کہ...... ان لوگوں نے برگنڈی ریڈ تابوت کو زمین پر رکھ دیا اور ان میں سے چند افراد مفرور عورت کے پیچھے لپکے۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ایک بات تو بالکل واضح تھی کہ اس عورت نے جنازے کو دیکھ کر ہی ایک جانب دوڑ لگا دی تھی اور یہ بھی طے تھا کہ یہ لوگ اس عورت کو پکڑنے کے لیے اس کے تعاقب میں گئے تھے۔ اس کے بعد ایک بڑا سا ''کیوں؟'' ذہن میں کسی زہریلے ناگ کے مانند پھن پھیلا کر کھڑا ہو جاتا تھا جس کا جواب فی الحال میری سوچ میں کہیں موجود نہیں تھا۔

مجھے زیادہ دیر تک لاجواب نہیں رہنا پڑا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ اس عورت کو دونوں بازوؤں سے تھام [illegible]
[illegible] لا رہے [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] تو [illegible] آسانی [illegible]
کی۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ...... بینا تھی۔

میں نے چلا کر کہا۔ ''اے...... چھوڑ دو اسے۔''

میرے لہجے میں اگرچہ تحکم پایا جاتا تھا لیکن ان میں سے کسی نے میری آواز پر کان نہیں دھرے اور وہ بینا کو کھینچتے ہوئے تابوت کے نزدیک لے آئے۔ بینا ان کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور چیخ چلا بھی رہی تھی لیکن وہ لوگ بینا کی کسی بات پر توجہ دیے بغیر اپنے کام میں مصروف رہے۔

یہ منظر میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے ایک بار پھر حلق کی پوری قوت کے ساتھ انہیں وارننگ دی۔ ''اگر تم لوگوں نے بینا کو نہیں چھوڑا تو میں تم سب کو چیر ڈالوں گا......''

مگر وہاں تو معاملہ یہ تھا کہ...... زمین جنبد نہ جنبد گل محمد۔ ان میں سے کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ یہی محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی آنکھیں مجھے دیکھ پا رہی ہیں اور نہ ہی میری آواز ان کی سماعت تک رسائی حاصل کر پا رہی تھی۔ کوئی بے بسی سی بے بسی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھانے کی نیت کی کہ بزورِ بازو انہیں

روکنے کی سعی کرتا ہوں، اسی لمحے احساس ہوا کہ میں تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا۔ گویا کسی جادوگر نے سحر پھونک کر مجھے پتھر کا بنا دیا تھا اور اب میں کسی قسم کی حرکت کے قابل نہیں رہا تھا۔ [illegible] میں اتنا مجبور کیسے ہو گیا تھا؟ [illegible] بے کسی اور بے بسی کے عالم میں دیکھتا رہ گیا اور ان ظالموں نے بڑی بے دردی سے بینا کو اٹھا کر زبردستی اس تابوت کے اندر ڈال دیا اور پھر تابوت کو اٹھا کر ایک جانب چل پڑے۔ اب کی بار میں ان کے ساتھ نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ میں حسرت و یاس کی تصویر بنا وہیں کھڑا رہ گیا۔

میری آنکھوں نے جو آخری منظر کیپچر کر کے اسے میری یادداشت میں محفوظ کیا، وہ برگنڈی ریڈ تابوت کے بند ہونے کا سماں تھا۔ جب ان لوگوں نے بینا کو تابوت میں ڈالنے کے بعد اس کا ڈھکنا بند کیا تو میں اس ڈھکنے کی پشت پر بنا ہوا لوگو دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ وہ ''اسکل اینڈ بونز'' سوسائٹی کا مخصوص مارکا تھا۔ خطرناک تاثر پیدا کرتی ہوئی ایک انسانی کھوپڑی۔ اس کے نیچے کراس کی شکل میں رکھی ہوئی دو ہڈیاں اور ان ہڈیوں کے نیچے نائٹ ٹیمپلرز کی مخصوص تلوار۔ اس تلوار اور دونوں ہڈیوں کے بیچ میں لکھا ہوا ایک نمبر یعنی ''تھری، ڈبل ٹو''...... 322......!

☆☆☆

قبل از......

ایک صاحب نے کتاب پڑھتے پڑھتے بیگم سے کہا۔ ''سنتی ہو، ایک مفکر کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے احمق ترین عورت بھی کسی چالاک مرد کے ساتھ نباہ کر سکتی ہے لیکن کسی احمق مرد کے ساتھ گزارا کرنے کے لیے عورت کا چالاک ہونا ضروری ہے۔''

بیگم نے مسکرا کر کہا۔ ''شادی سے چند دن بعد ہی میں نے یہ مقولہ پڑھ لیا تھا۔''

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

جب میری آنکھ کھلی تو میرا پورا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا اور وہ ہولناک خواب بھی میرے ذہن میں تروتازہ تھا۔ اس وقت گرم بستر میں اونی کمبل اوڑھ کر سونے کا موسم تھا اور میں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ یہ سب اس خواب کے اثرات تھے جو میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بینا کے حوالے سے دیکھا تھا۔ اچانک میری نگاہ دیوار گیر کلاک پر پڑی تو میں بُری طرح چونک اٹھا۔

میں نے رات شارو کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دماغ میں صبح سات بجے اٹھنے کا الارم لگایا تھا، ان ہدایات کے ساتھ کہ میں نہایت ہی پُرسکون، میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا اور صبح ٹھیک سات بجے میری آنکھ ہشاش بشاش کھل جائے گی لیکن میری اس نیند کے دوران میں اگر اس گھر کے کسی حصے میں کوئی بھی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کے آثار پیدا ہوئے تو میں وقتِ مقررہ سے پہلے ہی بیدار ہوجاؤں گا اور...... ایسا ہی ہوا تھا۔

دیوار گیر کلاک ساڑھے چھ بجے کا وقت بتا رہا تھا اور میرے چونکنے کا سبب بھی یہی تھا کہ وقتِ مقررہ سے آدھا گھنٹا پہلے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ ایک تو بینا والے خواب نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا رکھا تھا، اوپر سے یہ خلافِ توقع بیداری سونے پر سہاگا تھی۔

میں نے شارو پر نگاہ ڈالی۔ وہ میری بغل میں پُرسکون، آسودہ نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ [illegible] میں وہ معمول سے زیادہ حسین اور پر[illegible] لگ رہی تھی۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس کے حسن اور معصومیت کو دل کھول کر دادِ تحسین پیش کرتا مگر ان لمحات میں میری فکرمندی ساتویں آسمان کو چھو رہی تھی اور میں مسلسل اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ وقتِ مقررہ سے آدھا گھنٹا پہلے میری آنکھ کیسے کھل گئی؟

ایک جانب میرا ذہن اس سوال کا جواب تلاشنے میں مصروف تھا تو دوسری طرف بینا والے خواب نے افراتفری مچا رکھی تھی۔ ایسا خوفناک خواب میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بینا جب سے سوسائٹی کے قبضے میں تھی تو میں اس کی طرف سے گہری تشویش میں مبتلا ضرور تھا لیکن ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ سوسائٹی والے اس بہیمانہ انداز میں اسے کسی تابوت میں بند کرکے کہیں لے جائیں گے۔ وہ کوئی ایکس، وائے یا زیڈ لوگ نہیں تھے۔ میں نے خواب میں برگنڈی ریڈ تابوت کے ساتھ جن کم و بیش پچاس افراد کو ماتمی انداز میں چلتے ہوئے دیکھا تھا، ان کا تعلق یقیناً سوسائٹی ہی سے تھا جس کا سب سے بڑا اور ٹھوس ثبوت مذکورہ تابوت کی بالائی سطح یعنی ڈھکنے کی پشت پر بنا ہوا "اسکل اینڈ بونز" سوسائٹی کا وہ مخصوص لوگو تھا جس میں دلوں پر دہشت طاری کردینے والی کھوپڑی، ہڈیاں اور تلوار نظر آرہی تھی۔ کیا "ایس این بی" والے میری جاں نثار ساتھی بینا کے ساتھ واقعتاً ایسا ظالمانہ سلوک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یا یہ میرا کوئی لاشعوری خدشہ تھا جو خواب کی صورت مجھے دکھائی دیا تھا؟

دماغ کی کرشمہ کاریوں پر تو شک نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری ناآسودہ خواہشات اور اندیشہ ہائے دور و دراز بعض اوقات حالتِ نیند میں اسی طرح خواب کا لبادہ اوڑھ کر جلوہ گر ہوجاتے ہیں۔ شاید یہ بھی کوئی ایسا ہی خوابِ پریشان تھا۔

میں اس خواب کو اپنے موجودہ غیر یقینی حالات کے کھاتے میں ڈال کر بڑی آسانی سے ریلیکس ہوجاتا مگر خلافِ ہدایت آدھا گھنٹا پہلے کھل جانے والی آنکھ نے معاملے کو بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ میں ابھی مختلف زاویوں سے اس بارے میں غوروفکر کر ہی رہا تھا کہ زیریں منزل پر ابھرنے والی ایک ہلکی سی آواز نے میری تشویش میں کئی گنا اضافہ کردیا۔

وہ علی الصباح کا وقت تھا۔ ماحول میں گہری [illegible] اور سناٹے نے اپنے [illegible] یہ [illegible] خاموشی تھی [illegible] کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اسی مہیب سناٹے کی کرم نوازی سے میں وہ آواز بھی سن پایا تھا۔ میری سماعت کو دھوکا نہیں ہوا تھا۔ وہ آواز کسی سائیلنسر لگی گن سے فائر ہونے والی گولی کی مخصوص بے صدا "ٹھک" سے گہری صوتی مشابہت رکھتی تھی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یقیناً زیریں منزل پر کسی قسم کی گڑبڑ کا آغاز ہوچکا تھا۔ میرے دماغ نے وقتِ مقررہ سے پہلے مجھے بیدار کرکے کوئی غلطی نہیں کی تھی لہٰذا میرے پاس بھی غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے فوراً سے پیشتر جھنجوڑ کر شارو کو جگا دیا۔ اس کی نیند کا ستیاناس کرنے کا مجھے ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوا تھا۔ ان لمحات کے مطابق اس اپارٹمنٹ میں ایمرجنسی نافذ ہوچکی تھی۔

وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھی اور الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔ "کیا ہوا علی۔ تم نے مجھے اس طرح کیوں جھنجوڑا ہے۔ کیا سات بج گئے......؟"

"اس وقت میرے دماغ کے بارہ بجنے والے ہیں۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا اور بیڈ سے نیچے اترتا، پھر شارو کی الجھن دور کرنے کی غرض سے کہا۔ "نیچے زیریں منزل پر کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے وہاں عجیب سی آواز سنی ہے۔"

"ارے ...... دینارا ہمارے لیے ناشتا تیار کررہی ہوگی۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ "تم خوامخواہ ہی پریشان ہورہے ہو۔"

"ناشتے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹا پڑا ہے اور تم نے دیکھا ہی ہے، دینارا وقت کی کتنی پابند ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ کوئی اور ہی معاملہ لگ رہا ہے۔ تم واش روم میں جاؤ۔ میں اس مسئلے کو دیکھتا ہوں۔"

"مجھے تو کوئی مسئلہ سنائی یا دکھائی نہیں دے رہا......"

"کوئی بحث نہیں......" میں نے شارو کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دوٹوک انداز میں کہا۔ "واش روم میں جاؤ اور اندر سے کنڈی لگالو...... ٹھہرو!" میں نے ایک فوری خیال کے تحت پروگرام میں تبدیلی لاتے ہوئے حکمانہ انداز میں کہا۔ "واش روم میں نہیں، تم اس دبیز پردے کے پیچھے چھپ کر چپ چاپ کھڑی ہوجاؤ اور جب تک میں [illegible] مذکورہ پردے کی سمت اشارہ بھی کردیا۔

میری ہدایات میں کچھ ایسی سنگینی پائی جاتی تھی کہ شارو نے میرے موڈ کو بھانپتے ہوئے کوئی سوال نہیں کیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میرے حکم کی تعمیل کردی۔

میں بلی کے مانند دبے پاؤں کچن میں پہنچ گیا۔ بیڈروم کو چھوڑنے سے پہلے میں نے بستر پر لمبائی کے رخ تکیے رکھ کر ان کے اوپر گرم کمبل کو اس طرح اوڑھا دیا تھا کہ بادی النظر میں وہاں بیڈ پر دو افراد ایک دوسرے میں گھس کر سوتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہ سیٹنگ میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر کی تھی اور میں اپنی اس حکمتِ عملی پر مطمئن تھا۔

اس اپارٹمنٹ میں کچن اور واش روم دیگر کمروں سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر بنائے گئے تھے۔ کشادہ کچن کے اندر مجھے اپنے مطلب کی چیز تلاش کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں نے ایک تیز دھار چھری اٹھائی اور بہ آہستگی کچن سے باہر نکل آیا۔ اسی لمحے مجھے زینے پر کسی کے قدموں کی دھیمی چاپ سنائی دی۔

کوئی بڑی احتیاط کے ساتھ زیریں منزل سے بالائی منزل کی سمت پیش قدمی کررہا تھا۔ ایک بات کا مجھے یقین تھا کہ وہ دینارا ہرگز نہیں تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، کسی قیمت پر ہمارا دوست نہیں ہوسکتا تھا۔ اس خیال نے میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑا کر مجھے بے حد چوکنا بنادیا۔ میں ایک ایسے ستون کی آڑ میں چلا گیا جہاں سے زینے کے بالائی حصے کو آسانی سے واچ کیا جاسکتا تھا اور اس اوٹ کے باعث نیچے سے اوپر آنے والا مجھے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس سنگی ستون کے عقب میں پناہ گزیں ہوکر مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، چند سیکنڈ کے بعد ہی وہ میری نگاہ میں آگیا۔

وہ ایک دراز قامت سیاہ فام تھا جو ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ایک سائیلنسر لگی نائن ایم ایم گن بھی دکھائی دی۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ خطرناک گن سونتے زینہ بہ زینہ بالائی منزل کی جانب گامزن تھا۔ اس امر میں کسی شک وشبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ مجھ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے آیا تھا لہٰذا میں اس کے فقیدالمثال استقبال کے لیے ریڈ الرٹ ہوگیا۔

وہ دراز قد، سیاہ رو گن بردار بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ میں اس روکے سنگی ستون کے پیچھے ایک دم تیار کھڑا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گز دو گز پر چوکنا نگاہ رکھے ہوئے بیڈروم میں داخل ہوگیا۔ بیڈروم کا دروازہ میں نے کھلا چھوڑ دیا تھا لہٰذا ستون کے عقب میں رہتے ہوئے مجھے بیڈروم کے اندر کا منظر بالکل واضح نظر آرہا تھا۔

میں نے دیکھا، اس نامعلوم سیاہ فام نے بستر کے قریب پہنچ کر اپنی دانست میں بیڈ پر سوئے ہوئے دو افراد (میں اور شارو) پر یکے بعد دیگرے چار پانچ بے آواز فائر کرڈالے۔ "ٹھک ٹھک" کی مخصوص آواز کے بعد ایک اور آواز بھی ابھری۔ یہ گن کے میگزین کے خالی ہوجانے کی مخصوص "کلک" تھی۔

اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اس سفاک قاتل نے واپسی کی راہ لی۔ سیدھی سی بات تو یہی تھی کہ وہ ہمیں موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد کامیاب لوٹ رہا تھا۔ اس کی نظر میں اور اسے بھیجنے والوں کے ریکارڈ کے مطابق ہمارا قصہ پاک ہوچکا تھا۔ یہ صورتِ حال ہمارے حق میں جاتی لیکن آج کے دور میں حق کا حصول کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں جسے سیدھی سی بات سمجھ رہا تھا، وہ اچانک

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

الٹی ہوگئی۔

"دوتکیوں کے قاتل" اس سیاہ فام گن بردار نے شکی ستون کے پیچھے میری موجودگی کو محسوس کرلیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی زینے کی سمت اٹھنے والے اس کے قدم میری جانب بڑھنے لگے۔ اس بے رحم شخص نے جو کرنا تھا، وہ کرچکا تھا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے تو اسے اپنے در سے خوش فہمیوں کی سوغات کے ساتھ واپس جانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا لیکن وہ کسی ضدی بچے کے مانند مچل گیا تھا اور "ڈوموز...... ڈوموز" کے تقاضے کے ساتھ وہ میری طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ میں اس کو عطا کردہ خوش فہمیوں میں عملی اقدام کا بگھار لگانے کے لیے تیار ہوگیا۔

وہ جیسے ہی ستون کے نزدیک پہنچا، میں ستون کے پیچھے سے نکل کر ایک دم اس کے سامنے آگیا۔ میں اگر یہ حرکت نہیں بھی کرتا تو یقیناً وہ مجھے پا ہی لیتا لیکن میں نے اسے مزید زحمت سے بچاتے ہوئے خود کو اس کے سامنے حاضر کردیا۔

اپنی دانست میں وہ چند لمحے پہلے مجھے اور شارو کو موت کی نیند سلا چکا تھا۔ مجھے اپنے سامنے زندہ دیکھ کر اس کو ایک استعجابی جھٹکا لگا۔ شاید وہ اس بات پر حیرت زدہ تھا کہ میں زندہ کیسے ہوگیا۔ وہ ایسا سوچ رہا تھا یا اس کے ذہن میں کچھ اور چل رہا تھا، میں نے اس بات کی پروا کیے بغیر بجلی ایسی سرعت کے ساتھ اس کے پیٹ میں [illegible] رسید کردی۔

وہ میری جانب سے کسی ایسی حرکت کی توقع نہیں کررہا تھا۔ پیٹ پر میری زوردار لات کھا کر وہ لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے کی جانب گیا لیکن زمین بوس ہونے سے پہلے ہی وہ بڑی مہارت کے ساتھ سنبھل گیا اور اس نے میری جانب گن سیدھی کرکے فائر کردیا۔

میری خوش قسمتی کہ مجھے گولی نہیں لگی۔ وہ چند لمحے پہلے اپنی گن کا پورا کلپ دوتکیوں میں خالی کرچکا تھا۔ میں نے خود گن کا میگزین خالی ہونے کی مخصوص کلک سنی تھی۔

اپنی اس ناکامی پر وہ ایک لمحے کے لیے جھنجلا کر رہ گیا۔ اس نے میرے ہاتھ میں چھری دیکھ لی تھی۔ خالی گن ایک پتھر سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ اس نے غصے سے اپنی گن کو میرے چھری والے ہاتھ پر پھینک مارا۔ میں نے اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی اور ایک جانب جھک کر اس کا وار خالی دیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے کسی جنگلی جانور کے مانند مجھ پر چھلانگ لگادی۔

اس کے جست بھرنے سے پہلے میں نے اس کی آنکھوں میں الجھن اور حیرت کے ملے جلے تاثرات دیکھے تھے۔ اس نے کچھ ایسے انداز سے گھور کر مجھے دیکھا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔ اس کی اس کوشش کا سبب جلد ہی میری سمجھ میں آگیا۔

میں اس وقت جس حلیے میں تھا، وہ ڈاکٹر رائیل سے قطعی مختلف تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ ڈاکٹر رائیل کو ٹھکانے لگانے وہاں پہنچا تھا اور اپنی دانست میں اس نے یہ کام کر بھی ڈالا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ کمبل کے نیچے سوئے ہوئے ڈاکٹر رائیل اور اس کی ساتھی لڑکی کو اس نے فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لوکس گونزیلو کے اجنبی روپ میں مجھے وہ کوئی ایکسٹرا کردار جان کر مجھ سے بھڑ گیا تھا۔

اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ ایکسٹرا کیریکٹر بھی اس کی طرح لڑائی بھڑائی کا ماہر ہے۔ وہ جیسے ہی میرے اوپر آیا، میں نے چھری کو ہاتھ سے چھوڑ کر اسے اپنے پنجوں پر رکھ دیا۔

وہ بڑی مہارت کے ساتھ میرے طوفانی مکوں کو بلاک کرکے جوابی حملے بھی کررہا تھا۔ مجھے یہ ماننا پڑا کہ وہ ایک ماہر فائٹر تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کی حرکات و سکنات میں مشینی تیزی پائی جاتی تھی۔ وہ مجھ سے پٹنے کے دوران میں مجھے بھی چوٹیں لگا رہا تھا پھر ایک موقع پر اس کا داؤ چل گیا اور اس نے میرے بازو [illegible] گرفت میں لے کر ایک [illegible] دیوار [illegible] دیا۔

میں بیڈروم کے فرش پر جا کر گرا تھا۔ وہ بھی میرے پیچھے بیڈروم میں چلا آیا۔ اس کے انداز میں وحشیانہ جارحیت پائی جاتی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی جو مرمت کی تھی، وہاں کئی مقامات پر میرے گھونسوں کے طفیل اس کے چہرے کی کھال پھٹ گئی تھی اور ان زخموں سے خون بھی رسنے لگا تھا۔ وہ اس انداز سے میری جانب بڑھا تھا جیسے مجھے اپنے پاؤں کی ٹھوکروں میں اڑا لے گا۔ میں نے پہلی فرصت میں فرش سے اٹھنے کی کوشش کی۔

قبل اس کے کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل کرپاتا، حملہ آور نے ایک عجیب حرکت کی۔ میری سمت اٹھنے والے اس کے قدموں نے ایک فوری فیصلے کے تحت مجھے فراموش کرکے بیڈ کا رخ کیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ ان لاشوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا جو اس کے حساب سے کمبل کے نیچے موجود ہونا چاہیے تھیں۔ یقیناً اس گھر میں خلافِ توقع ایک ایکسٹرا کردار

کو دیکھ کر وہ شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

بستر کے معائنے سے جو نتیجہ برآمد ہونا تھا، وہ مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا لہٰذا میں اطمینان سے اٹھا پھر جارحانہ انداز میں اس کی جانب بڑھا۔ اس دوران میں وہ کمبل ہٹا کر وہاں کی صورتِ حال سے آگاہ ہوچکا تھا۔ مشن میں بری طرح حاصل ہونے والی ناکامی نے اسے آتشِ زیرپا کردیا اور وہ کسی جنگلی درندے کے مانند غرا کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں اس کی جانب سے ایسے ہی کسی حملے کی توقع کے ساتھ آگے بڑھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کمبل کے نیچے کے حالات کو دیکھ کر اس کا دماغ گھوم جائے گا اور گھومے ہوئے دماغ کے ساتھ انسان کچھ بھی کرسکتا ہے...... کچھ بھی!

اس نے ہوا میں اچھل کر ایک فلائنگ کک ماری۔ اگر میں ایک لمحے کے لیے بھی چوک جاتا تو اس کی چلائی ہوئی کک میرے تھوبڑے کا سوا ستیاناس مار کر رکھ دیتی۔ میں پہلو میں جھک کر اپنا چہرہ بچانے میں تو کامیاب رہا تاہم اس کی کک جزوی طور پر میرے کندھے پر لگی اور میں اس کک کے پریشر سے بیڈ کے اوپر جا گرا۔ اس نے آناً فاناً میں میرے اوپر چھلانگ لگادی۔

میں "دوتکیوں" کے اوپر، پشت کے بل گرا تھا اور اب وہ [illegible] میرے سینے پر سوار ہو کر میرا گلا دبانے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ وہی بیڈ تھا جہاں [illegible] شب شارو میرے سینے پر سواری ڈال کر اس کے اندر معلوم اور نامعلوم چڑیلوں کی کوئی طویل فہرست کھوجنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں نے شارو کی اس کیف آور اور گرم جوش کوشش کے راستے میں کوئی مزاحمتی دیوار کھڑی نہیں کی تھی مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ میں یہ رعایت ہرایرے غیرے اور نتھو خیرے کو بھی دے دوں گا......!

وہ جنگلی اپنے ہاتھوں کی حیوانی طاقت سے میری گردن کو دبوچے زور لگا رہا تھا۔ اگر اس وقت اس کی گرفت میں کسی ہما شما کی گردن دبی ہوتی تو اس ہما شما کی آنکھیں کب کی حلقوں سے ابل کر باہر نکل چکی ہوتیں......!

میں اس کی کلائیوں پر ہاتھ جمائے ایک طرف زور لگا کر اپنی گردن کو آزاد کرانے کی کوشش تو کر ہی رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کا دھیان بچا کر اپنی دونوں ٹانگوں کو فولڈ کرکے گھٹنوں کو اپنے پیٹ کے ساتھ لگالیا۔ وہ اپنی تمام تر توجہ میرا ٹیٹوا دبانے پر مرکوز کیے ہوئے تھا، میری اس حرکت کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور یہ غفلت اسے بہت مہنگی پڑ گئی۔

میں نے دونوں گھٹنوں کو اپنے پیٹ کے ساتھ لگا کر دونوں پاؤں کو اپنے اوپر سوار اس وحشی درندے کی ناف کے مقام پر رکھا اور جھٹکے سے دونوں ٹانگیں کھول دیں۔

یہ ایک دھواں دھار ڈبل کک تھی۔ میرے پٹھوں میں موجود بے پناہ توانائی نے اس کے ہاتھوں کی آہنی انگلیوں کو کیچڑوں میں بدل دیا۔ نتیجے کے طور پر میری گردن پر سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ توپ میں سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند فضا میں پرواز کرتے ہوئے عقبی پردہ پوش دیوار سے جا ٹکرایا۔ اگلے ہی لمحے ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی۔

یہ وہی دیوار تھی جس پر لٹکے ہوئے پردے کے پیچھے میں نے شارو کو چھپا رکھا تھا۔ وہ شیطان گینڈا براہِ راست شارو کے اوپر جا کر تو نہیں گرا تھا تاہم اس افراتفری نے شارو کو حواس باختہ کردیا تھا۔ وہ چیختے ہوئے پردے کے عقب سے نکل کر بیڈروم کے ماحول میں حاضر ہوگئی تھی۔

یہ کوئی خوشگوار ماحول نہیں تھا کہ شارو اسے انجوائے کرتی اور تالیاں بجا کر ہمیں داد دیتی۔ میں نے شارو پر دھیان دینے کے بجائے اپنی تمام تر توجہ اس سیاہ فام حملہ آور پر مرکوز رکھی اور اس کے اٹھنے سے پہلے میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔

دیوار سے خوف ناک تصادم کے نتیجے میں اس کی کمر پر کوئی کاری ضرب لگی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش میں تھوڑا سا سیدھا ہوا ہی تھا کہ میں نے اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ وہ بھی ممکنہ حد تک اپنے بچاؤ کی کوشش کر رہا تھا اور گاہے بگاہے مجھ پر حملہ بھی کردیتا تھا لیکن ان لمحات میں مجھ پر جیسے ایک جنون سا سوار ہوگیا تھا۔ کافی دنوں کے بعد کسی باقاعدہ فائٹر کے سامنے مجھے ہاتھ پاؤں کھولنے کا موقع ملا تھا۔ میں نے خوب طبیعت سے اس کی دھلائی کر ڈالی۔ چند لمحات کے بعد اس کی ناک اور منہ سے خون جاری ہوگیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کٹے ہوئے شہتیر کے مانند بیڈروم کے فرش پر گر کر ہانپنے لگا۔

اس کا چہرہ بھیانک صورت اختیار کرچکا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر غصیلے لہجے میں سوال کیا۔

"بتاؤ، کون ہو تم...... تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

اس نے میرے استفسار کا جواب نہیں دیا۔ میرے

مزید دو تین بار پوچھنے پر بھی جب اس نے کوئی مثبت ردِعمل ظاہر نہیں کیا تو میرا غصہ ساتویں آسمان پر جا پہنچا۔
''تم ایسے زبان نہیں کھولو گے۔'' میں نے اس کے چہرے پر اپنے پاؤں کی طوفانی ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے زنبور ڈال کر تمہارے جبڑے کھلوانا پڑیں گے......''

وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی ڈھٹائی نے میرے غصے کو قہر میں بدل دیا اور میں نے غضب ناک انداز میں اس کے سر کو فٹ بال بنا دیا۔ وہ میرے پاؤں کی ٹھوکریں برداشت کر رہا تھا مگر میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس ناکامی نے مجھے آپے سے باہر کر دیا اور میں نے اس کے چہرے، سینے اور پیٹ پر دھواں دھار فولادی ٹھوکروں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ میرے اس تشدد سے گھبرا کر وہ زبان کھول دے گا لیکن یہ میری بھول تھی۔ اس نے میرے سامنے اپنی زبان کھولنے کے بجائے ہمیشہ کے لیے بند کر لی۔

جس دوران میں، میں نے اپنے پاؤں کی طوفانی ٹھوکروں سے اس کے جسم کو تختۂ مشق بنا رکھا تھا، اسے ایک غیر متوقع حرکت کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے اپنا بچاؤ کرنے کے بجائے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کیپسول نکالا اور پھر بڑی سرعت کے ساتھ اس کیپسول کو اپنے منہ میں ڈال لیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے بدن کو خطرناک جھٹکے لگنے لگے۔

اس کیپسول میں یقیناً کوئی سریع الاثر زہر بھرا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جھٹکے کھاتا ہوا بدن ایک دم شانت ہو گیا پھر جب میں نے اس کے چہرے کو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ خون آلود ہونے کے باوجود بھی اس کے چہرے اور جسم کے باقی کھلے ہوئے حصے نیلے پڑ گئے تھے۔ اب اسے زندوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے ایک جھرجھری لی پھر شارو کی جانب دیکھتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔ ''یہ ختم ہو چکا ہے۔ ہمارا یہاں ایک لمحہ بھی رکنا ٹھیک نہیں۔ اپنا بیگ اٹھا لو۔ ہم یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔''

وہ خود بھی وہاں ٹھہرنے کے بارے میں قطعاً نہیں سوچ سکتی تھی۔ فوراً سے پیشتر وہ میرے حکم کی تعمیل میں لگ گئی۔ میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے حلیے کو اتنا درست کر لیا کہ باہر کے ماحول میں کوئی میرا چہرہ دیکھ کر چونک نہ اٹھے۔ اس موذی قاتل سے مارا ماری کے دوران میں میری حالت زیر و زبر ہو گئی تھی۔

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے بیگ اٹھائے بالائی منزل کے زینے اتر کر زیریں منزل کی جانب جا رہے تھے۔ ہمارے استعمال کے کپڑے، پاسپورٹ، ٹکٹ اور دیگر ضروری کاغذات اپنے اپنے بیگ کے اندر موجود تھے۔ میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ سرِدست دینارا کی سیاہ ماسکوچ میں وہاں سے نکلوں گا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔

ہم نے جیسے ہی زیریں منزل پر قدم رکھا، ایک بار پھر شارو کی چیخ نکل گئی۔ دینارا اوندھے منہ فرش پر پڑی تھی اور اس کے نزدیک ہی ایک دائرے کی شکل میں خون پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک طرح سے اس خون آلود دائرے کے اوپر پڑی تھی۔

میں اس نوعیت کے کسی خونچکاں منظر کی توقع کر رہا تھا۔ میں سائیلنسر لگی گن کی مخصوص ''ٹھک'' سن کر ہی سمجھ گیا تھا کہ زیریں منزل پر دینارا کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے۔ وہ خبیث درندہ دینارا کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہی ہماری جانب بڑھا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس نے دینارا کے سینے پر عین دل کے اندر بے آواز گولی اتاری ہو گی۔

میں شارو کو سنبھالا دے کر داخلی دروازے تک پہنچا۔ شارو کی حالت خاصی [illegible] ہو رہی تھی۔ ان [illegible] واقعات نے [illegible] زدہ کر دیا تھا۔ میں نے [illegible] اس کو سہارا دیے رکھا اور دیوار پر سے ماسکوچ کی چابی اتار لی پھر ہم اپارٹمنٹ سے باہر نکل آئے۔

اگلے ہی لمحے میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اپارٹمنٹ سے باہر قدم رکھتے ہی میں نے جو منظر دیکھا، وہ اپارٹمنٹ کے اندر نظر آنے والے خونچکاں مناظر سے کہیں زیادہ ہیبت ناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔

میری نگاہ سیاہ ماسکوچ کے برابر میں موجود شے پر جم کر رہ گئی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا، میرا دل و دماغ ایک خوف ناک دھماکے سے پھٹ جائیں گے اور میرا بدن ریشہ ریشہ ہو کر فضائے بسیط میں بکھر جائے گا۔

وہ میری زندگی کا سب سے ہولناک منظر تھا......!

امنگوں حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

پگڈنڈی

ڈاکٹر شیر شاہ سید

کچھ لوگوں کے نزدیک قوم سے محبت کا اپنا الگ مزہ ہوتا ہے۔ ان کے جذبے اور احساسات بھی اپنی ذات کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں پاتے۔ ان کا ہر قدم دوسروں کی بھلائی اور فلاح کے لیے ہوتا ہے۔ اس نے بھی اپنی قوم کی خاطر نس نس میں اتر جانے والے عشق اور پاگلوں کی طرح فدا ہو جانے والے عاشق کو قربان کر دیا تھا کیونکہ... اسے ہر حال میں اپنی نسل کو بچانا تھا۔

نارسائی کے آنسوؤں میں ڈوب کر ابھرنے والی دوشیزہ کا عزم

آیو کی اس کا نام تھا۔ پہلے دن ایسا لگا جیسے یہ نام کچھ جانا پہچانا سا ہے۔ وہ ریڈ انڈین تھی اور میڈیکل کالج میں اس کا داخلہ ریڈ انڈین لوگوں کے لیے مخصوص نشست پر ہوا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ امریکا کے میڈیکل کالجوں میں بھی مختص سیٹیں ہوتی ہیں اور ان سیٹوں پر مخصوص لوگوں کو کم نمبر کے باوجود داخلہ دیا جاتا ہے۔ میرے ڈیڈی کا تعلق پاکستان سے تھا، وہ ڈاکٹر بن کر امریکا آ گئے تھے۔ میری تو پیدائش بھی امریکا میں ہوئی اور

وہ فزیالوجی، اناٹومی اور بائیوکیمسٹری کے معاملات میں تھوڑا کمزور تھی لیکن مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ انتہا درجے کی محنتی تھی۔

اس نے ہی ایک دن باتوں باتوں میں بتایا کہ اس کا تعلق امریکا کے اصل باشندوں کے بڑے قبیلے چروکی سے ہے اور اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ ان خصوصی نشستوں پر ہوا ہے جو ریڈ انڈین لوگوں کے لیے مختص ہے۔ اس کا تعلق چروکی خاندانوں کے اس گروہ سے تھا جو سو فیصد چروکی تھے اور ان کے خون میں ابھی تک کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ہائی اسکول میں تاریخ امریکا کی خانہ جنگی اور جنگِ آزادی، امریکا اور اس کی جنگیں یہ سب کچھ پڑھا تھا۔ اسی طرح سے امریکا کے اصل باسیوں سے یورپی لوگوں کی جنگوں کے بارے میں بھی پڑھا تھا لیکن عملی زندگی میں، میں نے کبھی کسی ریڈ انڈین کو نہ دیکھا تھا، نہ ملا تھا اور نہ ہی ان سے بات کی تھی۔ میرے لیے اور میرے جیسے بہت سے پاکستانی امریکیوں کے لیے یہ افسانوی کردار تھے، ہالی وڈ کی فلموں کی کہانیاں تھیں جن پر طرح طرح کی فلمیں بنا کر ہالی وڈ کے ان داتا پیسے کما رہے تھے۔ ان حالات میں میری ملاقات اس چروکی لڑکی سے ہوئی اور ایسی چروکی لڑکی جو ابھی تک ریڈ انڈین تھی، اس کے اقدار بھی وہی تھے اور زبان بھی وہی تھی۔ سوچ کا انداز بھی چروکی تھا جس نے اپنی تاریخ سے اپنا رشتہ نہیں توڑا تھا۔

ایک دن اس سے بات کرتے کرتے مجھے یاد آگیا کہ آیو کی تو چروکی قبیلے کے ایک مشہور آدمی سکی اوا کی بیٹی کا نام تھا۔ سکی اوا جب انگریزوں سے ملا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ لوگ اپنی زبان لکھ لیتے ہیں اور پھر اسی طریقے سے ایک سے دوسری جگہ پیغامات بھیجنا شروع کردیتے ہیں، ایک دوسرے کو خط لکھتے ہیں اور ہونے والی جنگوں کے حالات کو کاغذ پر لکھ لیتے ہیں۔ اسے یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوئی تھی کہ یہ لوگ اپنے کاغذوں پر اپنے جانوروں کے بارے میں ساری تفصیلات بھی لکھتے ہیں۔ اس نے سوچا تھا انڈین لوگوں کی بھی اپنی زبان ہونی چاہیے پھر آہستہ آہستہ اس نے حروف بنانے شروع کیے۔ پہلی دفعہ جب اس نے حروف بنائے تو ان کی تعداد سیکڑوں میں تھی پھر اس نے حروفوں کو ملا کر آوازیں بنائیں اور اس طرح سے آج کے ریڈ انڈین لوگوں کی لکھنے کی زبان وجود میں آئی۔ آیو کی اس کی بیٹی تھی اور سکی اوا کے آخری سفر میں اس کے ساتھ تھی اور اسی سفر میں اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔

یاد آتے ہی میں نے اس سے پوچھ لیا کہ اس کا نام سکی اوا کی بیٹی پر ہے تو وہ مسکرا دی تھی۔

”کیوں نہ ہو؟ آخر میں چروکی ہوں اور سکی اوا ہمارا بڑا محسن تھا۔ میرا نام میری ماں نے اس کی بیٹی کے نام پر رکھا ہے۔“ ساتھ ہی اس نے ریڈ انڈین لوگوں کی ختم ہونے والی نسلوں کے بارے میں کئی کہانیاں سنا دی تھیں۔ اس کے اندر ریڈ انڈین خون کے ساتھ ساتھ ریڈ انڈین احساسات بھی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر اسی لیے بن رہی ہے کہ ڈاکٹر بننے کے بعد ریڈ انڈین لوگوں کے ان علاقوں میں جا کر کام کرے جہاں ابھی تک انہیں وہ سب کچھ میسر نہیں ہے جو دوسرے امریکیوں کو میسر ہے۔

امریکا میں پیدا ہو کر بڑے ہوتے ہوئے میں نے نہیں سوچا تھا کہ امریکا کے اندر بھی کئی اور امریکا ہیں۔ ایسے غریب لوگوں کا امریکا جہاں جہالت بھی ہے اور غربت بھی ہے اور [illegible] بیماریاں [illegible] بیماریاں بھی ہیں۔ امریکا بڑے شہروں کی اونچی اونچی عمارتوں کا نام نہیں ہے، ان بڑے بڑے شہروں کو ملانے والی عظیم الشان شاہراہوں سے بننے والے امریکا کے اندر ایک اور امریکا ہے۔ آیو کی اسی امریکا سے آئی تھی۔ پہلی دفعہ مجھے اس کا چہرہ پُرکشش لگا، اس کی آواز دلکش لگی۔ اس کے چہرے کے سرخ رنگ کے اندر ایک جذبوں سے بیدار پُرکشش لڑکی نظر آئی۔

ہماری دوستی بڑھتی ہی چلی گئی، میڈیکل کالج کے چار سال ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے۔ ہم دونوں ہی نے فیصلہ کیا کہ کچھ اختیاری کام کرنے کے لیے ساؤتھ امریکا کے ملک نکاراگوا اور گوئٹے مالا جائیں گے۔ اس تمام عرصے میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ خواب دیکھنے لگے تھے، خواب بھی ایسے جو میرے ڈیڈی اور امی کے لیے قابلِ قبول نہیں تھے۔ کالج میں ہم دونوں کا زیادہ تر وقت ساتھ ہی گزرتا تھا اور ہر کچھ دنوں کے بعد مجھے امریکا میں

بھی پلا بڑھا تھا میں۔ کولوراڈو کے جس ڈسٹرکٹ میں ہم لوگ رہتے تھے، وہاں کا اسکول بہت اچھا تھا، یہیں تعلیم حاصل کی میں نے اور اتنے اچھے نمبروں سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا کہ مجھے کالج جانے کے لیے وظیفہ مل گیا تھا۔

ایمری یونیورسٹی میں کالج کے دن بہت اچھے گزرے، اپنے والدین کی خواہشات اور اپنے شوق کے مطابق میرے نمبر اتنے اچھے تھے کہ میڈیکل کالج میں میرے داخلے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔

ڈیڈی جب پاکستان سے آئے تو ڈاکٹر تھے، امریکا میں ہی انہوں نے تربیت حاصل کی، اس کے بعد یہاں پریکٹس کرتے رہے تھے۔ ہم دو بھائیوں، دو بہنوں نے امریکا میں بہترین تعلیم حاصل کی اور کبھی بھی کسی معاشی مسائل کا سامنا نہیں کیا تھا ہم لوگوں نے۔ ہر چیز کی فراوانی تھی، زندگی کی وہ ساری آسائشیں میسر تھیں جو کسی امیر ڈاکٹر کے گھرانے کو حاصل ہوتی ہیں۔ ہمارے گھر میں ہر طرح کی آزادی تھی سوائے مذہبی آزادی کے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ سب گھر والے [illegible] ہوتے گئے تھے جس کے بعد سے مذہبی [illegible] ہوگئی تھی [illegible]

بچپن کے دن مجھے یاد ہیں، ہمارا گھر کافی [illegible] آئے دن ڈیڈی کے دوستوں کا ہجوم رہتا تھا۔ امی بھی مختلف قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھیں۔ ہم لوگ سال دو سال میں ایک دفعہ پاکستان کا بھی چکر لگا لیتے۔ اس کے علاوہ جب بھی موقع ملتا سارا خاندان ڈیڈی کی پسندیدہ وین میں سوار ہو کر تفریح کے لیے نکل کھڑا ہوتا۔

میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ گھر کے طور طریقوں میں آہستہ آہستہ تبدیلی آرہی ہے۔ اتوار کو مسجد جانا لازمی ہوگیا۔ شروع شروع میں تو مجھے برا نہیں لگا لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ہی مسجد کی زبردستی حاضری مجھے کھلنے لگی تھی۔ ہم بھائی بہنوں میں کوئی بھی سوال نہیں کرتا مگر مجھے سوالوں کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ میرے زیادہ تر سوالوں کا جواب نہ تو ڈیڈی کے پاس ہوتا تھا اور نہ ہی مسجد کے مولوی صاحب کے پاس۔

مجھے سب سے زیادہ کوفت یہ دیکھ کر ہوتی تھی کہ زیادہ تر پابندیاں میری بڑی بہنوں پر تھیں، انہیں سر ڈھانپنا ہوتا، انہیں ٹانگیں ڈھکی رکھنی ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا کہ ہر کوئی ان سے کسی نامعلوم وجوہات کی بنا پر خائف ہے۔ اچھے خاصے میرے آزاد خیال امی ڈیڈی مولوی ٹائپ بن گئے تھے۔

میں آزاد تھا ہر طرح سے آزاد بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ میں نے آزادی چھین لی تھی۔ میرے رویے نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ میرے بہت سے معاملات میں انہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں پاکستان میں پیدا ہونے والا نہیں تھا۔ میں امریکا میں پیدا ہونے والا امریکن تھا۔ میری بہنیں بھی امریکا میں پیدا ہونے والی امریکن تھیں لیکن بچپن سے ہی انہیں جو تعلیم دی گئی تھی اس نے انہیں نہ جانے کیسے اس بات پر قائل کرلیا کہ وہ مختلف ہوگئی تھیں، شاید میری امی اور ڈیڈی بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ حجاب پہن کر، سر کے بالوں کو چھپائیں، مجھے ان باتوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا اگر یہ سب کچھ وہ اپنی مرضی سے کرتیں۔ انہی باتوں کی وجہ سے ہمارے درمیان ایک چھوٹی سی خلیج حائل ہوگئی تھی۔

اسکول اور کالج تک میرا دھیان صرف کتابوں، سوئمنگ اور فٹ بال کے میچوں میں رہا۔ یہ نہیں کہ لڑکیوں نے اپنی طرف متوجہ نہیں کیا۔ متوجہ تو بہت کیا لیکن امی ڈیڈی کی باتیں نہ مانتے ہوئے بھی میں لاشعوری طور پر بھی نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع ملے۔ یہ تو ہونا تھا۔ یہ تو ایسا ہی تھا۔

میڈیکل کالج میں دوسری طرح کے معاملات تھے۔ زندگی کا باضابطہ سفر شروع ہوگیا تھا۔

آیو کی اتنی ذہین نہیں تھی جتنی اس کی آنکھوں میں ذہانت تھی۔ سوچتا ہوا لبوترا سا سرخ چہرہ، سر پر سیاہ گھنے بال جنہوں نے بڑی مشکل سے پیشانی کی جگہ چھوڑی تھی۔ سیاہ چمکیلی ذہین آنکھوں کے درمیان روایتی سرخ امریکیوں والی ناک۔ وہ بال بھی فلموں میں نظر آنے والی ریڈ انڈین لڑکیوں کی طرح بناتی تھی اور اس کی تھوڑی کے نیچے ایک نشان کندا ہوا تھا، اس کا تعلق سرخ امریکیوں کے چروکی قبیلے سے تھا۔

اس سے میری دوستی ہوگئی۔ وہ اکثر و بیشتر پڑھنے میں میری مدد لیتی تھی۔ اسے دنیا کے بہت سارے دوسرے معاملات کے بارے میں تو بہت کچھ پتا تھا لیکن

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

رہنے والے ریڈ انڈینز کے بارے میں نئی نئی چیزوں کا پتا لگتا تھا۔ ان کی تاریخ کے وہ پہلو میرے سامنے آتے جن پر میری نظر کبھی بھی نہیں پڑی تھی۔ تاریخ بڑی تکلیف دہ تھی۔

ہم دونوں اپنا اختیاری کام کرنے کے لیے نکاراگوا اور گوئٹے مالا چلے گئے۔ یہ دونوں ممالک امریکا کے پڑوس میں ہونے کے باوجود غریب ملک تھے۔ یہ تجربہ بڑا مختلف تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے پاکستان آگیا ہوں۔ اپنے والدین کا پاکستان جہاں میں کئی سالوں سے نہیں گیا تھا۔ بچپن میں جب بھی پاکستان جاتا تو مجھے پاکستان میں بہت مزہ آتا مگر جب کالج کی چھٹیوں میں پاکستان جانا ہوا تو مجھے پاکستان سے بوریت ہونے لگی تھی۔ وہاں کی غربت، چاپلوسی، جھوٹ اور دوغلا پن میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ ہمارے رشتے دار تو خاصے امیر تھے مگر غربت کی عام صورت حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ یہی سب کچھ ہم دونوں نے نکاراگوا اور گوئٹے مالا میں دیکھا تھا۔ ایک طرف بے شمار دولت، دوسری جانب انتہائی غریب لوگ۔ بیماریاں، پریشان حال بوڑھے اور بھیک مانگتے ہوئے سڑکوں پر گھومنے والے ننھے بچے۔

آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آیا کہ میرے ڈیڈی اور میرے ڈیڈی کی طرح کے بہت سے پاکستانی ڈاکٹر امریکا میں کیوں آباد ہو گئے تھے، امریکا میں ان کے لیے سب کچھ تھا۔ معاشی آزادی، سماجی تحفظ اور بغیر کسی خوف کے زندہ رہنے کی آزادی اور اپنے پیشے میں آگے بڑھنے کے تمام تر مواقع۔

آیوکی اور میں نے نکاراگوا اور گوئٹے مالا میں بہت کچھ سیکھا۔ مجھے پتا تھا کہ آج کے امریکا میں طب، طب کی تعلیم اور مریضوں کے لیے علاج کی سہولتیں اپنے انتہا پر پہنچی ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی آیوکی کی اس بات نے مجھے حیران کر دیا تھا کہ اب بھی امریکا میں ایسے علاقے ہیں جہاں ریڈ انڈین لوگوں کو خراب ترین حالات کا سامنا ہے۔ ان کے پاس نہ تعلیم ہے اور نہ ہی صحت کی سہولتیں۔ وہ کہتی تھی کہ ڈاکٹر بننے کے بعد وہ ریڈ انڈین لوگوں کے علاقے میں جا کر کام کرے گی۔ جہاں اس کے اپنے لوگ رہتے ہیں انہیں اس کی ضرورت ہے۔

مجھے اس کی بات اچھی لگتی تھی۔ وہ سادہ تھی۔ اس کی باتیں صاف تھیں اور اس کے دل کے اندر ایک بہت بڑا پیار کا سمندر تھا۔ پیار اپنی قوم سے، اپنی زمین سے، اپنی روایات سے، اپنی ثقافت سے، اپنی زبان سے۔ وہ جب کبھی بھی ریڈ انڈین لوگوں کی طرح سے لباس پہنتی تھی تو مجھے اور بھی زیادہ حسین لگتی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ کوئی بھی لباس پہنے ریڈ انڈین لباس کا کوئی نہ کوئی جز اس کا حصہ ضرور ہوتا تھا۔

مجھے پتا تھا کہ میں آہستہ آہستہ اس سے شدید محبت کرنے لگا ہوں اور مجھے یہ بھی پتا تھا کہ میں بھی اسے اچھا لگتا ہوں مگر اس نے کبھی کھل کر اس کا اظہار نہیں کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو عزیز رکھتے تھے۔ مذاق میں کئی دفعہ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اس سے ہی شادی کروں گا جس دن وہ ہاں کہے گی، اسے انگوٹھی پہنا دوں گا۔

وہ ہنس دیتی تھی، اس کی آنکھیں جیسے کھل اٹھتی تھیں۔ اس کے ہونٹوں کے پیچھے سے سفید موتی جیسے دانتوں نے جیسے مسکرا کر ہاں کہہ دیا تھا مگر وہ خاموش رہتی تھی۔ یہ آیوکی کی شخصیت کا ایک پراسرار پہلو تھا، شاید قدیم امریکی ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔

[illegible]

دوستی بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ ان کے خیالات تو بہت جدا تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں ڈھیر سارے کسی پاکستانی انکل اور آنٹی کی بیٹی سے شادی کروں یا پھر پاکستان جا کر وہاں کی کسی پڑھی لکھی لڑکی کو بیاہ کر امریکا لے آؤں مگر مجھے یہ بات بالکل بھی پسند نہیں تھی، مجھے تو آیوکی ہی اچھی لگتی تھی اور میں اسی سے شادی کرنا چاہتا تھا، آہستہ آہستہ ہمارے گھر میں آیوکی وجہ عناد بن گئی تھی۔

آیوکی ڈاکٹر بننے کے بعد واپس ریڈ انڈین کے مخصوص علاقوں میں جا کر کام کرنا چاہتی تھی، اس کا خیال تھا کہ آج کے جدید امریکا میں گوروں کو تو سب کچھ میسر ہے مگر ریڈ انڈین لوگ صحت کے مسائل کا شکار ہیں اور اس کا فرض ہے کہ وہ جو کچھ بھی ان کے لیے کر سکتی ہے کرے۔ ان لوگوں تک پہنچے جو اس کے اپنے لوگ ہیں، جنہیں اس کی ضرورت ہے۔

مجھے اس کی بات اچھی لگتی تھی مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ میں امریکا میں پیدا ہوا تھا، پلا اور بڑھا تھا، یہاں وظیفہ پا کر بہترین اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی اور اگر یہاں کے کسی ایسے علاقے میں کام کرنے جاتا جہاں ڈاکٹر نہیں ہیں تو یہ ایک طرح سے میرا فرض بھی تھا۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ آیوکی سے متعلق بحث کے دوران ڈیڈی نے کہا تھا کہ میں پاکستان چھوڑ کر امریکا اس لیے آیا تھا کہ یہاں زندگی بناؤں، اچھا مستقبل ہو، بچوں کی اچھی تعلیم ہو جو پاکستان میں ممکن نہیں تھی اور اب تم یہ چاہتے ہو کہ امریکا کے کسی دور افتادہ گاؤں میں جا کر رہو محض اس ریڈ انڈین لڑکی کے لیے۔

میرے پاس جو جواب تھا وہ ان کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ وہ یہ بھول رہے تھے کہ میں پاکستانی باپ کا بیٹا ضرور تھا مگر پاکستانی نہیں تھا۔ میں امریکی تھا اور دوسرے امریکیوں کی طرح مجھے اپنی زندگی کے بارے میں خود ہی فیصلے کرنے تھے، اچھے یا برے۔ یہ حق میں کسی اور کو دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ وہ ضرور پاکستان چھوڑ کر اپنی زندگی بنانے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی بنا بھی لی تھی، ان کے لیے جو مناسب ہوگا شاید [illegible]

[illegible]

ہم دونوں ہی ڈاکٹر بن گئے اور اس سے پہلے کہ ہم دونوں دوسرے امتحانات کے بارے میں فکر مند ہوتے، ہم نے فیصلہ کیا کہ جارجیا جا کر اس مشہور پگڈنڈی پر تھوڑا سفر کریں گے جس پر گزرتے ہوئے ہزاروں سرخ انڈین لوگوں نے جانیں دے دی تھیں۔ یہ سرخ امریکیوں کی تاریخ کا ایک اہم دردناک واقعہ تھا۔

آیوکی نے مجھے اس پگڈنڈی کی تاریخ بتائی تھی۔ امریکی صدر جارج واشنگٹن کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ریڈ انڈین اپنا مذہب، ثقافت، روایات چھوڑ کر محض امریکی بن جائیں گے لہٰذا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے مگر ایک اور امریکی صدر اینڈریو جیکسن نے گورے یورپیوں کے مفاد کے لیے انڈین لوگوں سے کیے گئے تین سو سے زیادہ معاہدوں کو توڑتے ہوئے اٹھارہ سو تیس میں ایک قانون بنوایا کہ انڈین لوگوں کو ان کی آبائی زمینوں سے دھکیل کر مسی سپی دریا تک پہنچا دیا

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

جائے۔ چروکی، چوکنا، سیمی نول اور کریک لوگوں سے ان کی آبائی زرخیز سونا اگلنے والی زمینیں خالی کرائی جائیں جہاں یورپ کے سفید لوگ روئی کی کاشت کریں، اپنی فصل بوئیں۔ اس مہم میں سب شامل تھے انگریز، فرانسیسی، جرمن، اٹالین، اسپینی اور دوسرے یورپی مہاجر۔ انہیں زمین چاہیے تھی اور زرخیز زمینیں چاہیے تھی، چاہے قیمت کچھ بھی ہو۔ سرخ امریکیوں نے بھاری قیمت ادا کی تھی تاریخ کا یہ جبر امریکیوں کے ضمیر کا بوجھ بن کر رہ گیا ہے۔

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ اس زمانے میں چروکی لوگوں نے امریکی سپریم کورٹ سے اس قانون کے خلاف فیصلہ لے لیا تھا مگر صدر جیکسن نے اس قانون کو لاگو کرا کر ہی دم لیا تھا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کو بہانوں حیلوں سے رد کر دیا گیا تھا۔ لاکھوں ریڈ انڈین لوگ جارجیا، الاباما، فلوریڈا، آرکنسا، اوکلاہوما، مزوری، الی نوائے اور کیرولینا سے بے دخل کر دیے گئے تھے اور بارہ سو میل لمبی پگڈنڈی پر سفر کرتے ہوئے نہ جانے کیسے تکلیفیں اٹھاتے ہوئے جان دیتے ہوئے مسی سی پی.... دریا کے دوسرے کنارے کے علاقوں تک پہنچے تھے۔

کئی سالوں کے اس سفر میں ان کی جانیں گئی تھیں۔ ان کے ایک سردار جارج ہارکنس نے کہا تھا۔ ”ہم اپاچی لوگ مصیبتیں اٹھائیں گے مگر سفید آدمی کے قانون کے تابع نہیں ہوں گے۔ ہم آزاد لوگ ہیں اور آزادی کے لیے جان بھی دے دیں گے۔“ انہوں نے جانیں دی تھیں، بارہ سو میل کے سفر میں ملیریا، کالرا، ٹائیفائڈ، ٹائی فس، ہوپنگ کف، بھوک اور دوسری بیماریوں کا شکار ہو کر مر گئے تھے۔ یہی وہ پگڈنڈی تھی جسے آنسوؤں کی پگڈنڈی اور موت کا راستہ قرار دیا گیا تھا۔

آیوکی کے ساتھ اس پگڈنڈی پر چلتے چلتے میرے سامنے جیسے کوئی فلم چل رہی تھی۔ گھوڑوں، خچروں کے ساتھ چلتے ہوئے ہزاروں افراد کمر خمیدہ بوڑھی عورتیں، بلکتے لرزتے اور مرتے ہوئے بچے، زخمی نوجوان اور روتے ہوئے بوڑھے لوگ، مائیں اپنے بچوں کو سنبھالتی ہوئی اور نوجوان لڑکیاں جھکی ہوئی ہراساں اور پریشان۔ آنسوؤں کی پگڈنڈی پر نہ جانے کیا کیا ہوا ہوگا۔ کس کس طرح سے لوگوں نے جانیں دی ہوں گی۔ بچے اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے لپٹ لپٹ کر روتے ہوں گے۔ ان کے شانوں، ان کے بازوؤں، ان کے کاندھوں پر دم توڑتے ہوں گے۔ پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ اپنے پیاروں کو دفن کرنے والے ریڈ انڈین لوگ آنسوؤں سے تر چہروں کے ساتھ، درد سے بھرے دلوں کو لیے ہوئے مسی سی پی.... دریا کے کنارے پہنچے ہوں گے۔ یہ سب کچھ گزر چکا تھا، اس کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا، ذہن میں خاکہ بنایا جا سکتا تھا مگر بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ میں اور میرا ذہن تاریخ میں بھٹک رہے تھے۔

اسی راستے پر چلتے چلتے ایک جگہ پر ایک کتبہ لگا ہوا تھا۔ ”ان لوگوں کی یاد میں جو چلتے ہوئے مارے گئے یا روتے ہوئے چلے گئے۔“ اسی راستے پر چلتے چلتے میں نے دوبارہ آیوکی سے شادی کی درخواست کی تھی، میں نے یہ وعدہ کیا کہ زندگی کے سفر میں اس کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ وہی سب کچھ کروں گا جو تم چاہتی ہو، ویسے ہی جیوں گا جیسے تم جیو گی۔ تمہارے خواب میرے خواب ہیں۔ مجھے اپنا دامن میں ... لو ... ہی دنیا کو اپنانا چاہتا ہوں۔

مگر اس نے منع کر دیا۔

اس نے کہا تھا کہ اس کی شادی کسی ریڈ انڈین سے ہو گی تاکہ یہ قوم یہ ذات نسل کشی کا شکار نہ ہو۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ ”محبت اپنی جگہ پر لیکن میں چروکی ہوں اور چروکی ہی رہنا چاہتی ہوں۔“ اس کی آواز پھنس گئی تھی، وہ وہیں بیٹھ گئی تھی۔ ”میرے بچے چروکی ہوں گے۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں رک رک کر کہا تھا۔ ”وائٹ مین سفید آدمیوں نے ہمیں ختم کر دیا ہے، میں نے اور میرے جیسے لوگوں نے اپنی حیثیت برقرار رکھی ہے، میں ہار نہیں کر سکتی ہوں۔“

اس کے کتابی سرخ چہرے پر آنسو پھیل رہے تھے۔ اس کی ٹھوڑی پر کالا کندا کیا ہوا نشان نمایاں ہو گیا تھا۔ میرے بھی آنسو نکل آئے تھے۔ آنسوؤں کی اس پگڈنڈی پر نہ جانے کتنی دیر تک ہم دونوں آنسو بہاتے رہے۔

انہوں نے حضرت مریم کے بارے میں حضرت زکریا پر بہتان لگایا تھا لیکن یہ معجزہ دیکھ کر کہ ابن مریم عالم شیر خوارگی میں باتیں کر رہا ہے اور اپنی صفائی پیش کرتا ہے انہیں یقین کرنا پڑا تھا کہ یہ منجانب اللہ ہے۔ اس میں مریم کا قصور نہیں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اس واقعے کو لوگ بھول بھال گئے تھے۔ اب ان لوگوں نے ایک مرتبہ پھر اس معاملے کو اٹھایا اور حضرت زکریا کو ذمے دار ٹھہرانے لگے اور ایسا شیطانی گروہ تیار کر لیا جو حضرت زکریا کو تنگ کرنے کے درپے ہو گیا۔ آپ جہاں

تیسرا حصہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بے شک کائنات کا نظام اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے... جو انسانی کے ... رواں دواں ہے لیکن... اس روانی کو درست طریقے سے برقرار رکھنے کے لیے ... اللہ پاک نے انبیا کو مبعوث فرمایا اور انہیں انسانوں میں سے ہی ... کیا۔ اسی سلسلے کو بڑھاتے ہوئے حضرت عیسیٰ ؑ کی ولادت باسعادت ہوئی جو بذاتِ خود ایک معجزہ اور بنی نوع انسان کے لیے ایک بہترین ہدایت ہے۔

اللہ کے ایک برگزیدہ پیغمبر کے حالاتِ زندگی

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

وعظ کرنے کھڑے ہوتے، یہ شرارتی وہاں پہنچ جاتے۔
بال دار لوگ اور حکمران طبقہ آپ کے خلاف تھا جبکہ آپ کے عقیدت مند زیادہ تر غریب لوگ تھے جنہیں آسانی سے ڈرایا دھمکایا جاسکتا تھا۔

یہودیوں کی سازش میں یہ بات شامل تھی کہ ان عقیدت مندوں کو ڈرایا دھمکایا جائے تاکہ حضرت زکریاؑ اکیلے رہ جائیں۔ ان کی یہ ترکیب کارگر ہوئی۔ بے چارے غریب لوگ دھمکیوں میں آگئے۔

سازشیں بڑھتی گئیں۔ تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ معلوم کرلیا گیا کہ حضرت زکریاؑ کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت نہیں ہوتے۔ معلوم ہوا کہ دوپہر کے وقت وہ گھر پر ہی ہوتے ہیں۔ گرمی سے بچنے کے لیے دیگر لوگ بھی اپنے اپنے گھروں میں ہوتے ہیں۔ مکمل سناٹا ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو یہ کام سپرد کیا گیا تھا، ایک دوپہر آپ کے گھر کے چاروں طرف پھیل گئے۔ منصوبہ یہی تھا کہ گھر میں داخل ہوکر انہیں بے خبری کے عالم میں قتل کردیا جائے گا۔

حضرت زکریاؑ ابھی ابھی باہر سے آکر بستر پر بیٹھے ہی تھے کہ باہر سے کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ آپ کو کچھ دنوں سے دھڑکا لگا ہوا تھا لہٰذا ان آوازوں کو سن کر چونک گئے۔ گھر سے باہر جھانک کر دیکھا تو کچھ لوگوں کے تیور ٹھیک معلوم نہیں ہو رہے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں وہ پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ یہ بدمعاشوں کا ایک گروہ تھا جو آپ کی تبلیغ کے دوران آپ کو مذاق کا نشانہ بناتا رہتا تھا۔

”شاید وہ وقت آگیا جس کا مجھے ڈر تھا۔ یحییٰ کے بعد اب یہ لوگ مجھے بھی زندہ دیکھنا نہیں چاہتے۔“ آپ نے زوجہ سے کہا۔

”اس سے پہلے کہ یہ لوگ اندر آئیں، آپ پچھلے دروازے سے باہر نکل جائیے۔ وہ اندر آئے تو آپ تک نہ پہنچ سکیں گے۔“

آپ پچھلے دروازے کی طرف بڑھے اور باہر نکل گئے۔ آپ سمجھ رہے تھے کہ اس طرف کوئی نہیں ہوگا لیکن آپ کے نکلتے ہی لوگوں نے آپ کو گھیر لیا۔ آپ ان سے بچنے کے لیے جنگل کی طرف بھاگے۔ تعاقب کرنے والے کچھ فاصلے سے ان کے پیچھے تھے۔ آپ ایک درخت [illegible] گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ آواز [illegible] درخت سے آواز آئی۔ ”زکریا [illegible]“ [illegible] درخت کا تنا اصلی حالت پر آگیا۔ تعاقب کرنے والوں نے آپ کو درخت تک آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ غائب ہوگئے تھے۔ اب وہ پریشان تھے کہ زکریاؑ گئے تو کدھر گئے۔ اتنی دیر میں ایک شخص سامنے آیا۔ کہا جاتا ہے یہ ابلیس تھا۔ جس وقت حضرت زکریاؑ درخت کے تنے میں داخل ہوئے تھے، آپ کے کُرتے کا دامن باہر رہ گیا تھا۔ ابلیس نے اس کی نشاندہی کی۔

”یہ کپڑا دیکھ رہے ہو؟ زکریا اسی درخت میں ہیں۔ انہوں نے جادو کے زور سے خود کو درخت میں بند تو کرلیا لیکن کرتے کے دامن کا کچھ حصہ باہر رہ گیا۔ یہ دیکھو۔“

یہود نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں اس درخت کو جلا دینا چاہیے لیکن وہی شخص پھر آگے بڑھا۔

”درخت کو جلاؤ نہیں بلکہ ”آرا“ چلا کر درخت کے دو ٹکڑے کردو۔ اگر زکریا اس درخت میں ہوئے تو وہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ زکریا خود بھی لکڑی حاصل کرنے کے لیے آرے سے درخت کاٹتے رہے ہیں۔ آج وہی آرا ان پر چلا دو۔“

لوگوں کو یہ مشورہ پسند آیا۔ کچھ لوگ دوڑ کر شہر کی طرف گئے اور ”آرا“ لے آئے۔ جب درخت پر ”آرا“ چلایا گیا اور یہ آرا آپ کے قریب پہنچا تو وحی آئی۔ ”اگر تم نے کچھ بھی آہ وزاری کی تو ہم یہ سب زمین تہ و بالا کردیں گے اور اگر تم نے صبر سے کام لیا تو ہم فوراً اپنا غضب نازل نہیں کریں گے۔“ آپ نے پہلا راستہ اختیار کیا اور صبر سے کام لیا۔

☆☆☆

جب حضرت یحییٰؑ بھی قتل ہو چکے اور حضرت زکریا علیہ السلام کو بھی آرے سے چیر دیا گیا تو جلالِ الٰہی کو جوش آیا۔ حضرت عیسیٰؑ کی عمر اس وقت تیس سال تھی۔ دو عظیم المرتبت پیغمبر دنیا سے اٹھ چکے تھے۔ اب ایک ایسے داعی کی ضرورت تھی جو خدا کی حجت کو پورا کرے۔ اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ ہر قوم کی طرف اصلاحِ احوال کرنے والا ضرور بھیجا ہے تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ

ہمارے پاس کوئی سمجھانے والا نہیں آیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو منصبِ نبوت پر فائز کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اب وہ اپنی نبوت کا اعلان کریں اور لوگوں کو توحید کی طرف بلائیں۔

اس وقت بنی اسرائیل ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے۔ انفرادی و اجتماعی نقائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جن پر ان کا عمل نہ ہو۔ وہ گمراہیوں کا محور بنے ہوئے تھے۔ اعتقاد اور اعمال دونوں معاملوں میں گھاٹے میں پڑے ہوئے تھے۔ اس سے بڑی گمراہی اور کیا ہوگی کہ اپنے ہی پیغمبروں کو قتل کرنے سے نہیں چوک رہے تھے۔ ہیرودیس نے اپنی محبوبہ کے اشارے پر کس بے دردی سے حضرت یحییٰؑ کو قتل کردیا تھا۔

عقائد و اعمال کا یہ حال تھا کہ مشرکانہ رسوم کو جزوِ ایمان سمجھ لیا گیا تھا۔ اخلاقی برائیوں کو کریمانہ حیثیت دے رکھی تھی۔ نادم ہونے کے بجائے وہ ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے۔ علماء کا حال یہ تھا کہ درہم و دینار پر خدا کی آیات کو فروخت کردیا کرتے تھے۔ اپنی کتاب توریت کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس کتاب میں جو حرام تھا وہ ان کے لیے حلال ہوگیا تھا۔ قانونِ [illegible] کو مسخ کردیا تھا۔

یہ تاریک حالات اس وقت مزید تاریک ہوگئے جب حضرت یحییٰؑ اور پھر زکریاؑ بھی قتل کردیے گئے۔ گویا بنی اسرائیل نے خدا کے حکموں کے خلاف بغاوت و سرکشی کی حد کردی تو حضرت عیسیٰؑ نے یہ اعلان کر کے بنی اسرائیل میں ہلچل ڈال دی کہ [illegible] خدا کے رسول اور پیغمبر ہیں اور رشد و ہدایتِ خلق ان کا فرضِ منصبی ہے۔

”لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا رسول اور پیغمبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت میرے سپرد کی ہے۔ میں اس جانب سے پیغامِ ہدایت لے کر آیا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں خدا کا جو قانون (توریت) ہے اور جس کو تم نے اپنی جہالت اور کج روی سے پس پشت ڈال دیا ہے، میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس کی مزید تکمیل کے لیے خدا کی کتاب (انجیل) لے کر آیا ہوں یہ کتاب حق و باطل کا فیصلہ کرے گی اور آج جھوٹ اور سچ کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔ سنو! سمجھو اور اطاعت کے لیے خدا کے حضور جھک جاؤ کہ یہی دین و دنیا کی فلاح کی راہ ہے۔“

[illegible] اس خطاب [illegible] اس طرح بیان [illegible] نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک زمین اور آسمان ٹل نہ جائیں، ایک نقطہ یا ایک شوشہ [illegible] سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ جب تک سب پورا نہ ہو جائے پس جو کوئی ان چھوٹے چھوٹے حکموں میں سے کسی کو بھی توڑے گا اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا وہ آسمان کی بادشاہی میں سب سے چھوٹا کہلائے گا کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری راست بازی فقیہوں اور فریسیوں کی راست بازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہی میں ہرگز داخل نہ ہوگے۔“

قرآن کے الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے یوں مخاطب ہوئے۔

”اور میں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی جو میرے سامنے ہے اور میں (اس لیے آیا ہوں) تاکہ تمہارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کردوں جو (تمہاری کج روی کی وجہ سے) تم پر حرام کردی گئی تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر آیا ہوں۔ پس اللہ کا خوف کرو اور میری پیروی کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ پس اس کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔“

”پھر ان کے بعد ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم علیہم السلام کو رسول بنا کر بھیجا اور اس کو کتاب (انجیل) عطا کی۔“

وہ کفرنحوم نامی گاؤں میں چلے گئے جہاں سے انہیں بحیثیت نبی تبلیغ کا آغاز کرنا تھا۔ آپ نے لوگوں کو درسِ خداوندی دینا شروع کیا اور پھر گلیل کے کئی شہروں میں گئے اور لوگوں تک اپنی تعلیمات پہنچائیں۔

”اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھو اور اپنے پڑوس سے اپنے برابر محبت رکھو۔ اپنے دشمن سے محبت رکھو جو تم سے عداوت رکھیں۔ ان کا بھلا کرو جو تم کو لعنت کریں۔ ان کے لیے برکت چاہو جو تمہاری بے عزتی کریں۔ ان کے لیے دعا کرو جو تمہارے حق میں برے ہوں۔ جو تمہارے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دو۔ جو تیرا چوغہ لے اس کو کرتہ لینے سے منع نہ کر۔ جو کچھ تجھ سے مانگے دے اور جو تیرا مال لے اس سے طلب نہ کر۔ اگر تم محبت رکھنے والوں سے محبت رکھو گے تو تمہارا کیا احسان ہوا کیونکہ گناہ گار (ایسا ہی) کرتے ہیں۔ اگر انہیں تم قرض

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

وہ جن سے وصول ہونے کی امید رکھتے ہو تو تمہارا کیا احسان ہے۔ گناہ گار بھی گناہ گاروں کو قرض دیتے ہیں تا کہ پورا وصول کر لیں مگر تم اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور بھلا کرو اور بغیر کسی امید کے قرض دو تو تمہارا اجر بڑا ہوگا۔ خلاصی دو تم بھی خلاصی پاؤ گے۔ دیا کرو تمہیں بھی دیا جائے گا۔ اچھا پیمانہ داب داب کر اور ہلا ہلا کر اور لبریز کر کے دو۔ تمہارے پلے میں بھی ویسا ہی دیا جائے گا کیونکہ جس پیمانے سے تم ناپتے ہو اور اس کے سوا کچھ نہیں کرتے لیکن میں تمہیں جتاتا ہوں کہ کس سے ڈرنا چاہیے۔ اس سے ڈرو جس کو قتل کرنے کے بعد اختیار ہے کہ جہنم میں ڈالے۔ ہاں میں تم سے کہتا ہوں کہ اس سے ڈرو۔ اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے اور نہ اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے کیونکہ جان خوراک سے بڑھ کر ہے اور بدن پوشاک سے۔ پرندوں پر غور کرو کہ نہ بوتے ہیں اور نہ کاٹتے ہیں۔ نہ ان کی کٹیا ہوتی ہے اور نہ ان کی کوٹھری تو بھی خدا انہیں کھلاتا ہے۔ تمہاری قدر تو پرندوں سے زیادہ ہے۔ تم میں سے کون ایسا ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بڑھا سکے۔ پس چھوٹی بات نہ کر سکے تو باقی باتوں کی فکر کیوں کرتے ہو۔"

اس کے بعد وہ بیت صدا کو گئے۔ گینسرت میں تبلیغ کی۔ وہاں بیماروں کو شفا دی۔ غرض گلیل کے تمام علاقوں میں تبلیغ کرتے رہے کیونکہ آپ کا طریقہ کار یہی تھا کہ مسافروں کی طرح گھوم پھر کر اللہ کا پیغام سناتے رہتے تھے۔ چند لوگ آپ کے ساتھ ہو گئے تھے جو ساتھ چلتے رہتے تھے۔

اس خلوص تبلیغ کے باوجود لوگ ان کی باتوں کو سن ضرور رہے تھے لیکن ہنسی مذاق میں اڑا رہے تھے۔ آپ کے معجزوں کو شعبدہ اور جادوگروں سے تعبیر کر رہے تھے۔ بہت کم تھے جو آپ پر ایمان لائے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام معاندین و مخالفین کی دراندازیوں اور ہرزہ سرائیوں کے باوجود اپنے فرض منصبی میں سرگرم عمل رہتے اور شب و روز بنی اسرائیل کی آبادیوں اور بستیوں میں پیغام حق سناتے اور لوگوں کو قبول حق و صداقت پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔ جہاں جھٹلانے والے تھے، وہیں ایسی سعید روحیں بھی نکل آتی تھیں جو آپ کی دعوت حق پر لبیک کہتیں اور سچائی کے ساتھ دین حق کو قبول کر لیتی تھیں۔ ان ہی پاک بندوں میں وہ مقدس ہستیاں بھی تھیں جو آپ کے شرف صحبت سے فیض یاب ہو کر نہ صرف ایمان لے آئی تھیں بلکہ دین حق کی سربلندی کے لیے انہوں نے جان کی بازی لگا کر خدمت دین کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ یہی وہ لوگ [illegible] تھے جو "حواری" ("رفیق") کہلائے۔ [illegible] لوگ حضرت [illegible] آپ کے حکم سے مختلف شہروں میں جاتے اور بنی اسرائیل [illegible] پیغام پہنچاتے [illegible]

"اور (اے عیسیٰ وہ وقت یاد کرو) جبکہ میں نے حواریوں کی جانب (تیری معرفت) یہ وحی کی کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ تو انہوں نے جواب دیا۔ ہم ایمان لائے اور اے خدا گواہ رہنا کہ ہم بلاشبہ مسلمان ہیں۔" (سورۃ مائدہ)

"اے ایمان والو! تم اللہ کے دین کے مددگار ہو جاؤ جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے جب حواریوں سے کہا: اللہ کے راستے میں کون میرا مددگار ہے تو حواریوں نے جواب دیا۔ "ہم اللہ (کی راہ) کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لائی اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا۔ سو ہم نے مومنوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی۔ پس وہ غالب رہے۔" (صف)

آپ کے یہ حواری بیشتر غریب اور مزدور طبقے میں سے تھے۔ اللہ کی سنت یہی رہی ہے کہ پیغمبروں کی صدائے حق پر لبیک کہنے والے غریب اور کمزور طبقے ہی کے لوگ ہوتے ہیں کیونکہ صاحب اقتدار اور اہل ثروت اپنے اقتدار اور دولت کے گھمنڈ میں مبتلا رہتے ہیں اور مقابلے پر آ جاتے ہیں لیکن بالآخر فلاح و کامرانی ان کمزور فدایان حق ہی کا حصہ ہو جاتا ہے اور مغرور ہستیاں ہلاکت کے قعر مذلت میں گر جاتی ہیں۔

جس طرح ان حواریوں کے دلوں میں خدا نے یہ بات ڈالی کہ میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور وہ ایمان لے آئے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی وحی اتاری کہ ان میں سے کون ہے جنہیں تو اپنا حواری بنائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دین کے فروغ میں مدد کے لیے پرخلوص دوستوں کی ضرورت تھی جن پر وہ بھروسا کر سکیں کیونکہ وہ ہر ایک پر بھروسا نہیں کر سکتے تھے۔ بیشتر وہ تھے جو زبان سے کچھ کہتے تھے، دل میں کچھ اور رکھتے تھے۔ وہ کس کو اپنا دوست سمجھیں اور اس پر بھروسا کریں۔ انہیں خدا کی راہنمائی کی ضرورت تھی۔ آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ آپ رات بھر گریہ وزاری کرتے رہے اور صبح کے وقت آپ پر وحی نازل ہوئی اور آپ کو وہ بارہ نام بتا دیے گئے جو آپ کے حواری کہلائے اور "انجیل" کے مطابق آپ نے انہیں "رسول" کا لقب دیا۔ انجیل نے ان بارہ حواریوں کے نام بھی درج

پیچھے لیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے لیے بارہ حواری چن لیے۔ ان سے عہد لیا اور ان کے لیے دعا کی۔

مبارک ہو تم جو غریب ہو
کیونکہ خدا کی بادشاہی تمہاری ہے
مبارک ہو تم جو اب بھوکے ہو
کیونکہ آسودہ ہو گے

یہ دعا آپ پہلے بھی فرما چکے تھے لیکن وہ عام تھی اور آپ یہ صرف حواریوں کے لیے فرما رہے تھے۔ آپ نے ان سب کو اپنے پاس بلایا۔

"میں نے تمہیں آدم کی اولادوں میں سے اپنے لیے چن لیا ہے۔"

"اے اللہ کے نبی! ہم بھی آپ کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔"

"دیکھو کل ایک شخص میرے پاس آئے گا۔ اس سے جو گفتگو ہوگی اسے غور سے سننا۔ اس میں تمہارا امتحان بھی ہے۔"

"کیا آپ ابھی ہمارا امتحان لیں گے؟"

"ایک وقت آئے گا جب تم بھی میرا امتحان لو گے۔"

یہ بات حواریوں کی سمجھ سے بالاتر تھی لیکن انہوں نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے دن کا انتظار کرنے لگے کہ کل [illegible] آئے گا اور کیا بات کرے گا۔

دوسرے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات سچ ثابت ہوئی۔ ایک شخص آیا جو مالدار بھی تھا اور سچ کا متلاشی بھی۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا۔

"اے استاد! میں کون سی نیکی کروں تا کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔"

"اگر تو نیک بننا چاہتا ہے تو جن باتوں کا خدا نے حکم دیا ہے ان سب پر عمل کر۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا۔

[illegible] کن باتوں کا حکم دیا ہے؟" [illegible] علیہ السلام نے کہا۔ "خون نہ کر۔ زنا نہ کر۔ چوری نہ کر۔ جھوٹی گواہی نہ دے۔ اپنے باپ کی اور اپنی ماں کی عزت کر اور اپنے پڑوسی سے محبت کر۔"

"میں نے ان سب پر عمل کیا ہے۔ اب مجھ میں کس بات کی کمی ہے؟"

"اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال و اسباب بیچ کر غریبوں کو دے۔ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا اور آ میرے پیچھے ہو لے۔"

وہ جوان یہ بات سن کر غمگین ہوا کہ اپنا مال کیسے دے دوں۔ مال کی محبت نے اسے کامل بننے سے روک دیا اور وہ چلا گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونا مشکل ہے۔ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔"

"پھر کون نجات پا سکتا ہے؟" حواریوں نے پوچھا۔

"یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"ہم تو سب کچھ چھوڑ کر آپ کے پیچھے ہو لیے ہیں۔ اس کے بدلے ہمیں کیا ملے گا؟" حواریوں نے کہا۔

"جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو لیے ہو، بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے۔ جو کچھ تم نے چھوڑا ہے، اس کا سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کے وارث ہو گے۔"

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس تمثیل کے ذریعے اپنے حواریوں کو یہ بتا چکے تھے کہ گھر بار چھوڑنے کا صلہ انہیں کیا ملے گا تو پھر ان سب کو اپنے پاس ایک مرتبہ پھر بلایا۔

"اب تم میری نمائندگی اس طرح کرو گے کہ سب شہروں میں جا کر خدا کی بادشاہی کی نمائندگی کرو گے۔"

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

”ہم سے لوگ وہی کچھ چاہیں گے جو آپ سے چاہتے ہیں۔ ہماری بات کون مانے گا۔“

”تم میرا نام لے کر بیماروں کو شفا دو گے اور خدا تمہاری مدد کرے گا اور دیکھو راہ کے لیے کچھ نہ لینا۔ نہ لاٹھی نہ جھولی نہ روٹی نہ روپیا۔ نہ دو دو کرتے رکھنا اور جس گھر میں داخل ہو وہیں رہنا اور وہیں سے روانہ ہونا اور جس شہر میں لوگ تمہیں قبول نہ کریں اس شہر سے نکلتے وقت اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ دینا تاکہ ان پر گواہی ہو۔“

”اے خداوند! جیسا یوحنا نے اپنے شاگردوں کو دعا کرنا سکھایا تھا تو بھی ہمیں سکھا۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں دعا کے الفاظ سکھانے کے لیے فرمایا۔

”جب تم دعا کرو تو کہو

اے باپ

تیرا نام پاک مانا جائے

تیری بادشاہی آئے

ہماری روز کی روٹی ہر روز ہمیں دیا کر

اور ہمارے گناہ معاف کر

کیونکہ ہم بھی اپنے قرض دار کو معاف کرتے ہیں

اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال“

☆☆☆

ان حواریوں کو آپ نے روانہ کیا کہ گاؤں گاؤں خوشخبری سنائیں اور بیماروں کو شفا دیں۔ جب یہ حواری واپس آئے اور تبلیغ کے دوران جو کچھ پیش آیا وہ سنا چکے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان شہروں پر افسوس کیا جو ایمان نہیں لائے تھے۔

”اے خرازین تجھ پر افسوس! اے بیت صدا تجھ پر افسوس! کیونکہ جو معجزے تم میں ظاہر ہوئے اگر ”صور“ اور ”صیدا“ میں ظاہر ہوتے تو وہ ٹاٹ اوڑھ کر اور خاک میں بیٹھ کر کب کے توبہ کر لیتے۔“

پھر وہ حواریوں سے مخاطب ہوئے۔

”جو تمہاری سنتا ہے وہ میری سنتا ہے اور جو تمہیں نہیں مانتا وہ مجھے نہیں مانتا اور جو مجھے نہیں مانتا وہ میرے بھیجنے والے کو نہیں مانتا۔“

اس کے بعد آپ ان بارہ افراد [illegible] ایک شہر کو چلے گئے [illegible] وہاں جمع ہو گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ [illegible] ان تمام باتوں میں اتنا وقت گزر گیا کہ دن ڈھلنے لگا۔ کھانے کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ آپ کے حواری آپ کے پاس آئے اور عذر پیش کیا۔

”ہم یہاں ویران جگہ پر ہیں۔ اس بھیڑ کو رخصت کیجیے تاکہ ہم کسی قریب کے گاؤں میں چلے جائیں اور کھانے کی کچھ تدبیر کریں۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”جو کچھ کھانے کے لیے ہے، اس سے ان کی تواضع کرو۔“

”ہمارے پاس تو صرف پانچ روٹیاں اور دو تلی ہوئی مچھلیاں ہیں اور یہ پانچ ہزار افراد ہیں۔ ان کے لیے تو کھانا مول لے کر آنا ہوگا۔“

”اس کی بھی ضرورت نہیں۔ یہی ان کے لیے کافی ہوگا۔ ان کو پچاس پچاس کی قطاروں میں بٹھاؤ۔“

حواری حیران تھے کہ یہ پانچ روٹیاں کیسے ان سب کو پوری ہوں گی لیکن حکم تو ماننا تھا۔ انہوں نے ان آدمیوں کو پچاس پچاس کی قطاروں میں بٹھا دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وہ پانچ روٹیاں اور دو مچھلیاں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ آسمان کی طرف دیکھ کر ان پر برکت بخشی اور توڑ توڑ کر اپنے شاگردوں کو دیتے کہ لوگوں کے آگے رکھیں۔

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہی تھا کہ سب نے کھایا اور سیر ہو گئے اور بچ بھی گیا۔ ان کی بچی ہوئی ٹکڑیوں کی بارہ

ارسطو نے کہا

1. ہر ایک نئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر دوستی جتنی پرانی ہو اتنی ہی عمدہ اور مضبوط ہوتی ہے۔
2. شر کو شر سے رفع کرنا اچھی بات ہے۔ مگر شر کو خیر سے رفع کرنا نسبتاً زیادہ بہتر ہے۔
3. جو بات معلوم نہ ہو اس کے اظہار میں شرم نہ کرنی چاہیے۔
4. دنیا ایک خس پوش کنواں ہے۔ عقل مندوں کو ہوشیاری کے ساتھ قدم رکھنا چاہیے۔
5. نہ تو پیاسے رہو اور نہ زیادہ نشے میں چور رہو۔
6. زیادہ باتیں کرنا دیوانگی کی دلیل ہے۔ چاہے وہ باتیں کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں۔
7. زندگی میں سب سے بہتر اس طرح اٹھنا چاہیے کہ جس طرح ایک دعوت سے اٹھتے ہیں۔
8. انسان کے اسبابِ ظاہری میں عزت کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔
9. خاموشی سب سے آسان کام اور زیادہ نفع بخش عادت ہے۔
10. کسی کے عیب مت تلاش کر تاکہ دوسرا تیرے عیبوں کی جستجو نہ کرے۔

مرسلہ: ریاض اختر تبسم، بابو محلہ، شوق مراد

ٹوکریاں اٹھائی گئیں۔

☆☆☆

[illegible] جماعت اگرچہ [illegible] لیکن یہ [illegible] لوح بھی تھے اور ضروریاتِ زندگی کے اعتبار سے [illegible] کی جماعت میں سے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے معجزے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ خدا سے جو کہتے تھا پورا ضرور ہوتا ہے۔ کیوں نہ اپنے لیے بھی کچھ مانگ کر دیکھیں۔ یہ بے اعتقادی یا آزمائش نہیں تھی بلکہ محض ایک بشری خواہش تھی۔ ایک غریب آدمی جتنا سوچ سکتا ہے، اتنا ہی سوچا۔ وہ سب مل کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

”خداوند تعالیٰ نے آپ کے دستِ حق نما پر کئی معجزے ظاہر کیے ہیں۔ خدا میں یہ طاقت بھی ضرور ہوگی کہ وہ ہمارے لیے غیب سے ایک دسترخوان نازل کر دیا کرے تاکہ ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو کر اطمینانِ قلب کے ساتھ دینِ حق کی تبلیغ میں مصروف رہا کریں۔“

”زندگی گزارنے کے لیے تو ہزار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کون کون سی چیزیں آسمان سے اتارے گا۔“

”ہمیں کچھ اور کی طلب نہیں۔ ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں غذا میسر آئے۔ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل آرام پائیں۔“

یہ کہتے ہوئے ان کا مقصد شاید یہ بھی ہوگا کہ آسمان سے جو غذا اترے گی، وہ یقیناً ایسی لذیذ اور بیش قیمت ہوگی جو ہم نے کبھی نہیں کھائی ہوگی۔ توریت میں انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا حال بھی پڑھا ہوگا کہ اس قوم کی فرمائش پر آسمان سے ”من و سلویٰ“ اترا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی خواہش سن کر نصیحت فرمائی۔

”اگرچہ خدا کی طاقت بے نہایت اور لامحدود ہے لیکن بندے کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ خدا کو آزمائے۔ پس خدا سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو۔“

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

حواریوں نے کہا۔ ''ہم اور خدا کو آزمائیں؟ ہمارا یہ مقصد نہیں۔ ہمارا تو یہ مطلب ہے کہ رزق کی جدوجہد سے مطمئن ہوکر یادِ خدا میں غرق ہوجائیں اور آپ کی تصدیق میں ہمیں حق الیقین کا درجہ حاصل ہوجائے۔ اس کی تصدیق ہوجائے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں سچ ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب ان کا بڑھتا ہوا اصرار دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں دعا کی۔

''اے خدا! تو ان کے سوالوں کو پورا کر اور آسمان سے ایسا مائدہ (دسترخوان) نازل فرما کہ وہ ہمارے لیے تیرے غضب کا مظہر ثابت نہ ہو بلکہ ہمارے اول و آخر سب کے لیے خوشی کا باعث بن جائے اور تیرا نشان کہلائے اور اس کے ذریعے سے ہم کو اپنے غیبی رزق سے شادکام کرے کیونکہ تو ہی بہتر رزق دینے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی۔

''عیسیٰ! میں نے تمہاری دعا قبول کی۔ میں اس کو ضرور نازل کروں گا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کھلی نشانی کے نازل ہونے کے بعد اگر ان میں سے کسی نے بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی تو پھر ان کو عذاب بھی ایسا دوں گا جو کائنات کے کسی انسان کو بھی نہیں دیا جائے گا۔''

قرآن حکیم کی سورۃ مائدہ میں اس کو بیان کیا گیا ہے۔

''اور دیکھو جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا...... اے عیسیٰ بن مریم! کیا تمہارا پروردگار ایسا کرسکتا ہے کہ آسمان سے ہمیں ایک خوان اتار دے؟ عیسیٰ (علیہ السلام) نے کہا، خدا سے ڈرو۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل آرام پائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہمیں سچ بتایا تھا اور اس پر ہم گواہ ہوجائیں۔ اس پر عیسیٰ بن مریم نے دعا کی اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک خوان بھیج دے کہ اس کا آنا ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں پچھلوں سب کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے نشانی ہو۔ ہمیں روزی دے۔ تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔ اللہ نے فرمایا۔ میں تمہارے لیے خوان بھیجوں گا مگر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا اسے میں ایسی سزا دوں گا جو میں نے کسی کو نہیں دی ہوگی۔'' (سورۃ مائدہ)

یہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں؟ قرآن عزیز نے اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی ... تذکرہ ہے البتہ آثار صحابہ و تابعین ... جاتی ... حسن بصریؒ اور چند دوسروں کا خیال یہ ہے کہ مائدہ نازل نہیں ہوا تھا کیونکہ خدائے تعالیٰ نے اس کے نزول کو جس شرط کے ساتھ مشروط کیا تھا، سوال کرنے والے اس سے ڈر گئے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی دردناک عذاب سے دوچار ہوجائیں۔ انہوں نے اپنا سوال واپس لے لیا تھا۔

دسترخوان نہیں اترا تھا۔ یہ اصحاب اس نتیجے پر اس لیے بھی پہنچے تھے کہ اگر اس دسترخوان کا نزول ہوا ہوتا تو یہ ایسا معجزہ تھا کہ نصاریٰ اس پر جس قدر بھی فخر کرتے، وہ کم تھا اور اس کی خوب شہرت ہوئی ہوتی لیکن ان کے ہاں ایسا کوئی تذکرہ نہ پایا جاتا۔ اس کا مطلب ہے سوال کیا ضرور گیا تھا لیکن پھر واپس لے لیا گیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عباس بن یاسرؓ سے منقول ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا۔ جمہور کا رجحان اس طرف ہے البتہ اس کی تفصیلات میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ مثلاً صرف ایک دن نازل ہوا یا چالیس روز تک اترتا رہا؟ اور پھر اترنا بند ہوگیا تو کیوں؟ یہ چند کے لیے تھا یا سب کے لیے؟ جن لوگوں کی وجہ سے بند ہوا ان پر عذاب بھی ہوا یا نہیں؟

جو لوگ یہ روایت کرتے ہیں کہ مائدہ کا نزول صرف ایک دن نہیں بلکہ چالیس دن تک برابر جاری رہا۔ وہ بند ہونے کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ مائدہ پر یہ حکم ہوا تھا کہ اس کو فقیر، مسکین اور مریض ہی کھائیں۔ تونگر اور بھلے چنگے نہ کھائیں مگر چند روز کی تعمیل کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اس کی خلاف ورزی شروع کردی یا یہ حکم ملا تھا اس کو کھائیں مگر اگلے روز کے لیے ذخیرہ نہ کریں۔ اس کی خلاف ورزی ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مائدہ کا نزول بند ہوگیا بلکہ خلاف ورزی کرنے والے عذاب کا شکار بھی ہوئے۔

مائدہ کا سوال اگرچہ حواریوں کی جانب سے کیا گیا تھا مگر تھا سب کی جانب سے۔ اس لیے خلاف ورزی کے مرتکب حواری نہیں تھے اور نہ ان پر عذاب نازل ہوا۔ یہ پاک ہستیاں اس سے مبرا تھیں۔

کتب تفاسیر میں یہ واقعات نہایت تفصیل سے اس طرح بیان ہوئے ہیں۔

''اللہ نے آسمان سے دسترخوان نازل فرمایا اور سب لوگ اس کو دو بادلوں کے درمیان اترتا دیکھ رہے تھے۔ جب بھی کچھ آگے بڑھتا حضرت عیسیٰ علیہ السلام دعا کرتے، اے اللہ اس کو رحمت بنا، عذاب مت بنا حتیٰ کہ دسترخوان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے آکر ٹھہر گیا اور اس پر رومال ڈھکا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کھڑے ہوئے اور عرض کر رہے تھے ''اللہ کے نام سے جو رزق دینے والوں میں سب سے بہتر ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رومال ہٹایا تو اس میں سات روٹیاں، سات مچھلیاں اور سرکہ تھا اور کہا جاتا ہے انار اور دیگر پھل تھے۔ ایسی نفیس خوشبو پھیلی کہ اس کی مہک نے سب کو مست کردیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کھانے کا حکم دیا (غالباً حواریوں کو) تو کہنے لگے ہم اس وقت تک نہیں کھائیں گے جب تک آپ نہ کھالیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، یہ تمہارا حق ہے کیونکہ سوال کی ابتدا تم نے کی تھی۔ یہ سن کر سب گھبرائے کہ نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو کہ خدا کا رسول تو نہ کھائے ہم کھائیں۔

''اچھا...... فقرا، مساکین اور معذورین کو بلاؤ۔ یہ ان کا حق ہے۔'' ایسے سب لوگوں کو بلایا گیا۔ یہ کل تیرہ سو افراد تھے۔ ان بندگان نے خوب سیر ہوکر کھایا مگر مائدہ کی مقدار میں فرق نہ آیا۔

بعض کہتے ہیں مائدہ نہ اترا۔ عذاب کا سن کر مانگنے والے ڈر گئے۔ نہ مانگا لیکن پیغمبر کی دعا بے کار نہیں جاتی۔ شاید اسی کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت (نصاریٰ) ہمیشہ آسودہ حال رہی اور جس کسی نے اس میں ناشکری کی تو شاید آخرت میں دوسروں سے زیادہ عذاب کا حقدار بنے۔

اس میں مسلمانوں کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرق عادت کی راہ سے نہ چاہے پھر اس کی شکرگزاری بہت مشکل ہے۔ اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔

☆☆☆

جب کائناتِ انسانی کی فلاح کے لیے نبی کو مبعوث کیا جاتا ہے تو اس کو من جانب اللہ محکم دلائل کے ساتھ ساتھ معجزات ... کے ذریعے دستور و نظام پیش کرتا ہے تو دوسری جانب حسب مصلحت خداوندی ... اسی لیے ہر پیغمبر کو اسی قسم کے معجزات عطا کیے ... لوگوں کو عاجز و درماندہ کردیں اور قائل ہوجائیں ... جاتے ہیں جو اس زمانے کی علمی ترقیوں کے مناسب حال ... انسانوں کی قدرت سے بالاتر ہے۔ اگر تعصب اور ضد کہ جو ان کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے یا جیسے وہ مشاہدہ کر رہے ہیں درمیان میں نہیں ہے تو وہ مان لیں کہ یہ صرف خدائے واحد کی جانب سے ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں علم نجوم اور علم کیمیا کا زور تھا۔ کواکب و نجوم کی پرستش کی جاتی تھی۔ سورج سب سے بڑا دیوتا تھا اور کرۂ ارض پر ''آگ'' کو اس کا مظہر مان کر اس کی بھی پرستش کی جاتی تھی۔ اسی لیے بت پرست بادشاہ نے آپ کو دہکتی آگ کے حوالے کردیا اور پھر جب وہ آگ ان پر ٹھنڈی ہوگئی تو گویا ان کے دیوتا کو شکست ہوگئی وہ اسے معجزہ کہنے پر مجبور ہوگئے کیونکہ آگ کی خاصیت تو یہ ہے کہ وہ چیزوں کو جلا دیتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں ''جادو'' مصری علوم و فنون میں بہت زیادہ نمایاں اور امتیازی شان رکھتا تھا اور مصریوں کو فن سحر میں کمال حاصل تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قانون ہدایت (توریت) اور علمی دلائل کے ساتھ ید بیضا اور ''عصا'' جیسے معجزات دیے گئے اور جب ساحرین مصر سے مقابلہ ہوا اور اللہ کے حکم سے آپ نے اپنا عصا زمین پر ڈالا جو قدرتِ الٰہی سے بڑا اژدھا بن گیا اور ساحرین کے پھینکے ہوئے تمام سانپ کھا گیا۔ وہ سب پکار اٹھے کہ یہ انسانی طاقت سے بالاتر مظاہرہ ہے۔ یہ قطعی جادو نہیں ہے۔ وہ سب جادوگر کہہ اٹھے کہ آج سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدائے واحد کے پرستار ہیں لیکن جنہیں نہ ماننا تھا نہ مانے۔ فرعون اور اس کے درباری یہی کہتے رہے کہ یہ صریح جادو ہے۔

اسی طرح جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تو ایک جانب ان کو براہین اور حکمت سے نوازا اور انجیل عطا کی تو دوسری جانب زمانے کے مخصوص حالات کے مناسب چند ایسے معجزات بھی عطا فرمائے جو اس زمانے کے اربابِ کمال پر اس طرح اثرانداز ہوں کہ جویائے حق کو اس اعتراف میں کوئی جھجک باقی نہ رہے۔

قرآن عزیز نے ایسے چار معجزات کا ذکر کیا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کیے گئے تھے۔

وہ خدا کے حکم سے مردے کو زندہ کردیا کرتے تھے۔

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو صحت یاب کر دیتے تھے۔ نابینا دیکھنے لگتا تھا اور کوڑھ کا مریض شفایاب ہو جاتا تھا اور وہ بھی کسی دوا کے بغیر صرف چھونے سے۔

وہ مٹی سے پرندہ بنا کر اس میں پھونک دیتے تھے اور خدا کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی۔

وہ یہ بھی بتا دیا کرتے تھے کہ کس نے کیا کھایا اور خرچ کیا اور کیا گھر میں ذخیرہ محفوظ کیا۔

یہ آخری معجزہ صرف اس لیے تھا کہ مخالفین ازراہِ تمسخران سے کہا کرتے تھے کہ اگر تم اتنے مقبول بندے ہو تو یہ بتاؤ آج ہم نے کیا کھایا ہے اور کیا بچایا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس تمسخر کو سنجیدگی سے بدل دیتے تھے اور وحی الٰہی کی نصرت سے اس طرح بتا دیا کرتے تھے جیسے انہوں نے بہت سنجیدہ سوال کیا ہو حالانکہ نبوت اور کارِ نبوت سے اس سوال کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

جب لوگ ان معجزات کو دیکھتے تھے تو جن کے قلوب میں حق کی طلب موجزن تھی، وہ اقرار کرتے تھے کہ بلاشبہ اس قسم کا مظاہرہ انسانی دسترس سے باہر اور منجانب اللہ ہے اور جن دلوں میں رعونت، حسد اور بغض تھا، ان کے تعصب نے وہی کہنے پر مجبور کیا جو ان سے پیشتر کے لوگ اپنے عہد کے رسولوں سے کہتے تھے یعنی ''یہ کچھ نہیں سوائے جادو کے۔''

سورۂ آل عمران ان کے ان معجزات کو اجمالاً یوں بیان کرتی ہے۔

''اور خدا سکھاتا ہے اس (عیسیٰ) کو کتاب، تورات اور انجیل اور وہ رسول ہے بنی اسرائیل کی جانب کہ بے شک میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے ''نشانی'' لے کر آیا ہوں۔ وہ یہ کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندہ بناتا ہوں پھر اس میں پھونک دیتا ہوں اور وہ خدا کے حکم سے زندہ پرندہ بن جاتا ہے اور پیدائشی اندھے کو اور برص اور کوڑھ کے مریض کو اچھا کر دیتا ہوں اور خدا کے حکم سے مردے کو زندہ کر دیتا ہوں اور جو تم کھا کر آتے ہو اور جو تم گھر میں ذخیرہ کر آتے ہو...... سو اگر تم حقیقی ایمان رکھتے ہو تو بلاشبہ ان امور میں ''نشان'' ہے اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ بعض ان چیزوں کو جو تم پر حرام ہو گئی ہیں، تمہارے لیے حلال کر دوں۔ تمہارے لیے پروردگار کے پاس سے نشان لایا ہوں۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ سو اس کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔''

سورۂ مائدہ اور سورۂ صف میں بھی انداز مختلف مضمون یہی ہے۔

''اور (اے عیسیٰ بن مریم تو میری اس نعمت کو یاد کر) جبکہ تو میرے حکم سے گارے سے پرندے کی شکل بنا دیتا [illegible] پھر اس میں پھونک دیتا تھا اور میرے حکم سے وہ زندہ پرندہ بن جاتا تھا اور جبکہ تو میرے [illegible] کوڑھی کو اچھا کر دیتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے مردے کو زندہ [illegible] (سورۂ مائدہ)

''پھر جب وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ان کے پاس کھلے نشان لے کر آیا تو انہوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔'' (سورۂ صف)

☆☆☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ''یریحو'' میں تھے کہ انہیں یروشلم جانے کا حکم ملا۔ اب تک وہ بہت معجزے دکھا چکے تھے لیکن یہ معجزے عام لوگوں کے لیے تھے۔ اب انہیں دلائل سے اپنی نبوت کا یقین دلانا تھا۔ اس کے لیے یروشلم کا سفر ضروری تھا کیونکہ تمام علمائے یہود وہیں جمع تھے۔ برائیاں بھی وہیں سب سے زیادہ تھیں۔ یہاں پہنچ کر تبلیغ کرنا یروشلم کو فتح کرنے کے مترادف تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام کے قتل میں بھی یہودی شامل تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور کے وقت یہودی چار فرقوں میں منقسم تھے۔ صدوقی فرقہ، آخرت اور جزا و سزا کا قائل نہیں تھا۔ فریسی دنیاداری کو مذہب پر ترجیح دیتے تھے۔ کاہن دولت کے حصول کے لیے مذہبی رسومات کو بیچتے تھے اور احبار یا فقیہہ جن کی مذہب پر اجارہ داری تھی، وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیتے رہتے تھے۔

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیاء۔ ابن کثیر۔ انجیل مقدس (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) سو عظیم آدمی۔ ترجمان القرآن

ہارڈ ویئر کی دکان سے رسی خریدنے کے بعد بھی برطانوی نژاد اداکار رینگل نٹز سوچ رہا تھا کہ کیا وہ خود اپنے گلے میں پھندا ڈال سکتا ہے۔ بھورے پتھروں سے بنے ہوئے مکان کا شہتیر شاید اس کا وزن برداشت نہ کر سکے اور اسے اس کام کے لیے کوئی جادوگری دکھانا ہوگی۔

گول پتھروں سے بنے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے اس نے خودکشی کے تمام ممکنہ طریقوں پر غور کیا۔ گزشتہ کئی ہفتوں سے اس کا یہی معمول تھا۔ زہر سے کام نہیں بنے گا۔ وہ

مسئلہ کوئی بھی ہو اگر اسے حل کرنے کی تکنیک سے واقفیت ہو تو چٹکی بجاتے ہی ذہن سے بوجھ اتر سکتا ہے... ورنہ دوسری صورت میں دل و دماغ کی تباہی کے ساتھ زندگی بھی بوجھ بن جاتی ہے ... اور وہ زیرک انسان سانپوں سے دوستی رکھنے والی کو قابو کر سکتا تھا تو بے چارے سانپ کس شمار میں تھے۔

انتہائی مکاری سے اپنی زندگی آسان کرنے والے ایک ڈرامے باز کا قصہ

سانپ اور لاٹھی

ثمر عباس

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

نہیں جانتا تھا کہ خودکشی کرنے کے لیے زہر کی کتنی مقدار درکار ہے۔ اگر وہ اپنا پیٹ پکڑے فرش پر تڑپتے ہوئے پایا گیا تو اسے فوری طور پر اسپتال لے جایا جائے گا اور ڈاکٹر اس کے حلق میں ایک نلکی ڈال کر پمپ کے ذریعے معدہ صاف کردیں گے پھر اسے پولیس کی پوچھ گچھ کا بھی سامنا کرنا ہوگا۔

اس کے پاس اپنا پستول بھی نہیں تھا جو کنپٹی پر رکھ کر خود کو گولی مار لیتا۔ ایسی صورت میں اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ رسی کا پھندا گلے میں ڈال کر چھت سے لٹک جائے۔ رسی کا گچھا بغل میں دبائے وہ گھسٹتا ہوا چارلس اسٹریٹ پر آگیا جہاں گہری دھند میں پیسٹری شاپ کے نیون سائن کی روشنی چھن کر آرہی تھی۔

بیکن ہل کی اینٹوں سے بنے ہوئے فٹ پاتھ، قدیم طرز کی دکانیں اور گیس لائٹ دیکھ کر اسے پرانے دور کے لندن کی یاد آجاتی تھی۔ یہاں اپنی گردن میں پھندا ڈال کر خودکشی کرنا ایک تاریخی واقعہ ہوگا۔ اسی جگہ میری ڈائر کو بھی اس کے مذہبی اعتقادات کی وجہ سے 1660ء میں پھانسی دی گئی تھی۔ اس کا سیاہ گرینائٹ سے بنا ہوا مجسمہ اسٹیٹ ہاؤس کے سامنے نصب تھا۔

پھانسی کے پھندے پر جھولتی ہوئی میری ڈائر... کا خیال آتے ہی وہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس کا اپنا عکس شراب کی دکان کی کھڑکی میں نظر آرہا تھا۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھیں، رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور بکھرے ہوئے بال...... لیکن یہ اس کا اپنا چہرہ نہیں تھا۔ یہ اس کی لٹکتی ہوئی لاش کی تصویر تھی جو اچانک ہی اس کے سامنے آگئی تھی۔

نیگل دوبارہ حال کی طرف لوٹ آیا اور شراب کی دکان میں رکھی ہوئی سرخ شراب کی بوتلوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے سیل فون پر نظر ڈالی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا اور اسے اپنا کام کرنے کے لیے تھوڑی سی روشنی کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ ایک مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے رابرٹ فراسٹ کا خیال آیا جو تقریباً ایک صدی قبل وہاں رہتا تھا۔ فراسٹ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد سکون کی تلاش میں بیکن ہل آیا تھا۔ کیا اس کی بیوی کو بھی سکون مل جائے گا؟

وہ جنوب مغربی انگلستان میں پیدا ہوا۔ اس نے میگ ڈیلن کالج سے تعلیم حاصل کی پھر وہ اداکاری کی تعلیم حاصل کرنے امریکا آگیا۔ نوجوانی میں اس نے کبھی اداکار بننے کا نہیں سوچا تھا اور وہ شاید کوئی اور پیشہ اختیار کرلیتا لیکن اس کی قسمت میں فینی سے ملنا لکھا ہوا تھا۔ اچانک ہی اس کے دماغ میں اداکار بننے کا خیال آیا اور اس نے ڈراما اسکول میں داخلہ لے لیا۔

فینی سے محبت کرنے میں اس کے دماغ کا کوئی دخل نہیں تھا لیکن اسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ فینی میں اس نے کیا دیکھا۔ شاید اس کا صاف ستھرا برطانوی لہجہ، اس کا برتاؤ یا پھر اس کی اداکارانہ صلاحیت۔

شیکسپیئر پر اپنا مقالہ مکمل کرنے کے بعد نیگل لاس ویگاس چلا گیا جہاں غیر مقامی افراد کو آسانی اور جلدی سے ایکٹرز اکویٹی کارڈ مل جاتا تھا۔ اس نے دوسرے معاون اداکاروں کی طرح ایک ڈرامے میں مختصر کردار ادا کیا جہاں اس کی ملاقات فینی سے ہوئی۔ وہ بے حد خوبصورت اور تماشائیوں کی پسندیدہ اداکارہ تھی۔ وہ سانپ کی کھال جیسا منی اسکرٹ، جالی دار موزے اور اونچی ایڑی کے سینڈل پہنتی۔ موسم گرما کے آخر میں ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

ایک سال بعد وہ فینی کے ساتھیوں سمیت لاس اینجلس آگئے تاکہ نیگل صحیح معنوں میں ایکٹنگ کیریئر اپنا سکے۔ فینی نے اپنے نام میں معمولی سی تبدیلی کی اور تیزی سے شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ اسے ایک فلم میں پنجورن ایوارڈ ملا اور اس کے بعد وہ سائنس فکشن فلم اسنیک پرنس آف انڈر ورلڈ میں بہترین معاون اداکارہ کا [illegible] ایوارڈ لینے میں [illegible] [illegible] کو محسوس ہوا [illegible] یافتہ اداکاروں کے لیے کرداروں کی کمی ہے، نیگل نے ایسٹ کوسٹ میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا جہاں عالمی معیار کی تین تھیٹریکل کمپنیاں تھیں لیکن فینی نے اسے روک لیا۔

”میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم میرے لیے ایک چٹان ہو۔ میرے بہترین دوست اور استاد۔ میں تمہارے بغیر کچھ نہیں کرسکتی۔“ وہ التجا کررہی تھی۔ ”میرا نیا ویڈیو گیم آنے والا ہے جو ہماری قسمت بدل دے گا۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے، تم اس پر مطمئن کیوں نہیں ہوجاتے؟ کیوں رنگین تتلیوں کے پیچھے بھاگ رہے ہو؟ اگر تم چلے گئے تو میرا کیریئر تباہ ہوجائے گا۔ میرے ایوارڈ، میری شہرت سب کچھ تمہاری وجہ سے ہے۔“ اور یہ سچ تھا۔ نیگل نے اس کے ساتھ انتھک کام کیا تھا۔ وہ اسے کیریکٹر سمجھاتا، ہر اسکرپٹ کی ایک ایک لائن اور لفظ کی ریہرسل کرواتا جس کی وجہ سے فینی کی اداکاری میں پختگی آتی جارہی تھی۔

لہٰذا وہ فینی کے پاس ہی لاس اینجلس میں رک گیا لیکن جب اس کے لیے اداکاری کے مواقع کم ہوتے چلے گئے تو اس نے اسٹیج پر کامیڈی کرنے کی کوشش کی۔ ابتدا میں اسے کچھ کامیابی ہوئی لیکن اس کے مزاج میں کسر نفسی کا عنصر نوجوان تماشائیوں کو متاثر نہ کرسکا۔ ایجنٹ نے شکایت کی کہ اس کی خود کلامی بہت زیادہ نمائشی تھی۔ اسے کچھ مسالا ڈالنے کی ضرورت ہے۔

پھر نیگل نے دوسرے ناکام اداکاروں کی طرح اسکرپٹ لکھنے کی کوشش کی مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ جو کچھ پڑھتا یا سوچتا، وہ مطالعے سے عاری عام لوگوں کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں تماشائیوں کی نہیں بلکہ اس کی اپنی غلطی ہے۔

بارہ سال بعد فینی ہالی وڈ کی دوسری سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ بن چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی ویڈیو گیم بھی بہت کامیاب تھی اور نیگل جس نے ایک بار تھنڈر سے بھی کم کمائی کی تھی، اپنی بغل میں موت کا آلہ دبائے بیکن ہل کی سڑکوں پر گھشت رہا تھا۔

اسمتھ لوڈی ایک ہفتے سے نیگل کا تعاقب کررہا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ فینی نے اپنے ناکام شوہر کو چھوڑنے سے کیوں انکار کردیا۔ [illegible] اس وقت نہیں چھوڑ [illegible] اسے [illegible] نہیں چھوڑوں [illegible] میں جانتی ہوں۔ وہ بہت شائستہ انسان ہے۔ اس نے اپنے آپ کو میرے لیے وقف کردیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی سخت قدم اٹھالے۔“

اسمتھ مایوس ہوگیا۔ اس عورت نے اس فضول شخص میں کیا دیکھا؟ وہ اس کے ساتھ اتنی وفادار کیوں ہے اور اسے اس پر کیوں ترجیح دے رہی ہے؟

جب اس نے وجہ جاننا چاہی تو فینی نے کہا کہ اس کا شوہر بہت ذہین ہے جو کلاسیکل تھیٹر کے نازک پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ”نیگل غیر معمولی طور پر ذہین ہے اور کردار میں ڈھلنے میں میری مدد کرتا ہے۔ وہ مجھے سکھاتا ہے۔ میرے ایوارڈز، میری شہرت سب اسی کی وجہ سے ہے۔“

اسمتھ بوسٹن کے ایک تھیٹر میں ڈرامے کی ریہرسل کر رہا تھا۔ لہٰذا اسے موقع مل گیا۔ اس کے لیے نیگل کا تعاقب کرنا آسان تھا جو نہیں جانتا تھا کہ کوئی اس کی بیوی کو ورغلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسمتھ اسے بتانا چاہتا تھا، اسے مجبور کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اور فینی ایک ہوسکیں اور لوگوں کو بھی یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اور فینی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ایک بار فینی کے ساتھ اس کا نام جڑ جائے تو اس کا کیریئر آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے گا لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ فینی سے سچ مچ محبت کرتا تھا البتہ فینی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنے شوہر کو بتاسکے کہ وہ کسی دوسرے مرد سے محبت کرتی ہے۔

پہلے اسمتھ کا خیال تھا کہ وہ نیگل پر یوں ظاہر کرے جیسے یہ اتفاقیہ ملاقات ہے۔ فینی برک شائر میں اپنی فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھی۔ اس لیے اسمتھ کے پاس نیگل کا پیچھا کرنے اور اس سے ملاقات کرنے کے لیے پانچ دن تھے۔ بہرحال وہ ایک اداکار تھا اور اسے ایک اتفاقیہ ملاقات کا رنگ دے سکتا تھا۔ وہ اس پر کسی نہ کسی طرح یہ ظاہر کردیتا کہ فینی اس سے بے وفائی کررہی ہے لیکن پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ نیگل سے روبرو ملاقات کرے گا اور اسے دکھائے گا کہ وہ بازی جیت چکا ہے۔

اس نے اپنے منصوبے کے مطابق ہر روز سہ پہر میں ریہرسل ختم ہونے کے بعد نیگل کا تعاقب کرنا شروع کردیا لیکن سردیوں میں ہونے والی بارش اسے پریشان کررہی تھی۔ وہ کیلی فورنیا کا رہنے والا تھا اور چوبیس سال کی عمر میں ہالی وڈ کا ابھرتا ہوا اداکار بن رہا تھا یا بننے والا تھا۔ نا گر اس کا نام فینی کے ساتھ لیا جانے لگے۔ اسے ابھی تک صرف ایک ڈرامے میں مختصر کردار ملا تھا جس کے لیے فینی نے ان کی سفارش کی [illegible]۔

لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ نیگل بھی بوسٹن میں موجود تھا اور اپنے مکان میں ہونے والے تعمیراتی کام کی نگرانی کررہا تھا جس کی تزئین و آرائش وہ اور فینی بڑے شوق سے کررہے تھے۔ تاہم اسمتھ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کوئی اس خستہ حال پرانے مکان میں کیوں رہنا چاہے گا؟ جبکہ وہ دونوں لاس اینجلس کے کسی نئے اور خوبصورت مکان میں بہ آسانی رہائش اختیار کرسکتے تھے۔

نیگل کا پیچھا کرنا بہت آسان تھا۔ وہ اپنے معمول کے مطابق وقت گزارنے کا عادی تھا۔ پہلے وہ اس میٹنگ میں جاتا جہاں شراب کی عادت ترک کرنے کے خواہش مند شریک ہوتے ہیں۔ پھر وہ بیکن ہل میں آوارہ گردی کرتا پھر وہ اس خستہ حال مکان کو دیکھنے جاتا جسے دو دن پہلے مقفل کرنا بھول گیا تھا۔

لیکن آج کی رات مختلف تھی۔ اسے ایک ہارے ہوئے شخص سے سامنا کرنا تھا۔ وہ نیگل کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ یعنی اسمتھ ہر لحاظ سے اس سے بہتر ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے فینی کے پیسوں سے چمڑے کی جیکٹ، لانگ بوٹ،

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

جینز اور آدھی آستین کی قمیص خریدی تھی۔

جب نیگل میٹنگ سے باہر آیا تو اسمتھ نے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ اس کا رقیب مختلف مقامات سے گزرتا ہوا اپنے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا لیکن جب نیگل ایک ہارڈ ویئر کی دکان میں داخل ہوا تو وہ بھی ایک ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ اسٹور سے باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں رسی کا گچھا اور ایک جیبی چاقو تھا۔ اس نے رسی کو بغل میں دبایا اور چاقو جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

اسمتھ سوچنے لگا کہ کیا وہ اس پرانے مکان میں کچھ لگانا چاہ رہا ہے؟ وہ اس کے اور قریب ہو گیا۔ نیگل نے دکان کے شیشے پر نظر ڈالی۔ اسمتھ کو لگا جیسے وہ آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھ رہا تھا لیکن نہیں...... وہ شراب کی دکان تھی اور وہ بے وقوف شراب کی بوتلوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ ایک ڈرنک کے لیے مرا جا رہا ہو۔

وہ احمق شراب کا بھوکا تھا۔ کیا یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ اسے یہیں بتا دیا جائے کہ اس کی بیوی اس سے بے وفائی کر رہی ہے؟ اس مقصد کے لیے وہ اسے وہسکی کی ایک بوتل بھی پیش کر سکتا ہے، سوائے اس کے کہ فینی کو یہ بات معلوم نہ ہو۔ اس کے شرابی شوہر کی مدد کر کے اسے جھکانا کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ فینی کبھی اسے پسند نہیں کرے گی۔

پورے ہفتے نیگل کا تعاقب کرنے کے بعد بھی اسمتھ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ نیگل میں وہ کون سی خاص بات تھی جس کی وجہ سے فینی اس میں شروع سے ہی کشش محسوس کرنے لگی۔ وہ اس طرح چلتا جیسے پوری دنیا کا مالک ہو۔ اس کی ناک چپٹی، آنکھوں میں پیلاہٹ اور بالوں کا رنگ سیب کے سر کے جیسا تھا۔ البتہ اس کا قد اسمتھ سے کچھ زیادہ تھا جس کی وجہ سے وہ اس سے حسد کرنے لگا اور یوٹیوب پر اس کے کامیڈی شوز دیکھ کر اس کی نفرت میں مزید اضافہ ہوا، جن میں مزاح برائے نام جبکہ ثقیل الفاظ اور سانپوں کے بارے میں لولے لنگڑے لطیفے ہوتے تھے۔ اسمتھ کو سانپ پسند نہیں تھے۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ اس کی کھال پر رینگ رہے ہوں۔

نیگل کو بیکن ہل پر لمبے لمبے ڈگ بھرتے دیکھ کر اسمتھ کا دل چاہا کہ اس کا منہ توڑ دے۔ یہ شخص کسی بھی طرح ایک خوبصورت اور مشہور عورت کا شوہر بننے کا مستحق نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جسے سب کچھ چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر دے دیا گیا ہو۔

سردی کے باوجود نیگل کو ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ کیا وہ ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی جان لے لے؟ اسے اپنے دل کی دھڑکن کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ مکان تھا جس کی تزئین و آرائش ہو رہی تھی تاکہ وہ اور فینی اس میں اکٹھے رہ سکیں۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور فٹ پاتھ سے نیچے اتر آیا۔ اب وہ اس پانچ منزلہ مکان کے سامنے کھڑا ہوا تھا جس پر تختوں اور بانس کی مدد سے باڑ لگا دی گئی تھی۔ نیگل نے اپنا سر نیچے کیا اور باڑ کے تختوں سے بچتا ہوا چھوٹے داخلی دروازے پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے کی پیڈ پر چار ہندسوں کا کوڈ دبایا اور تہ خانے کا دروازہ کھولنے سے پہلے ایک دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔

اندھیرے نے اردگرد کے مکانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ نیگل نے آگے بڑھ کر تہ خانے کا دروازہ کھولا۔ اسے اندھیرے میں سیڑھی نظر نہیں آئی تاوقتیکہ وہ اس سے ٹکرا نہیں گیا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل فون نکالا اور اس کی ٹارچ روشن کر کے سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ وہ بڑے محتاط انداز میں زینہ چڑھ رہا تھا اور اس کا پورا دھیان اپنے قدموں سے پیدا ہونے والی گونج کی طرف تھا۔

اسے اپنی بیوی کا خیال آیا جس نے اپنا کیریئر ایک شعبدہ باز کے معاون کے طور پر شروع کیا۔ اب وہ ایک جانی پہچانی اداکارہ تھی اور اپنی عمدہ اداکاری [illegible] جیت [illegible] تھی۔ اس نے اپنا ویڈیو [illegible] اور اس کا شوہر اپنی زندگی کی آخری پرفارمنس دینے جا رہا تھا۔ آج اس کے مرنے کا دن تھا اور اس کی وجہ فینی تھی جو ایک کم عمر مرد سے چوری چھپے مل رہی تھی۔

نیگل کے دوستوں نے اسے اس کی بیوی کے معاشقے کے بارے میں بتایا جو ایک نئے اداکار اسمتھ سے پیار کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ نیگل یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اسے فینی سے اس بے وفائی کی امید نہیں تھی۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ اسمتھ کو تلاش کر کے اس سے براہِ راست ملاقات کرے پھر خیال آیا کہ گوگل پر اس کے بارے معلومات حاصل کر کے اسے سوشل میڈیا کے ذریعے ہراساں کیا جائے لیکن یہ اس کے وقار کے منافی تھا۔

اس کے بجائے نیگل نے کام کرنا بالکل چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو بیورلے ہلز والے مکان میں قید کر لیا۔ وہ کثرت سے شراب پینے لگا اور اس نے دیوانوں کی طرح فینی کا ایکشن ویڈیو گیم لگانا شروع کر دیا۔ اسے اس گیم میں

مہارت ہو گئی جس میں اسے اپنے حریفوں سے لڑنا تھا تاکہ فینی کے متحرک وجود کی خیالی توجہ حاصل کر سکے لیکن جب اس کا اسکور بڑھنے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ جیتنا نہیں چاہتا، اس متحرک وجود کو جو اس کی بیوی سے مشابہت رکھتا تھا۔ وہ فینی کے ساتھ اس طرح کی شرمناک زندگی گزارنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک بے وفا بیوی کا شوہر کہلانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس دو راستے تھے۔ وہ فینی کا سامنا کر کے اس سے باز پرس کرتا جس کے بعد ان دونوں کے درمیان لڑائی شروع ہو جاتی یا پھر آنکھیں بند کر کے خاموشی اختیار کر لیتا۔ یہ دونوں باتیں اس کے لیے ناقابلِ قبول تھیں چنانچہ اس نے اس کا ایک اور حل سوچا۔ ایسی زندگی سے بہتر ہے کہ وہ موت کو گلے لگا لے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر خودکشی کر لے گا اور وہ اسی مقصد کے تحت یہاں آیا تھا۔

اب وہ دوسری منزل پر کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ کیا شکستہ شہتیر اس کا وزن برداشت کر سکے گا؟ اس نے کانپتے ہاتھوں سے چاقو نکالا۔ رسی موٹی تھی لیکن چاقو کا تیز دھار پھل اسے کاٹ سکتا تھا۔

☆☆☆

ماؤنٹ ورنن اسٹریٹ پہنچ کر اسمتھ نے ایک درخت [illegible] قریب ہو کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ [illegible] جانب بڑھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ اس کے بازو کے ابھرے ہوئے پٹھوں کو دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ اس عمر میں بھی نیگل حیرت انگیز جسمانی قوت کا مالک تھا لیکن اسمتھ کو اس سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ کیا اب بھی فینی اور اس کا شوہر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں؟ کیونکہ حال ہی میں اس نے فینی سے کہا تھا کہ وہ اسے اپنا بیورلے ہلز والا گھر دکھائے۔ دراصل وہ اس بہانے اس کے بیڈروم میں جانا چاہ رہا تھا لیکن فینی نے صاف انکار کر دیا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتی اسمتھ۔'' فینی نے اپنی دلفریب آواز میں کہا۔ ''میرے پالتو جانور اجنبیوں کو پسند نہیں کرتے۔''

''اجنبی......؟'' اسمتھ نے پوچھا۔ ''تمہارا مطلب کتے بلیوں سے ہے؟''

''ہاں، ہمارے پاس ایک بلی، کتا، گنی پگ اور ایک کانٹے دار چوہا ہے لیکن سانپ تو لوگوں کو دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ خاص کر ہمارا لہریا سانپ۔ میں ویگاس میں سانپوں سے کھیل چکی ہوں۔ اس لیے مجھے رینگنے والے جانور پسند ہیں لیکن زیادہ تر لوگوں کو یہ اچھے نہیں لگتے۔''

اس نے جانوروں کی جگہ menagerie کا لفظ استعمال کیا تھا جس کے لغوی معنی جانور خانے کے ہیں لیکن وہ اسے سمجھ نہیں سکا۔ اس نے گوگل کا سہارا لیا لیکن اسے اس لفظ کے ہجے معلوم نہیں تھے اس لیے وہاں سے بھی کوئی مدد نہیں ملی۔

اسے بڑی کوفت ہوتی جب فینی مشکل الفاظ استعمال کرتی یا ان کتابوں کے بارے میں بات کرتی جو اس نے نیگل کے ساتھ بیٹھ کر پڑھی تھیں۔ وہ اس غیر معمولی ذہانت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو نیگل سے بہتر سمجھتا تھا۔ وہ محض کتابی کیڑا تھا جبکہ اسمتھ میں جنسی کشش زیادہ تھی۔ فینی بھی اس کی جسمانی قوت سے متاثر تھی کہ اس کا خیال تھا کہ وہ نیگل کے مقابلے میں فینی کو زیادہ جنسی تسکین دے سکتا ہے۔

اس مکان کے قریب پہنچ کر وہ اپنے خیالوں سے باہر آ گیا۔ اس نے چوراہے پر لگے ہوئے جنگلے میں جھانک کر نیگل کو سڑک پار کرتے دیکھا۔ وہ گردن گھما کر اپنے عقب میں یوں دیکھ رہا تھا جیسے یہ زمین پر اس کا آخری نظارہ ہو۔ جب نیگل باڑ سے گزر کر دروازے سے اندر چلا گیا تو وہ بھی جنگلے سے باہر آیا لیکن اس کا پاؤں فٹ پاتھ پر باہر کی طرف نکلی ہوئی اینٹ سے ٹکرایا۔ وہ بے خیالی میں آگے کی طرف جھکا اور لڑکھڑاتے ہوئے بالآخر اپنا توازن برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے دل ہی دل میں شہری انتظامیہ کو برا بھلا کہا کہ وہ دوسرے شہروں کی طرز پر یہاں بھی سیمنٹ کے پختہ فٹ پاتھ کیوں نہیں بناتے۔

اسمتھ سڑک پار کر کے مکان تک پہنچا اور باڑ کے تختوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہوا دروازے پر آیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر گہرے کش لینے لگا۔ اس کی نظر تہ خانے کے دروازے پر گئی اور اس نے دیکھا کہ وہ مقفل نہیں تھا لہٰذا اسے دروازہ کھولنے اور اندر جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اندر اندھیرا تھا۔ اس نے آئی فون نکال کر فلیش لائٹ جلائی اور اس کی روشنی میں تہ خانے کا کونا کونا دیکھ ڈالا لیکن اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ آہستگی سے کنکریٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کے بھاری جوتوں کی دھمک سناٹے میں گونج رہی تھی۔

یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے؟ پہلی منزل بالکل خالی تھی۔ دوسری منزل پر پہنچ کر وہ سیدھا ہوا۔ اندھیرے میں اسے کوئی عجیب چیز نظر آئی جو اس سے چند انچ کے فاصلے پر

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ مزید محتاط ہوگیا۔ شہتیر کی کڑی سے لٹکی ہوئی ایک لاش فضا میں معلق تھی۔ اس نے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ یہ فینی کا شوہر ہے کیونکہ اس بارے میں اسے یقین تھا کہ یہ وہی ہوسکتا ہے البتہ اس نے اپنا فون پکڑ کر اسے قریب سے دیکھا۔ فلیش لائٹ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

اس نے ہارڈ ویئر کی دکان سے خریدی ہوئی رسی گلے میں ڈال کر خودکشی کی تھی۔ اسمتھ کا دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے اس کے سینے میں ڈرم بج رہا ہو۔ نہ جانے کیوں اس نے نیگل کو نیچے اتارنے کا سوچا۔ اس نے لاش کے پیروں کے پاس پڑا ہوا جیبی چاقو اٹھایا اور لکڑی کے کریٹ پر چڑھ کر رسی کاٹنا شروع کردی۔ چاقو کے بلیڈ کو آگے پیچھے چلانے میں اسے کافی کوشش کرنا پڑی لیکن وہ رسی کاٹنے میں کامیاب ہوگیا اور لاش پھر سے نیچے آن گری۔

اسمتھ کریٹ سے نیچے اتر کر سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا وہ نو... گیارہ کو فون کردے......؟ لیکن وہ انہیں کیا بتائے گا کہ وہ فینی کے مکان میں اس کے مردہ شوہر کے ساتھ کیا کر رہا تھا؟

نہیں...... وہ پولیس کو فون نہیں کرسکتا۔ اس کے بجائے اسے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ وہ جیسے ہی باہر جانے کے لیے گھوما، اسے فینی کی بات یاد آگئی۔ اس نے بتایا تھا کہ مکان کے باہر تعمیراتی کام کی نگرانی کے لیے سیکیورٹی کیمرے لگائے گئے ہیں۔ اگر پولیس نے اس کے مکان میں داخل ہونے اور واپس جانے کی فوٹیج دیکھ لی تو وہ پکڑا جائے گا۔

وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور اس کا تنفس بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کی ہتھیلیاں اور سینہ دبایا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس نے صبر کے ساتھ یہ کارروائی جاری رکھی کیونکہ وہ پولیس کو بتانا چاہتا تھا کہ اس نے سب کچھ کرکے دیکھ لیا تھا لیکن اس کا جسم ساکت پڑا رہا۔

وہ جانتا تھا کہ اسے اپنی موجودگی کا جواز بتانا ہوگا لیکن وہ پولیس کو کیا بتائے؟ اس نے کوئی معقول وجہ سوچنے کے لیے دماغ پر زور دینا شروع کیا۔ تبھی اس نے محسوس کیا کہ لاش میں حرکت ہوئی ہے۔ وہ کراہنے لگا۔ اس آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور ایک لمحے کے لیے اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی کہ اس نے رسی کیوں کاٹی۔

وہ ایک بار پھر کراہ کر خاموش ہوگیا۔ اسمتھ نے منہ کے ذریعے اس کا سانس بحال کرنے کے بارے میں سوچا لیکن فوراً ہی یہ سوچ کر اس خیال کو مسترد کردیا کہ شاید یہ اس کی آخری ہچکی ہو لیکن نہیں...... نیگل نے رال جھاڑی اور کمزور آواز میں بولا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

''تم نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کی تھی۔'' یہ کہہ کر اسمتھ نے اس کا بازو اوپر اٹھایا اور لکڑی کے کریٹ کے سہارے بٹھا دیا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' نیگل نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

''میں نے تمہاری جان بچائی ہے۔'' اسمتھ نے کہا۔ ''اچھا ہوا کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا۔''

''تم گستاخ اور بے وقوف ہو۔'' نیگل مینڈک کی طرح ٹرٹرایا۔

''دوست۔ میں نے تمہارے ساتھ بھلائی کی...... تمہیں میرا شکرگزار ہونا چاہیے۔'' اسمتھ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''تم چاہتے ہو کہ میں تمہارا شکریہ ادا کروں۔'' نیگل نے زور زور سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بجائے کیوں نہ تمہارے منہ پر گھونسا رسید کردوں۔''

''تم مجھے ایک گھٹیا انسان لگتے ہو۔''

''تم یہاں کیا [illegible]'' نیگل نے کہا۔

اسمتھ کی ناراضی بڑھتی جارہی تھی لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ نیگل اس کے بارے میں پولیس کو کچھ بتائے۔ اس نے فلیش لائٹ کمرے میں گھمائی اور بولا۔ ''اگر تمہیں اپنے نہ مرنے پر مایوسی ہوئی ہے تو تم دوبارہ یہ کوشش کرسکتے ہو۔''

''بالکل اسی طرح مجھے دوسری بار یہ تکلیف اٹھانی چاہیے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اپنے آپ کو پھانسی دینا اتنا آسان ہے؟ تم نے جو کچھ کیا، اس بارے میں جتنا سوچتا ہوں اتنا ہی میرا غصہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں اتنا اندھیرا کیوں ہے؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے جس نے اتنی ڈھٹائی سے اس تکلیف دہ عمل میں مداخلت کی جو قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کھڑے ہوجاؤ احمق...... روشنی کردو۔ اس کا سوئچ دیوار پر لگا ہوا ہے۔ مجھے اس طرح اندھیرے میں نہ بٹھاؤ۔ کم از کم تم اتنا تو کرسکتے ہو۔''

اسمتھ کھڑا ہوگیا۔ اس کی پشت نیگل کی جانب تھی۔ اس نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ''اب ہم جو کرنے والے ہیں۔'' نیگل نے کہا۔ ''اس بار تم مناسب انداز میں میری مدد کروگے۔''

اسمتھ وقتی طور پر رک گیا۔ اگر یہ بے وقوف دوبارہ اپنے آپ کو پھانسی دینا چاہتا ہے تو وہ اسے نہیں روکے گا۔ پہلے ہی اس نے اسے بچا کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی ہے، اب وہ کم از کم اس کا ازالہ کرسکتا ہے۔ وہ دیوار کے ساتھ چلتا ہوا بورڈ تک گیا اور سوئچ آن کردیا۔

''تم کون ہو؟'' نیگل نے پوچھا۔

''کوئی نہیں۔'' اسمتھ نے جواب دیا۔

''تم میرے گھر میں کیوں داخل ہوئے؟''

اسمتھ نے برجستہ کہا۔ ''میں نے تمہیں ہارڈ ویئر کی دکان سے رسی خریدتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تم مجھے مایوس اور دل شکستہ لگ رہے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ تم خودکشی کرنا چاہ رہے ہو ورنہ رسی کیوں خریدتے لہٰذا میں نے تمہارا پیچھا کیا۔''

''یہ تمہاری پیش بینی ہے ورنہ میرا خیال ہے کہ رسی خریدنے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔''

''پیش بینی؟'' یہ اسمتھ کے لیے ایک نیا اور مشکل لفظ تھا لیکن وہ نیگل سے اس کے معنی جاننا نہیں چاہ رہا تھا۔

''لہٰذا تم نے ہیرو بننے کا فیصلہ کرلیا لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ میں یہاں مرنے کے لیے کیوں آیا کیونکہ میرے [illegible] ناقابلِ برداشت ہوگیا [illegible] لیکن [illegible] دوبارہ [illegible] کا تعلق [illegible] تو میں [illegible] نہیں کرسکتا۔''

''کیوں نہیں کرسکتے؟'' اسمتھ نے بے تابی سے پوچھا۔

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ جب میں نے کریٹ کو لات ماری اور اپنے آپ کو گرتا ہوا محسوس کیا......''

''تمہارے اعصاب جواب دے گئے؟''

''بالکل نہیں۔''

''پھر کیا؟''

''میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' نیگل نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ''جب میں لٹکا ہوا تھا تو میری گردن کے گرد پھندا تنگ ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ میرے سر کے بال کھڑے ہو رہے ہیں۔ میرے بازو اکڑ گئے ہیں اور میری رگوں میں ٹھنڈک اتر آئی ہے۔ میں تیزی سے نیچے آ رہا تھا لیکن اسی کی پکڑ بہت سست تھی۔ لگ رہا تھا کہ وقت ایک جگہ رک گیا ہے۔ یہ تکلیف ناقابلِ برداشت تھی کہ موت بھی اتنی آسانی سے نہیں آئی پھر جب میں بالکل ہوش و حواس کھو بیٹھا تو تم نے مجھے سنبھال لیا۔ ظالمانہ اور غیر معمولی سزا مجھے زندگی کی طرف واپس لا رہی تھی۔ کیا تم اس پر کچھ نہیں کہوگے؟''

''اگلی بار خواب آور گولیاں زیادہ مقدار میں لینا۔ بالکل تکلیف نہیں ہوگی لیکن تمہاری زندگی میں ایسا کیا ہوگیا کہ تم موت کو گلے لگانا چاہتے ہو؟''

''ایک عورت...... وہ ہمیشہ عورت ہی ہوتی ہے۔ میں نے اس سے ٹوٹ کر محبت کی لیکن میرے خواب بکھر کر رہ گئے۔''

اسمتھ چونک پڑا۔ کیا اسے شبہ ہوگیا ہے کہ اس کی بیوی اس سے بے وفائی کر رہی ہے؟ ''کیا اسی لیے تم نے خودکشی کی کوشش کی؟ ایک عورت کی وجہ سے...... کیونکہ اب وہ تم سے محبت نہیں کرتی؟''

''وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی...... یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟ تمہارے پاس سگریٹ ہے؟'' نیگل نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اسمتھ نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکالی۔ نیگل نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ لیا اور ایک کش لیتے ہوئے بولا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے ایک نیک مقصد کے تحت میری جان بچائی لیکن کاش تم مداخلت نہ کرتے۔ تمہارا خیال تھا کہ تم مجھے بچا رہے ہو لیکن تم سے غلطی سرزد ہوگئی۔ تم نے مجھے ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کردیا جو ناقابلِ برداشت ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو وہ خودکشی کرلے گی اور وہ کئی مرتبہ یہ کوشش کرچکی ہے۔ لہٰذا میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ [illegible]''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' اسمتھ اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس سے پہلے کبھی ایسی احمقانہ بات نہیں سنی۔ یہ کوئی عقل مندی نہیں۔ اگر تم اپنی بیوی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو اسے چھوڑ دو۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ محبت انسان کو مایوسی کے اندھیرے میں دھکیل دیتی ہے۔''

''تم اس سے محبت کرتے ہو؟''

''پہلے کرتا تھا جب تک وہ وہمی اور غیر مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ ہم نے بہترین ڈاکٹروں کو دکھایا۔ میں ایسی بیوی کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں جس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں اس کے لیے خوش بختی کی علامت ہوں۔ جب بھی میں نے اسے چھوڑنے کی کوشش کی، وہ اپنے آپ کو مارنے کی دھمکی دیتی ہے۔ اگر میں مرگیا تو وہ کسی اور مرد سے رشتہ جوڑ لے گی اور وہ اس کے اعصابی خلل کو سنبھال لے گا۔ وہ مجھ سے بہتر ہی ہوگا۔''

''دیکھو، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ایک مسئلہ ہے لیکن

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

اتنا شدید بھی نہیں کہ میں خودکشی کرلوں۔ میں ایک عورت سے محبت کرتا ہوں جو اپنے شوہر کو نہیں چھوڑنا چاہتی۔ وہ اس کی وفادار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر اس نے اسے چھوڑ دیا تو وہ کوئی احمقانہ حرکت کر بیٹھے گا...... شاید خودکشی۔''

''کیا وہ بہت خوب صورت ہے؟''

''بہت زیادہ...... اس کی آنکھیں مجھے دیوانہ بنا دیتی ہیں۔ لوگ اسے فلموں میں دیکھ کر پاگل ہوجاتے ہیں۔ وہ بہت زیادہ پُرکشش اور شاندار عورت ہے۔''

''میری بیوی نے بھی اسی طرح مجھے اپنا دیوانہ بنایا تھا لیکن تم نے بتایا کہ تمہاری دوست شادی شدہ ہے۔ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ کیا اس کا شوہر اس سے محبت نہیں کرتا؟ کیا وہ اس کی خواہشات پوری نہیں کرسکتا لیکن تم اس قابل ہو۔ عام طور پر یہی وجہ ہوتی ہے جب عورت کسی دوسرے مرد کی طرف دیکھنے لگے۔ میں بھی کبھی اپنی بیوی کی محبت میں پاگل ہوگیا تھا۔ اس کی اداؤں اور لاڈ پیار نے مجھے فریب میں مبتلا کردیا۔'' نیگل کی آواز جذباتی ہوگئی۔ ''لیکن اس وقت میں جوان اور کم عقل تھا جبکہ میری بیوی ایک اداکارہ تھی۔ کسی اداکارہ سے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کسی طرح بھی اس کی انا کی تسکین نہیں کرسکتے۔''

''میں کئی اداکاروں کو جانتا ہوں۔ وہ بھی ہماری طرح انسان ہیں۔''

''ہم بہت سے سیاست دانوں کو [illegible] سمجھتے ہیں جو دن رات اپنے اعلیٰ اصولوں اور اخلاقی اقدار کا پرچار کرتے رہتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ لوگ مغرور اور انا پرست ہوتے ہیں۔ اسی طرح اداکار بھی داد حاصل کرنے کے لیے اپنی روح تک کا سودا کردیتے ہیں۔ یہ اس پیشے کا خاص مرض ہے۔''

''خاص مرض؟''

''ہر اداکارہ اپنی تعریف، خوشامد اور پرستش چاہتی ہے۔ اس کے درجنوں معاشقے ہوتے ہیں۔''

''یہ تم کیسے جانتے ہو؟''

''اس نے مجھے ان کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے اذیت پہنچانے کے لیے...... لیکن اس وقت جب یہ سلسلہ ختم ہوچکا تھا۔ ان کا دل توڑنے کے بعد...... ان میں زیادہ تر اداکار تھے۔''

''کیا وہ اب بھی ایسا کررہی ہے؟ اسی لیے تم نے......''

''دوستوں نے مجھے اس کے معاشقے کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ مردوں، خاص طور پر نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جو اس کی جنسی تسکین کا سامان کرسکیں۔''

''لگتا ہے کہ تم اس سے حسد کرتے ہو؟''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کے ساتھ اس لیے رہتا ہوں کیونکہ اسے میری ضرورت ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ میں اس کی کامیابی کی وجہ ہوں۔ وہ یہ بھی سمجھتی ہے کہ میں اس سے مخلص ہوں لیکن تم نے دیکھا کہ میں نے اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے بجائے خودکشی کی کوشش کی۔ میں سب کچھ ہوسکتا ہوں لیکن مخلص نہیں۔ یہ اپنی اپنی قسمت ہے کہ میں ایک عورت کی وجہ سے خودکشی کرنا چاہتا ہوں اور تم زندہ رہنے کے خواہش مند ہو کیونکہ تمہیں ایک خوب صورت عورت کا ساتھ مل گیا ہے۔''

''ممکن ہے کہ وہ تمہارے ساتھ مزید نہ رہنا چاہتی ہو؟ ہوسکتا ہے کہ وہ طلاق لینا چاہ رہی ہو؟''

''ایسا نہیں ہے کہ وہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ اسے وہم ہوگیا ہے کہ میں اس کی زندگی سے جانا چاہتا ہوں۔ میری بیوی کہتی ہے کہ میں بہت اچھا انسان ہوں پھر تم ہی بتاؤ کہ میں اس حالت میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟''

وہ دونوں سگریٹ کا کش لیتے اور دھواں اڑاتے رہے پھر نیگل نے ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں رسی کاٹنے میں پانچ منٹ کی تاخیر ہوجاتی تو ہم یہ گفتگو نہ کررہے ہوتے۔ کیا تم اپنی محبوبہ [illegible] چاہتے ہو؟''

''میں بہت جلد اس سے شادی کرلوں گا جیسے ہی......'' اسمتھ کی آواز اس کے منہ سے نکلنے والے دھوئیں کے ساتھ ہی فضا میں بہہ گئی۔

''پھر میں تم دونوں کے لیے ایک خوشگوار مستقبل کی دعا کرتا ہوں۔ شاید اس کے بعد وہ سانپوں کو پسند کرنا چھوڑ دے۔''

''میری بیوی نے ایک سپیرن کے طور پر اپنا کیریئر شروع کیا تھا۔ وہ کنڈلی مارے سانپ کے انداز میں بال بناتی ہے۔ اس نے سانپوں پر ایک ویڈیو گیم بھی بنایا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں اس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کون ہے۔ اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ہم بیڈروم میں بھی سانپوں کے ساتھ کھیلیں۔''

اسمتھ کو حیرت کا جھٹکا لگا اور وہ خوفزدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ رسی سے لٹکنے کے دوران تمہارے دماغ میں آکسیجن کی بہت زیادہ کمی ہوگئی تھی۔''

نیگل افسردگی سے بولا۔ ''اگر میرے پاس خفیہ

دولت ہوتی تو میں غائب ہوجاتا اور دنیا کے کسی دور افتادہ ملک میں چھپ کر دوسری شادی کرلیتا۔ فینی جیسی عورت کے ساتھ رہنے سے بہتر ہے کہ آدمی خودکشی کرلے۔ اوہ...... بھول جاؤ کہ میں نے اس کا نام لیا تھا۔''

''تم ہذیانی کیفیت میں ہو دوست۔''

''کتنی عجیب بات ہے۔'' نیگل نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ایک گھنٹا پہلے ہم اجنبی تھے۔ میں اپنے دل میں گھٹن محسوس کررہا تھا جو دور نہیں ہورہی تھی۔ اب میں کچھ اور محسوس کررہا ہوں۔ شاید اس خودکشی سے مجھے نئی امید ملے۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔ بیوی کے ساتھ تکلیف دہ زندگی پر ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ شاید مجھے یہ کتاب لکھنی چاہیے۔ ناکام رائٹرز اپنی یادداشتیں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب خوب بکے گی لیکن اس کتاب سے اسے تکلیف ہوگی اور میں دل سے ایسا نہیں چاہتا۔''

''وہ اتنی بری نہیں ہوسکتی جیسا تم سمجھ رہے ہو۔''

''وہ واقعی اتنی بری ہے۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں جب وہ سانپ کی کھال سے بنے ہوئے انڈرگارمنٹ اور اس پر نیلی لباس زیب تن کرتی ہے تو میں جانتا ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہے۔''

''کیا؟'' اسمتھ نے پوچھا۔

''اس کے سانپ ایک عذاب بن گئے ہیں۔ مجھے [illegible] بستر پر لیٹا تو تکیے کے نیچے ایک کوبرا لپٹا ہوا تھا لیکن میری بیوی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ مانتا ہوں کہ مجھ میں بھی کچھ خامیاں ہیں۔ میں شراب چھوڑنے کی کوشش کررہا ہوں۔ میں ایک ناکام اداکار ہوں۔ دیر تک ویڈیو گیم کھیلتا ہوں لیکن سانپ...... کیا میں اس سلوک کا مستحق ہوں؟ جب میں نے فینی سے شادی کی تو جانتا تھا کہ وہ سپیرن ہے لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا......'' آنسو اس کے چہرے پر بہنے لگے۔ ''میں اپنے کمرے میں دوبارہ سانپوں سے خوفزدہ ہونا نہیں چاہتا۔''

اسمتھ کا جی متلانے لگا۔ اس نے بمشکل تمام اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم...... اپنی بیوی کے پاس چلے جاؤ۔ اسے بتا دو کہ تم اس سے طلاق چاہتے ہو۔''

''وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑے گی۔ میرے پاس اس کے راز ہیں اور تم بھی اس پر ظاہر نہیں کرو گے کہ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب ہمارے درمیان ایک تعلق قائم ہوچکا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ ہمارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں، وہ اپنے تک ہی رکھو گے۔''

''نہیں...... میرا مطلب ہے کہ ہاں...... میں قسم کھاتا ہوں لیکن اب میں تمہیں چھوڑ کر جارہا ہوں، چاہے تم خودکشی کرو یا نہیں لیکن مجھے اس معاملے سے الگ کردو۔ مجھے سانپوں سے نفرت ہے۔ میں ان کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتا۔ میں یہاں سے جارہا ہوں۔''

اسمتھ لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے نکلا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے چلا گیا۔ جو کچھ نیگل نے بتایا اگر وہ سچ تھا تو وہ فینی کو پیغام بھیج دے گا کہ وہ اس کے ساتھ تعلق ختم کررہا ہے اور اسے یقین دلانے کے لیے دوسری لڑکیوں کے ساتھ اپنی تصویریں بھی انسٹاگرام پر ڈال دے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک طرح سے اس کا یہاں آنا سودمند رہا۔ فینی کے شوہر نے اس پر جو احسان کیا تھا، وہ اس سے کہیں زیادہ تھا جو اس نے نیگل کی جان بچا کر کیا تھا۔

اس ویران مکان میں تنہا نیگل نے اپنا سیل فون اٹھایا اور فینی کو پیغام بھیجنے لگا۔ ''میں شیکسپیئر اینڈ کمپنی کے آڈیشن میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ تم گھر آجاؤ تو ہم مل کر اس کا جشن منائیں گے۔''

اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر رسی کی گرہ کھینچی۔ [illegible] نے ایک ڈرامے کے دوران کرتب دکھاتے [illegible] پورے ہفتے وہ اسمتھ کو چارے کے طور پر پھانسنے کی امید کرتا رہا لیکن آج اسے یہ ترکیب استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ اسمتھ بہت قریب ہوکر اس کا تعاقب کررہا تھا۔ اس نے اسمتھ کا عکس شراب کی دکان کے شیشے میں دیکھا۔ وہ اس سے الجھنے کے موڈ میں تھا۔

اس نے دو دن پہلے ہی تہ خانے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ اسمتھ اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جائے پھر سب کچھ اس کے منصوبے کے مطابق ہوا۔ اس نے اسمتھ کے سامنے فینی کی انتہائی خوفناک تصویر پیش کی کہ وہ خوفزدہ ہوگیا حالانکہ وہ نہ تو انا پرست تھی اور نہ ہی اسے سانپوں سے کوئی لگاؤ تھا۔ اسمتھ سے ملنے سے پہلے وہ اس کی پوری طرح وفادار تھی لیکن وہ اسے مسلسل ورغلا رہا تھا چنانچہ اس نے اسمتھ کو بھگانے کے لیے وہ طریقہ اختیار کیا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اب وہ بیکن ہل کے اس مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزار سکتا تھا۔

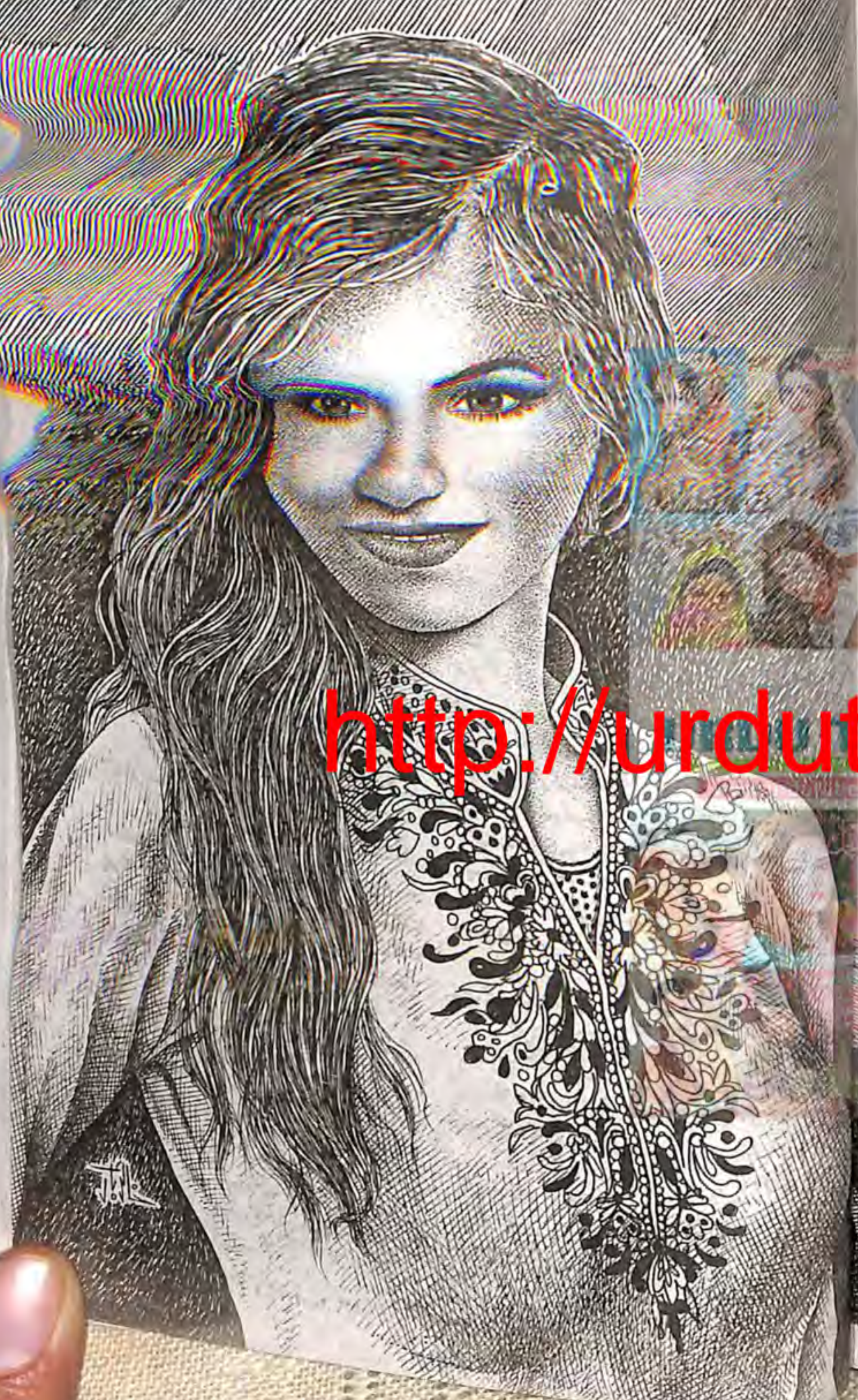

آخری صدمہ

نشور ہادی

اگر غور کیا جائے تو رشتے اللہ کی طرف سے ایک خوبصورت تحفہ ہوتے ہیں... ان میں سے کچھ رشتے بعض اوقات بہت بڑا امتحان بن جاتے ہیں جو قدم قدم پر آزمائش میں مبتلا کیے رکھتے ہیں۔ ان کا جوڑ بھی اس قدر بے جوڑ تھا کہ بے بسی نے ان کے تعلقات کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا... ایک ذرا سے اشتعال نے ان کی زندگی میں بھونچال پیدا کردیا اور پھر عمر بھر کی آبلا پائی نے ایک ایک لمحے کا تاوان کچھ اس طرح وصول کیا کہ پیار سے بنائے جانے والے آشیانے کا تنکا تنکا طوفانوں کی زد میں آگیا۔ وہ جو اپنے جیون ساتھی کے ساتھ چاہت اور ایمانداری سے بھرپور رفاقت چاہتی تھی کہ اچانک سرزد ہونے والی حماقت نے اسے جدائی کے غار میں دھکیل دیا۔

محبت سے زندگی گزارنے والی ایک قاتلہ کی بے باکی......

ایک خطا کار بیوی کی وفاداری کی داستان

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

صبح کا وقت تھا۔ نگار اس وقت اپنے دفتری کمرے میں تھی۔ اس کے سامنے کمپیوٹر کھلا ہوا تھا۔ وہ کچھ دن سے ایک خاص نوعیت کا پروگرام بنانے میں مصروف تھی۔ پروگرام بہت ہی غیر معمولی تھا۔ تین چار دن پہلے جب اسے احساس ہوا کہ وہ کامیابی کے بہت قریب ہے تو وہ زیادہ پُرجوش ہوگئی۔ دفتر نو بجے شروع ہوتا تھا لیکن وہ ان دنوں آٹھ بجے ہی آنے لگی تھی جبکہ چپراسی وغیرہ دفتر کی صفائی میں مصروف ہوتے تھے۔

جب اس کے موبائل نے نو بجے کا الارم بجایا تو وہ چونکی۔ وہ ایک گھنٹے میں جتنا کام کر چکی تھی، اسے ''سیو'' کر کے اس نے کمپیوٹر بند کیا ہی تھا کہ چپراسی نے آ کر اطلاع دی کہ جنہیں انٹرویو کے لیے بلایا تھا، وہ آ گئے ہیں۔

نگار نے الارم لگایا ہی اس لیے تھا کہ نو بجے کمپیوٹر بند کر سکے اور ان لوگوں کا انٹرویو لے جنہیں اس نے بلایا تھا۔ اشتہار دینے پر درخواستیں تو بہت آئی تھیں لیکن انٹرویو کے لیے اس نے صرف پانچ افراد کا انتخاب کیا تھا اور انہیں نو بجے آنے کے لیے میسج کر دیا گیا تھا۔

وہ کرسی سے اٹھ کر برابر والے کمرے میں آ گئی جہاں کے ساز و سامان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک عام قسم کا دفتر تھا۔ وہ اپنی میز کی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گئی۔ چپراسی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی ایک کو اندر بھیج دے۔ [illegible] ایک لڑکی اندر آئی جس کی عمر چوبیس سال کے [illegible] ہوگی۔

نگار نے اپنے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھو!''

لڑکی بیٹھ گئی۔ نگار نے اس سے کمپیوٹر کے بارے میں سوالات شروع کیے۔ دس منٹ تک سوال و جواب ہوئے، پھر نگار اس لڑکی کو اپنے ساتھ اس کمرے میں لے گئی جہاں وہ کمپیوٹر پر کام کرتی رہی تھی۔ وہاں نگار کے کمپیوٹر کے علاوہ ایک کمپیوٹر اور تھا۔ نگار نے لڑکی کو اس کمپیوٹر کے سامنے بٹھایا اور لڑکی کا عملی امتحان لینے لگی۔ پانچ منٹ میں ہی وہ لڑکی کی طرف سے مایوس ہو چکی تھی۔ اسے اپنا اسسٹنٹ بنانا اس کے لیے قطعی غیر مفید ہوتا۔

''بس۔'' نگار نے اس سے کہا۔ ''اب تم باہر جا کر بیٹھو اور نتیجے کا انتظار کرو۔ پانچوں انٹرویوز کے بعد آج ہی بتا دیا جائے گا کہ میں نے کس کا انتخاب کیا ہے۔'' اس نے لڑکی سے اخلاقاً یہ نہیں کہا کہ وہ اس کے لیے بیکار ہے۔

پانچ انٹرویوز لینے میں نگار کو ڈیڑھ گھنٹے سے کچھ زیادہ لگا۔ تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ نگار کو صرف ایک لڑکے میں وہ صلاحیت نظر آئی جو اسے مطلوب تھی۔

''گڈ!'' نگار نے اس سے اس وقت کہا جب پانچوں انٹرویوز لینے کے بعد اسے دوبارہ اپنے دفتری کمرے میں بلایا۔ ''تم یقیناً میرے لیے ایک اچھے اسسٹنٹ ثابت ہو سکتے ہو وقاص! میں نے تمہارا ہی انتخاب کیا ہے۔''

''شکریہ میڈم!'' خوبصورت وقاص نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مجھے امید تھی کہ میرا ہی انتخاب ہوگا۔''

''اچھا!'' نگار آہستہ سے ہنسی۔ ''پہلے ہی سے امید باندھ لینا اچھا نہیں ہوتا۔ معاملہ اگر برعکس ہو جائے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔''

''شاید مجھے خود پر بہت زیادہ اعتماد ہے۔''

''خیر! تمہارا اپائنٹمنٹ لیٹر تو ابھی بن جائے گا۔ تم کب سے ڈیوٹی جوائن کر سکتے ہو؟''

''جب سے آپ چاہیں۔''

''ضرورت تو مجھے فوری ہے۔''

''تو میں حاضر ہوں نا میڈم!''

''ویری گڈ!'' نگار خوش ہو گئی، پھر اس نے میز پر رکھے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملائے۔ دوسری طرف دو مرتبہ گھنٹی بجی، پھر ریسیور اٹھایا گیا اور ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ''یس؟''

[illegible] نگار بول [illegible] اسسٹنٹ مل گیا [illegible] ہے اور میرا [illegible] مرضی کے مطابق [illegible]

''مبارک ہو۔'' جواب آیا۔ ''تمہارا ڈیپارٹمنٹ، کمپنی کے دوسرے ڈیپارٹمنٹ سے ہمیشہ آگے رہا ہے۔ اب غالباً اور آگے بڑھے گا۔''

''یقیناً سر! آپ جانتے ہیں کہ مجھے اس کام سے دیوانگی کی حد تک عشق ہے۔''

''کام سے عشق ہی انسان کی ترقی کا سبب ہوتا ہے۔ خیر اور کچھ؟''

''نہیں سر! بس یہی اطلاع دینا تھی۔''

اس گفتگو کے بعد نگار نے ریسیور رکھ کر وقاص سے کہا۔ ''دفتر کا وقت ساڑھے چار بجے تک ہے لیکن میں کبھی ایک دو گھنٹے زیادہ بھی بیٹھ جاتی ہوں۔ اس صورت میں......''

''مجھے بھی رکنا پڑے گا۔'' وقاص مسکرا کر بول پڑا۔ ''میں رات بھر رک سکتا ہوں میڈم!''

''خیر اب اتنا بھی نہیں۔'' نگار کرسی سے اٹھی۔ ''اگر مجھے اس سے بھی زیادہ دیر ہو جائے تو میری بیٹی بہت ہلکان ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے میرے شوہر مجھ پر بہت

جھنجلاتے ہیں۔ خیال رکھنا پڑتا ہے مجھے...... آؤ!''

وہ وقاص کے ساتھ اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی جسے اس کا ''کمپیوٹر روم'' کہا جا سکتا تھا۔

''آپ کی بیٹی کتنی بڑی ہے میڈم؟'' وقاص نے پوچھا۔

''چار سال کی ہو چکی ہے۔''

''اوہ!'' وقاص کے انداز میں تعجب تھا۔

''کیوں؟'' نگار نے کمپیوٹر روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کی عمر میڈم! میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے بس تین سال بڑی ہوں گی۔''

نگار دھیرے سے ہنسی۔ ''میں تم سے چار سال بڑی ہوں۔ جب میں تئیس سال کی تھی تو میری شادی ہو گئی تھی...... بیٹھو!'' اس نے دوسرے کمپیوٹر کے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وقاص بیٹھ گیا۔ نگار نے اپنا کمپیوٹر کھولتے ہوئے وقاص کو بھی کمپیوٹر کھولنے کا اشارہ کیا۔

ایک بجے لنچ ٹائم ہوا تو وقاص کو اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا۔ وقاص نے اس پر ایسی اچٹتی سی نظر ڈالی جیسے وہ اس کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو۔ اپائنٹمنٹ لیٹر پر کمپنی کا نام لکھا تھا۔ ''ڈیٹا آرٹ'' [illegible] سوفٹ ویئر [illegible] کسٹم میڈ [illegible] ڈیولپر۔

نگار اس دن بہت خوش تھی۔ وقاص اس کی توقعات پر سو فیصد پورا اترا تھا۔ دفتر کا ٹائم ختم ہونے تک اس نے محسوس کیا کہ وہ جو پروگرام بنا رہی تھی، وہ اب جلد ہی پورا ہو جائے گا۔ شاید اس لیے اس دن ساڑھے چار بجے ہی دفتر چھوڑ دیا۔

جب وہ دفتر سے نکل رہی تھی تو وقاص بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس پروگرام کے بارے میں کچھ باتیں پوچھ رہا تھا جو نگار بنا رہی تھی۔

عمارت کے باہر رک کر نگار ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہو گئی...... شرجیل کو آ جانا چاہیے تھا۔''

''میں سمجھا نہیں میڈم!''

''شرجیل میرے شوہر ہیں وقاص! آج میری گاڑی کچھ خراب تھی۔ میں نے ان کو فون کر دیا تھا کہ مجھے لینے آ جائیں۔''

''اگر آپ برا نہ مانیں تو......''

''اوہ!'' نگار جلدی سے بول پڑی۔ ''آ گئی کار۔'' وہ دائیں جانب دیکھ رہی تھی۔ کار تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ وہ قریب آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اس کا شوہر شرجیل تھا۔ اس کے برابر کی سیٹ پر اس کی چار سالہ بیٹی صنوبر بیٹھی تھی۔

''کل وقت پر آ جانا وقاص!'' نگار نے کہا اور کار کا دروازہ کھولنے لگی۔

''میں وقت کا خیال رکھتا ہوں میڈم...... خدا حافظ!''

وقاص نے شرجیل کو سلام کیا۔ شرجیل نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ نگار کار میں بیٹھی۔ صنوبر کو اس نے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔ شرجیل کار حرکت میں لے آیا۔

''یہ نوجوان کون تھا نگار؟'' شرجیل نے پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا، مجھے ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ آج پانچ انٹرویوز کیے تھے۔ یہ نوجوان بہت مناسب ہے۔ وقاص نام ہے۔''

''ہوں۔'' شرجیل نے مزید استفسار کیا۔ ''خوب صورت نوجوان ہی ضروری تھا؟''

نگار نے چونک کر شرجیل کی طرف دیکھا۔ شرجیل نے لفظ ''خوبصورت'' پر بہت زور دیا تھا، تاہم اس نے بات سمجھ جانے کے باوجود تحمل سے جواب دیا۔ ''مجھے نہایت سمجھدار اسسٹنٹ کی ضرورت تھی اور پانچ انٹرویوز میں وقاص ہی سمجھدار ثابت ہوا۔''

''تمہیں خوبصورتی پسند بھی ہے۔'' شرجیل عجیب انداز میں ہنسا۔

نگار اس کی وجہ بھی سمجھ گئی۔ وہ شرجیل کے شکی مزاج سے اس طرح واقف تھی اور کچھ دوسری باتوں کو بھی خوب جانتی تھی لیکن انہیں زبان پر لانے سے گریز کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے سنی ان سنی کر دی اور اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی۔ ''تم آج چپ چپ کیوں ہو میری جان!''

صنوبر جواب دینے کے بجائے بسورنے لگی۔

''میں نے ڈانٹا تھا۔'' شرجیل بول پڑا۔

''کیوں؟ کوئی گڑبڑ......'' نگار کا جملہ پورا نہیں ہو سکا۔ شرجیل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''نئی گورنس پسند نہیں آ رہی ہے اسے...... ہاتھ اٹھا دیا تھا اس پر!''

''ارے!'' نگار نے صنوبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا حرکت کی تم نے؟''

''وہ اچھی نہیں ہے مما!'' صنوبر نے جواب دیا۔ ''پہلے والی...... اچھی تھی......''

پہلی گورنس کسی وجہ سے ملازمت چھوڑ گئی تھی۔ ''وہ جو پہلے تھی، وہ تو بوڑھی تھی صنوبر...... یہ جوان بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ یہ تو تمہارا بہت اچھی طرح خیال رکھے گی۔''

''نہیں۔'' صنوبر نے سر جھٹکا۔

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

"لیکن کسی پر ہاتھ اٹھانا بُری بات ہے میری جان...... اچھا خیر، دو ایک دن میں کچھ اور بندوبست کر دوں گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" شرجیل بگڑ کر بولا۔ "اس کی ہر ضد پوری کرو گی تو ابھی سے اس کا دماغ خراب ہو جائے گا۔ سمجھاؤ اس کو۔ گورنس نہیں بدلے گی۔" شرجیل کا آخری فقرہ ایسا تھا جیسے اس نے فیصلہ سنایا ہو۔

نگار خاموش ہو گئی۔ وہ بہت تحمل سے کام لیتے ہوئے شرجیل سے سمجھوتا کیے ہوئے تھی۔ شادی کے دو سال بعد ہی اس کے علم میں آنا شروع ہو گیا تھا کہ شرجیل کے تعلقات کئی لڑکیوں سے تھے۔ وہ تلملا کر رہ گئی تھی۔ اگر صنوبر پیدا نہ ہو چکی ہوتی تو وہ یقینی طور پر شرجیل سے طلاق کا مطالبہ کر دیتی یا پھر خلع حاصل کرتی لیکن اپنی بچی کے مستقبل کے پیشِ نظر وہ اس صورتِ حال سے سمجھوتا کرتی رہی۔ شرجیل وہ سب کچھ نگار سے چھپ کر ہی کرتا تھا اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ نگار بالکل بے خبر تھی۔ خود نگار نے بھی اس سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس طرح اس نے سمجھ داری کا ثبوت دیا تھا۔ اگر ایک بار بھی آمنے سامنے بات ہو جاتی تو شرجیل کی جھجک بھی ختم ہو جاتی۔ وہ اس کے سینے پر ہی مونگ دلنا شروع کر دیتا۔ ممکن تھا کہ وہ کبھی کبھی کسی لڑکی کو گھر بھی بلا لیا کرتا۔

اب اس نے صنوبر کے لیے ایک نوجوان خوبصورت لڑکی کو گورنس رکھا تھا۔ اس پر نگار کھٹکی تو تھی لیکن اب اسے یقین ہو گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہی ہے۔ وہ صنوبر کی ناپسندیدگی کے باوجود اسی گورنس کو رکھنے پر اصرار کر رہا تھا جس کا نام شفیقہ تھا۔

نگار نے جواباً کچھ نہیں کہا اور صنوبر کو شانے سے لپٹا کر تھپکنے لگی، البتہ اس کا دماغ ضرور کام کر رہا تھا۔ اس کی یہ کوشش ناکام ہی رہی تھی کہ شرجیل باہر کچھ بھی کرتا پھرے، گھر کا ماحول خراب نہ ہو لیکن آخر کار ایسا ہو کر ہی رہا تھا۔ یہ وہ کبھی سوچ ہی نہیں سکی تھی کہ شرجیل نے معمولی لڑکیوں سے بھی تعلقات رکھے ہوں گے۔ گورنس کی حیثیت سے ملازمت کرنے والی لڑکیاں کسی کھاتے پیتے گھرانوں کی نہیں ہوتیں۔

شفیقہ آئی بھی بہت سج دھج کر تھی، تیز قسم کی خوشبوئیں بھی اس کے لباس میں رچی بسی ہوئی تھیں...... اس وقت نگار نے اس "نزاکت" کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا جو اس کی غلطی تھی۔

کار جب گھر کے قریب پہنچنے لگی تو شرجیل بولا۔ "یہ کیا سو گئی؟" اس کا اشارہ صنوبر کی طرف تھا۔

"ہوں۔" نگار نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"تو میں شفیقہ کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ اٹھا کر لے جائے گی اسے اوپر!...... دراصل میں تو تمہیں اتار کر فوراً چلا جاؤں گا۔ کسی سے ملنا ہے۔"

"آپ چلے جائیے گا۔ صنوبر کو میں لے جاؤں گی۔ زینے تو طے نہیں کرنے۔ لفٹ میں ہی جاؤں گی اوپر۔ میں اتنی کمزور نہیں ہوں کہ اس کا بوجھ اتنی دیر بھی نہ اٹھا سکوں۔"

"جیسی تمہاری مرضی...... اور ہاں! میں نے گیراج فون کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ تمہاری کار ٹھیک ہو گئی ہے۔ وہ پہنچا دے گا گھر۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ چابی گھر میں ملازمہ کو یا شفیقہ کو دے دے۔ شاید وہ دے کر جا چکا ہو۔"

نگار نے پھر سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

شرجیل نے کار اپارٹمنٹس کے پھاٹک پر ہی روک دی، پارکنگ شیڈ میں نہیں لے گیا۔ صنوبر کو شانے سے لگائے نگار کار سے اترنے لگی۔

"میں کھانے کے وقت تک آ جاؤں گا۔" شرجیل نے کہا۔

اب بھی نگار نے صرف سر ہی ہلایا تھا۔ کار سے اتر کر اس نے دروازہ بند کیا اور اپارٹمنٹ کی طرف مڑ گئی۔ شرجیل بھی کار فوراً ہی حرکت میں لے آیا تھا۔ نگار نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

اپارٹمنٹ دوسری منزل پر تھا۔ نگار لفٹ سے اوپر پہنچی۔ اندر سے اپارٹمنٹ کا دروازہ [illegible] ملازمہ [illegible] جو عمر [illegible] آیا کرتی تھی اور [illegible] کے بعد واپس جاتی تھی۔

ملازمہ کے بعد نگار کا سامنا شفیقہ سے ہوا۔

"بے بی کو مجھے دے دیجیے میڈم!"

"ضرورت نہیں ہے۔" نگار نے خشک لہجے میں کہا۔ "تم سے طے بھی یہی ہوا تھا کہ میں جب دفتر سے آؤں گی تو تم چلی جایا کرو گی۔"

"بے بی کو بیڈروم تک تو پہنچا دوں!"

"جب میں اسے اوپر تک لے آئی ہوں تو بیڈروم تک نہیں لے جا سکتی؟ میں نے کہا نا، بس اب تم جاؤ...... ملازمہ سے کہہ دینا کہ دروازہ بولٹ کر لے۔"

"جی...... بہتر۔" شفیقہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔

نگار بیڈروم میں پہنچی اور صنوبر کو بستر پر لٹایا۔ پھر یکایک چونک سی گئی۔ اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی ہو، پھر یکایک اس کے چہرے پر شدید غصے کی سرخی پھیل گئی۔ اس نے صنوبر کو بستر

سے اٹھایا اور تیزی سے چلتی ہوئی بیڈروم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ اس نے صنوبر کو ایک صوفے پر لٹایا اور ٹہلنے لگی۔ اس کے دماغ میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ وہ اس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی اور بہ مشکل خود کو نارمل کر سکی۔

☆☆☆

کھانے کی میز پر شرجیل بھی تھا لیکن نگار کی توجہ صنوبر کی طرف تھی جسے اس نے اپنے برابر کی کرسی پر بٹھایا ہوا تھا۔ وہ خود بھی کھا رہی تھی اور صنوبر کو بھی کھلا رہی تھی۔

"تمہاری گاڑی آ گئی؟" شرجیل نے پوچھا۔

"ہاں۔" نگار نے جواب دیا۔ "چابی دے دی ہے مجھے ملازمہ نے۔"

ایسی ہی رسمی باتوں میں کھانا ختم ہو گیا۔

اس رات شرجیل جب خواب گاہ میں جا کر لیٹا تو دس منٹ بعد ہی اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ خواب گاہ میں آتا تھا تو دو چار منٹ میں ہی نگار بھی آ جاتی تھی بلکہ زیادہ تر تو ساتھ ہی آتی تھی لیکن اس رات دس منٹ گزر جانے کے بعد بھی نگار نہیں آئی تھی۔

وہ تو اس وقت ڈرائنگ روم میں تھی اور وہ بھی اس عالم میں کہ اس نے دو صوفے ایک دوسرے سے ملا لیے تھے اور اسی پر لیٹ گئی تھی۔ صنوبر کو بھی اس نے اپنے ساتھ لٹا لیا تھا۔ اس عجیب تبدیلی پر صنوبر نے سوالات تو کیے تھے لیکن نگار نے اسے [illegible] طرح بہلا لیا تھا۔ [illegible] بعد ہی [illegible] عادت تھی کھانے کے بعد جلدی سو جانے کی، لیکن نگار جاگتی رہی۔ مختلف النوع خیالات کا ریلا اس کے دماغ میں چل رہا تھا۔

آہٹ سن کر اس نے اندرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہنے شرجیل اندر آیا تھا۔ نگار اٹھ بیٹھی لیکن اس نے شرجیل سے نظریں نہیں ملائیں۔

"یہ سب کیا ہے؟" شرجیل نے حیرت کا اظہار کیا۔ "کمرے میں نہیں آؤ گی؟"

"آج تو نہیں آؤں گی۔" نگار نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیوں؟ آج کیا ہوا؟"

"کل میں دفتر سے جلدی آ جاؤں گی۔ بستر تبدیل کرواؤں گی۔"

"کیوں؟ اس بستر میں کیا ہو گیا؟"

"بو آئی تھی آج مجھے اس بستر سے۔" نگار کی نظریں جھکی رہیں۔

"کیا مطلب؟"

"کسی اجنبی جسم کی بو۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم!" شرجیل کے لہجے میں تیزی آ گئی۔

"پلیز شرجیل! بات زیادہ آگے نہ بڑھائیے۔ میں بہت عرصے سے طرح دیتی آ رہی ہوں۔ نہیں چاہتی کہ بات بڑھے۔ میں بچی نہیں ہوں کہ کچھ نہ سمجھ سکوں۔ آپ جو زندگی گزار رہے ہیں، گزارتے رہیے لیکن وہ سب کچھ میں اپنی آنکھوں کے سامنے برداشت نہیں کر سکتی۔"

"کیا ہوا ہے تمہاری آنکھوں کے سامنے؟" شرجیل کے لہجے کی تیزی میں اضافہ ہوا۔

"جو بو آج بستر سے آ رہی تھی، اس نے مجھے سارا منظر دکھا دیا ہے۔ میری آنکھوں نے وہ سب کچھ دیکھ لیا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"پلیز شرجیل! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

"گو ٹو......" شرجیل نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا اور مڑ کر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

"میں تو ہوں ہی جہنم میں۔" نگار زیرِ لب بڑبڑائی۔ "اب یہاں سے کس جہنم میں جاؤں گی۔"

وہ لیٹ گئی......

دوسری صبح شرجیل سے اس کا سامنا ناشتے کی میز پر ہوا، لیکن ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں ہوئی...... ناشتے کے بعد شرجیل اپنے دفتر چلا گیا۔

نگار اپنی بچی کے ساتھ اپنی کار میں جا بیٹھی۔ یہ اس کا معمول تھا۔ صنوبر کو اسکول چھوڑنے وہ خود جاتی تھی۔ اسے چھوڑ کر اپنے دفتر کا رخ کرتی تھی۔ صنوبر کی اسکول سے گھر واپسی اسکول بس سے ہوتی تھی۔

"وہ تو...... آج بھی آئے گی نا مما!" راستے میں صنوبر بولی۔

"کون؟" نگار اپنے خیالات سے چونکی، پھر فوراً ہی بولی۔ "اچھا وہ؟ تمہاری نئی گورنس؟" صنوبر نے سر ہلا دیا۔

"نہیں۔" نگار نے کہا۔ "اس کی فکر نہ کرو میری جان! آج میں خود اسکول آؤں گی تمہیں لینے۔ تم میرے ساتھ گھر چلو گی۔ تمہاری اس گورنس کو میں آج ہی چھٹی دے دوں گی۔" صنوبر خوش ہو گئی۔

اسے اسکول چھوڑ کر نگار اپنے دفتر روانہ ہوئی۔ جو خیالات گزشتہ روز سے اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے، ان کا سلسلہ بس اسی وقت ٹوٹا تھا جب رات گئے اسے

http://urdutubes.com/

نیند آئی تھی۔ صبح بیدار ہوتے ہی ان خیالات کی گردش پھر شروع ہوگئی تھی اور وہ سلسلہ اس وقت بھی جاری تھا۔

جب وہ اپنے دفتر کی عمارت میں داخل ہورہی تھی تو اس کا سامنا دفتر ہی کے ایک ڈیپارٹمنٹ کے انچارج رفیع سے ہوگیا۔

''ہیلو مسز نگار!'' وہ بولا۔

''ہیلو!'' نگار نے اپنے ذہنی انتشار کے باوجود مسکرانے کی کوشش کی۔ ''کیسا چل رہا ہے آپ کا ڈیپارٹمنٹ؟''

''فرسٹ کلاس۔'' رفیع نے جواب دیا، پھر فوراً ہی بولا۔ ''آپ کا نیا اسسٹنٹ آپ سے پہلے پہنچ چکا ہے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اسے ملازمت کرنے کی ضرورت کیوں ہے۔''

بات ایسی تھی کہ نگار آگے قدم بڑھاتے بڑھاتے رک گئی۔ ''یہ کیا بات ہوئی رفیع صاحب؟ آج کل تو قحط ہے ملازمتوں کا!''

''لیکن آپ کا ماتحت تو کسی آسودہ گھر کا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا دیر پہلے ہی دیکھا تھا میں نے اسے۔ خاصی قیمتی کار میں آیا ہے وہ......! اگر وہ کار اس کے کسی جاننے والے کی ہوتی تو وہ اسے چھوڑ کر کار واپس لے جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آپ کا ماتحت اکیلا ہی تھا کار میں۔ خود ہی ڈرائیو کررہا تھا۔ کار پارکنگ شیڈ میں کھڑی کردی ہے۔''

''اچھا! میں نے اس سے اس کے بارے میں کوئی غیر ضروری پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ شکریہ کہ آپ نے مجھے آگاہ کیا۔ اچھا، پھر ملیں گے۔''

رفیع نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ نگار آگے بڑھ گئی۔ اس کے ذہنی انتشار میں ایک خلش اور بڑھ گئی تھی۔ یہ سوال غور طلب تو تھا کہ ایک آسودہ حال نوجوان نے یہ ملازمت کیوں کی ہے؟

وہ اپنے کمرے میں پہنچی۔ وقاص اس کا منتظر تھا۔ اس نے کھڑے ہوکر نگار کو سلام کیا۔ نگار نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، پھر بولی۔ ''فوراً کام شروع کردیا جائے۔ آج مجھے جلدی بھی جانا ہے۔''

''جی، بہتر......''

''ایک بات بتاؤ وقاص!'' نگار نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر کمپیوٹر کھولتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ ملازمت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

چند لمحوں کے لیے وقاص کا چہرہ اس طرح سنجیدہ ہوگیا جیسے وہ سوچنے لگا ہو کہ یہ سوال کیوں کیا گیا ہے، پھر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''کیا آپ نے میری کار دیکھ لی ہے میڈم؟''

اب نگار نے کمپیوٹر کی اسکرین سے نظر ہٹا کر وقاص کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''میں نے تو نہیں دیکھا لیکن کسی نے مجھے بتایا ہے کہ تم ایک قیمتی کار میں آئے ہو اور وہ غالباً تمہاری ہی ہے۔''

''جی ہاں میڈم! وہ میری ہی ہے۔ میرے والد ایک بڑے بزنس مین ہیں۔''

''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''آپ نے مجھ سے ایسا کوئی سوال ہی نہیں کیا تھا میڈم، ورنہ میں آپ کو بتا دیتا۔ یہ ایسی کوئی بات ہی نہیں جو میں آپ سے چھپاتا، بلکہ کل جب ہم دفتر سے نکلے تھے اور اس وقت تک آپ کے شوہر کار لے کر نہیں آئے تھے جس کا آپ نے اظہار بھی کیا تھا، اسی وقت میں نے آپ سے کہا تھا کہ اگر آپ برا نہ مانیں تو...... لیکن میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی آپ کی کار آگئی تھی۔ آپ بول پڑی تھیں اور میرا جملہ پورا نہیں ہوسکا تھا۔ میرا پورا جملہ یہ ہوتا میڈم کہ اگر آپ برا نہ مانیں تو میری کار حاضر ہے۔''

''ہوں۔'' نگار نے سر ہلایا۔ ''مجھے یاد آرہا ہے۔ تم نے ایسی کوئی بات کہی تو تھی۔ بہرحال! ایسی صورت میں میرا سوال غلط [illegible] ہے کہ تمہیں ملازمت کرنے کی [illegible]''

''میں [illegible] یہاں اس لیے نہیں [illegible] ضرورت ہے۔ میں یہاں بس آپ کا شاگرد بننے کے لیے آیا تھا۔ مجھے جنون کی حد تک یہ شوق ہے کہ میں کمپیوٹر کے بارے میں سب کچھ جان لوں یا جتنا زیادہ جان سکتا ہوں، جان لوں۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کہ مجھے کمپیوٹر کے معاملے میں خاصی مہارت ہے لیکن میں اس سے کہیں زیادہ ماہر بننا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کے ادارے کی بہت شہرت سنی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس ادارے کی اتنی زیادہ کامیابی کا سبب آپ ہیں۔ اسی لیے جب میں نے اخبار میں آپ کے ادارے کا اشتہار دیکھا جو ملازمت ہی کے سلسلے میں تھا تو میں نے فوراً درخواست بھیج دی۔'' وقاص نے وضاحت سے جواب دیا۔

نگار نے فوراً کہا۔ ''وہ اشتہار ادارے کی طرف سے تھا، میری طرف سے نہیں۔''

''جی ہاں۔'' وقاص نے جواب دیا۔ ''میں نے سوچا تھا کہ اگر مجھے اس ادارے میں قدم رکھنے کا موقع مل گیا تو میں کسی نہ کسی طرح آپ تک رسائی حاصل کرہی لوں گا۔''

وقاص کے جوابات اتنے بے ساختہ اور صاف تھے کہ ان پر شبہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یہی نگار نے بھی محسوس کیا اور مسکرائی۔ ''ٹھیک ہے۔ اب میں مطمئن ہوگئی۔ جب مجھے تمہاری کار کے بارے میں معلوم ہوا تھا تو کچھ الجھن میں پڑ گئی تھی۔''

''آپ نے درخواست میں میرے گھر کے پتے پر غالباً توجہ نہیں دی ہوگی ورنہ آپ اسی وقت سمجھ جاتیں کہ میرا تعلق کس قسم کے گھرانے سے ہے۔ پتا اس علاقے کا ہے جہاں غریب تو کیا، متوسط درجے کے لوگ بھی نہیں رہ سکتے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم یقیناً میں نے تمہارے گھر کے پتے پر توجہ نہیں دی ہوگی۔ خیر، اب یہ باتیں پھر کبھی فرصت میں سہی۔ ابھی تو کام شروع کردینا چاہیے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ آج میں جلد ہی اٹھ جاؤں گی۔ اچانک ایک ضروری کام نکل آیا ہے۔ تم نے ابھی تک اپنا کمپیوٹر نہیں کھولا۔''

''سوری میڈم! آپ کے سوالات میں الجھ گیا تھا۔ خیال ہی نہیں رہا۔'' وقاص نے جواب دیتے ہوئے اپنا کمپیوٹر کھولا۔

''کل دفتر چھوڑنے سے پہلے ہی میں نے تمہارے کمپیوٹر کو ایک فائل دی تھی، ڈی تھرٹین کے نام سے...... وہ کھولو۔''

''[illegible]'' [illegible] کام [illegible] ضرور [illegible] ہو [illegible] لیکن جلد ہی نگار کو محسوس ہوگیا کہ کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ [illegible] باتیں کرتے ہوئے اس کا دماغ کچھ ہلکا ہوا تھا لیکن اب پھر بھاری ہوگیا تھا۔ جو خیالات گزشتہ شام سے اس کے دماغ میں چکراتے رہے تھے، وہی پھر امنڈنے لگے تھے۔ ایسی حالت میں کام کرتے ہوئے اس سے کوئی ایسی غلطی بھی ہوسکتی تھی جو اب تک کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر اپنا کمپیوٹر بند کردیا۔

وقاص نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''آج مجھ سے کچھ نہیں ہوگا وقاص!''

''آپ خاصی پریشان معلوم ہورہی ہیں۔'' وقاص بولا۔

''چلو کچھ اپنے بارے میں بھی اور بتاؤ۔'' نگار اس کی بات ٹال گئی۔ ''باتوں ہی میں کچھ وقت گزرے۔ جہاں مجھے جانا ہے، اس وقت میں ابھی دیر ہے۔ تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟''

وقاص نے ایک بڑی ٹیکسٹائل مل کا نام بتاتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہماری ہی ہے میڈم!''

''گڈ!'' نگار نے سر ہلایا۔ ''تم کتنے بہن بھائی ہو؟''

''میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں، البتہ ایک چچازاد بہن ہے جو ہمارے ساتھ ہی رہتی ہے۔ غزالہ نام ہے اس کا۔''

''گویا خاصے لوگ رہتے ہیں تمہارے گھر میں!''

''جی نہیں میڈم! بس میرے والدین ہیں یا غزالہ۔ ہم کُل چار افراد ہیں۔''

''ارے! تو تمہارے چچا وغیرہ؟''

''وہ نہیں ہیں میڈم! غزالہ صرف ایک سال کی تھی جب اس کے والدین ایک حادثے کا شکار ہوکر دنیا سے چل بسے تھے۔ کار ایکسیڈنٹ تھا۔ یہ معجزہ ہی کہنا چاہیے کہ غزالہ کو اس حادثے میں بس کچھ خراشیں ہی آئی تھیں۔''

''اوہ! یہ ٹریجڈی ہوچکی ہے تمہارے گھرانے میں؟''

''جی میڈم! غزالہ نے میری والدہ کی گود میں پرورش پائی ہے۔''

''کیا عمر ہے اس کی؟'' نگار بس وقت گزار رہی تھی۔

''مجھ سے چار سال چھوٹی ہے۔ اسی سال اس نے تھرڈ ایئر کا امتحان دیا ہے۔'' وقاص نے بتایا۔ ''وہ میری یہاں کی مصروفیت سے بہت بور ہے۔''

''کیوں؟''

''دراصل میری والدہ اب نہ صرف تنہائی پسند ہوگئی ہیں بلکہ ان کا رجحان عبادت گزاری کی طرف بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ زیادہ تر مصلے ہی پر ہوتی ہیں۔ کمرے سے بہت کم باہر نکلتی ہیں۔ غزالہ کو بس میری کمپنی مل جاتی تھی جو کل سے نہیں رہی۔ کل سے وہ تنہائی کا شکار ہوگئی ہے۔ آج تو کالج جانے سے پہلے مجھ سے لڑی بھی تھی کہ میں اپنی یہ مصروفیت ختم کروں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے کالج کی لڑکیوں سے دوستی بڑھائے۔ انہیں گھر بلا لیا کرے لیکن وہ......'' وقاص مسکرایا۔ ''منہ پھلائے کالج چلی گئی۔''

''اب مناؤ گے اسے؟'' نگار خفیف سا مسکرائی۔

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی میڈم!...... اس کا موڈ وقتی طور پر خراب ہوتا ہے۔ وہ کالج کی لڑکیوں سے دوستی بڑھا لے گی تو اس کے لیے یہ مسئلہ نہیں رہے گا۔ لڑکیاں آتی رہا کریں گی۔ وہ خود بھی ان کے گھر جاسکتی ہے۔ کار تو ڈیڈی نے اسے بھی دلا دی ہے۔ مزاج کی وہ اچھی ہے میڈم! کبھی اس سے ملیے گا۔ اگر میں آپ کو چائے پر مدعو کروں تو آپ آنا پسند کریں گی؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں وقاص!...... اگر تمہارا تعلق کسی معمولی گھر سے ہوتا تب بھی تمہارے مدعو کرنے پر میں ضرور

http://urdutubes.com/

آتی۔ طبقاتی اونچ نیچ میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔"
"تو اب کے اتوار کی شام......"
"نہیں۔" نگار نے اس کی بات کاٹی۔" ابھی کوئی وعدہ نہ لو۔ دراصل کل سے میں ایک پریشانی میں پڑ گئی ہوں۔ اس پریشانی سے نکلنے میں کتنے دن لگ جائیں گے، اس کا مجھے ابھی اندازہ نہیں ہے۔"
"اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں تو حاضر ہوں۔"
"نہیں وقاص! وہ میرا بہت نجی معاملہ ہے۔"
"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"
نگار نے گھڑی دیکھی۔ ان باتوں میں کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اور صنوبر کی چھٹی کا وقت ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ باتوں میں اتنا وقت گزارنا ممکن نہیں تھا اور وہ اس خیال سے کام بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ کسی قسم کی گڑبڑ ہوجانے کا اندیشہ تھا۔
اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال آیا اور اس نے وقاص سے کہا۔" اب چھٹی ہی کردو وقاص!...... مجھے ایک اور کام بھی یاد آگیا ہے، وہ بھی کرڈالوں۔"
اس نے وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔
دفتر چھوڑنے سے پہلے اس نے ادارے کے مالک کو فون پر بتادیا کہ اچانک اسے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے اس لیے وہ دفتر سے جارہی ہے۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے بعد وہ صنوبر کے اسکول کی پرنسپل کے کمرے میں تھی۔
"خیریت مسز شرجیل!" پرنسپل اسے جانتی تھی۔" کیا صنوبر کے سلسلے میں اسکول سے کوئی شکایت؟"
"ارے نہیں۔" نگار بہت دھیرے سے ہنسی۔ "اچانک مجھے خاندان میں کہیں جانا پڑ رہا ہے اور ضروری ہے کہ میں صنوبر کو بھی ساتھ لے جاؤں۔"
"ہاں ہاں، ضروری ہے تو لے جایئے...... میں ابھی کسی کو بھیج کر اسے کلاس سے بلواتی ہوں۔"
پندرہ منٹ بعد نگار صنوبر کو کار میں اپنے ساتھ لے جارہی تھی۔
صنوبر بہت خوش تھی۔" اتنی جلدی چھٹی مما!"
"ہاں میری جان! تمہاری نئی گورنس کا بندوبست کرنا ہے نا!"
ذرا دیر بعد ہی نگار نے اپنی کار ایک بنگلے کے برآمدے کے سامنے روکی۔ یہ اس کی ایک پرانی دوست عارفہ کا گھر تھا۔ دفتر سے چلتے وقت اس نے عارفہ کو بھی فون کردیا تھا کہ وہ گھنٹا بھر میں اس سے ملنے آرہی ہے۔ اسی لیے جب اس کی کار رکی تو عارفہ برآمدے میں کھڑی اس کا انتظار کررہی تھی۔
"اس وقت بہت ہی غیر متوقع ہے تمہاری آمد۔" عارفہ گرم جوشی سے ملتے ہوئے بولی اور نگار کے کچھ کہنے سے پہلے اس نے صنوبر کو اپنی گود میں اٹھالیا۔" کیسی ہو بے بی؟"
نگار کا وہاں آنا جانا رہتا تھا اس لیے عارفہ سے صنوبر مانوس ہوچکی تھی۔
"میں اسی کے سلسلے میں تم سے ملنے آئی ہوں۔" نگار نے صنوبر کی طرف اشارہ کیا۔
"اسے کیا ہوگیا؟" عارفہ نے صنوبر کے گال پر پیار کرتے ہوئے کہا اور پھر گود سے اتارتے ہوئے بولی۔ "چلو، اندر تو چلو......"
ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھنے کے بعد نگار نے پوچھا۔" وہ گورنس کہاں ہے جو تم نے شمسہ کے لیے رکھی ہے؟"
شمسہ، عارفہ کی بیٹی کا نام تھا۔
"کیوں!" عارفہ ہنس دی۔" اس سے کیا کام پڑ گیا تمہیں؟"
"دراصل صنوبر کی پرانی گورنس تو ملازمت چھوڑ گئی ہے۔ اب دوسری گورنس کی ضرورت [illegible] شمسہ کی [illegible]
[illegible] لیے کوئی عورت [illegible] نا تو چا [illegible]
[illegible] بارے میں سوچ ہی رہی تھی۔ دراصل مجھے تو شمسہ کے لیے گورنس کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ ہر وقت گھر میں رہتی ہوں۔ وہ تو چھ ماہ کے لیے آٹھ دس سسرالی آگئے تھے لندن سے۔ ان کی وجہ سے میں شمسہ پر پوری توجہ نہیں دے پاتی تھی اس لیے رکھ لی تھی وہ گورنس۔ لندن والے سب لوگ پرسوں واپس چلے گئے ہیں۔ میں مہینا مکمل ہونے پر اس کی چھٹی کردیتی۔"
"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ میں یہی چاہتی تھی کہ جلد از جلد کوئی بندوبست ہوجائے۔"
نگار کا کیونکہ عارفہ کے گھر آنا جانا رہتا تھا اس لیے صنوبر بھی شمسہ کی گورنس سے کسی حد تک مانوس ہوچکی تھی۔
عارفہ نے اسی وقت گورنس کو بلا کر اسے معاملے سے آگاہ کیا۔ شمسہ اسکول گئی ہوئی تھی لیکن گورنس رہتی ہی عارفہ کے گھر میں تھی۔ اس پینتالیس سالہ بیوہ کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ عارفہ اسے زلیخا بائی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔
اس عورت کے قیام کا معاملہ نگار کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے جو کمرا ملازمہ کو دے رکھا تھا، اسی میں زلیخا بائی

بھی رہ سکتی تھی۔ معاملات طے ہوجانے کے بعد نگار نے اس سے کہا۔" میں ابھی تمہیں اپنے ساتھ ہی لے چلوں گی۔ تم اپنا سامان ٹھیک کرلو۔"
"سامان کیا ہے بیگم صاحبہ! بس کپڑوں کا چھوٹا سا صندوق اور ایک بستر ہے۔" زلیخا بائی نے جواب دیا۔
"لیکن۔" عارفہ بولی۔" اب تم کھانا کھا کر ہی جانا۔"
"شمسہ کے اسکول سے آنے کے بعد ہی کھانا کھاتی ہوگی تم!"
"ہاں۔ کیا تم جلدی کھانے کی عادی ہو؟"
"عادت کو چھوڑو۔ میں بھی اسی وقت کھالوں گی جب شمسہ آجائے گی لیکن ابھی اس میں خاصا وقت ہے۔ مجھے ایک کام ہے۔ وہ کرکے میں آتی ہوں ایک دو گھنٹے میں......" پھر اس نے صنوبر سے کہا۔" تم یہیں رہو۔ زلیخا بائی کے ساتھ۔ میں آتی ہوں تھوڑی دیر میں۔"
"کہاں جارہی ایں مما!"
"ایک کام ہے۔ تم زلیخا بائی کے ساتھ رہنا۔ ٹھیک ہے؟" نگار نے صنوبر کو پیار کیا۔
صنوبر خوشی خوشی زلیخا بائی کے ساتھ رہ گئی اور نگار وہاں سے روانہ ہوگئی۔
[illegible] گھنٹے لگ گئے۔ اس [illegible]
[illegible] اور پرانا بیڈ [illegible] دیا۔ [illegible]
ہدایت کردی کہ وہ بستر پر نئی چادر بچھادے اور تکیوں پر غلاف بھی نئے چڑھائے۔
پھر وہ واپس عارفہ کے گھر پہنچ گئی۔ کچھ وقت باتوں میں گزرا۔ شمسہ کے آنے پر کھانا کھایا گیا۔ اس کے بعد نگار وہاں سے روانگی کے لیے کار اسٹارٹ کررہی تھی کہ شرجیل کا فون آگیا۔
"کہاں ہو تم؟" شرجیل کا لہجہ درشت تھا۔" صنوبر کو لے کر کہاں گھومتی پھر رہی ہو؟"
"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" نگار نے سکون سے پوچھا۔
"شفیقہ کا فون آیا تھا۔ وہ گھر پہنچ گئی ہے۔ اسی نے بتایا کہ صنوبر ابھی تک اسکول سے نہیں آئی۔ میں نے اسکول فون کیا تو معلوم ہوا کہ اسے تم لے گئی ہو اسکول سے اور وہ بھی کئی گھنٹے پہلے۔"
"ہاں۔ اسے لے کر میں اپنی ایک دوست کے گھر چلی گئی تھی۔ کچھ بات کرنی تھی اس سے۔ اس نے کھانے کے لیے روک لیا۔ اسی میں دیر ہوگئی۔"
"صنوبر کو اسکول سے لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟"
"شام کو آپ دفتر سے لوٹیں گے تو بتادوں گی۔"
دوسری طرف سے اس طرح سلسلہ منقطع ہوا جیسے جھنجلاہٹ میں بند کیا گیا ہو۔
نگار نے پروا نہیں کی اور کار اسٹارٹ کی۔ زلیخا بائی کو اس نے برابر کی سیٹ پر بٹھالیا تھا۔ صنوبر اس کی گود میں تھی۔
جب وہ گھر پہنچی تو حسب معمول ملازمہ ہی نے دروازہ کھولا۔ داخل ہوتے وقت صنوبر، زلیخا بائی کی گود میں تھی۔
شفیقہ لپکتی ہوئی قریب آئی۔" ارے میڈم! میں تو پریشان ہوگئی تھی۔" ساتھ ہی اس نے صنوبر کو زلیخا بائی کی گود سے لینے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے۔
"اب اسے چھونا بھی نہیں۔" نگار نے ڈپٹ کر کہا۔
شفیقہ ٹھٹک گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔
نگار نے زلیخا بائی سے کہا۔" بے بی کو میرے کمرے میں لے جاؤ۔ اس کے کپڑے بدلواؤ۔" پھر اس نے ملازمہ کو ہدایت کی کہ وہ زلیخا بائی کی راہنمائی کرے۔
جب وہ دونوں چلی گئیں تو نگار نے اپنے پرس سے کچھ نوٹ نکال کر شفیقہ کی طرف بڑھائے۔" آج تمہارا دوسرا ہی دن ہے لیکن یہ تمہاری ایک ماہ کی تنخواہ ہے۔"
"آپ مجھے الگ کررہی ہیں۔" شفیقہ نے نوٹ لیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔" لیکن میرا قصور کیا ہے میڈم!"
[illegible] جواب میں اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید [illegible] شفیقہ لڑکھڑا گئی۔
"آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا میڈم کہ آپ مجھ پر ہاتھ اٹھائیں!" شفیقہ تیز لہجے میں بولی۔
"جی تو یہ چاہ رہا ہے کہ تمہاری چمڑی ادھیڑ ڈالوں۔" نگار نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔" کسی طوائف کو میرے گھر میں نہیں رہنا چاہیے۔ بس اب دفع ہوجاؤ یہاں سے!"
"آپ مجھ پر سنگین الزام لگا رہی ہیں۔" شفیقہ کے لہجے کی تیزی برقرار رہی۔
"الزام!" نگار نے دانت پیسے۔" یہ الزام تم نے کل میرے بستر پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ تم جو یہ تیز قسم کی گھٹیا خوشبو لگاتی ہو، میں نے کبھی نہیں لگائی لیکن کل یہ بو میرے بستر میں تھی۔ کل میرا بستر گندا کیا ہے تم نے۔"
شفیقہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔
"بس، اب چلی جاؤ یا کچھ اور بھی سننا چاہتی ہو۔" نگار نے کہا اور مڑ کر تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں پہنچی۔ اس نے دیکھا کہ صنوبر کے کپڑے تبدیل کیے جاچکے تھے۔ زلیخا بائی خاصی پھرتیلی

http://urdutubes.com/

ثابت ہوئی تھی۔

''گڈ!'' غصے میں ہونے کے باوجود نگار نے زلیخا بائی کو داد دی۔

''یہ تو بہت اچھی ہیں مما!'' صنوبر بولی۔

''ہوں۔'' نگار نے اسے پیار کیا، پھر زلیخا بائی سے کہا۔ ''عارفہ نے بتایا تھا کہ تم کچھ پڑھی لکھی بھی ہو۔ یہ بھی دیکھ لیا کرو کہ صنوبر اسکول میں کیا کر کے آتی ہے۔ اسکول تو وہ بہت اچھا ہے۔''

''جی، میں نے سوچ لیا تھا بیگم صاحبہ!''

اسی وقت نگار کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ اسکرین پر شرجیل کا نام چمک رہا تھا۔

''ہیلو!'' اس نے کال ریسیو کی۔

''تو نکال ہی دیا تم نے اسے!'' شرجیل کی غصیلی آواز آئی۔

''اوہ!'' نگار کے منہ سے نکلا اور پھر وہ تیزی سے چلتی ہوئی خواب گاہ سے نکل آئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ زلیخا بائی کے سامنے شرجیل سے اس موضوع پر بات کرے۔

''ہیلو!'' نگار کی خاموشی پر شرجیل کی غراہٹ سنائی دی۔

''سن رہی ہوں۔'' نگار نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بڑی پھرتی دکھائی اس نے...... یہاں سے نکلتے نکلتے ہی آپ کو فون کر کے فریاد کی ہوگی۔ اسی لیے آپ اتنی جلدی میں جواب طلب کر رہے ہیں۔''

''تم نے میری بات نہیں مانی۔ صنوبر کا دماغ خراب کر کے رہو گی تم!''

''بات صنوبر کی بھی ہے لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ آئے دن مجھے اپنا بستر بھی تبدیل کرنا پڑے۔ آج ہی سب خریداری کی ہے میں نے۔ دوسرا بیڈ خریدا ہے۔ چادر بھی تبدیل کروائی ہے۔ میں نہیں کر سکتی یہ سب کچھ آئے دن۔''

''تو اب آج سزا کے لیے بھی تیار رہو۔'' شرجیل نے کہا۔ ''اور سزا یہ ہے کہ آج میں گھر نہیں آؤں گا۔''

''شفیقہ کے ساتھ گزارو گے رات؟ خیر...... پہلے دن میں ہی گزارتے رہے ہو۔ اب بات کھل گئی ہے تو تم اور زیادہ کھل کر کھیلو گے۔''

''یہ اندازِ گفتگو کیا ہے۔'' شرجیل غصے سے بولا۔ ''تم مجھے آپ کہنا بھی بھول گئیں۔''

''جب آدمی غصے میں ہو تو اس کے منہ سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔''

''اب تمہیں مجھ پر غصہ آتا ہی رہے گا۔ اب تمہیں اپنے سے کم عمر نوجوان بھی مل گیا ہے نا۔''

''کیا مطلب!'' نگار کا لہجہ بہت تیز ہو گیا۔

''میں تمہارے نئے اسسٹنٹ کی بات کر رہا ہوں۔ خوب صورت بھی ہے وہ! آج رات میں تو آؤں گا نہیں، اسی کو بلا لینا۔''

''شرجیل!'' غصے سے نگار کا سارا جسم لرز گیا۔

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

نگار کو اتنا غصہ آیا تھا کہ فوری طور پر تو اس کا دل چاہا کہ موبائل دیوار پر دے مارے لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا اور دیوانگی کی اس حد تک نہیں گئی۔

☆☆☆

دوسری صبح جب وہ دفتر پہنچی تو بھی اس کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ رات اس نے بڑے کرب میں گزاری تھی۔ ٹھیک سے سو بھی نہیں سکی تھی۔ اسی لیے دماغ بھی بھاری تھا۔ اس دن بھی اس نے محسوس کیا کہ اپنے کام پر وہ مکمل توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ ایک بار تو اس سے غلطی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جھنجلا کر اس نے کمپیوٹر بند کر دیا۔

''آج بھی آپ ڈسٹرب ہیں میڈم!'' وقاص دھیمی آواز میں بولا۔

''ہاں۔'' نگار نے طویل سانس لی۔ ''[illegible] میرا کیریئر [illegible] تباہ ہو جا[illegible] مجھے [illegible] سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔'' اسی وقت نگار کے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ وہ شرجیل سے طلاق لے لے۔

''میڈم!'' وقاص بولا۔ ''میں یہ پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ آخر آپ کی پریشانی کا سبب کیا ہے؟''

''سبب!'' نگار نے زیرِلب دہرایا، پھر بولی۔ ''شاید میں تمہیں بتا دوں لیکن ابھی نہیں۔'' اس نے غور سے وقاص کی طرف دیکھا۔ شرجیل کی یہ بات درست ہی تھی کہ وقاص بہت خوب صورت اور پُرکشش نوجوان تھا لیکن اسے اتنی غور سے دیکھتے ہوئے نگار کے ذہن میں کوئی ایسا خیال نہیں آیا تھا کہ اس کا ضمیر اسے ملامت کر سکتا۔

''آپ اتنی غور سے مجھے کیوں دیکھنے لگیں میڈم؟'' وقاص بولا۔

''آں!'' نگار چونک سی گئی، پھر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ''کسی نے مجھ سے ایک بات کہی تھی۔ اسی کی تصدیق کر رہی تھی میں۔ تم واقعی بہت پُرکشش اور خوبصورت بھی ہو۔''

''ارے نہیں میڈم! ایسا بھی کیا۔'' وقاص کا انداز

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

ایسا تھا جیسے جھینپ گیا ہو۔
''واقعی۔'' نگار نے کہا۔ ''خوش قسمت ہوگی وہ لڑکی جو تمہاری بیوی بنے گی۔ ابھی یکایک میرے ذہن میں بھی خیال آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری شادی تمہاری کزن غزالہ سے ہوگی۔''
''جی۔'' وقاص نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ ''میرے والدین کی سوچ تو یہی ہے۔ اس کا اندازہ کسی حد تک، بلکہ شاید بڑی حد تک غزالہ کو بھی ہو گیا ہے۔'' پھر اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اسی لیے وہ مجھ پر زیادہ حق بھی جتانے لگی ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرتا ہوں تو روٹھ جاتی ہے۔''
''کل بتایا تھا تم نے۔'' نگار نے کہا۔
''جی ہاں۔ میری اس مصروفیت کی وجہ سے بھی وہ بور ہے۔ کل روٹھ بھی گئی تھی لیکن شام کو اس کا موڈ ٹھیک بھی ہو گیا۔ میں نے اسے سمجھایا بھی کہ میں اس فیلڈ میں اپنا کیریئر بنانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے آپ سے بہتر راہنما شاید نہیں مل سکتا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ میں نے آپ کو چائے پر مدعو کیا ہے اور آپ کسی دن آئیں گی۔''
''کھانے پر مدعو کر لو!'' نگار مسکرائی۔ ''آج ہی چلی چلوں گی۔''
''آپ نے تو مجھے خوش کر دیا۔ غزالہ نے بھی کہا تھا کہ مدعو کرنا ہے تو چائے کے بجائے کھانے پر مدعو کرو۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے میڈم! آپ اس سے مل کر خوش ہوں گی۔ میں ابھی اسے فون کرتا ہوں۔ بتاتا ہوں اسے کہ......'' وہ یکایک رکا، پھر بولا۔ ''لنچ یا ڈنر؟''
''لنچ ہی رکھو!'' نگار فوری طور پر ماحول کی تبدیلی چاہتی تھی۔
''میں ابھی بتاتا ہوں اسے!''
وقاص نے فوراً ہی اپنے موبائل پر غزالہ سے بات کی۔ فون بند کرنے سے پہلے اس کا آخری فقرہ تھا۔ ''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔''
''کیا ٹھیک رہے گا؟'' نگار نے پوچھا۔
وقاص فون بند کر چکا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''اس نے کہا تھا کہ ابھی کالج سے چھٹی لے کر گھر پہنچے گی تاکہ آپ کی دعوت آپ کے شایانِ شان بنا سکے۔ ویسے تو خانساماں ہے گھر میں لیکن کھانا پکانے میں غزالہ کو بہت مہارت ہے۔ ایسی ڈشز بنا لیتی ہے جو ہمارا خانساماں بھی نہیں بنا سکتا۔''
''یہ تو اچھا نہیں ہوا۔ پڑھائی کا حرج نہیں ہونا چاہیے۔ پروگرام تبدیل کر لو۔ لنچ کے بجائے ڈنر رکھ لو۔''
''اب تو میں کہہ چکا ہوں اس سے......! بہتر ہوگا میڈم کہ لنچ پر ہی چلیے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کو فوری طور پر ماحول کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔''
یہی نگار نے بھی سوچا تھا۔
وقاص پھر بولا۔ ''کچھ دن کے لیے کسی پہاڑی مقام پر چلی جائیں۔''
''سوچوں گی۔ چلو ابھی تو چل کر کچھ شاپنگ کر لیں۔ ایک دو گھنٹے گزارے جا سکتے ہیں۔ پھر تمہارے گھر چلتی ہوں۔''
''مجھے خوشی ہوگی اگر آپ میری گاڑی میں چلیں۔ اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دیں۔ بعد میں آپ کو میں پھر یہاں لے آؤں گا۔ آپ اپنے گھر اپنی گاڑی میں چلی جایئے گا۔''
''کوئی حرج نہیں۔ ایسا کر لیتے ہیں۔''
دفتر چھوڑنے سے قبل نگار نے ادارے کے مالک کو فون پر اطلاع دے دی کہ وہ آج بھی چھٹی کر رہی ہے۔
نگار اس ادارے کے لیے اتنی اہم ہو چکی تھی کہ مالک کو اس کی اچانک پے در پے چھٹیوں پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔
''ڈرائیونگ میں کروں گی۔'' نگار نے کار کے قریب پہنچ کر کہا۔
''ضرور میڈم!'' وقاص نے کار کی چابی اس کی طرف بڑھا دی۔
''یہ کار۔'' نگار نے کار [illegible]
''مجھے اس اعتبار سے پسند ہے کہ اس کی [illegible] خاصی کشادہ ہوتی ہے۔ اگر بہت زیادہ شاپنگ کی جائے تو اسٹپنی میں سب کچھ آجائے گا۔''
''میں یہ کار آپ کی نذر کیے دیتا ہوں میڈم!''
''ارے نہیں۔ کسی چیز کی تعریف کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا۔ مجھے اس بات سے بہرحال خوشی ہوئی کہ تم کشادہ دل کے بھی ہو۔''
''میں واقعی......''
''اب ہم کسی اور موضوع پر بات کریں گے۔'' نگار یکدم سنجیدہ ہو گئی۔
''جی، بہتر!''
نگار نے کار ایک شاپنگ مال کے احاطے میں روکی۔ شاپنگ کرنے یا وقاص کے گھر میں کھانا کھانے کا مقصد ایک ہی تھا۔ اس طرح نگار اپنے ذہن کو ادھر ادھر بھٹکا کر اپنا اعصابی تناؤ ختم کرنا چاہتی تھی جو شرجیل کے ایک سنگین الزام کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

غزالہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ نگار نے اسے پسند کیا۔ کھانے بھی اس نے بہت مزے دار بنائے تھے۔ کھانے کے بعد اس نے اپنے خاندان کی کئی ویڈیوز بھی نگار کو دکھائیں۔ اس میں خاصا وقت گزر گیا۔
ساڑھے چار بجنے والے تھے جب وقاص نے اسے دفتر پہنچایا۔ اس وقت ڈرائیونگ وقاص ہی نے کی تھی۔ وہاں سے نگار اپنی کار میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا اعصابی تناؤ کم تو ہوا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔
دفتر سے شرجیل کے آنے کا جو وقت تھا، وہ اس وقت پر آنے کے بجائے رات کو دس بجے کے قریب آیا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ نگار اس کی شراب نوشی سے واقف تھی۔ وہ گھر پر بھی پیا کرتا تھا لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ خود کو نشے میں غرق کر لے۔
وہ نگار سے کوئی بات کیے بغیر بستر پر گر پڑا۔ کپڑے تبدیل کرنا تو کیا، اس نے جوتے بھی نہیں اتارے تھے۔ کچھ ہوش ہی نہیں تھا اسے۔
اس رات بھی نگار کو ٹھیک سے نیند نہیں آسکی۔ گزشتہ رات تو خاصی دیر تک جاگی تھی۔ شاید یہی سبب تھا کہ وہ دوسری صبح بیدار ہوئی تو اسے ہلکا سا بخار تھا۔ ناشتا اس نے [illegible] اور صنوبر بھی ڈریسنگ ٹیبل [illegible] تیار تھی۔
''مجھے کچھ بخار ہے صنوبر!'' اس نے شرجیل کو سنانے کے لیے کہا...... ''میں تمہیں اسکول چھوڑنے تو جاؤں گی لیکن آج دفتر نہیں جاؤں گی۔ آرام کرنے سے اتر جائے گا بخار......''
''یہ اچھا ہوگا کہ تم واپس آجاؤ گی۔'' شرجیل بولا۔ ''مجھے کچھ بات کرنی ہے تم سے۔''
نگار نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔
صنوبر کو اسکول چھوڑ کر وہ واپس لوٹی تو شرجیل خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا۔ ٹہل بھی ایسے رہا تھا جیسے کوئی بپھرا ہوا شیر پنجرے میں ہو۔ اس کے یہ تیور دیکھ کر نگار دروازے ہی پر ٹھٹک گئی۔ وہیں رک جانے کا جواز اس نے یہ بنایا کہ ہاتھ میں دبے ہوئے ٹشو سے وہ گل دان صاف کرنے لگی جو دروازے کے قریب ایک خوبصورت اونچے اسٹول پر رکھا ہوا تھا۔
نگار کو دیکھتے ہی اس نے ٹہلنا موقوف کیا اور نگار کو گھورنے لگا۔
''کوئی بات کرنی ہے مجھ سے۔'' نگار نے گل دان صاف کرتے ہوئے شرجیل کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اسے گمان تھا کہ شرجیل اس سے شفیقہ ہی کے بارے میں کچھ کہے گا۔ ممکن تھا کہ اس میں انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا ہو اور وہ بتانا چاہتا ہو کہ وہ شفیقہ سے شادی کر رہا ہے۔ نگار کی طبیعت اب بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے دماغ میں خیال آیا کہ فی الحال وہ اس موضوع کو ٹال جائے۔ اپنی بات کا جواب ملنے سے پہلے ہی وہ پھر بولی۔ ''کوئی خاص بات ہوگی۔ بہتر ہوتا کہ پھر کسی وقت کر لی جاتی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے بتایا بھی تھا کہ مجھے بخار ہے۔''
شرجیل نے جیسے اس کی کوئی بات سنی ہی نہیں اور تیزی سے اس کے قریب آیا۔ ''تم نے یہ ہمت کیسے کی؟''
''میں سمجھی نہیں۔'' نگار کی آواز دھیمی تھی۔
''شفیقہ کو میں نے رکھا تھا صنوبر کے لیے...... اسے الگ کر کے تم نے میری توہین کی ہے اور تمہیں اس کا تو حق ہی نہیں تھا کہ اسے تھپڑ مارتیں۔ یہ بات اس نے مجھے کل رات بتائی۔''
''میں نے جو کچھ کیا، کم کیا۔'' نگار نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ ''جی تو چاہا تھا کہ اس کی اچھی طرح درگت بنا دوں۔ وہ میرا بستر گندا کر چکی تھی۔ اسے میں بہ مشکل ہی برداشت کر سکی۔''
''میں بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اسے تھپڑ مارا [illegible] رات کو [illegible] زیادہ پیے ہوئے تھا ورنہ کل رات [illegible] تم سے [illegible]'' وہ دانت پیسنے لگا۔
''کیا کرتے مجھ سے کل رات؟'' اب نگار کو بھی طیش آنے لگا۔ وہ شرجیل کی بیوی تھی لیکن شرجیل کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس پر شفیقہ کو ترجیح دے رہا ہو۔
''وہ تو تمہیں اس تھپڑ کا جواب نہیں دے سکی۔'' شرجیل بولا۔ ''لیکن میں دوں گا جواب۔'' ساتھ ہی اس کا دایاں ہاتھ گھوم گیا۔
تھپڑ نگار کے بائیں گال پر پڑا۔ اس کا منہ پھر گیا تھا۔
''شرجیل!'' وہ غصے سے کانپ گئی۔ ''تم اپنی بیوی پر ایک طوائف کو ترجیح دے رہے ہو۔''
''طوائف۔'' شرجیل نے دانت پر دانت جمائے اور اس کا ہاتھ پھر گھوم گیا۔ اس مرتبہ کا تھپڑ پہلے تھپڑ سے زیادہ زور کا تھا۔
اب تو نگار آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے اسٹول سے گل دان اٹھایا اور پوری طاقت سے شرجیل کے سینے پر مارنا چاہا۔
شرجیل نے جھک کر خود کو بچانے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ زیادہ پھرتی نہیں دکھا سکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پیتل کا وزنی

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

گل دان اس کے سر پر پڑا اور وہ چکرا کے فرش پر گر پڑا۔ اس کے سر سے بے تحاشا خون بہہ نکلا تھا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر نگار کا غصہ کافور ہوگیا۔ وہ گھبرا کر فرش پر بیٹھی اور شرجیل کو سیدھا کیا۔ وہ کروٹ کے بل گرا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

بے ہوش ہوگیا، نگار کو خیال آیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور بستر سے چادر گھسیٹ لائی۔ چادر سے اس نے شرجیل کا سر اس طرح باندھنا چاہا کہ خون کا بہاؤ رک سکے۔

یہ میں کیا کر بیٹھی ہوں، اس کے دماغ میں آیا، یہ صورتِ حال ایسی نہیں تھی جسے ڈاکٹر کے بغیر سنبھالا جاسکتا، لیکن ڈاکٹر کو بلانے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ بات پولیس تک پہنچ جاتی۔

''اوہ گاڈ!'' وہ کھڑی ہوگئی۔

''یہ میں کیا کر بیٹھی ہوں؟'' اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔

یکا یک ایک خیال آیا جس سے اس کا سارا جسم سنسنا گیا۔

''موت!''

وہ جلدی سے جھکی۔ اس نے شرجیل کی نبض دیکھی جو ساکت تھی۔ پھر اس نے اپنا کان شرجیل کے سینے سے لگایا لیکن دل کی خفیف سی دھڑکن بھی محسوس نہیں ہوئی۔ گل [illegible] کی ضرب اس کے سر پر کسی ایسی جگہ لگی تھی جس [illegible] دماغ اس ضرب کی شدت برداشت نہیں کرسکا تھا اور اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔

نگار بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ کچھ لمحوں کے لیے وہ بالکل شل ہوکر رہ گئی تھی۔ ان لمحوں میں دماغ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ چند لمحوں بعد جب دماغ نے دھیرے دھیرے کام کرنا شروع کیا تو صورتِ حال کی سنگینی کے احساس سے اس کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی اور چہرے پر پسینا چمکنے لگا۔

''یہ کیا ہوگیا؟'' اس کے دماغ میں سوال ابھرا۔

اگرچہ وہ شرجیل سے بہت اکتا چکی تھی اور اگر وہ طبعی موت مرتا تو اسے قطعی افسوس نہ ہوتا لیکن افسوس تو اب بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی پریشانی صرف یہ تھی کہ شرجیل اس کے ہاتھوں قتل ہوگیا تھا۔ اگرچہ وہ اسے قتل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے گل دان شرجیل کے سینے پر مارا تھا۔ اگر وہ خود کو بچانے کے لیے جھکا نہ ہوتا تو گل دان اس کے سر پر ہرگز نہ لگتا۔ وہ خود کو بیوہ اور صنوبر کو یتیم کیوں کرنا چاہتی؟ شرجیل کی بے راہ روی کو وہ اسی لیے برداشت کرتی رہی تھی کہ اس سے الگ ہوکر وہ اپنی زندگی کے لیے بہت سی پریشانیاں کھڑی کرلیتی۔

مگر اب تو جو ہونا تھا، وہ ہوچکا تھا۔ اس کے بعد قانون کی کہانی شروع ہونا تھی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ قانون کا احترام کرتے ہوئے فون پر پولیس کو اس کی اطلاع دے۔ لیکن اس صورت میں اس کی گرفتاری یقینی امر تھی۔ اسے لمبی سزا بھی ہوتی۔ اس کے دل میں قانون کا اتنا احترام تھا کہ وہ اسے بھی اپنا مقدر سمجھ کر برداشت کرلیتی لیکن اسے صنوبر کا خیال آیا جس کا حشر اس کے بعد نہ جانے کیا ہوتا۔

شرجیل سے دو سال چھوٹا اس کا ایک بھائی تھا تو سہی لیکن اس کی تنک چڑھی بیوی کی وجہ سے دونوں بھائی ایک دوسرے سے کم ہی ملتے تھے۔ اگر وہ دنیا دکھاوے کے لیے یا خود بھی بھتیجی کی محبت میں اس کے سر پر ہاتھ رکھتا تو بھی اس کی بیوی قدسیہ کو یہ گوارا نہ ہوتا۔ شوہر کی وجہ سے وہ صنوبر کو اپنے پاس رکھ تو لیتی لیکن اسے اپنے گھر کی نوکرانی بنا لیتی۔ اس کی ایک بیٹی آٹھ سال کی تھی۔ شاید صنوبر کو اس کے جوتے بھی صاف کرنے پڑتے۔

نہیں، اس نے فیصلہ کیا، وہ خود کو قانون کے حوالے نہیں کرے گی۔ اسے صنوبر کی خاطر خود کو قانون کی گرفت سے بچانے کی ضرورت تھی۔

[illegible] خیالات کے ساتھ [illegible] خون [illegible] ہوئے ''رگ'' کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نگار کو فوراً احساس ہوا کہ یہ مناسب نہیں ہوگا۔ اسے یہاں سے خون کے دھبے بھی صاف کرنا ہوں گے اور لاش بھی غائب کرنا ہوگی۔ یہ اس کے دماغ میں ابھی نہیں تھا کہ وہ لاش کیسے غائب کرسکے گی؟ فوری طور پر تو اسے ''رگ'' کو خون سے بچانا تھا۔

اس کے لیے فوری طور پر اس کے دماغ میں کوئی تدبیر نہیں آسکی تو اس نے جلدی سے اپنی ساڑی ہی اتار کر خون پر اس طرح ڈال دی کہ خون ''رگ'' تک نہ پہنچ سکے اور اس کی ساڑی ہی میں جذب ہوتا رہے۔ پھر وہ تیزی سے الماری کی طرف گئی۔ اس میں سے ایک اور ساڑی نکال کر باندھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ میں خیالات اور سوالات بھی چکراتے رہے۔ لاش کو غائب کرنے کی تدبیر تو اس کے دماغ میں فوری طور پر نہ آسکی لیکن اسے یہ خیال ضرور آگیا کہ صنوبر جب اسکول سے آئے تو باپ کی لاش کو نہ دیکھ سکے۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی ایک بات آئی کہ وہ لاش گھسیٹ کر بیڈ کے نیچے کردے اور فرش پر خون کا کوئی دھبا نہیں رہنے دے۔

Digitized by Google

اس نے دیکھا کہ ساڑی شرجیل کا سارا خون نہیں روک سکے گی۔ اس نے پھر الماری کھولی اور کچھ پرانے سوتی کپڑے بھی اس طرح ڈال دیے کہ خون ''رگ'' تک نہ پہنچ سکے۔ پھر اس نے اپنے سینڈل بھی اتار کر رکھ دیے تاکہ بے خیالی میں ان پر خون کا داغ نہ لگ جائے۔ اگر اس کے پیروں پر خون لگ جاتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ پیر دھو سکتی تھی، سینڈل نہیں دھوئے جاسکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ پیروں پر تو خون لگنا ہی تھا کیونکہ فرش وہ خود ہی صاف کرسکتی تھی۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں تھا جس کے لیے وہ ملازمہ کو بلاتی جو کھانا پکانے کے علاوہ گھر کی صفائی بھی کیا کرتی تھی۔

یہ سب کچھ کرنے کے لیے اسے اتنی دیر انتظار بھی کرنا تھا کہ شرجیل کے خون کا بہاؤ بالکل رک جائے۔ اس کے بعد ہی اس کی لاش گھسیٹ کر بیڈ کے نیچے چھپائی جاسکتی تھی۔ فی الحال یہ اس کے ذہن میں نہیں آرہا تھا کہ وہ لاش کو یہاں سے غائب کس طرح کرے گی؟ لاش مستقل طور پر تو بیڈ کے نیچے نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں نہیں تو اس سے کچھ زیادہ وقت میں لاش کے خراب ہونے سے کمرے میں بو پھیل سکتی تھی۔ نگار کو اس کا ادراک نہیں تھا کہ لاش [illegible] بدبو [illegible] جاتا ہے۔ [illegible] دروازے پر [illegible] والی دستک نے اسے اتنا [illegible] کہ وہ تقریباً اچھل ہی پڑی۔

''بیگم صاحبہ!'' باہر سے زلیخا کی آواز آئی۔ ''آپ اب دفتر تو نہیں جائیں گی؟ وہ رامی پوچھ رہی ہے کہ کھانا زیادہ تیار کیا جائے۔ آپ کے لیے بھی!''

ملازمہ کا نام تو رحمانیہ تھا لیکن گھر میں اسے شروع ہی سے ''رامی'' کہا جانے لگا تھا۔

اس وقت نگار کو خیال آیا کہ دروازہ اندر سے بولٹ نہیں تھا۔ یہ بات ممکن تو نہیں تھی کہ وہ اجازت لیے بغیر اندر آجاتی لیکن بے خیالی میں اس سے یہ حرکت ہوسکتی تھی۔

''نہیں۔'' نگار نے دھڑکتے دل سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''میں دفتر تو نہیں جاؤں گی لیکن کھانا بھی نہیں کھاؤں گی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بس دودھ پی لوں گی۔''

''جی اچھا۔'' زلیخا بائی کی آواز آئی۔ پھر اس کے واپس جاتے ہوئے قدموں کی آہٹ آئی نگار کا دماغ اتنا الجھا ہوا تھا کہ زلیخا بائی کے دروازے کی طرف آتے ہوئے قدموں کی آہٹ نہیں سن سکی تھی۔

اب وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور اسے آہستگی سے بولٹ کردیا۔

☆☆☆

صنوبر کی اسکول سے واپسی تک وہ بے حد مصروف رہی اور کمرے کو بظاہر غیر مخدوش بنا دیا۔ بیڈ کے نیچے لاش چھپانے سے قبل اس نے وہاں کچھ پھٹے پرانے کپڑے بھی بچھا دیے تھے تاکہ لاش سے معمولی حد تک رستا ہوا خون ان کپڑوں ہی میں جذب ہوتا رہے۔ فرش پر سے خون صاف کرنے کے لیے اس نے کپڑے گیلے کرکے استعمال کیے تھے۔ پھر وہ سب خون آلود کپڑے اور اپنی خون آلود ساڑی مضبوط پلاسٹک کی ایک تھیلی میں ڈال کر تھیلی بھی بیڈ کے نیچے ہی ڈال دی تھی۔

جب وہ اپنی پھولی ہوئی سانس درست کرنے کے لیے بستر پر لیٹی تو اسے لگا کہ اس کی بخار کی کیفیت ختم ہوچکی ہے صورتِ حال نے اس کے بخار کے لیے تریاق کا کام کیا تھا۔ تکان بھی اس کے بخار میں اضافہ نہیں کرسکی تھی۔

صنوبر اسکول سے آئی تو ماں سے لپٹ گئی۔ اسے بہت دن بعد یہ موقع ملا تھا کہ اسکول سے واپسی پر ماں سے مل سکے۔

زلیخا بائی بھی کمرے میں آگئی۔ اسی نے صنوبر کو ہاتھ [illegible] دھلایا، اس کے کپڑے تبدیل کرائے، پھر [illegible] کھانا کھانے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر پہنچی۔ [illegible] اس کے لیے کھانا تیار نہیں ہوا تھا۔ اس نے صرف دودھ پینے پر اکتفا کیا۔

''آپ کچھ پریشان ہیں بیگم صاحبہ!'' زلیخا بائی نے کہا۔

''ارے نہیں۔'' نگار زبردستی ہنسی۔ ''بس طبیعت کچھ خراب ہے نا آج!''

''کیا ہوا ماما آپ کو؟'' صنوبر بولی۔

''کچھ نہیں جان! بس ہلکا سا بخار تھا۔ میں نے دوا کھالی ہے۔ اب اس وقت کھانا اسی لیے نہیں کھا رہی ہوں کہ طبیعت اور بہتر ہوجائے۔''

''کھانا نہیں کھائیں تو کیا طبیعت ٹھیک ہوجاتی ہے؟'' صنوبر نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں۔'' نگار آہستہ سے ہنس دی لیکن یہ ہنسی بھی جبری تھی۔

صنوبر کا معمول تھا کہ وہ کھانے کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے سو جاتی تھی۔ اس کا کمرا ابھی الگ نہیں تھا۔ چوڑے بیڈ پر وہ شرجیل اور نگار کے بیچ میں سویا کرتی تھی۔ دن میں اسے اکیلے ہی سونا پڑتا تھا لیکن اس روز وہ نگار کے پہلو میں لیٹ کر سوئی۔

http://urdutubes.com/

نگار کا دماغ بدستور الجھا ہوا تھا۔ اسے یہ بھی سوچنا تھا کہ شام کو شرجیل کے نہ ہونے پر وہ صنوبر کو کیا بتائے گی۔ اس کے علاوہ بنیادی پریشانی تو اسے یہ لاحق تھی کہ لاش کہاں ٹھکانے لگائے۔

صنوبر دو گھنٹے بعد سو کر اٹھی۔ زلیخا بائی نے اس کا منہ ہاتھ دھلایا۔ پھر وہ نگار اور زلیخا بائی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ زلیخا بائی ڈرائنگ روم ہی میں صنوبر کا اسکول کا کام دیکھنے اور اسے پڑھانے بیٹھی۔ وہیں نگار نے چائے بھی پی۔ بہت عرصے بعد ایسا ہوا تھا کہ اس نے شام کی چائے، اتوار کے علاوہ گھر پر پی......

''بیگم صاحبہ!'' زلیخا بائی یکایک اس سے مخاطب ہوئی۔ ''الجھن سی ہے مجھے۔ کئی بار آپ سے پوچھنا چاہا لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ کیا آپ مجھے ایک بات پوچھنے کی اجازت دیں گی؟''

''ہاں ہاں، پوچھو!''

''صاحب آج دفتر نہیں گئے تھے۔ صبح آپ بے بی کو اسکول چھوڑ کر آئی تھیں، تب بھی وہ گھر پر تھے۔ اس کے بعد وہ نظر ہی نہیں آئے۔''

اس بات پر نگار کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے یہ خیال آیا ہی نہیں تھا لیکن زلیخا بائی نے یہ بات چھیڑی تو اسے فوراً جواب ضرور سوجھ گیا۔

''نہیں زلیخا بائی!'' اس نے کہا۔ ''... کے تھوڑی دیر بعد ہی اپنے دفتر چلے گئے تھے۔ میں خود انہیں چھوڑنے دروازے تک گئی تھی۔ تم شاید اس وقت کچن میں رامی کے ساتھ ہو گی۔''

زلیخا بائی کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔

''کیوں؟'' نگار بولی۔ ''کیا سوچنے لگیں؟''

''مجھے تو یاد آ رہا ہے کہ میں یہاں ڈرائنگ روم ہی میں تھی۔ ڈیکوریشن پیس نئے سرے سے اور اپنے خیال سے زیادہ بہتر طور پر سیٹ کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ آپ نے شاید غور نہیں کیا یہاں کی آرائش پر!''

اب نگار نے ڈرائنگ روم پر طائرانہ نظر ڈالی۔

''ہاں۔ کچھ نیا پن تو آ گیا۔ اچھا لگتا ہے نیا پن......''

''بس یہی سب کر رہی تھی میں اس وقت!''

''یاد نہیں ہو گا تمہیں۔ شاید باتھ روم وغیرہ گئی ہو جب میں شرجیل کو دروازے تک چھوڑنے کے لیے ادھر سے گزری تھی۔''

''ہو سکتا ہے۔'' زلیخا نے بڑبڑانے والے انداز میں زیر لب کہا۔ نگار نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ زلیخا بائی اب پوری طرح صنوبر کی طرف متوجہ تھی۔

''ڈرائنگ روم کی خوب صورتی میں کچھ اور اضافہ کیا جائے۔'' نگار نے اپنی سوچی ہوئی ایک تدبیر کے مطابق کہا۔

''ضرور کریں بیگم صاحبہ!''

''یہ بتیس انچ کا ایل سی ڈی دیکھتے دیکھتے اکتاہٹ ہونے لگی ہے۔ ڈرائنگ روم بھی خاصا بڑا ہے۔ اس کے لیے بڑا ایل سی ڈی ہونا چاہیے۔''

''جی ہاں بیگم صاحبہ!'' زلیخا بائی نے کہا۔ ''اس ڈرائنگ روم کے لیے تو یہ خاصا چھوٹا ہے۔''

''میں ابھی جاتی ہوں مارکیٹ۔ آج ہی لے آتی ہوں۔''

صنوبر چونک کر جلدی سے بولی۔ ''میں بھی مما!...... آپ کے ساتھ۔''

''ہاں ہاں، تم بھی چلنا۔'' نگار نے کہا۔ ''ابھی پڑھ تو لو۔''

اس وقت رامی چائے کا سامان سمیٹنے آئی تھی۔

''ڈیڈی آ جائیں نا!'' صنوبر بولی۔ ''اسی وقت چلیں۔''

''آج وہ نہیں آئیں گے۔'' صنوبر نے اپنے سوچے ہوئے منصوبے کے مطابق کہا۔

''کیوں مما؟''

''وہ دفتر سے ہی حیدرآباد چلے جائیں گے۔ تمہارے چاچو سے کوئی کام ہے انہیں...... شرجیل بھائی راحیل ...... نگار نے مزید کہا۔ ''ان کا کوئی دوست بھی حیدرآباد جا رہا ہے۔ وہ اسی کی کار میں جائیں گے۔'' یہ اس لیے کہنا پڑا کہ شرجیل کی کار اپارٹمنٹ ہی کے پارکنگ شیڈ میں کھڑی تھی جو کسی وقت بھی زلیخا بائی، رامی یا صنوبر کی نظر میں آسکتی تھی۔

''تبھی تو......'' رامی چائے کا سامان سمیٹتے ہوئے بڑبڑائی۔

''تبھی تو؟'' نگار نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تبھی تو کیا؟''

''میں کچھ سودا لینے نیچے گئی تھی۔ صاحب کی کار دیکھی تھی میں نے۔ مجھے تو یہ خیال تھا کہ وہ گھر پر ہی ہیں۔ کسی وجہ سے نہیں نکلے اپنے کمرے سے۔''

''نہیں۔'' نگار نے کہا۔ ''جب میں واپس آئی تھی، اس کے ذرا دیر بعد ہی وہ چلے گئے تھے۔''

رامی نے سر ہلایا اور سامان لے کر چلی گئی۔

''مجھے تو......'' صنوبر بولی۔ ''ڈیڈی نے بتایا ہی نہیں۔ بس روٹھ گئی میں ان سے۔'' اس نے منہ پھلایا۔ ''فون بھی نہیں کروں گی انہیں۔''

اس بات سے نگار نے سکون محسوس کیا۔ اگر صنوبر فون

کرنے پر بضد ہو جاتی تو نگار اسے روکنے کے لیے کوئی تدبیر سوچنے پر مجبور ہو جاتی۔

ایک گھنٹے بعد اس نے صنوبر کے ساتھ مارکیٹ کا رخ کیا۔ اس نے اتنا بڑا ایل سی ڈی خریدا جس کا ڈبا اس کی کار میں نہیں آسکتا تھا۔ اس کے لیے سوزوکی کرنا پڑی۔ دکان دار کا ایک آدمی بھی نگار کے ساتھ آیا تا کہ قاعدے سے اور نگار کی خواہش کے مطابق ایل سی ڈی سیٹ کر سکے۔

اس رات صنوبر ایل سی ڈی پر ٹی وی چینلز کے پروگرام دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔ اتنا بڑا ایل سی ڈی دیکھنے کے لیے زلیخا بائی کے علاوہ رامی بھی ڈرائنگ روم میں تھی۔

دس بجے کھانا کھانے کے بعد نگار نے صنوبر سے کہا۔ ''اب چل کر سو جاؤ۔''

''میں تو کارٹون دیکھوں گی مما! آج تو بڑا مزہ آئے گا۔''

''نہیں۔ پھر صبح وقت پر نہیں جاگ سکو گی۔ اسکول سے ناغہ نہیں کیا جاتا۔''

صنوبر تھوڑا سا مچلی، پھر رام ہو گئی۔

''اس کا کیا کرنا ہے بیگم صاحبہ؟'' زلیخا بائی نے ایل سی ڈی کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا جو ابھی ڈرائنگ روم ہی میں تھا۔

''...... میں پہنچا دو۔'' نگار نے رامی سے کہا۔ ''...... لوگی؟''

''جی ہاں بیگم صاحبہ!''

''وہاں کیا کریں گی اس کا؟'' زلیخا بائی بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''وہ دراصل......'' نگار نے کہا۔ ''بیڈ روم میں بہت سا اضافی سامان جمع ہو گیا ہے۔ وہ بھر دوں گی اس میں۔ پھر گودام میں ڈلوا دوں گی۔''

سوال کیونکہ کسی حد تک متوقع تھا اس لیے نگار نے جواب پہلے ہی سوچ لیا تھا۔

رامی ڈبا گھسیٹ کر لے جانے لگی تو نگار بھی اس کے ساتھ تھی۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ کوئی ابھی اکیلا اس کے کمرے میں نہ جائے۔ کسی بھی وجہ سے کوئی بیڈ کے نیچے جھانک سکتا تھا جہاں شرجیل کی لاش پڑی تھی۔

ڈبا نگار نے بستر کے قریب ہی رکھوا کر رامی کو رخصت کر دیا۔ صنوبر پہلے ہی سے اچھل کر بستر پر بیٹھ چکی تھی۔

''مٹھائی کھاؤ گی؟'' نگار نے اس سے پوچھا۔

صنوبر خوشی سے تیار ہو گئی۔ اسے مٹھائی کا بہت شوق تھا۔ نگار نے ریفریجریٹر سے ایک پلیٹ میں کچھ مٹھائی نکالی۔ اس نے جو گلاب جامن صنوبر کو کھلائی، اس میں خواب آور دوا کا ایک چوتھائی حصہ بھی ملا دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس رات صنوبر گہری نیند سوئے، ذرا سی بھی آہٹ اسے جگا نہ سکے۔ شرجیل کی لاش ڈبے میں ٹھونستے ہوئے کچھ گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ بڑا ایل سی ڈی اس نے خریدا ہی اس لیے تھا کہ اس میں شرجیل کی لاش ٹھونسی جا سکتی تھی......

بعد میں اس ڈبے کا کیا کیا جاتا؟ یہ بھی نگار نے سوچ لیا تھا۔

آدھی رات کے بعد جب بالکل سکوت ہو گیا اور نگار نے یقین کر لیا کہ رامی اور زلیخا بائی بھی سو چکی ہوں گی تو وہ بستر سے اٹھی۔

جو کام اسے کرنا تھا، وہ اس کے اعصاب کو جھنجوڑ رہا تھا۔ کسی لاش کا ڈبے میں ٹھونسنا کسی عادی قاتل کے لیے تو کوئی خاص کام نہیں تھا لیکن نگار بے تحاشا خوف محسوس کر رہی تھی۔

لرزتے ہاتھوں سے وہ شرجیل کی لاش بیڈ کے نیچے سے گھسیٹ سکی۔ لاش کے نیچے اس نے جو کپڑے ڈال دیے تھے، ان پر خون کے تھوڑے بہت داغ آ گئے تھے۔ شرجیل کی لاش اس حالت میں تھی جیسے کوئی بچہ ماں ...... ہے۔ نگار نے یہ اس لیے کیا تھا کہ زلیخا بائی یا رامی کو کمرے میں داخل ہوتے وقت لاش کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہ آ سکے۔

اب اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ اور سوچے بغیر یہ کام کر گزری تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو لاش ڈبے میں ٹھونسنا بہت مشکل ہوتا۔ اب لاش مڑی تڑی حالت میں اکڑ چکی تھی۔ اس کے باوجود لاش کو ڈبے میں ٹھونسنا نگار کے لیے آسان ثابت نہیں ہوا۔ اتنے وزن کو ڈبے میں ٹھونستے ہوئے وہ بری طرح ہانپ گئی۔ ڈبا اسے بیڈ کے قریب بھی لانا پڑا تھا۔ اب اسے پھر کنارے سے لگانے کی ضرورت بھی تھی۔ یہ کام کرنے سے پہلے نگار نے بستر پر لیٹ کر کچھ دیر آرام کیا۔ لیٹنے سے پہلے اس نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ اس کے لباس پر خون کا کوئی دھبا نہ لگا رہ گیا ہو......

ڈبے کو کنارے لگانے کے بعد اس نے چوڑے ٹیپ سے اس کا اوپری حصہ بند کیا اور اس کے اوپر ایک چادر بھی ڈال دی کہ اگر خون کا کوئی دھبا ڈبے پر آ جائے تو اس پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ یہ اندیشہ صرف زلیخا بائی کی طرف سے تھا کیونکہ صبح صنوبر کو تیار کرنے وہی کمرے میں آتی تھی۔

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

بیڈ کے نیچے پڑے ہوئے کپڑوں پر خون کے دھبے تھے۔ اس نے انہیں بھی پلاسٹک کی ایک تھیلی میں ڈالا۔ اس کے بعد اسے خیال آیا کہ دن میں خون آلود ہو جانے والی ساڑی اور دیگر خون آلود کپڑوں کی تھیلی بھی اسے ڈبے میں ڈال دینی چاہیے تھی۔

اس کام کے لیے اسے دوبارہ ڈبا کھولنا اور بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ بری طرح تھک چکی تھی، اس کے باوجود اسے فوراً نیند نہیں آسکی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ صبح سے اب تک وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی بھیانک خواب دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

دوسری صبح بھی وہ دفتر نہیں گئی۔ وقاص کو فون کر کے کچھ ہدایات دیں، پھر کہا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ آج شام تم اپنی کار مجھے دے دو؟“

”جی ہاں میڈم...... ضرور!“ وقاص نے فوراً جواب دیا۔

”میں شام کو تمہارے گھر آؤں گی۔ اپنی کار وہیں چھوڑ دوں گی۔ کل صبح تم میری ہی کار پر آفس آنا۔ واپسی پر اپنی کار لیتے جانا۔ دراصل بات یہ ہے کہ آج مجھے خاصی شاپنگ کرنی ہے۔ تمہاری کار کی اسٹپنی اتنی بڑی ہے کہ سب سامان اس میں آجائے گا۔ سامان کی نوعیت ایسی ہے کہ میں کرائے کی سوزوکی نہیں لے سکتی۔“

”آپ کو یہ سب بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی میڈم! میں نے کوئی سوال کیا تھا کیا آپ سے؟“

”میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں بتا دوں۔ تم نے کوئی بات تو نہیں کی لیکن تمہارے ذہن میں یہ سوال ضرور رہتا کہ میں نے تمہاری کار کیوں لی جبکہ کار میرے پاس بھی ہے اور میرے شوہر کے پاس بھی۔ اچھا خیر! میں شام کو آؤں گی۔“

وقاص کے کچھ بولنے سے پہلے نگار نے فون بند کر دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس بارے میں مزید کوئی بات ہو۔ وہ شرجیل کی لاش کا ڈبا وقاص کی گاڑی کی ڈکی میں رکھ کر لے جاتی اور کہیں سمندر میں پھینک دیتی۔ اس کے علاوہ کوئی تدبیر اس کے دماغ میں نہیں آسکی تھی۔

پھر اس نے بستر کے نیچے کا فرش بھی گیلے کپڑے سے اچھی طرح صاف کیا۔ اس وقت اسے ڈبا ایک بار پھر کھولنا پڑا۔ یہ کپڑا بھی وہ ڈبے ہی میں رکھنا چاہتی تھی۔ ڈبا کھولنے پر اس نے بو محسوس کی۔ کپڑا ڈبے میں رکھنے کے بعد ڈبا بند کرنے سے پہلے اس نے خاصا اسپرے کر دیا۔ ڈبا بند کرنے کے بعد کمرے میں بھی گلاب کے ایئر فریشنر سے کمرے میں خوشبو پھیلائی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ صنوبر اسکول سے واپس آنے کے بعد وہ ناگوار بو محسوس کرے جو ڈبا کھولنے کی وجہ سے کمرے میں پھیلی تھی۔

وہ ناشتا کر چکی تھی لیکن اس نے ملازمہ سے پھر ایک کپ چائے منگوا کر پی۔ وہ سر میں درد محسوس کر رہی تھی۔ یہ سوال اسے تھکائے دے رہا تھا کہ وہ شرجیل کی عدم موجودگی کو کب تک اور کس طرح چھپا سکے گی؟

ملازمہ جب چائے لے کر آئی تھی تو اس نے پوچھا تھا۔ ”آج بھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیگم صاحبہ تو کسی ڈاکٹر......“

”نہیں......“ نگار نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”طبیعت ٹھیک ہے، میں بس آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

لیکن آرام تو اسے اسی وقت مل سکتا تھا جب ذہن سے بوجھ ختم ہوتا...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ لاش سے نجات حاصل کرنے کے بعد بھی اسے جن حالات کا سامنا کرنا پڑتا، اس کا بوجھ بھی تھا ذہن پر!

صنوبر اسکول سے واپس آئی تو اس نے پوچھا۔ ”ڈیڈی واپس آگئے مما؟ دفتر گئے ہیں؟“

”ابھی نہیں آئے۔ شام تک آئیں گے۔“

”ان سے فون پر میری بات کرائیے۔“

”شام کو کر لینا۔ وہ وہاں ابھی مصروف ہوں گے۔“

اس طرح وہ اس وقت تو صنوبر کو ٹال سکی لیکن شام کو صنوبر نے پھر [illegible] بات کی۔ [illegible] وہ ضد پر اتر آئی۔ اس وقت [illegible] بری طرح ڈانٹ دیا۔ وہ رونے لگی۔

یہ واقعہ ڈرائنگ روم میں پیش آیا تھا۔ روتی ہوئی صنوبر کو زلیخا بائی نے اپنی گود میں لے لیا اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے نگار کی طرف دیکھتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔ ”بات کرا دیتیں نا بیگم صاحبہ!“

”وہاں وہ بہت مصروف ہیں۔ دن میں ان سے فون پر میری بات ہو چکی ہے۔“

زلیخا بائی نے مزید کچھ نہیں کہا۔

نگار اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ ذرا دیر بعد اسے کار لینے کے لیے وقاص کے گھر جانا تھا۔ وہ اپنا کمرا مقفل کر کے جانا چاہتی تھی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ صنوبر کو بھی اپنے ساتھ لے جاتی۔

دس پندرہ منٹ بعد زلیخا بائی صنوبر کو لے کر واپس آگئی۔ وہ صنوبر کو چپ کرانے میں کامیاب ہو چکی تھی لیکن صنوبر کا منہ اترا ہوا تھا۔ نگار اسے اتنا چاہتی تھی کہ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل رو پڑا۔ وہ صرف صنوبر ہی کی خاطر سب کچھ کر رہی تھی ورنہ شاید خود کو قانون کے حوالے کر چکی ہوتی۔

نگار نے اسے زلیخا بائی کی گود سے اپنی گود میں لے لیا اور اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔ ”ضد نہیں کیا کرتے میری جان!...... رات کو بات کرا دوں گی میں تمہارے ڈیڈی سے!“

”ابھی۔“ صنوبر کا منہ پھولا ہوا تھا۔

”تم پھر ضد کرنے لگیں۔ تم جاؤ زلیخا بائی! میں اب سنبھال لوں گی اسے۔“

زلیخا بائی کمرے سے چلی گئی۔ اس کی موجودگی میں نگار کو اب ڈر لگنے لگا تھا۔ رہ رہ کر اسے خیال آتا کہ زلیخا بائی لاش نہ دیکھ لے حالانکہ لاش ڈبے میں بند تھی۔

”چلو اب بازار چلتے ہیں۔“ نگار نے صنوبر سے کہا۔ ”ایک بہت اچھی ٹرائیکل آئی ہے مارکیٹ میں۔ ابھی تمہیں دلا کر لاؤں گی...... اور ہاں! تمہاری پسندیدہ مٹھائی بھی تو ختم ہو گئی ہے، وہ بھی لانا ہے۔“

اسی قسم کی باتوں سے نگار نے صنوبر کو بہلایا۔ اس کے بعد وہ اسے گود میں لیے لیے باہر نکلی اور کمرا مقفل کیا۔ ”میں ایک دو گھنٹے میں آجاؤں گی۔“ گھر سے رخصت ہوتے ہوتے نگار نے رامی اور زلیخا بائی کو بتایا۔

”کھانا تو تیار ملے گا نا اس وقت تک؟“ یہ سوال اس نے رامی سے [illegible] تھا۔

”[illegible] بیگم صاحبہ [illegible]“ [illegible] نے جواب دیا۔

[illegible] اپارٹمنٹ [illegible] صنوبر کے ساتھ لفٹ میں سوار ہوتے وقت نگار کو پہلی بار خیال آیا کہ وہ رات کے وقت لاش کا ڈبا لفٹ تک کیسے لا سکے گی؟...... پھر اسے نیچے لے جا کر لفٹ سے نکالنا اور پھر کار کی ڈکی میں رکھنا۔ لفٹ نیچے جانے لگی اور نگار کو پسینا آنے لگا۔ عادی مجرم نہ ہونے کے سبب وہ یہ سب کچھ پہلے سے نہیں سوچ سکی تھی۔

وقاص کے گھر پہنچنے تک بھی اس کا ذہن منتشر ہی رہا۔

”بہت پیاری ہے آپ کی بیٹی!“ وقاص کی چچازاد غزالہ نے مسکرا کر صنوبر کو گود میں لینا چاہا لیکن وہ نگار کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ غزالہ ہنسنے لگی۔ وقاص بھی مسکرا دیا۔

نگار نے مسکرا کر غزالہ سے کہا۔ ”یہ کسی سے دو ایک بار ملنے کے بعد ہی مانوس ہوتی ہے۔“

”اچھا بیٹھیے تو!“ غزالہ نے کہا۔ ”وقاص نے بتایا تھا کہ آپ آئیں گی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے ایک خاص قسم کے کباب بنائے ہیں آپ کے لیے۔ کھانا کھا کر جائیے گا۔“

نگار نے سوچا تھا کہ وہ دس پندرہ منٹ بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو جائے گی۔ اس نے کہا۔ ”نہیں غزالہ! میں اتنی دیر نہیں رک سکوں گی۔ پھر دکانیں بند ہو جائیں گی۔ وقاص نے تمہیں بتایا نہیں کہ مجھے خاصی شاپنگ کرنی ہے۔“

”ہاں بتایا تو تھا کہ آپ کو خاصی شاپنگ کی وجہ سے وقاص کی کار بھی چاہیے۔“

”بس تو پھر کھانے کے لیے اصرار نہ کرو۔ میں بس اب چلوں گی۔“

”ارے نہیں، چائے تو پی لیں۔ اور کچھ کباب بھی کھا لیجیے گا۔ میں نے بڑے چاؤ سے بنائے ہیں آپ کے لیے۔“

اتنے محبت آمیز اصرار کے بعد نگار کو آدھے گھنٹے رکنا ہی پڑا۔ پھر وہ اپنی کار وہیں چھوڑ کر وقاص کی کار میں وہاں سے روانہ ہوئی۔

شاپنگ تو اسے کچھ کرنا نہیں تھی۔ اس نے بس صنوبر کے لیے ایک ٹرائیکل خریدی اور ایک دکان سے صنوبر کے لیے گلاب جامن خریدیں۔ وہ خود زیادہ مٹھائی نہیں کھاتی تھی۔

اپارٹمنٹس واپس پہنچ کر اسے ٹرائیکل اوپر لے جانے کے لیے پارکنگ شیڈ کے چوکیدار سے کہنا پڑا۔ اسی نے ٹرائیکل اوپر پہنچائی، اسی وقت نگار کو خیال آیا کہ لاش کا ڈبا لانے کے لیے بھی چوکیدار سے کہہ سکتی تھی۔ اسی خیال کے باعث اس نے اس وقت چوکیدار کو معمول سے زیادہ ”ٹپ“ دی۔ چوکیدار خوش ہو گیا۔ نگار چاہتی بھی یہی تھی۔

خوب صورت ٹرائیکل صنوبر نے اسی وقت اپارٹمنٹ میں چلانا شروع [illegible]ی۔ اس میں وہ اتنی مگن ہوئی تھی کہ اسے شرجیل سے فون پر بات کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ یہ نگار کے لیے اطمینان بخش بات تھی......

کھانے کے بعد بھی صنوبر نے کچھ دیر ٹرائیکل چلائی۔ سونے کے لیے جب ماں بیٹی کمرے میں گئیں تو گزشتہ رات کی طرح نگار نے اسے گلاب جامن میں ذرا سی خواب آور دوا دے دی۔

اب نگار کو اس کا انتظار تھا کہ رات کچھ اور گزر جائے۔ وہ بستر پر لیٹی پریشان کن خیالات میں گھری رہی۔ جب سے شرجیل اس کے ہاتھوں سے ہلاک ہوا تھا اور اس کی لاش کمرے ہی میں رہی تھی، اسے کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے کسی وقت بھی لاش اٹھ کر اس پر جھپٹ پڑے گی۔ اسی لیے وہ اس سے جلد از جلد نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ساڑھے دس بجے وہ اٹھی۔ ساڑی کے بجائے شلوار سوٹ اس نے پہلے ہی پہن لیا تھا۔ جو کام اب وہ کرنے جا رہی تھی، اس میں ساڑی دشواری کا سبب بنتی۔

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

وہ کمرا مقفل کر کے ڈرائنگ روم میں پہنچی جہاں زلیخا بائی ٹی وی کا کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ اس نے آواز بہت ہلکی رکھی تھی تاکہ نگار کے کمرے تک ذرا بھی نہ جاسکے۔ نگار کو دیکھ کر وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

"مجھے خیال تھا کہ تم جاگ رہی ہوگی۔ رامی تو جلدی سو جاتی ہے۔ تم ذرا نیچے جاؤ، پارکنگ شیڈ میں۔ وہاں سے چوکیدار کو بلا لاؤ۔ اس سے کہنا کہ میں بلا رہی ہوں۔"

"کس چوکیدار کو بیگم صاحب؟" زلیخا بائی نے پوچھا۔ پارکنگ شیڈ کے دو چوکیدار تھے۔

نگار نے نام بتایا، پھر کہا۔ "دراصل جو سامان میرے کام کا نہیں رہا، وہ میں نے ڈبے میں بھر دیا ہے۔ پہلے تو سوچا تھا کہ گودام میں رکھوا دوں گی لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے فائدہ کیا۔ بہتر ہے کہ وہ سامان کسی غریب کے کام آجائے۔ وہ سب میں اب ایک فلاحی ادارے کو دے دوں گی۔ کل مجھے دفتر میں بہت مصروفیت ہوگی اس لیے یہ کام اسی وقت کر ڈالنا چاہتی ہوں۔ ڈبا بہت وزنی ہوگیا ہے۔ چوکیدار ہی اسے گھسیٹ کر لفٹ تک لے جاسکتا ہے اور نیچے لے جا کر کار کی ڈکی میں رکھ سکتا ہے۔ تم جا کر اسے بلا لاؤ۔ میرا نام لوگی تو وہ فوراً آجائے گا۔"

"جی اچھا۔" زلیخا بائی نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

نگار اتنی مضطرب تھی کہ بیٹھ کر انتظار کرنے کے بجائے ٹہلنے لگی۔ اس وقت اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ جو کچھ وہ اب تک کرتی رہی تھی اور جو کرنے جارہی تھی، وہ آنے والے دلوں میں اس کے لیے خاصی پریشانیوں کا سبب بنے گا۔

زلیخا بائی چوکیدار کو لے آئی۔ نگار نے چوکیدار کو بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ فوراً تیار ہوگیا۔ جب اس نے ڈبا اس کے بیڈ روم سے گھسیٹ کر باہر نکال لیا تو نگار کے لیے کمرا مقفل کرنا ضروری نہیں رہا۔

"تم دروازہ بند کر کے میرے کمرے ہی میں آجانا۔" نگار نے زلیخا بائی سے کہا۔ "صنوبر ویسے تو گہری نیند سو رہی ہے لیکن شاید اس کی آنکھ کھل جائے۔ مجھے نہیں پائے گی تو گھبرائے گی۔"

"بہتر۔"

نگار نے تیزی سے قدم بڑھائے اور بیرونی دروازے تک پہنچ گئی۔ چوکیدار ڈبے کو گھسیٹ کر پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ نگار اس کے ساتھ باہر نکلی۔ زلیخا بائی نے اپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

لفٹ اتنی بڑی تھی کہ اس میں ڈبا آسانی سے آسکتا تھا۔

"اس وقت اتنا بڑا ڈبا لے کر کہاں چل دیں؟" پڑوس کی ایک عورت بھی لفٹ میں تھی، اس نے نگار سے پوچھا۔

"کچھ سامان ہے۔ کہیں پہنچانا ہے۔" نگار نے جواب دیتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ کوشش اس لیے کرنا پڑی کہ وہ اس وقت شدید اعصابی تناؤ کا شکار تھی۔

چوکیدار نے نیچے پہنچ کر ڈبا لفٹ سے نکالا اور اسے گھسیٹتا ہوا وقاص کی کار تک لے گیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ نگار اسی کار میں آئی تھی۔ وہاں رک کر وہ اپنی پھولی ہوئی سانس درست کرنے لگا۔

"ڈکی میں رکھنا ہے اسے۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔" نگار بولی۔

"ارے نہیں بیگم صاحب جی!" چوکیدار ہنس کر بولا۔ "بس ذرا سانس لے لوں۔ میں ہی رکھ دوں گا اسے ڈکی میں۔ یہ کار آپ اسی کے لیے لائی ہیں؟"

"ہاں، ایک دوست کی ہے۔ میری کار کی ڈکی میں تو یہ ڈبا آتا نہیں۔"

"جی بیگم صاحب جی! اس میں تو نہیں آتا۔"

نگار نے ڈکی کھول دی تھی۔

جلد ہی چوکیدار نے اپنی سانسوں پر قابو پالیا اور پھر ڈبا اٹھا کر ڈکی میں رکھ دیا۔ نگار نے ڈکی بند کی اور پرس سے [illegible] روپے اس کی جیب میں [illegible]

نگار نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا کہ اب تک تو سب کام آسانی سے ہوتا رہا ہے۔

کار سڑک پر پہنچ گئی۔ ابھی رات اتنی نہیں گزری تھی کہ ٹریفک نہ ہوتا لیکن بیس منٹ بعد ہی نگار ایسی سڑک پر پہنچ گئی جہاں اکا دکا گاڑیاں آجارہی تھیں۔

بارہ بج چکے تھے جب نگار کی کار اس پل پر تھی جس کے نیچے سمندر بہہ رہا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی دوسری گاڑی نہیں تھی لیکن سامنے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آرہی تھیں۔ وہ گاڑی قریب آتی جارہی تھی۔ نگار نے کار کی رفتار کم کی۔ اسے پل پر اس وقت رکنا تھا جب وہاں مکمل سناٹا ہوتا۔ یہیں سے اسے وہ ڈبا سمندر میں پھینکنا تھا۔ ذہنی طور پر منتشر ہونے کے باعث اس کے دماغ میں اب تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ ڈکی سے وہ وزنی ڈبا اتارنا کیا اس کے لیے ممکن ہوگا؟

کار خاصا آگے لے جانے کے بعد اس نے اسے روک کر واپسی کے لیے موڑا۔ اب وہ اس گاڑی کی عقبی سرخ روشنی دیکھ رہی تھی جس کی کچھ ہی دیر پہلے ہیڈ لائٹس دیکھی تھیں۔ وہ سرخ روشنی دور ہوتی جارہی تھی۔

نگار نے جب کار ایک جگہ روکی تو جانے والی گاڑی کی عقبی سرخ روشنیاں معدوم ہوچکی تھیں۔ اب آگے پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ نگار نے کار سے اتر کر ڈکی کھولی۔ اس وقت اسے خیال آیا کہ کیا وہ ڈبا نکال سکے گی؟

یہ خیال آنے کے باوجود اس نے ڈبا نکالنے کے لیے زور لگایا اور اسے تھوڑا ہی سا سرکانے میں کامیاب ہوسکی۔ اس کے لیے بھی اسے اپنی پوری طاقت استعمال کرنی پڑی تھی۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے کمرے کے فرش پر تو ڈبے کو ادھر ادھر سرکاتی رہی تھی لیکن سپاٹ فرش اور ڈکی میں فرق ہوتا ہے۔

یہ اندازہ اسے ہوگیا کہ وہ ڈبا نکال تو لے گی لیکن اس میں وقت خاصا گزر جائے گا۔ اس دوران میں ادھر پھر کوئی گاڑی بھی آسکتی تھی۔

ایک گھنٹے میں وہ ڈبا ڈکی سے باہر سڑک پر گرانے میں کامیاب تو ہوگئی لیکن اس کی سانس بری طرح پھول گئی تھی اور سارا جسم پسینے پسینے ہوگیا تھا۔

وہ کھلی ہوئی ڈکی پر ہی بیٹھ کر سانس درست کرنے لگی [illegible] بھی نہیں گزرے تھے کہ اسے اسی جانب [illegible] نظر آئی۔ ہیڈ لائٹس کی [illegible] سے [illegible] طور پر اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کس قسم کی گاڑی ہوگی لیکن وہ کسی قسم کی بھی گاڑی ہوتی، اسے دیکھ کر نگار پریشان تو ہوئی۔ پہلی بار اسے خیال آیا کہ وہ جو کچھ منصوبہ بندی کرتی رہی تھی، اس پر عمل کرنا آسان نہیں تھا۔

پھر اسے عقب سے بھی روشنی کا احساس ہوا۔ اس نے ڈکی سے اتر کر اس طرف دیکھا۔ ادھر سے بھی کوئی گاڑی آرہی تھی۔

نگار کی پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ وہ لوگ اسے اس طرح وہاں دیکھ کر حیران تو ہوتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ وہاں رک بھی جاتے۔ نگار کا دماغ ناکارہ سا ہونے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگر وہ لوگ رک گئے تو وہ انہیں کیا بتائے گی کہ وہ یہاں اس عالم میں کیسے کھڑی تھی۔

سامنے سے آنے والی گاڑی اس کے قریب آکر رک گئی۔ اس میں سے جو شخص اترا اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ وضع قطع سے خاصا خوش حال نظر آرہا تھا لیکن اس کی کار معمولی قسم کی تھی۔

نگار نے ڈکی بند کردی۔

"معاف کیجیے گا محترمہ!" اجنبی قریب آکر بولا۔ "آپ یہاں اس وقت اور یہ......" اس نے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور استفہامیہ نظروں سے نگار کی طرف دیکھنے لگا۔

"گھر کا خاصا سامان بے کار ہوگیا تھا۔" نگار فوری طور پر یہی جواب دے سکی۔ "وہی بھر کر لائی تھی ڈکی میں۔ اسے سمندر میں پھینکنا ہے۔"

"اوہ...... اتنا بڑا ڈبا!" اجنبی نے جھک کر ڈبے کو نہ صرف چھوا بلکہ اسے سرکانے کے لیے کچھ طاقت بھی صرف کی۔ دوسری طرف سے آنے والی گاڑی قریب آکر سست تو ہوئی تھی لیکن رکی نہیں اور رفتار بڑھا کر دور ہوتی چلی گئی۔

"ڈبا تو خاصا وزنی ہے۔" اجنبی نے کہا۔ "آپ اسے ڈکی ہی میں رکھ کر لائی ہوں گی۔"

"جی ہاں......"

"بڑی ہمت کی آپ نے کہ اسے ڈکی میں رکھ لیا۔" اجنبی بولا۔ "اسی کی وجہ سے آپ تھکی ہوئی بھی نظر آرہی ہیں۔ اسے ڈکی سے اتارنے میں بھی مشکل ہوئی ہوگی۔ اب آپ اسے سمندر میں پھینکنے کے لیے گرل پر کیسے چڑھائیں گی؟" سڑک کے کنارے لوہے کے پائپ لگائے گئے تھے۔

"[illegible]ش تو کروں گی۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں؟"

"اوہ، یقیناً میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔"

اسی دوران میں ایک اور کار بھی وہاں سے گزری۔ رفتار اس کی بھی سست ہوئی تھی۔ اگر نگار تنہا نظر آتی تو شاید اس کار سے بھی کوئی اترتا لیکن ایک مرد کو بھی وہاں دیکھ کر رکنا ضروری نہیں سمجھا گیا ہوگا......

اجنبی ڈبے کو گھسیٹتا ہوا سڑک کے کنارے لگے پائپس کی طرف لے جانے لگا۔ اس میں نگار نے بھی اس کا ساتھ دینا چاہا تو وہ ہنس کر بولا۔ "ابھی آپ خود کو نہ تھکائیں۔ جب ڈبا اوپر چڑھانا ہوگا، تب کچھ مدد کیجیے گا میری۔"

نگار نے اس کی بات مان لی۔ اسے خود بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ اتنا کچھ کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے اب تک کے اقدامات اضطراری ہی کہے جاسکتے تھے۔ اس میں غور و فکر کا دخل نہیں تھا۔

اجنبی نے نگار کی برائے نام مدد سے ڈبا اٹھا کر سمندر میں پھینکا۔ اس کے سمندر میں گرنے سے خاصی آواز ہوئی تھی۔

http://urdutubes.com/

اس کام سے اجنبی کی سانس بھی قدرے پھول گئی تھی حالانکہ وہ خاصا تندرست تھا۔

''چلیے آپ کا یہ کام تو ہوا۔'' اجنبی نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

''میں شکر گزار ہوں آپ کی۔'' نگار نے کہا۔

''میرا نام سلمان ہے۔'' وہ بولا۔ اس کا مقصد یہی ہوگا کہ نگار بھی اپنا نام بتا دے۔

اور نگار نے بتا دیا۔

سلمان بولا۔ ''آپ کے گھر میں کوئی مرد نہیں جو یہ کام کرسکتا ہو؟''

''میرے شوہر ہیں لیکن وہ آج کل شہر سے باہر ہیں۔''

''میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو مجھے یاد کرلیجیے گا۔ یہ میرا کارڈ ہے۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر نگار کی طرف بڑھایا اور مزید کہا۔ ''اس پر میرا ٹیلی فون نمبر، موبائل نمبر، گھر کا پتا، سب کچھ لکھا ہوا ہے۔''

''جی۔'' نگار نے کارڈ لے لیا۔

''آپ مجھے ایک اچھی خاتون معلوم ہوتی ہیں۔'' سلمان نے کہا۔ ''کیا ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست نہیں بن سکتے......؟''

''یہ دوستی ہی ہے کہ آپ نے میری اتنی مدد کی۔''

''تو پھر کیا میں آپ کا فون نمبر معلوم کرسکتا ہوں؟''

نگار نے اسے اپنا موبائل نمبر بھی بتا دیا۔

سلمان نے فوراً اپنی جیب سے موبائل [illegible] اس کا نمبر فیڈ کرلیا۔

''ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔'' سلمان بولا۔ ''یہ میں اس لیے سمجھ رہا ہوں کہ آپ کی گاڑی کا رخ دوسری طرف ہے۔ میں بھی ادھر ہی سے آرہا ہوں جہاں سے آپ آئی ہیں اس لیے مجھے امید ہے کہ جلد ہی ہم پھر ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔ فی الحال تو میں قریب ہی ایک جگہ جارہا ہوں لیکن کل دوپہر تک واپس بھی آجاؤں گا۔ کل شام یا پرسوں فون کروں گا آپ کو۔ اگر اس وقت تک آپ کے شوہر واپس آگئے تو ہماری ملاقات ان کی موجودگی ہی میں ہوگی۔ میں انہیں مبارک باد بھی دوں گا کہ انہیں آپ جیسی اچھی شریکِ حیات ملی ہے۔ کیا اب آپ مجھے اجازت دیں گی؟''

''جی ضرور۔ خاصا وقت ضائع ہوگیا آپ کا۔''

سلمان ہنسا۔ ''جب ہم دوست بن چکے ہیں تو آپ کو اس قسم کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اچھا خیر، اب چلوں گا۔ خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔'' نگار کی آواز بہت دھیمی تھی۔

اتنی دیر میں وہاں سے کئی کاریں گزر چکی تھیں۔ ہیوی ٹریفک کو اس پل سے گزرنے کی اجازت نہیں تھی۔

سلمان اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا تو نگار بھی کار میں بیٹھی اور اسے واپسی کے لیے موڑا۔ شرجیل کی لاش سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس کے دماغ کا خاصا بوجھ کم ہوگیا تھا لیکن یہ خیال اسے اس وقت بھی نہیں آیا کہ وہ بہت سی غلطیاں کرچکی ہے۔

☆☆☆

دوسری صبح وہ دفتر گئی۔

''تم میری ہی کار میں آئے ہو نا؟'' اس نے وقاص سے پوچھا۔

''جی ہاں، ظاہر ہے۔ آپ نے کہا بھی تھا۔''

''اب تم اپنی کار لے جانا۔'' نگار نے اسے اس کی کار کی چابی دیتے ہوئے کہا۔

وقاص نے بھی اس کی کار کی چابی لوٹا دی اور کہا۔ ''میری کار سے آپ کا سب کام اطمینان بخش طور پر ہوگیا نا؟''

''ہاں بالکل، میں تمہاری شکر گزار ہوں۔''

''شرمندہ نہ کیجیے...... اور ہاں...... غزالہ کو صنوبر بہت پیاری لگی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آپ اسے کبھی کبھی ہمارے گھر لایا کیجیے۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ چلو اب کام شروع کیا جائے۔ دو دن تو ضائع ہوچکے ہیں۔''

[illegible]

جلدی مکمل طور سے پُرسکون ہوا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بہرحال تھی کہ کسی وقت بھی شرجیل کے بھائی راحیل کا فون آسکتا تھا۔ دو ایک دن کے وقفے سے دونوں بھائیوں میں ٹیلی فون پر بات ہوتی تھی۔ امکان تھا کہ وہ نگار ہی کو فون کرتا۔ شرجیل کے موبائل سے اس کا رابطہ ہی نہیں ہو پاتا۔ نگار نے شرجیل کا موبائل بھی بند کرکے لاش کے ساتھ ڈبے میں ڈال دیا تھا۔

نگار کا یہ خیال درست ہی ثابت ہوا۔ شام کو جب وہ گھر پر تھی تو راحیل کا فون آگیا۔

''کیا حال چال ہیں بھابی؟'' اس نے پوچھا۔ ''بھائی صاحب آج کہاں مصروف ہیں کہ انہوں نے اپنا فون ہی بند کر رکھا ہے۔ صبح سے کئی مرتبہ کوشش کرچکا ہوں۔''

اس بارے میں نگار پہلے ہی سوچ چکی تھی۔ اس نے صنوبر سے کہہ بھی دیا تھا کہ اس کے ڈیڈی اس کے چچا سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو راحیل؟'' نگار نے اپنے لہجے میں حیرت کا عنصر پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔ ''وہ تو پرسوں یہاں کہہ کر گئے تھے کہ کسی کام سے تمہارے پاس جارہے ہیں۔''

''ارے...... نہیں بھابی! وہ میرے پاس تو نہیں آئے۔''

''اوہ! تو پھر کہاں چلے گئے؟''

''کیا آپ سے بھی پرسوں سے اب تک فون پر کوئی رابطہ نہیں ہوا؟''

''نہیں۔ جب وہ گئے تھے تو مجھ سے کچھ ناراض تھے۔ بہت معمولی سی بات تھی۔ میں نے صنوبر کی گورنس تبدیل کردی تھی جبکہ وہ چاہتے تھے کہ پہلی ہی گورنس کو رہنے دیا جائے۔ اتنی سی بات پر ان کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ میں نے اس معاملے کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں۔ سوچا تھا کہ جب وہ آئیں گے تو ان کا موڈ ٹھیک ہوچکا ہوگا لیکن اب تو یہ تشویش ناک بات ہے کہ وہ تمہارے پاس بھی نہیں پہنچے۔''

''تشویش ناک نہیں، بہت تشویش ناک بات ہے۔'' راحیل نے کہا۔

''اچھا تم پانچ منٹ بعد میرے دوسرے فون کا انتظار کرنا۔ ان کا ایک نمبر اور ہے جس پر وہ صرف مجھ سے بات کیا کرتے تھے۔ وہ نمبر انہوں نے کسی اور کو نہیں دیا تھا۔''

[illegible]

''میں بس دو تین منٹ بات کروں گی ان سے، پھر فوراً تمہیں فون کرتی ہوں۔''

نگار نے رابطہ منقطع کیا اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ وہ شرجیل کو فون کرتی لیکن یہ اس نے راحیل سے غلط نہیں کہا تھا کہ شرجیل نے اپنا ایک نمبر اس کے علاوہ کسی کو نہیں بتایا تھا۔

اس دوسرے نمبر کی ''سم'' بھی اسی موبائل میں تھی جو نگار نے شرجیل کی لاش کے ساتھ ڈبے میں ڈال دیا تھا۔

صنوبر اس وقت زلیخا بائی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھی۔

تین منٹ بعد ہی نگار نے راحیل کو فون کیا اور پریشان ہوجانے والے لہجے میں کہا۔ ''اس نمبر پر بھی رابطہ نہیں ہورہا ہے راحیل!''

''مائی گاڈ!...... یہ تو...... بھابی میں ابھی آتا ہوں وہاں۔ تین گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ میں آٹھ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔''

''آجاؤ۔ اب میرا دل بھی بہت گھبرانے لگا ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اپنے دونوں نمبر بند رکھیں۔''

''میں آرہا ہوں۔'' راحیل نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

اب نگار کا اضطراب ایک بار پھر بڑھنا شروع ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ بات اب راحیل کے ذریعے پولیس تک جائے گی۔ وہ اس صورتِ حال میں بھائی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے ہی کا فیصلہ کرتا......

وہ آٹھ بجے سے کچھ پہلے ہی آگیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ نگار اسے اپنے بیڈروم میں لے گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان دونوں کی گفتگو صنوبر اور زلیخا بائی کے سامنے ہو۔

''بھابی! اس کی تو رپورٹ درج کرانی چاہیے۔'' راحیل بولا۔ ''یہ ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دو دن سے غائب ہیں اور کسی سے رابطہ بھی نہیں ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے ان کے دفتر کے ایک دوست کو بھی فون کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ بھائی صاحب دو دن سے دفتر بھی نہیں آئے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اچھا ہوا کہ تم نے فون کرلیا اور پھر آ بھی گئے۔ میرے لیے مشکل ہوتا پولیس کا سامنا کرنا۔''

''رپورٹ کرنے تو آپ کو میرے ساتھ چلنا ہی ہوگا۔''

''تم ساتھ ہوگے تو مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''بس اب دیر نہ لگائیں!'' راحیل کھڑا ہوگیا۔ ''چلو!''

وہ دونوں اسی وقت پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے جو تین میل سے زیادہ دور نہیں تھا۔

راحیل نے سب سے پہلے ایس ایچ او سے ملنا ضروری سمجھا۔ خوبصورت اور پُروقار نگار کی وجہ سے ایس ایچ او بڑے اچھے انداز میں پیش آیا۔ اس نے صورتِ حال بڑے تحمل سے سنی۔ پھر سر ہلا کر بولا۔ ''کسی کا دو دن تک غائب رہنا یقیناً پریشانی کی بات ہے۔ آپ رپورٹ تو درج کرائیں۔ میں یہ کیس کسی ذہین افسر کے سپرد کروں گا۔''

رپورٹ نگار کی طرف سے درج کرائی گئی۔

ایس ایچ او نے اس دوران میں ایک شخص کو بلالیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ عمر چالیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ ایس ایچ او نے اس کا تعارف کرایا۔ ''یہ جمال ابدالی ہیں لیکن انہیں ہم لوگ صرف ابدالی کہتے ہیں۔ یہی آپ کے کیس کی تفتیش کریں گے۔''

''معاملہ کیا ہے؟'' ابدالی نے پوچھا۔

''انہوں نے رپورٹ درج کرادی ہے۔ وہ پڑھ لو،

http://urdutubes.com/

پھر جو چاہو ان سے پوچھ لینا۔"

"آپ میرے ساتھ آیئے۔" ابدالی نے نگار اور راحیل سے کہا۔

وہ انہیں پولیس اسٹیشن ہی کے ایک اور کمرے میں لے گیا۔ اس نے ان دونوں کو سامنے بٹھا کر رپورٹ پڑھی، پھر سر ہلاتے ہوئے یکے بعد دیگرے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"تو آپ کا اپنے شوہر سے جھگڑا بھی ہوا تھا؟" اس نے نگار سے پوچھا۔

"میں اسے جھگڑا تو نہیں کہہ سکتی، بس کچھ تلخی ہو گئی تھی۔" نگار نے جواب دیا۔ "جھگڑے کا مطلب تو کچھ اور ہوتا ہے۔"

"میں پڑھ چکا ہوں رپورٹ میں۔ جھگڑے کا لفظ روا روی میں میرے منہ سے نکل گیا۔ تو اس تلخی ہی کی وجہ سے آپ نے انہیں فون نہیں کیا اور ان کا فون نہ آنے سے آپ سمجھتی رہیں کہ وہ اس طرح اپنی خفگی کا اظہار کر رہے ہیں۔"

"جی۔"

"معاملہ کسی گورنس کا تھا؟"

"جی ہاں......"

"وہ جس گورنس کو رکھنا چاہتے تھے، اس کا نام نہیں لکھوایا آپ نے!"

"وہ میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔"

"میں اسے ضروری سمجھتا ہوں۔"

نگار نے شفیقہ کا نام بتا دیا۔

ابدالی نے پوچھا۔ "آپ کے شوہر اسی کو کیوں رکھنا چاہتے تھے؟"

"شاید وہ اسی کو زیادہ بہتر گورنس سمجھتے ہوں لیکن میری بیٹی کو وہ پسند نہیں تھی......"

"شفیقہ کی عمر کیا ہے؟"

"میں نے اس سے پوچھا نہیں تھا۔ چوبیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔"

"اوہ، جوان ہے۔" ابدالی نے بے اختیار کہا، پھر بولا۔ "اس کے گھر کا پتا؟"

"وہ میرے علم میں نہیں ہے۔"

"تفصیلات جانے بغیر ہی رکھ لیا تھا اسے؟"

"دراصل جب وہ گھر آئی تھی تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے شرجیل نے بھیجا ہے۔ میں نے فون کر کے شرجیل سے تصدیق بھی کر لی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ ضرورت مند ہے۔ ملازمت کے لیے ان کے دفتر گئی تھی۔ وہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور صنوبر کے لیے گورنس کی ضرورت تھی کیونکہ پہلے جو گورنس تھی، وہ کسی وجہ سے ملازمت چھوڑ گئی تھی۔ اسی لیے شرجیل نے اس کا انتخاب کر لیا تھا۔ غالباً انہی کو سب کچھ معلوم ہوگا اس کے بارے میں...... میں نے پوچھ کچھ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔"

"گورنس کی ضرورت کیوں تھی آپ کو اپنی بیٹی کے لیے......؟ آپ کی کیا مصروفیت رہتی ہے؟"

نگار نے اس سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دے دیا۔

"اوہ، خوب!" ابدالی نے کہا۔ "تو وہ نگار صاحبہ ہیں آپ! اس کمپنی کے حوالے سے یہ نام سامنے تو آ چکا ہے لیکن ابھی آپ سے ملتے ہوئے قطعی خیال نہیں تھا کہ آپ وہ نگار ہوں گی۔ اس کمپنی کی خاصی دھوم مچ گئی ہے آپ کی وجہ سے۔ اچھا خیر! مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ آپ کے شوہر کہاں ملازمت......"

نگار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دے دیا۔

"خوب!" ابدالی بولا۔ "وہ تو بہت اچھی پوسٹ پر ہیں۔ بہت معقول تنخواہ ہو گی ان کی۔ آپ نے ملازمت کیوں کی؟"

"بس شوق ہے یہ میرا۔"

اس دوران میں راحیل نہ جانے کیوں پہلو بدلنے لگا تھا۔ اس موقع پر وہ بول پڑا۔ "معاف کیجیے گا ابدالی صاحب! کیا میں کچھ کہوں؟"

"[illegible] ہاں، ضرور......"

"[illegible] اس [illegible] رہی ہے جیسے یہ کوئی عام قسم کی صورت حال ہو۔ میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔ نہ جانے بھائی صاحب کہاں ہیں اور ان پر کیا گزر چکی ہے یا کیا گزر رہی ہے۔"

"ہم لوگوں کے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہوتی مسٹر راحیل!" اس مرتبہ ابدالی کا لہجہ کچھ خشک ہو گیا۔ "بس گھمائی چھڑی اور سب کچھ معلوم ہو گیا۔ سارے حالات سے باخبر ہونے کے بعد ہی کوئی لائحہ عمل بنایا جا سکتا ہے۔ میں اس معاملے کو فوری طور پر سنگین سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میرے ذہن میں یہ امکان بھی ہے کہ جسے نگار صاحبہ معمولی تلخی کہہ رہی ہیں، وہ ممکن ہے کہ شرجیل صاحب نے شدت سے محسوس کی ہو۔ ہمارے معاشرے میں مرد بہرحال برتری چاہتا ہے۔ انہیں وہ تلخی زیادہ بری بھی لگ سکتی ہے جس کے نتیجے میں انہوں نے خود ہی روپوشی اختیار کر لی ہو۔ اس طرح وہ اپنی دانست میں نگار صاحبہ کو

پریشان کر کے انہیں اس تلخی کی سزا دینا چاہتے ہوں۔ آپ تو آج ہی آئے ہیں دوسرے شہر سے۔ نگار صاحبہ براہِ راست متاثر ہیں اس معاملے میں اور یہی مجھے ساری صورت حال بتا سکتی ہیں۔ آپ مجھے ان سے بات کرنے دیں۔"

راحیل کے چہرے سے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ابدالی کے اندازِ گفتگو سے تلملا گیا ہو لیکن پھر وہ کچھ بولا نہیں اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

ابدالی پھر نگار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ انہیں کسی نے اغوا کر لیا ہے تو ایسی صورت میں اغوا کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ آپ سے تاوان تو نہیں مانگا گیا۔ دوسرا امکان میں ظاہر کر چکا ہوں۔ وہ آپ کو اس تلخی کی سزا دینے کے لیے روپوش ہو گئے ہوں۔ تیسرا امکان یہ ہے کہ ان کا کوئی دشمن ہو۔ آپ اس بارے میں کیا بتا سکتی ہیں؟"

"اگر ان کی کسی سے دشمنی تھی تو مجھے اس کا علم نہیں۔"

نگار اپنی دانست میں بہت احتیاط سے جواب دے رہی تھی۔ پولیس اسٹیشن میں قدم رکھتے ہی اس کے ذہنی دباؤ میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا جس کی وجہ یہی تھی کہ اس کے دل میں چور تھا۔ شرجیل اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

"میں دشمنی کے امکان کو نظر انداز اس لیے نہیں کر سکتا کہ شرجیل صاحب کا مزاج خاصا گرم ہے۔ صرف ایک گورنس کی وجہ سے وہ اتنے تلخ ہو گئے۔ ایسا شخص اپنے دشمن [illegible]

"[illegible] تو [illegible]" راحیل بول پڑا۔ "ان [illegible] کو [illegible] سنگین ہی سمجھا جانا چاہیے۔"

"میں نے جس رائے کا اظہار کیا ہے، وہ حتمی بات نہیں ہے۔ میرا یہ خیال غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" اس کے بعد وہ پھر نگار سے مخاطب ہو گیا۔ "بس ایک آخری سوال! آپ نے ان کے دو فون نمبرز بتائے ہیں۔ آپ کو یقین ہے کہ ان کا کوئی تیسرا نمبر نہیں تھا؟"

"اگر تھا تو وہ میرے علم میں نہیں ہے۔"

"اچھا ہاں۔ ایک سوال اور! کیا وہ اپنی گھر سے باہر کی سرگرمیاں آپ سے شیئر کرتے تھے؟"

"جی نہیں۔"

"اچھا! تو پھر یہ بتایئے۔ کبھی آپ نے ان کی بیرونی سرگرمیاں جاننے کی کوشش کی؟ یعنی ان سے کچھ پوچھا؟"

"جی نہیں۔"

"اوہ! یہاں سے تو بات کچھ آگے بڑھ رہی ہے۔ بیویاں تو عموماً اپنے شوہر کی بیرونی سرگرمیاں جاننے کی خواہاں رہتی ہیں لیکن آپ نہیں تھیں۔ کیا میں اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا کہ آپ دونوں کے تعلقات کچھ خوشگوار نہیں تھے؟"

اس موقع پر نگار کے سینے میں اس کا دل بڑی زور سے اچھلا۔ اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ہر ایک کے اپنے مزاج کی بات ہوتی ہے ابدالی صاحب! میں اسے اچھا نہیں سمجھتی کہ بیویاں اپنے شوہر کی ٹوہ میں لگی رہیں۔ اس سے آپ یہ نتیجہ اخذ نہ کیجیے کہ ہمارے تعلقات اچھے نہیں تھے۔"

"ہوں۔" ابدالی نظریں جھکا کر کچھ سوچنے لگا، پھر کچھ لمحے بعد یکایک کھڑا ہو گیا۔ "میں دیکھوں گا کہ اس معاملے میں جلد از جلد کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ میں کسی بھی امپروومنٹ کی صورت میں آپ کو اس سے آگاہ رکھوں گا۔"

ابدالی کے کھڑے ہونے کا مطلب یہی تھا کہ اب راحیل اور نگار کو پولیس اسٹیشن سے رخصت ہو جانا چاہیے۔

وہاں سے واپسی پر نگار نے بھرائی ہوئی آواز میں راحیل سے کہا۔ "میرا دل اب بہت گھبرا رہا ہے۔"

"معاملہ ہی ایسا ہے بھابی! پولیس والے تو اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔"

"ان کے لیے تو اس قسم کے معاملات خاص نہیں ہو سکتے نا راحیل!...... انہیں تو ہر وقت اس قسم کے معاملات سے دوچار رہنا پڑتا ہوگا۔"

اسی وقت راحیل کا موبائل بج اٹھا۔ "قدسیہ کا فون ہو [illegible]" اس [illegible] موبائل جیب سے نکالتے ہوئے کہا، پھر [illegible] پر نظر [illegible] ال کر بولا۔ "ہاں وہی ہے۔" اس نے کال ریسیو کی۔ "ہاں قدسیہ! مجھے اندازہ تھا کہ تم پریشان ہو گی...... ہاں دیر تو ہونا ہی تھی۔ پولیس میں رپورٹ کروا دی ہے...... اچھا ابھی بتاتا ہوں۔" کچھ سن کر اس نے آخری فقرہ کہا، پھر نگار سے بولا۔ "پوچھ رہی ہے کہ میں کب لوٹوں گا۔ آپ اگر تنہائی سے پریشان نہ ہوں تو میں واپس چلا جاؤں؟"

"ہاں تمہیں جانا چاہیے۔" نگار نے کہا۔ "یہ تو خیر ممکن نہیں ہے کہ پریشان نہ ہوں لیکن تمہارے یہاں رکنے سے پریشانی ختم تو نہیں ہو جائے گی۔ تم چلے جاؤ۔"

جواب سننے کے بعد راحیل نے اپنی بیوی سے کہا۔

"میں بس زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں روانہ ہو جاؤں گا لیکن راستے میں تین گھنٹے تو لگیں گے...... نہیں نہیں...... زیادہ پریشان نہ ہو، میں آ رہا ہوں۔" اس نے رابطہ منقطع کر دیا، پھر نگار سے کہا۔ "آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔"

نگار نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ

http://urdutubes.com/

راحیل نے جھوٹ بولا ہوگا۔ وہ قدسیہ کے مزاج سے واقف تھی۔ دونوں بھائیوں کو الگ ہی اس نے کروایا تھا۔

"وہاں میں بھی پریشان ہی رہوں گا۔" راحیل بولا۔ "فون پر آپ سے رابطہ کرتا رہوں گا۔ اگر کوئی خاص بات ہو تو آپ فون کر دیجیے گا مجھے۔ کل دفتر جا کے دو تین روز کی چھٹی لے لوں گا۔ یہ معاملہ تو......" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا، پھر کہا۔ "خدا کرے بھائی صاحب خیریت سے ہوں۔ اس پولیس افسر کا خیال ٹھیک ثابت ہو کہ وہ صرف آپ کو پریشان کرنے کے لیے خود ہی کہیں چلے گئے ہوں۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" نگار اس کے علاوہ کیا کہہ سکتی تھی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ شرجیل اب واپس کہاں سے آئے گا۔

☆☆☆

دوسری صبح تک ابدالی نے نگار کو فون نہیں کیا لیکن نگار نے دفتر جانے سے پہلے اسے فون کر لیا۔ اس نے پولیس اسٹیشن سے چلتے وقت ابدالی سے اس کا نمبر لے لیا تھا۔

"صحیح معنوں میں تو اب تفتیش شروع ہوگی نگار صاحبہ...... کوئی بھی بات سامنے آئی تو میں آپ سے ضرور رابطہ کروں گا۔" ابدالی کا جواب تھا۔

زیادہ بات نہیں ہوئی تھی۔ نگار دفتر پہنچ گئی۔ اس کا دماغ بدستور الجھا ہوا تھا۔ معاملہ ہی کچھ ایسا ہوا تھا کہ وہ پُرسکون نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ مستقبل میں کیا پوشیدہ ہے۔ کیا یہ ممکن ہوگا کہ پولیس حقیقت کی تہہ تک پہنچنے میں ناکام ہو جائے اور کیس فائل بند کر دی جائے؟

اس قسم کے بہت سے سوال اس کے ذہن میں مسلسل گردش میں تھے۔

"میڈم!" وقاص بولا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ آج بھی پُرسکون نہیں ہیں۔ معاملہ آپ کا یقیناً نجی ہوگا لیکن کسی کو اپنا حال بتانے سے دل کا بوجھ کچھ تو کم ہوتا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے کچھ...... میرا مطلب ہے...... شاید میں آپ کے کچھ کام آسکوں۔"

"نہیں وقاص!" نگار نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جو کچھ کرے گی، اب پولیس ہی کرے گی۔"

وقاص چونکا۔ "ایسی کیا بات ہے؟"

"ہاں۔" نگار نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "میرے شوہر کہیں غائب ہو گئے ہیں۔"

"ارے!"

"کل شام پولیس میں رپورٹ تو کرا دی ہے۔"

"آخر......" وقاص کی بات پوری نہیں ہو سکی تھی کہ چپراسی نے آ کر بتایا کہ محکمۂ پولیس کا کوئی آدمی نگار سے ملنے آیا ہے اور اپنا نام ابدالی بتا رہا ہے۔

نگار جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے باہر نکل کر ابدالی کا استقبال کیا اور پھر اسے اپنے دفتری کمرے میں لاتے ہوئے بولی۔ "کچھ معلوم ہوا کیا؟"

"جی ہاں۔ بات کچھ آگے تو بڑھی ہے۔ معاملہ ایسا سامنے آیا ہے کہ آپ سے اس بارے میں بات کرنی ضروری تھی۔ امکان تھا کہ آپ دفتر میں ہوں گی اس لیے میں سیدھا یہیں چلا آیا۔"

"بیٹھیے!" نگار نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ......"

"یقیناً آپ بے چین ہوں گی۔ دراصل کل جب آپ سے پولیس اسٹیشن میں بات ہوئی تھی، اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال تھا کہ اس معاملے کا کوئی سرا یا کوئی درمیانی کڑی آپ کی بیٹی کی گورنس شفیقہ سے مل سکتی ہے۔ مجھے شبہ یہ تھا کہ شفیقہ سے آپ کے شوہر کا کچھ تعلق نکل سکتا ہے۔ گورنس کے طور پر عموماً تجربہ کار عورتوں کو رکھا جاتا ہے، نہ کہ جوان لڑکیوں کو۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا لیکن آپ اس کے پتے سے بے خبر تھیں۔ اسی لیے میں آج صبح آپ سے فون کرنے کے بعد ہی آپ کے شوہر کے دفتر گیا [illegible]

ابدالی نے ابھی کوئی خاص بات نہیں بتائی تھی لیکن نگار کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی......

"وہاں سے معلوم ہوا کہ شفیقہ اکثر شرجیل صاحب سے ملنے ان کے دفتر جایا کرتی تھی۔ شرجیل صاحب نے دفتر کے لوگوں کو بتایا تھا کہ وہ ان کے خاندان ہی کی کوئی لڑکی ہے اور ملازمت کی تلاش میں ہے اس لیے ان کے پاس آتی رہتی ہے۔ ان لوگوں میں سے کسی کو شفیقہ کے گھر کا علم نہیں تھا لیکن نگار صاحبہ! میرا تجربہ ہے کہ جرائم کے معاملات میں کبھی کبھی قدرت بھی قانون کی مدد کر دیتی ہے۔ جب میں وہاں سے رخصت ہو رہا تھا...... بلکہ باہر نکل آیا تھا تو وہیں کا ایک کلرک لپکتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی جس کی مجھے توقع بھی تھی۔"

"وہ کیا؟" نگار نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"آپ کو وہ بات مجھ سے چھپانا نہیں چاہیے تھی۔" ابدالی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کیا...... کیا بات؟" نگار نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"شرجیل صاحب کے شفیقہ سے کچھ خاص قسم کے تعلقات تھے یا ہیں۔"

"مجھے اس کا علم ہی نہیں تھا تو کیسے بتاتی؟"

"پھر آپ نے اسے برطرف کرتے وقت تھپڑ کیوں مارا تھا؟"

نگار کا جسم سنسنا گیا۔ وہ ابدالی کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

ابدالی پھر بولا۔ "یہ ایک الگ کہانی ہے کہ اس کلرک کو شفیقہ کا پتا بھی معلوم تھا جو اس نے مجھے بتا دیا۔ میں فوراً جا کر شفیقہ سے ملا۔ پہلے تو اس نے اس بات سے پہلو بچانے کی کوشش کی تھی کہ آپ نے اسے کیوں برطرف کر دیا تھا لیکن میرے پیچیدہ سوالات کی وجہ سے وہ جال میں پھنس گئی۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ آپ نے اس پر یہی الزام لگا کر برطرف کیا تھا۔ اس نے بس یہ اعتراف نہیں کیا کہ آپ کا الزام درست تھا۔"

"جی۔" نگار کی آواز بھرا گئی۔ "مجھے یہ بتانا اچھا نہیں لگا تھا کہ میرے شوہر اس سے......" وہ بات مکمل کیے بغیر خاموش ہو گئی۔

"آپ نے کہا تھا کہ ان سے آپ کی معمولی تلخی ہوئی تھی لیکن جب آپ نے شفیقہ پر یہ الزام لگایا تھا تو یقیناً کسی مضبوط بنیاد پر لگایا ہوگا۔ اس صورت میں یہ ممکن نہیں کہ ان [illegible]

"آپ کے اس یقین کی وجہ؟" ابدالی نے پوچھا۔

نگار کے دماغ میں فوراً ہی یہ بات آ گئی کہ اس موقع پر اسے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی آیا کہ ایک جھوٹ بولنے کے بعد دس جھوٹ اور بولنا پڑتے ہیں جس میں انسان پھنستا ہی چلا جاتا ہے لہٰذا وہ بہت مجبوری ہی میں کوئی جھوٹ بولے تو بہتر ہوگا۔ اس نے ابدالی کو بتا دیا کہ شفیقہ سے شرجیل کے تعلقات کا علم اسے کیسے ہوا تھا۔

سب کچھ سننے کے بعد ابدالی نے کہا۔ "اس پر یقیناً ان سے آپ کی خاصی تلخ گفتگو ہوئی ہوگی۔"

"جی۔"

"آپ نے یہ بات کیوں چھپائی؟"

"میرا خیال ہے کہ بیویاں اس قسم کے معاملات کا اظہار کرنے سے عموماً گریز ہی کرتی ہوں گی۔ مجھے بھی یہ بتانا اچھا نہیں لگا تھا۔"

"آپ نے ان سے رابطے کی کوشش غالباً اس خیال سے نہیں کی ہوگی کہ آپ کے خیال کے مطابق وہ شفیقہ کے پاس چلے گئے ہوں گے۔"

"جی......"

"آپ نے یہ بات رپورٹ میں نہیں لکھوائی تھی لیکن مجھے تو بتانا چاہیے تھا۔"

"شاید غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میں ذہنی انتشار میں مبتلا تھی۔ اس عالم میں انسان کوئی بھی غلطی کر سکتا ہے۔ کیا آپ یہ تسلیم نہیں کریں گے؟"

ابدالی نے سر ہلایا۔ "آپ کی بات سمجھ میں آتی ہے۔"

"اس نے آپ کو شرجیل کے بارے میں کچھ بتایا؟"

"لاعلمی کا اظہار کیا ہے اس نے اور غالباً سچ کیا ہے۔ ہم لوگوں کو لہجے سے بھی جھوٹ سچ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ اس کی نقل و حرکت سے باخبر رہوں گا۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ لہجے سے جھوٹ سچ کا اندازہ ہو جاتا ہے لیکن کبھی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔"

اسی وقت نگار کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

نگار نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو!"

"میڈم!" دوسری طرف سے وقاص کی آواز آئی۔ "کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟ چپراسی نے بتایا تھا نا کہ کوئی پولیس والا ملنے آیا ہے آپ سے!"

"نہیں، تشویش کی کوئی بات نہیں۔ معمولی سی تحقیقات کے لیے آئے ہیں وہ صاحب!"

"[illegible] یہ بھی بتانا تھا کہ کمپیوٹر میں کوئی وائرس آ گیا ہے۔ میں نے فوراً ہی کمپیوٹر بند کر دیا تھا۔"

"یہ اچھا کیا تم نے!...... میں خود دیکھوں گی۔"

"بہتر ہے۔" نگار نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ابدالی اچانک نگار کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے ہی نگار نے ریسیور رکھا، وہ بول پڑا۔ "کون تھا جسے آپ نے بتایا کہ میں معمولی تحقیقات کے لیے آیا ہوں؟"

"میرا اسسٹنٹ تھا۔" نگار نے جواب دیا۔ "چپراسی نے آپ کی آمد کے بارے میں مجھے اسی کے سامنے بتایا تھا اس لیے اسے کرید ہوئی ہوگی۔"

"تو آپ نے...... میری آمد ہی کی وجہ سے اسے یہاں سے بھیج دیا؟"

"جی نہیں۔ دراصل میں اپنا کام دوسرے کمرے میں کرتی ہوں۔ اسے آپ میرا کمپیوٹر روم کہہ سکتے ہیں۔ پرنٹر، اسکینر وغیرہ سب وہیں ہوتا ہے۔ میں وہیں تھی

http://urdutubes.com/

جب آپ کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہیں میرا اسسٹنٹ بھی تھا۔ اس نے ابھی کمپیوٹر روم ہی سے فون کیا تھا۔''

''آپ کی بات سے ظاہر ہوا کہ آپ کا اسسٹنٹ کوئی مرد ہے، لڑکی نہیں۔''

''جی ہاں۔ وہ ایک نوجوان ہے۔ میرے لیے وہ بہت اچھا اسسٹنٹ ثابت ہوا ہے۔''

''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ میں بلاتی ہوں اسے!'' نگار نے فون پر ہی وقاص سے رابطہ کر کے اسے بلایا۔

''یہ ابدالی صاحب ہیں۔'' نگار نے تعارف کرایا۔ ''شرجیل کی گمشدگی کے بارے میں تحقیقات کی ذمے داری انہیں دی گئی ہے اور ابدالی صاحب! یہ میرا بہت ذہن اسسٹنٹ ہے، وقاص......''

وقاص نے ابدالی کو سلام کیا۔ ابدالی نے اشارے سے جواب دیتے اور غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ معنی خیز سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''آپ کو تو کسی فلم میں ہیرو آنا چاہیے۔'' وقاص خفیف سا مسکرا کر رہ گیا۔

''بیٹھو وقاص!'' نگار نے کہا۔

موبائل فون کی گھنٹی کی آواز ابھری۔ وہ آواز ابدالی کی جیب سے آئی تھی۔ اس نے فوراً موبائل نکال کر کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے کچھ سن کر یکا یک کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ ''اچھا کیا جو مجھے اس کی اطلاع [illegible] یقیناً اسے دیکھنا چاہوں گا۔ فوراً آتا ہوں۔'' [illegible] نے رابطہ منقطع کیا، پھر نگار سے بولا۔ ''کل پولیس اسٹیشن میں جس نے آپ کی رپورٹ درج کی تھی، اس نے غالباً آپ سے کہا تھا کہ آپ پولیس کو شرجیل صاحب کی تصویر مہیا کریں۔''

''جی، بس خیال نہیں رہا۔ میں ابھی لنچ کے وقت اٹھوں گی تو گھر جا کے تصویر لے کر پولیس اسٹیشن آؤں گی۔''

''یہ بہت ضروری ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

وہ بہت عجلت میں رخصت ہوا۔ نگار کے دماغ میں اس کا وہ جملہ گونج رہا تھا جو اس نے موبائل پر کسی سے کہا تھا۔

''میں یقیناً اسے دیکھنا چاہوں گا۔''

نگار سوچنے لگی کہ پولیس کو آخر ایسی کیا چیز ملی ہوگی جسے دیکھنے کے لیے ابدالی بے چین ہوگیا تھا۔

''آپ کیا سوچنے لگیں میڈم!'' وقاص بولا۔

''آں!'' نگار چونکی پھر جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ ''چلو دیکھوں، کس قسم کا وائرس آگیا ہے۔''

وہ وقاص کے ساتھ اپنے کمپیوٹر روم میں آئی۔

☆☆☆

ایک گھنٹا گزرا تھا کہ ابدالی کی کال آگئی۔

''آپ فوراً پولیس اسٹیشن آجائیں۔'' اس نے نگار سے کہا۔

''کیا کوئی خاص بات......''

''جی ہاں۔'' ابدالی نے اسے جملہ بھی پورا نہیں کرنے دیا۔

''گھر سے شرجیل کی تصویر لیتی آؤں؟''

''وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ ابھی تو آپ فوراً آیئے!''

''ٹھیک ہے۔ میں آتی ہوں۔'' نگار نے رابطہ منقطع کر کے راحیل کا نمبر ملایا اور موبائل کان سے لگالیا۔

وقاص بولا۔ ''ابھی آپ نے کسی سے کہا تھا کہ شرجیل صاحب کی تصویر لیتی آؤں۔ کیا ابدالی صاحب کا فون تھا؟''

''ہاں، مجھے پولیس اسٹیشن......'' نگار اپنی بات پوری نہیں کرسکی۔ اس کے کانوں میں راحیل کی آواز آئی تھی۔

''جی بھابی! خیریت؟''

''ابدالی آیا تھا ابھی، دفتر ہی میں لیکن وہ کہانی ذرا لمبی ہے۔ ابھی اس نے مجھے پولیس اسٹیشن بلایا ہے۔ نہ جانے کیا معاملہ ہے۔ میں تمہیں یہ اطلاع اس لیے دے رہی ہوں کہ رابطے میں رہنا۔''

''میں خود آرہا ہوں بھابی!...... چھٹی لے لی ہے میں [illegible] بے چین رہے کہ آپ کو پولیس اسٹیشن کیوں بلایا گیا ہے۔''

نگار نے کسی بچے کے رونے کی آواز سنی۔

''تمہارے ساتھ کیا قدسیہ بھی ہے؟'' نگار نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ دونوں بچے بھی ہیں۔ مجھے اب آپ کے پاس اس وقت تک رکنا چاہیے جب تک بھائی صاحب کا پتا نہ لگ جائے۔ قدسیہ کو یہاں اکیلا چھوڑنا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' نگار نے کہا۔ ''جب تم یہاں رکنا چاہتے ہو تو یہ ضروری تھا کہ قدسیہ اور بچوں کو ساتھ لے آؤ۔ اچھا اب میں فون بند کر کے روانہ ہو رہی ہوں پولیس اسٹیشن کی طرف۔'' اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''کیا میں آپ کے ساتھ چلوں میڈم؟'' وقاص بولا۔

''نہیں۔ یہ کسی طور بھی مناسب نہیں ہوگا۔''

نگار اکیلی ہی پولیس اسٹیشن روانہ ہوگئی۔ اس کا ذہن خاصا الجھا ہوا تھا اور یہ سوال تو اسے مسلسل پریشان کیے

ہوئے تھا کہ اس معاملے کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

پولیس اسٹیشن میں ابدالی اس کا منتظر تھا۔ وہ نگار کو دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔

''آیئے!'' اس نے نگار سے کہا۔

''کہیں اور چلنا ہے؟'' نگار نے اس کے ساتھ دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

''جی ہاں۔'' ابدالی نے جواب دیا۔ ''ایک دوسرے علاقے کے پولیس اسٹیشن جانا ہے۔ آپ میری کار میں چلیے۔ اپنی کار یہیں چھوڑ دیجیے۔ واپسی پر لے لیجیے گا۔''

''جی بہتر۔''

نگار ابدالی کے ساتھ اس کی کار میں روانہ ہوئی۔

''آخر بات کیا ہے؟'' وہ خاصی بے چین تھی۔

''مچھیروں کو سمندر سے ایک مرد کی لاش ملی ہے۔''

ابدالی نے اتنا ہی کہا تھا کہ نگار کا دل بہت زور سے اچھلا......

ابدالی کہتا رہا۔ ''پولیس کا طریقہ کار یہ ہے کہ اگر گمشدگی کی کئی رپورٹیں ہوں تو کہیں کوئی لاش پائے جانے کی صورت میں سبھی متعلقین کو بلا کر لاش شناخت کرائی جاتی ہے۔ پھر لاش کی شناخت ہو یا نہ ہو، اس کے بعد وہ پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی جاتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ وہ شرجیل صاحب کی لاش ہو لیکن یہ کارروائی ضروری ہے کہ آپ بھی [illegible] غائب ہوگئے ہیں لیکن جیسا میں ابھی کہہ چکا ہوں [illegible] ہے کہ آپ وہ لاش دیکھ لیں۔ مجھے امید ہے، آپ کا بیان یہی ہوگا کہ وہ شرجیل صاحب کی لاش نہیں ہے۔''

نگار کا دماغ چکرانے لگا۔ اسے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ لاش اتنی جلدی دریافت ہوجائے گی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ مچھلیاں لاش کو نوچ نوچ کر اس قابل نہیں رہنے دیں گی کہ اسے شناخت کیا جاسکے لیکن ابدالی اسے اپنے ساتھ لے جارہا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ لاش قابلِ شناخت ہوگی۔

''آپ کا تو رنگ ہی اڑ گیا نگار صاحبہ!'' ابدالی بولا۔ ''میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ ایک رسمی کارروائی ہے کہ میں اس کی شناخت کے لیے آپ کو لے جارہا ہوں۔ یہ قطعی ضروری نہیں کہ لاش دیکھنا آپ کے لیے صدمے کا باعث ہو۔''

''میرا دل بھی نہیں مان رہا ہے کہ شرجیل کو کسی نے قتل کر کے سمندر میں پھینک دیا ہوگا۔'' نگار کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''ایک بات یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی نے سمندر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کی ہو۔'' ضروری تھا کہ وہ فوری طور پر اس قسم کی باتیں بناتی۔

''خودکشی تو یہ نہیں ہے۔'' ابدالی نے کہا۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ لاش کے سر پر کسی وزنی چیز کی ضرب کا خاصا گہرا نشان ہے۔ ایسا کوئی نشان کسی خودکشی کرنے والے کے سر پر نہیں ہوسکتا۔''

ابدالی کے اس جواب سے پہلے نگار نے خود کو یہ امید دلانی چاہی تھی کہ دریافت شدہ لاش کسی اور کی ہو لیکن ابدالی کی اس بات کے بعد شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ لاش شرجیل کے علاوہ کسی کی ہوگی......

ابدالی کہتا رہا۔ ''لاش سے کچھ فاصلے پر ایک بڑا ڈبا بہتا ہوا پایا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ لاش اسی ڈبے میں بند کر کے پھینکی گئی ہو لیکن ڈبے کا ڈھکنا پانی سے کھل جانے کے باعث لاش باہر نکل گئی ہو۔ پولیس نے وہ ڈبا بھی تحویل میں لے لیا ہے۔''

''خدا نہ کرے کہ......'' نگار کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں میں آنسو بھی تیرنے لگے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا سبب شرجیل کی محبت نہیں ہوسکتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہتھکڑیاں اس کی کلائی کی طرف بڑھنے کا آغاز ہوچکا ہے۔

ابدالی پھر بولا۔ ''سر پر اتنے گہرے زخم کا مطلب یہ [illegible] کہ قاتل کوئی مرد ہو۔ کوئی عورت کسی اتنی وزنی [illegible] نہیں کرسکتی۔''

ابدالی کی یہ بات نگار کے لیے کچھ سکون کا باعث بنی چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں ہوا......

کار آخر ایک پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوگئی......

وہ لمحہ نگار کے لیے بڑا جاں گسل تھا جب اس نے شرجیل کی لاش دیکھی۔ اس کا دماغ اس بری طرح چکرایا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ابدالی نے اسے سنبھالنا چاہا تھا لیکن اسے اتنی مہلت نہیں مل سکی......

جب نگار کو ہوش آیا تو وہ کسی بینچ پر پڑی ہوئی تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پولیس اسٹیشن ہی میں تھی۔ اس نے اپنا چہرہ اور بلاؤز بھیگا ہوا محسوس کیا۔ غالباً اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لایا گیا تھا۔

نگار نے جلدی سے اٹھنا چاہا۔

''نہیں۔'' ابدالی نے اس کے شانے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ ''دھیرے دھیرے اٹھیے۔ جلدی کرنے کی

http://urdutubes.com/

صورت میں آپ کا سر پھر چکرا سکتا ہے۔"

نگار نے دیکھا کہ ابدالی کے قریب دو کانسٹیبل اور ایک پولیس آفیسر بھی تھا۔ نگار آہستہ آہستہ اٹھی۔

ابدالی بولا۔ "آپ کے اس طرح بے ہوش ہوجانے کا سبب صدمہ ہی ہوسکتا ہے اور صدمہ اسی بات کا ہوگا کہ وہ لاش......"

"یہ کیا ہوگیا!" نگار پاگلوں کی طرح بڑبڑائی۔ "میں بیوہ ہوگئی، میری بچی یتیم ہوگئی۔" اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کچھ اداکاری کرے ورنہ اس کی بے ہوشی کا سبب صدمہ نہیں، یہ خوف تھا کہ وہ کہیں قانون کی گرفت میں تو نہیں جارہی ہے؟

ایک کانسٹیبل اس کے لیے پانی لے کر آیا۔

"نہیں۔" نگار نے اپنی طرف بڑھتا ہوا پانی کا گلاس ایک طرف ہٹا دیا۔

"دو گھونٹ تو پی لیں۔" ابدالی بولا۔ "یہ ضروری ہے۔ اس سے آپ کو اپنی حالت سنبھالنے میں مدد ملے گی۔"

ابدالی کے اصرار پر اس نے پانی کے دو گھونٹ لیے اور بیٹھے بیٹھے اس طرح ایک طرف تکنے لگی جیسے سکتہ ہوگیا ہو۔

"یہ لیجیے، آپ کا موبائل۔" ابدالی نے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ "معافی چاہتا ہوں کہ میں نے موبائل آپ کے پرس سے نکال لیا تھا۔ دراصل گھنٹی بجنے لگی تھی۔ میں نے موبائل نکال کر کال ریسیو کرلی۔ وہ راحیل صاحب تھے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ آپ یہاں [illegible] وہ [illegible] دیر میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ انہوں نے جاننا [illegible] تھا کہ کال آپ نے کیوں نہیں ریسیو کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ فون پر انہیں صورتِ حال بتاؤں۔ میں یہ کہہ کر ٹال گیا تھا کہ وہ یہاں آئیں گے تو انہیں معلوم ہوجائے گا۔"

نگار نے خاموشی سے موبائل لے لیا۔ شرجیل کی لاش ملنے کے بعد اس کی پریشانی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پولیس کی تفتیش اب تیزی سے آگے بڑھے گی۔ وہ خود کو قانون کی گرفت میں جاتا ہوا محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کا مزاج کچھ ایسا تھا کہ وہ مرنے سے بھی نہیں ڈرتی تھی۔ اسے خیال صرف اپنی پیاری بیٹی صنوبر کا تھا۔ اس کا مستقبل کیا ہوگا اگر اس کی ماں گرفتار کرلی گئی۔

پندرہ منٹ میں ہی راحیل وہاں پہنچ گیا۔ وہ کسی قدر پریشان نظر آرہا تھا حالانکہ ابدالی نے اسے شرجیل کی لاش مل جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

یہ بات اسے نگار سے معلوم ہوگئی اور وہ سکتے کی سی حالت میں رہ گیا......

ابدالی اس دوران میں وہاں سے ہٹ چکا تھا لیکن راحیل کے آنے کے ایک منٹ بعد ہی وہ پھر آگیا۔

"یہ کس نے کیا ہوگا آفیسر؟" راحیل نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے کہا۔

"تفتیش آگے بڑھے گی، تبھی کچھ معلوم ہوسکے گا۔" ابدالی نے جواب دیا۔ "یہ اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔ ضروری تھا کہ ان حالات میں نگار صاحبہ کے ساتھ کوئی ہو۔ آپ انہیں لے جائیے۔ لاش اب پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی جائے گی۔ اس کے بعد...... ظاہر ہے کہ اس کی وارث نگار صاحبہ ہی ہوں گی۔"

"پوسٹ مارٹم۔" راحیل اپنے جذبات پر قابو پائے ہوئے تھا لیکن اس کی آواز میں لرزش بہرحال آگئی۔ "پوسٹ مارٹم سے تو لاش کی نہ جانے کیا حالت ہو۔ کیا اس سے پہلے میں...... لاش دیکھ سکتا ہوں۔"

"ضرور...... آیئے!"

راحیل اس کے ساتھ چلا گیا۔ چند منٹ بعد جب لوٹا تو رومال سے اپنی آنکھوں کے کنارے خشک کر رہا تھا۔

"چلیے بھابی!" اس نے نگار سے کہا۔ "میں نے ابدالی سے کہہ دیا ہے۔ تین چار گھنٹے بعد......" اس کی آواز بھرا گئی۔ "بھائی صاحب ہمیں مل جائیں گے۔"

نگار نے اس کی طرف دیکھا اور پھر نچلا [illegible] سے کاٹتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

"[illegible] ابدالی نے بتایا [illegible]" راحیل بولا۔ "آپ اس کی گاڑی میں آئی تھیں۔ آپ کی گاڑی دفتر میں کھڑی ہوگی۔"

"ہاں۔"

"میں آپ کو وہیں لے چلتا لیکن مناسب نہیں ہے کہ آپ اس وقت ڈرائیونگ کریں۔ وہاں گاڑی کھڑی رہنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟"

"کئی دن بھی کھڑی رہے تو کوئی حرج نہیں......"

"بس تو میں کسی وقت جا کر لے آؤں گا۔ آپ تو...... ظاہر ہے کہ دو چار روز دفتر نہیں جائیں گی۔"

نگار نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ راحیل اسے اپنی کار میں لے جا رہا تھا۔

"تم نے بتایا تھا۔" نگار کچھ توقف سے بولی۔ "قدسیہ اور بچے بھی ساتھ آرہے ہیں تمہارے۔"

"میں نے قدسیہ کو اس کے میکے میں چھوڑ دیا تھا۔ جب وہاں سے روانہ ہوا تھا، تبھی ابدالی سے بات ہوئی تھی۔"

نگار خاموش رہی لیکن کچھ توقف سے پھر بولی۔ "تدفین بالا ہی بالا کروانا ہوگی۔ صنوبر کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔"

"یعنی ڈیڈ باڈی گھر میں نہ لائی جائے؟"

"ہاں۔ اپارٹمنٹس کا جو احاطہ ہے، وہیں بندوبست کرنا۔"

"جی بہتر۔" راحیل نے کہا، پھر بولا۔ "آپ کی حالت تو ٹھیک نہیں ہوگی لیکن آپ بڑی ہمت اور برداشت سے کام لے رہی ہیں۔"

یہ اس نے یقیناً اس لیے کہا ہوگا کہ نگار کے چہرے پر پریشانی تو تھی جسے راحیل غمزدگی سمجھ رہا ہوگا لیکن وہ رو نہیں رہی تھی۔ اسی کو اس نے ہمت اور برداشت کا نام دیا تھا۔

نگار خاموش رہی۔ کچھ راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ پھر یہ سکوت موبائل کی گھنٹی نے توڑا۔ آواز نگار کے موبائل سے آئی تھی۔ نگار نے موبائل نکالا۔ کال کرنے والا وقاص تھا۔

"میں پریشان تھا میڈم، اس لیے فون کیا۔ بہت دیر ہوگئی آپ کو۔ خیریت تو ہے؟"

"کسی نے میرے شوہر کو قتل کردیا ہے وقاص!" نگار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ارے......" وقاص کے منہ سے نکلا۔

"دفتر میں سب کو بتا دینا۔ میں اب دو چار روز آفس نہیں آسکوں گی۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔ آخر یہ...... اچھا خیر! میں بعد میں [illegible]" [illegible] نے خود ہی رابطہ منقطع کردیا۔

"وقاص کا فون تھا؟" راحیل نے اس وقت پوچھا [illegible] جب نگار موبائل رکھ رہی تھی۔

"ہاں، میرا اسسٹنٹ تھا۔"

راحیل سر ہلا کر رہ گیا۔

گھر پہنچ کر نگار نے ملازمہ اور زلیخا بائی کو رازداری سے شرجیل کے قتل کی اطلاع دی۔ رازداری اس لیے برتی کہ صنوبر کو بے خبر رکھنا مقصود تھا۔ اس نے زلیخا بائی کو تاکید بھی کی کہ صنوبر کو وہی زیادہ سے زیادہ سنبھالے۔

"مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" نگار نے یہ بھی کہا اور اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی......

شام سے پہلے پہلے شرجیل کی تدفین ہوگئی۔ جنازے میں شرکت کے لیے نگار کے دفتر سے تقریباً سبھی لوگ آئے تھے جن میں وقاص بھی تھا۔ راحیل کے سسرال سے بھی کبھی لوگ آئے تھے۔ قدسیہ نے بس اپنے بچوں کو وہیں کسی کے پاس چھوڑ دیا تھا۔

رات کے دس بج رہے تھے جب راحیل نگار کے کمرے میں آیا۔ نگار نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بھابی، دراصل۔" راحیل ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "قدسیہ کہہ رہی ہے کہ جب آپ گوشہ نشیں ہوگئی ہیں اور کسی سے مل ہی نہیں رہی ہیں تو وہ اپنے گھر چلی جائے، یعنی اپنے والدین کے گھر۔"

"ہاں ہاں۔" نگار نے کہا۔ "مجھے خیال نہیں رہا ورنہ خود ہی کہہ دیتی۔ تم بھی چلے جاؤ۔"

"آپ بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔"

"نہیں، یہ ہے نا میرے پاس!" نگار نے صنوبر کی طرف اشارہ کیا جسے وہ اپنے پہلو میں سلا چکی تھی۔

راحیل نے جاتے جاتے کہا۔ "میں کل صبح پھر آجاؤں گا۔"

نگار نے بس سر ہلا دیا۔ راحیل چلا گیا۔

☆☆☆

صبح صنوبر اسکول گئی ہی تھی کہ ابدالی آگیا۔

"معذرت چاہتا ہوں۔ صبح صبح تکلیف دی آپ کو!"

"کوئی بات نہیں۔ فرمائیے! آپ کو اپنا فرض تو ادا کرنا ہی ہے۔ کچھ معلوم کرنا ہوگا مجھ سے۔"

"شرجیل صاحب کو دو دن پہلے قتل کیا گیا تھا۔ یعنی اس دن جب آپ کے بیان کے مطابق وہ اپنے بھائی سے ملنے شہر سے گئے تھے۔"

"او [illegible]"

"جب [illegible] وہ گئے تھے، آپ اس وقت کہاں تھیں؟"

"میرا [illegible] دماغ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ دفتر ہی گئی ہوں گی۔"

"گویا ان کا قتل آپ کی عدم موجودگی میں ہوا۔"

"کیا مطلب؟"

"جو بات سمجھ میں آئی ہے، وہ یہی ہے۔ لاش کے ایک پیر میں سلیپر غالباً پھنس ہی گئی تھی کیونکہ ان کا دوسرا پیر ننگا تھا۔ دوسری چپل پیر سے نکل کر کہیں بہہ گئی ہوگی۔ اس سے میں سمجھ سکا ہوں، یا یہ کہہ لیں کہ اس بات سے یہی اشارہ ملتا ہے کہ انہیں یہیں، گھر میں ہی قتل کیا گیا تھا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"سلیپر انسان گھر میں ہی پہنے رہتے ہیں۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ کوئی گھر میں کیسے آسکتا ہے؟" نگار نے کہا۔ "ایک ہی دروازہ ہے جو بند رہتا ہے۔"

"کسی نے دروازہ کھولا ہوگا۔" ابدالی نے کہا۔ "کیا آپ اپنی ملازمہ اور اپنی بچی کی گورنس کی ضمانت دے سکتی

http://urdutubes.com/

Digitized by Google

ہیں کہ ان میں سے کسی نے دروازہ نہیں کھولا ہوگا۔"

"ملازمہ تو بہت پرانی ہے۔ گورنس کو حال ہی میں رکھا ہے لیکن وہ میری ایک دوست کے گھر میں عرصے سے ملازم تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی قابلِ اعتماد ہے۔"

"اگر آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی نے دروازہ نہیں کھولا ہوگا تو پھر دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ شرجیل صاحب نے خود کسی کو گھر میں بلایا۔ انہیں اس پر اعتماد ہوگا لیکن اسی نے ان کو قتل کیا، لیکن یہ بھی ایک معما ہے کہ وہ لاش یہاں سے کس طرح لے گیا ہوگا جو اس نے بعد میں سمندر میں پھینکی اور اسے اس کی ضرورت کیا تھی؟ وہ لاش یہیں چھوڑ کر فرار کیوں نہیں ہوا؟"

"آپ کی باتیں میرے ذہن کو بہت بری طرح الجھا رہی ہیں۔" نگار کی آواز واقعی بھرا گئی۔

"میں آپ کی ملازماؤں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں، کیجیے۔"

"ان دونوں کو آپ ڈرائنگ روم میں بلالیں لیکن جب میں ان سے سوالات کروں تو آپ اپنے کمرے میں چلی جائیے گا۔"

"یعنی میں یہاں نہیں رکوں؟"

"جی ہاں۔ میرا یہی مطلب ہے، لیکن [illegible] اعتمادی کا معاملہ نہیں ہے۔ ہم لوگوں کا طریقہ کار [illegible] بلکہ ان دونوں سے بھی میں الگ الگ پوچھ گچھ کروں گا۔"

نگار کی پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ اس نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ ہتھکڑیاں اس کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

ملازمہ اور زلیخا بائی کو بلا کر وہ اپنے کمرے میں آگئی اور بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ہوئے اسے پندرہ منٹ گزرے تھے کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

کال سلمان کی تھی۔ اسی شخص کی جس نے لاش کا ڈبا سمندر میں پھینکنے کے لیے نگار کی مدد کی تھی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ڈبا پھینکا ہی اس نے تھا۔

"حیران تو نہیں ہوگئیں آپ میری کال سے۔" وہ بولا۔

"نہیں، لیکن......"

سلمان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "دراصل ابھی ذرا ہی دیر پہلے میں نے اخبار میں آپ کے شوہر کے قتل کی خبر پڑھی ہے۔"

نگار کو کچھ خیال آیا اور وہ خاموش ہی رہی۔

"بہت افسوس ہوا خبر پڑھ کر۔" سلمان پھر بولا۔ "لیکن باقی خبر پڑھ کر میرے احساسات بدل گئے۔ لاش پولیس کو سمندر سے ملی ہے اور ایک ڈبا بھی خستہ حالت میں بہتا ہوا ملا ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ لاش اسی ڈبے میں بند کرکے سمندر میں پھینکی گئی تھی۔"

نگار کا جسم سنسنا گیا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ سلمان نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے۔

"آپ تو بار بار چپ ہوجاتی ہیں۔" سلمان آہستہ سے ہنسا۔ "آپ ڈریے نہیں۔ میں پولیس کو کچھ بتانے تھوڑی جارہا ہوں۔"

"کیا بتاؤ گے تم پولیس کو؟" نگار اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ باتیں فون پر مناسب نہیں۔ کیوں نہ ہم کسی کافی ہاؤس...... یا ایسی ہی کسی جگہ ملاقات کرلیں۔ جگہ کا انتخاب میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ میں آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

نگار کو یقین ہوگیا کہ وہ غالباً ایک بلیک میلر کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ سلمان سے ملنا اس کے لیے ضروری ہوگیا تھا۔

"آپ پھر خاموش ہوگئیں۔" سلمان بولا۔

"میں ابھی بہت مصروف ہوں۔ ابھی اس مصروفیت سے نکل بھی نہیں سکتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں انتظار کرلوں گا۔ آخر ہم دوست بن چکے ہیں۔" نگار نے [illegible] "[illegible] آپ کی مصروفیت؟" سلمان نے پوچھا۔

"یقین سے نہیں کہہ سکتی۔"

"ملنا بہرحال بہت ضروری ہے۔" سلمان نے زور دے کر کہا۔ "اور آج ہی۔"

"وقت ملتے ہی فون کروں گی میں تمہیں۔"

سلمان ہنسا۔ "کچھ غصے میں بے تکلف ہوئی ہیں آپ...... خیر!...... دوست ہیں ہم آخر...... اب مجھے بھی حق پہنچتا ہے کہ تمہیں اسی طرح مخاطب کروں۔"

"میں فون کروں گی تمہیں۔ کہہ تو چکی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا۔ یہ بہرحال ضروری ہے کہ ہماری ملاقات آج ہی ہو۔" سلمان نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

"یہ کیا ہوگیا؟" نگار نے فون بند کرتے ہوئے سوچا۔

پھر کوئی پون گھنٹا اور گزرا ہوگا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ نگار خیالات میں کھوئی ہوئی تھی اس لیے چونک پڑی۔

"کون؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"میں ہوں بیگم صاحبہ!" وہ زلیخا بائی تھی۔ نگار نے اس کی آواز میں لرزش محسوس کی۔ "صاحب ملنا چاہتے ہیں

آپ سے۔"

"آرہی ہوں۔" نگار دروازے کی طرف بڑھی۔

اس کا خیال تھا کہ زلیخا بائی اطلاع دینے کے لیے اکیلی ہی آئی ہوگی لیکن دروازہ کھولتے ہی وہ چونک پڑی۔ زلیخا بائی کے ساتھ ابدالی بھی تھا۔

"اب تم جاسکتی ہو۔" ابدالی نے زلیخا بائی سے کہا۔

زلیخا بائی بہ سرعت وہاں سے چلی گئی۔ نگار نے محسوس کیا کہ وہ کچھ خوف زدہ تھی۔ نگار اندازہ بھی نہیں لگا سکی کہ اس کے خوف کی وجہ کیا ہوگی۔

"کیا میں آپ کے بیڈروم میں آسکتا ہوں؟" ابدالی کے لہجے میں خاصی سنجیدگی تھی۔

"جی......" نگار نے اسے غور سے دیکھا۔ "آیئے!"

"وہ قتل سے پہلے سلیپر پہنے ہوئے تھے۔" ابدالی اندر آتے ہوئے بولا۔ "اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ انہیں یہیں، خواب گاہ میں ہی قتل کیا گیا ہوگا۔ میں یہاں کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہتا ہوں۔"

"جی!" نگار کو اپنی جان نکلتی محسوس ہونے لگی۔ اسے ڈر تھا کہ ابدالی کو یہاں سے کوئی خاص سراغ نہ مل جائے۔ اسے پریشانی بھی لاحق تھی کہ ملازمہ اور زلیخا بائی سے ابدالی نے جانے کیا کچھ معلوم کرچکا ہوگا۔ نگار کے خیال کے مطابق اسے ان دونوں سے کوئی ایسی بات تو [illegible] ہوسکتی تھی جس سے اسے شبہ ہوسکتا کہ شرجیل کی قاتل نگار ہوسکتی ہے۔

ابدالی کمرے میں آگیا اور ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ یکایک وہ اس جگہ رکا جہاں وہ وزنی گل دان رکھا تھا جو نگار نے شرجیل کو مارا تھا۔ بعد میں اس نے گل دان صاف کرکے اسی جگہ رکھ دیا تھا جو اس کی جگہ تھی۔

ابدالی کو وہاں رکتے دیکھ کر نگار کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

ایک مرتبہ ابدالی نے گل دان کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر اچانک ہی ہاتھ پیچھے کرلیا۔ غالباً وہ گل دان کے وزن کا اندازہ کرنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کس خیال سے رک گیا تھا۔

"آپ اکتاہٹ محسوس کررہی ہوں گی۔" اس نے پلٹ کر نگار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا کیا جائے۔ اس قسم کے کام ہم لوگوں کی مجبوری ہوتے ہیں کیونکہ یہ شبہ ہوگیا ہے کہ آپ کی عدم موجودگی میں شرجیل صاحب کو شاید یہیں قتل کیا گیا ہوگا۔ اگر یہ خیال درست ثابت ہوا تو یہ الجھن بھی رہے گی کہ قتل کے بعد اسے خاصا وقت بھی مل گیا۔ خون کے دھبے بھی صاف کیے گئے اور...... سب سے اہم نکتہ یہ کہ وہ لاش کو یہاں سے کیسے لے گیا اور کیوں لے گیا۔"

نگار بولی۔ "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ شرجیل کو زبردستی یہاں سے کہیں اور لے جاکر قتل کیا گیا ہو......"

"ہاں، ایک امکان یہ بھی ہے۔ اچھی بات سوچی آپ نے۔ بالکل ممکن ہے یہ بھی۔ وہ اس وقت تک دفتر جانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہوچکے ہوتے یا انہیں کسی اور جگہ قتل کیا گیا ہوتا تو ان کے پیروں میں جوتے ہوتے، نہ کہ سلیپر۔"

"جی......" نگار نے بس اتنا ہی کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"شاید وہ لوگ آگئے۔" ابدالی بڑبڑایا۔

نگار نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "کون؟"

"میں ہوں بیگم صاحبہ!" زلیخا بائی کی آواز آئی۔ "جو صاحب آئے ہوئے ہیں، انہوں نے کسی کو فون کیا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ ان کے محکمے کے کچھ لوگ آئیں گے۔ میں یہی بتانے آئی تھی کہ تین آدمی آئے ہیں۔"

اس مرتبہ ابدالی نے بلند آواز میں کہا۔ "انہیں یہیں بھیج دو۔"

"کسے بلایا ہے آپ نے؟" نگار نے پوچھا۔

"فنگر پرنٹ سیکشن کے لوگ ہیں۔" ابدالی نے جواب دیا۔ "ممکن ہے کہ قاتل کے ہاتھ کا یا انگلیوں کا نشان کہیں مل جائے۔"

جلد ہی وہ تینوں آدمی آگئے اور انہوں نے ابدالی کی ہدایت کے مطابق کام شروع کردیا۔ پھر جس وقت وہ... گل دان پر کام کر رہے تھے تو نگار ایک پل کے لیے پریشان ہوئی لیکن پھر مطمئن بھی ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ وہ گل دان اس کے کمرے میں تھا لہٰذا اس پر اس کی انگلیوں کے نشانات کا پایا جانا اس کا ثبوت نہیں ہوتا کہ اسی نے گل دان کی ضرب سے شرجیل کو قتل کیا ہوگا۔

خاصی دیر تک ان لوگوں کا کام جاری رہا، پھر ابدالی ان لوگوں کے ساتھ ہی رخصت ہوگیا۔

جاتے جاتے اس نے نگار سے کہا تھا۔ "ابھی یہ نہیں

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

کہا جاسکتا کہ اتنا وقت لگانے میں کوئی فائدہ بھی ہوا یا نہیں۔ انگلیوں کے نشانات تو ملے ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ سب آپ ہی کی انگلیوں کے نشانات ہوں، یا خود شرجیل صاحب کے یا آپ کی کسی ملازمہ کے۔“

نگار سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ نڈھال سی ہو کر بستر پر گر پڑی۔ بہت سے معاملات کے ساتھ اس کا ذہن سلمان میں بھی الجھا ہوا تھا جو اس کے خیال کے مطابق کوئی پیشہ ور بلیک میلر تھا یا شاید اس کو بلیک میل کرنے کا موقع مل گیا تھا اسے۔

انہی الجھنوں میں اسے اپنی ملازمہ اور زلیخا بائی سے بھی یہ بات کرنے کا خیال نہیں آیا کہ ابدالی نے ان دونوں سے کیا پوچھ گچھ کی تھی اور ان دونوں نے اسے کیا کچھ بتایا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اسے جلد از جلد سلمان سے مل لینا چاہیے۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر اس نے موبائل سنبھالا اور سلمان سے رابطہ کیا۔

”شکریہ۔“ سلمان چہکا۔ ”تمہیں یاد تو آیا کچھ......“

”کہاں ملنا ہے؟“ نگار خشک لہجے میں بولی۔

”جہاں تم کہو!“

”میرے گھر میں آجاؤ۔“

سلمان ہنسا۔ ”مجھے قتل ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ [illegible] عورت اپنے شوہر کو قتل کرسکتی ہو، اس سے مجھ جیسے شریف آدمی کو تو بچنا چاہیے۔“

”شریف آدمی!“ نگار زہریلے لہجے میں بولی۔ ”تم کہاں ملنا چاہتے ہو؟“

”میں یہ کہتا کہ تم میرے گھر آجاؤ لیکن ابھی تو تم مانو گی نہیں لہٰذا......“

”یہ کیا کہا تم نے!“ نگار تیز لہجے میں بولی۔ ”ابھی تو تم مانو گی نہیں!...... یعنی کیا پھر کبھی مان جاؤں گی؟“

”اوہ، چھوڑو بھی۔ تم تو لفظ پکڑتی ہو۔ ہم کسی کافی ہاؤس وغیرہ میں مل سکتے ہیں......“

نگار نے ایک کیفے کا نام لیا۔

”ٹھیک ہے۔“ سلمان بولا۔ ”کب آؤ گی؟“

”میں گھر پر ہوں۔ بس نکلتی ہوں۔“

”مجھے منتظر پاؤ گی۔“

نگار نے رابطہ منقطع کیا پھر کمرا چھوڑنے سے پہلے چیک بک پرس میں رکھی۔ فی الحال اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ سلمان زبان بند رکھنے کے لیے کیا طلب کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اس کا پہلا مطالبہ آخری مطالبہ تو ہوگا نہیں۔ وہ اسے ساری زندگی ہی بلیک میل کرنا چاہے گا جو ممکن نہیں تھا۔ اس طرح تو نگار بھکارن بن جاتی۔ اسے اس سلسلے میں بھی کچھ سوچنا تھا لیکن فی الحال اس کے پاس سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔

وہ کمرے سے نکلی اور جب ڈرائنگ روم میں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ بیرونی دروازے کی طرف سے وقاص اور غزالہ، ملازمہ کے ساتھ آرہے تھے۔ ملازمہ ان کے لیے دروازہ کھولنے گئی ہوگی۔ نگار اپنے خیالات میں اس حد تک ڈوبی رہی تھی کہ اس نے گھنٹی کی آواز نہیں سنی تھی۔

”ارے...... تم لوگ!“ نگار کے منہ سے نکلا۔

”جی میڈم! معاف کیجیے گا۔ ہم اطلاع کے بغیر آگئے۔“ وقاص نے کہا۔ ”دراصل ادھر ہی سے گزر رہے تھے۔ غزالہ آج کالج نہیں گئی۔ ادھر سے گزرے تو سوچا کہ آپ کی خیریت معلوم کرتے چلیں۔ غزالہ تو خاصی بے چین ہے صنوبر سے ملنے کے لیے۔“

”وہ ابھی اسکول سے نہیں آئی لیکن آتی ہی ہوگی اور......“

”آپ کے ہاتھ میں پرس لٹکا ہوا ہے۔“ غزالہ بول پڑی۔ ”کیا آپ کہیں جارہی ہیں؟“

”ہاں اور بہت جلدی میں ہوں۔ تم دونوں بیٹھو۔ [illegible] چائے وغیرہ پیو، صنوبر آتی ہی ہوگی [illegible] لوٹ آؤں گی۔“

”ہم بس صنوبر کے آنے تک رکیں گے۔“ وقاص نے کہا۔ ”یہ غزالہ ہر وقت صنوبر کی باتیں کرتی رہتی ہے۔“

”وہ ہے ہی اتنی پیاری۔“ غزالہ بول پڑی۔

”اچھا بیٹھو تو سہی!...... میں کوشش کروں گی جلدی آنے کی۔“ نگار دروازے کی طرف بڑھی تو اس کے ساتھ ملازمہ بھی چلی تا کہ دروازہ بند کرلے۔

نگار بہت جلدی میں اس لیے تھی کہ سلمان کہیں بدک نہ جائے۔

لیکن اس کی عجلت فائدہ مند نہیں رہی۔ جب اس کی کار اس سڑک پر پہنچی جس پر ایک میل آگے جاکر وہ کیفے تھا جس کا نام اس نے سلمان کو بتایا تھا تو اس کی کار ٹریفک جام میں پھنس گئی۔ بہت آگے کہیں دھواں اٹھتا نظر آرہا تھا۔

”شاید سپر مارکیٹ میں آگ لگی ہے۔“ نگار نے کسی کو کہتے سنا۔

”ہاں ابھی دو مہینے پہلے بھی وہیں آگ لگی تھی۔“ ادھر ادھر اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ نگار پریشان ہوگئی۔ ٹریفک اس بری طرح پھنسا تھا کہ وہ کسی طرف سے نکل سکتی اور

Digitized by Google

http://urdutubes.com/

جانب نکل نہیں سکتی تھی۔

وہ وقت بھی آگیا جب اسے کیفے میں ہونا چاہیے تھا جو سپر مارکیٹ سے ایک فرلانگ آگے تھا۔

نگار نے موبائل نکالا تا کہ سلمان کو صورت حال سے آگاہ کردے۔ یہ بات بہرحال یقینی تھی کہ آگ لگنے کی واردات سے سلمان بھی بے خبر نہیں رہا ہوگا۔

اس سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ دوسری طرف دس بارہ گھنٹیاں بج گئیں لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔

”مر گیا ہو کم بخت اسی آگ میں۔“ نگار بڑبڑائی۔

پھر پانچ منٹ گزرے تھے کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

کال سلمان کی تھی۔

”میں نے تمہیں فون کیا تھا۔“ نگار نے کہا۔ ”بتانا چاہتی تھی کہ سپر مارکیٹ میں آگ لگ جانے کے باعث ٹریفک جام ہوگیا ہے۔ میں پھنس گئی ہوں۔“

”ہاں۔“ سلمان کی آواز آئی۔ ”میں کال ریسیو نہیں کرسکا۔ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر کار چلا رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ اس قابل نہیں ہے کہ فون سنبھال سکے۔ آگ سپر مارکیٹ میں نہیں، اس کیفے میں لگی ہے اور بہت تیزی سے [illegible] بمشکل نکل سکا ہوں لیکن [illegible]“

”اوہ!“

”اب کار ایک اسپتال کے سامنے رکی ہے تو دائیں ہاتھ میں موبائل سنبھال کر تمہیں فون کیا ہے۔ ڈریسنگ کروانے کے بعد پھر کروں گا۔“

اس نے نگار کے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

☆☆☆

نگار کے گھر سے واپسی پر وقاص بہت الجھا ہوا اور پریشان سا نظر آرہا تھا۔ یہ بات غزالہ نے بھی محسوس کرلی تھی۔ اس نے وقاص سے سبب جاننا چاہا لیکن وہ صرف ایک جواب سے اسے ٹالتا رہا۔

”نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔“

لیکن خاص بات تھی۔ اپنے گھر پہنچ کر بھی اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اپنے کمرے میں جاکر دروازہ بند کرکے لیٹ گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ شدید ذہنی انتشار میں مبتلا ہوچکا تھا۔

اس انتشار کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب اس نے نگار کے گھر میں ایل سی ڈی دیکھا تھا، اس کی تعریف بھی کی تھی اور زلیخا بائی نے بتایا تھا کہ وہ دو دن پہلے ہی خریدا ہے نگار نے۔

بس اسی وقت یکلخت ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا تھا اور اس نے روا روی کے انداز میں زلیخا بائی سے کہا تھا۔

”اس کا ڈبا تو پڑا ہوگا گھر میں۔ مجھے ضرورت ہے ایک بڑے ڈبے کی۔“

”نہیں، ڈبا تو اب نہیں ہے اس کا۔“ زلیخا بائی نے جواب دیا تھا۔ ”گھر میں کچھ فالتو چیزیں بہت ہوگئی تھیں۔ بیگم صاحبہ وہ سب اس ڈبے میں بھر کرلے گئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ وہ سامان ان کے لیے تو بیکار ہے لیکن کسی غریب کے کام آسکتا ہے۔ وہ ڈبا لے کر چلی گئی تھیں کہ کسی فلاحی ادارے کو دے دیں گی۔“

اس جواب سے وقاص کے دماغ میں آنے والے خیال کو کچھ اور تقویت ملی اور گھر آکر بھی وہ اسی بارے میں سوچتا رہا۔ اخبار سے اسے یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ شرجیل کی لاش سمندر سے ملی تھی اور کچھ فاصلے پر ایک بڑا ڈبا بھی تیرتا ہوا ملا تھا۔ پولیس کے خیال کے مطابق لاش اسی ڈبے میں بند کرکے پھینکی گئی تھی۔ بعد میں ڈبا گل جانے کی وجہ سے لاش، ڈبے سے باہر نکل گئی۔

وقاص کو یاد آیا تھا کہ لاش ملنے سے ایک دن پہلے نگار نے اس کی کار اس لیے لی تھی کہ اسے بہت زیادہ شاپنگ کرنی تھی اور اتنا سامان اس کی کار کی ڈکی میں نہیں آسکتا تھا۔

اس نے زیادہ سامان کی بات کی تھی لیکن دراصل اسے صرف ایل سی ڈی خریدنا تھا۔ بعد میں وہ ایل سی ڈی کا ڈبا بھی ایک بہانہ کرکے گھر سے لے گئی تھی۔

یہی سب کچھ جان کر وقاص کے دماغ میں یہ سوال کلبلانے لگا تھا کہ کہیں نگار ہی نے تو شرجیل کو قتل نہیں کیا......؟ اور قتل کرکے لاش اس ڈبے میں بند کی اور ڈبا لے جاکر سمندر میں پھینک دیا۔

اسی کے بیان کے مطابق شرجیل اپنے بھائی سے ملنے دوسرے شہر گیا ہوا تھا لیکن یہ بات سامنے آچکی تھی کہ شرجیل اپنے بھائی کے پاس نہیں گیا تھا۔

کاش یہ سب کچھ اتفاقات ہوں اور قتل میڈم نے نہ کیا ہو۔ وقاص اس انداز میں بھی سوچ رہا تھا کیونکہ اسے نگار سے کچھ ایسی قربت محسوس ہونے لگی تھی جیسے وہ اس کی اپنی کچھ ہو۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹایا گیا اور غزالہ کی آواز آئی۔ ”تم سے کوئی ملنے آیا ہے وقاص۔“

"کون آ گیا؟" وہ بڑبڑاتا ہوا بستر سے اٹھا اور ساتھ ہی بلند آواز میں پوچھا۔ "وہ ہے کون؟ نام نہیں بتایا اس نے؟"

"نام تو نہیں بتایا۔" غزالہ نے جواب دیا۔

اسی وقت وقاص دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

غزالہ کہہ رہی تھی۔ "اس نے بس اتنا کہا کہ اس کا تعلق کسی سرکاری محکمے سے ہے۔ کوئی انکم ٹیکس وغیرہ کا معاملہ ہو شاید......"

"نہیں، وہ سب ڈیڈی خود دیکھتے ہیں۔ خیر!...... کہاں ہے وہ؟"

"ملازم نے اطلاع دی تھی تو میں نے باہر ہی جاکر اس سے بات کی تھی۔ کسی اجنبی کو اندر کیسے بلا لیتی۔ اسے برآمدے میں چھوڑ کر تمہیں بتانے آئی ہوں۔ چہرے مہرے سے کوئی برا آدمی تو نہیں معلوم ہوتا۔"

"دیکھتا ہوں۔" وقاص نے کہتے ہوئے قدم بڑھائے۔

برآمدے میں موجود شخص وقاص کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ نگار کے دفتر میں اس سے آمنا سامنا ہو چکا تھا۔ وہ محکمۂ پولیس کا افسر ابدالی تھا۔

وقاص چونک گیا۔ "آپ؟"

"جی......" ابدالی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کچھ ضروری معلومات حاصل کرنی ہیں آپ سے۔ امید ہے کہ آپ تعاون کریں گے۔"

"ہاں ہاں، یقیناً...... آیئے، اندر آیئے!" وقاص نے بظاہر سکون سے کہا لیکن وہ اعصابی تناؤ کا شکار ہو چکا تھا۔

"ابھی دو آدمی اور آنے والے ہیں۔" ابدالی نے کہا۔ "نیلے رنگ کی کار میں آئیں گے۔ اپنے کسی ملازم سے کہہ دیں کہ انہیں اندر آنے دیں۔"

وقاص نے سر ہلایا اور ایک ملازم کو قریب بلا کر اسے ہدایت کر دی۔ پھر ابدالی کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

"تشریف رکھیے!"

"شکریہ!" ابدالی بیٹھ گیا۔

وقاص پر اعصابی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی سوالیہ نگاہیں ابدالی کے چہرے پر جمی رہیں۔

"حیرت ہے کہ آپ کو ملازمت کی ضرورت پیش آئی۔" ابدالی بولا۔ اس نے طائرانہ نظروں سے ڈرائنگ روم کی قیمتی اشیا دیکھی تھیں۔

وقاص نے وہی جواب دیا جو وہ نگار کو دے چکا تھا۔

"خوب!"

ابدالی کے چہرے پر مسکراہٹ قائم رہی لیکن وقاص کا اندازہ تھا کہ ابدالی دراصل بہت سنجیدہ تھا اور کسی بہت ہی خاص وجہ سے آیا تھا۔

"آپ کی شادی ہو گئی؟" ابدالی نے پوچھا۔

"جی نہیں......"

"نگار صاحبہ خاصی خوب صورت ہیں۔" ابدالی نے اچانک بالکل غیر متعلقہ سی بات کہی لیکن وقاص اس کا مطلب سمجھ گیا۔

"میں ان کا بہت احترام کرتا ہوں۔" وقاص نے اپنے جذبات قابو میں رکھے۔

اسی وقت دو آدمی وقاص کے ملازم کے ساتھ اندر آئے۔ وہ دونوں ہی وقاص کے لیے اجنبی تھے۔

"آیئے!" ابدالی نے ان سے کہا۔ "میں آپ کا منتظر تھا۔ تشریف رکھیے۔ ان سے ملیے۔ یہ مسٹر وقاص ہیں۔"

ان دونوں نے یکے بعد دیگرے وقاص سے مصافحہ کیا لیکن وہ اتنے سنجیدہ تھے کہ انہوں نے کوئی رسمی جملہ تک نہ کہا البتہ وقاص کو دیکھا بہت غور سے تھا۔ ان کی خاموشی کی وجہ سے وقاص بھی چپ رہا۔

ابدالی نے سوالیہ نظروں سے ایک آدمی کی طرف دیکھا۔ اس نے کچھ کہے بغیر نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ پھر ابدالی نے دوسرے آدمی کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔" ابدالی نے ان سے [illegible] دونوں جا سکتے ہیں۔ تکلیف...... کے لیے معافی چاہتا ہوں۔"

"قانون کی مدد کرنا تو ہمارا فرض ہے ابدالی صاحب!" ان میں سے ایک نے کہا۔

وقاص کے جسم میں ہلکی سی سنسناہٹ پھیل گئی۔ قانونی مدد؟ اس نے سوچا، کیا یہ "شناخت پریڈ" جیسی کوئی بات تھی؟ مگر کیوں؟

وہ دونوں آدمی چلے گئے۔

"میں سمجھا نہیں بات کیا ہے۔" وقاص بولا۔

ابدالی نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا اور بولا۔ "ایک رات آپ کی کار آپ کے پاس نہیں تھی۔ کیا کسی کو دی تھی آپ نے؟"

وقاص کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کے دماغ نے اس وقت بہت تیزی سے کام کیا تھا۔ جو خیالات اسے ذرا دیر پہلے پریشان کیے ہوئے تھے، ان میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ ابدالی کو بھی اس معاملے میں نگار پر شک ہو چکا تھا۔

"جی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں اپنی کار کسی کو نہیں دیتا۔"

"دو تین دن پہلے کی بات ہے۔ ایک رات آپ کی کار آپ کے پاس نہیں تھی۔"

"جی ہاں، ایسا ہوا تو تھا۔ اس شام میں دفتر میں زیادہ دیر بیٹھا تھا۔ میڈم کے جانے کے بعد بھی کام کرتا رہا تھا۔ جب اٹھا تو اندھیرا پھیلنے لگا۔" وقاص نے بڑی تیزی سے کہانی گھڑی تھی۔ "پارکنگ لاٹ میں تو خاصی تاریکی تھی۔ جہاں میری کار کھڑی تھی، اس کے قریب کی لائٹ شاید فیوز ہو گئی تھی۔ میری کار اسٹارٹ نہیں ہو سکی۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی چھوٹی موٹی خرابی ہو گی اور ایسی خرابیاں میں خود بھی ٹھیک کر لیتا ہوں لیکن......"

"لیکن آپ نے کسی مکینک کو بلایا۔" ابدالی نے اس کی بات کاٹی۔ "وہ آپ کی کار کسی اور کار سے باندھ کر وہاں سے لے گیا۔"

وقاص کہانی کو یہ موڑ بھی دے سکتا تھا لیکن اس میں خرابی یہ ہوتی کہ ابدالی اس مکینک کے بارے میں بھی پوچھتا اور بعد میں اسے معلوم ہو جاتا کہ وقاص نے جھوٹ بولا تھا۔

"جی نہیں۔" وقاص نے جواب دیا۔ "میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ چھوٹی موٹی خرابی میں خود ٹھیک کر لیتا ہوں لیکن وہاں اندھیرا تھا۔ قریب کی لائٹ فیوز تھی۔ میرے پاس [illegible] بھی نہیں تھی۔ [illegible] جلدی میں بھی تھا اس لیے کار [illegible] چھوڑ کر [illegible] میں گھر آ گیا تھا۔ گاڑی کی اچانک خرابی اور پھر وہاں اندھیرا ہونے کے باعث مجھے جھنجلاہٹ بھی اتنی ہوئی تھی کہ چابی بھی گاڑی میں بھول گیا تھا۔"

ابدالی ہنسا۔ "بہت مضبوط کہانی سوچی آپ نے۔"

"آپ اسے جھوٹ سمجھ رہے ہیں؟" وقاص کچھ ناخوشگوار لہجے میں بولا۔

"چلیں فی الحال تو مان لیتا ہوں کہ آپ کا بیان درست ہے لیکن اگر یہ غلط ثابت ہو گیا تو آپ بھی ایک بڑی مشکل میں پھنس جائیں گے۔ آپ کی کار رات گئے سمندر کے پل پر دیکھی گئی تھی۔ ابھی جو دو شریف آدمی یہاں آئے تھے، انہوں نے خود ہی پولیس سے رابطہ کر کے یہ بات بتائی ہے۔ انہیں کچھ شبہ ہوا تھا اس لیے انہوں نے احتیاطاً کار کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اس نمبر ہی کی وجہ سے میں آپ تک پہنچ سکا۔ ان کے بیان کے مطابق وہاں جو دو کاریں کھڑی تھیں، ان کے پاس انہوں نے ایک مرد اور ایک عورت کو بھی دیکھا تھا۔ اس مرد کا پتا بھی لگ ہی جائے گا۔ فی الحال یہ معلوم

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس، فون نمبر 0301-2454188
سرکولیشن منیجر سید منیر حسین 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

http://urdutubes.com/

ہوگیا کہ وہ مرد آپ نہیں تھے۔"
"میری کار...... سمندر کے پل پر؟" وقاص نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔
"جی ہاں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شرجیل صاحب کی لاش ڈبے میں بند کرکے آپ کی کار کی ڈکی میں ڈال کر وہاں لے جائی گئی اور ڈبا سمندر میں پھینک دیا گیا۔"
"میں اس پر حیرت ہی کا اظہار کرسکتا ہوں۔ آخر کس نے میری کار استعمال کی ہے؟"
"میرا خیال ہے کہ بہت جلد اس کا علم بھی ہوجائے گا۔ بس اب میں جاؤں گا۔ چلتے چلتے پھر کہہ دوں کہ اگر آپ نے کسی کو بچانے کی کوشش کی ہے تو اس معاملے میں آپ بھی کچھ پریشانی میں پڑ سکتے ہیں۔"
"میں نے جو کچھ بتایا ہے، وہ حقیقت ہے۔"
ابدالی جواب میں کچھ کہنے کے بجائے کھڑا ہوگیا۔ اس نے مصافحے کے لیے وقاص کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اب بھی تھی جس سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ یقیناً وہ بہت ٹھنڈے مزاج کا پولیس آفیسر تھا۔
اس کے رخصت ہوتے ہی وقاص نے بڑی عجلت میں اپنے موبائل پر نگار کا نمبر ملایا۔ اب اسے بڑی حد تک یقین ہوچکا تھا کہ شرجیل کو نگار نے خود قتل کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن لاش سمندر میں پھینکنے کا کام اسی نے کسی کی مدد سے کیا تھا۔ بات جو کچھ بھی ہو، وقاص اسے قانون کے شکنجے [illegible] بچانا چاہتا تھا۔
"خیریت وقاص؟" رابطہ ہوتے ہی نگار نے پوچھا۔
"آپ اس وقت کہاں ہیں؟" وقاص نے بے چینی سے پوچھا۔
دوسری طرف سے ٹھنڈی سانس لینے کی آواز آئی، پھر کہا گیا۔ "جہاں جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی، وہاں پہنچ نہیں سکی۔"
نگار نے آتش زدگی کے بارے میں بھی بتایا۔
"جب سے اب تک ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی ہوں۔" وہ بولی۔ "اب آثار پیدا ہوئے ہیں کہ یہاں سے نکل سکوں۔"
"وہاں سے نکل کر آپ گھر تو ہرگز نہیں جایئے گا۔" وقاص نے کہا۔ "وہاں آپ کے لیے خطرہ ہے۔"
"کیسا خطرہ؟"
"ابدالی کا خطرہ، لیکن......"
"کیا مطلب؟" نگار نے تیزی سے بات کاٹی۔
"وقت بہت کم ہے۔ فون پر تفصیل بتانے میں وقت ضائع ہوگا۔ آپ سے فوراً ملنا ہے مجھے۔ آپ......"
نگار نے پھر اس کی بات کاٹی۔ "کیا تمہارے گھر آجاؤں؟"
"ہرگز نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ابدالی نے میرے گھر کی نگرانی شروع کرادی ہو۔"
"تم مجھے ہیجان میں مبتلا کر رہے ہو؟" نگار کی آواز بھرا گئی۔
"معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ ہمیں کسی اور جگہ ملنا ہوگا۔ آپ وہاں آجائیں گی جہاں میں آپ کو بلاؤں گا؟"
"ہاں کیوں نہیں لیکن......"
"آپ کچھ انتظار کریں۔ میں آپ کو فون پر ہی بتاؤں گا کہ ہم کہاں مل سکتے ہیں۔ اس دوران میں آپ کسی طرف بھی لانگ ڈرائیو پر نکل جایئے۔ میرے گھر یا اپنے گھر یا دفتر کا رخ ہرگز نہیں کیجیے گا۔"
"تمہاری باتوں سے میرا ہیجان بڑھتا ہی جارہا ہے۔"
"پلیز! آپ میری کوئی بات نظر انداز نہیں کیجیے گا۔ اب میں فون بند کر رہا ہوں۔ وقت کم ہے اور مجھے ملاقات کے لیے جگہ کا بندوبست کرنا ہے۔ پلیز! خیال رکھیے گا میری باتوں کا [illegible]"
اس [illegible] وقاص نے نگار کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور رابطہ منقطع کر کے اپنے ایک بہت بے تکلف دوست کا نمبر ملانے لگا۔
اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔
دوست کا نام خاور تھا۔ نہایت مختصر ابتدائی رسمی جملوں کے بعد وقاص نے اس سے کہا۔ "تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے سب گھر والے تمہیں چھوڑ کر شہر سے کہیں اور جانے والے ہیں۔ کیا وہ چلے گئے؟"
"ہاں یار! شدید بوریت میں ڈال گئے مجھے۔ میں بھی چلا جاتا اگر ملازمت کا مسئلہ نہ ہوتا لیکن اچانک تمہیں اس کا خیال کیسے آگیا؟"
"مجھے اس وقت ایک ایسے گھر کی ضرورت آپڑی ہے جہاں میں کسی سے رازداری میں مل سکوں۔ اگر تمہارے گھر کا خیال نہ آجاتا تو میں کسی ہوٹل میں کمرا لینے کے بارے میں سوچتا۔ امید ہے تم برا نہیں مانو گے اگر میں کسی کو تمہارے گھر پر بلاؤں۔"

خاور ہنسا۔ "کسے بلا رہے ہو جو اتنی رازداری کی ضرورت ہے؟"
"ایک خاتون ہیں لیکن تم اپنے ذہن میں کوئی غلط بات نہ لانا۔ وہ مجھ سے بڑی ہیں اور میرے لیے محترم بھی!...... بس کچھ ایسی بات ہے کہ میں ان سے بہت رازداری کے ساتھ ملنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ملازمین وغیرہ تو ہوں گے گھر میں!"
"نہیں۔ میں نے خانساماں کے علاوہ سب کو چھٹی دے دی ہے اور اس وقت تو گھر میں بالکل اکیلا ہوں۔ خانساماں اپنا کام کرکے جاچکا ہے۔ اکیلا پڑا بور ہو رہا ہوں۔ کھانا کھا کے کہیں نکلنے کا ارادہ تھا کہ تم......"
"تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا۔" وقاص نے اس کی بات کاٹی۔
"یار! میں اگر تمہارے کسی کام آؤں گا تو مجھے خوشی ہوگی، لیکن تم نے مجھے خاصی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ کچھ تو بتاؤ کہ آخر معاملہ کیا ہے؟"
"ابھی میں بہت جلدی میں ہوں۔ پھر کسی وقت کرلیں گے یہ باتیں...... میں ابھی ان خاتون کو وہاں بلانا چاہتا ہوں۔"
"بلالو!" خاور نے طویل سانس لی۔
[illegible] میں [illegible] اکیلا چھوڑ دو گے [illegible]!" وقاص [illegible] دروازے [illegible] اور تمہاری اخلاقیات [illegible] ہوں۔ تم چھپ کر ہماری باتیں سننے کی کوشش نہیں کرو گے۔"
"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تم کہو تو میں ان کا سامنا بھی نہ کروں۔"
"بہتر تو یہی ہے۔ میں ان سے پہلے پہنچ جاؤں گا تمہارے گھر۔ جب وہ آئیں گی تو دروازہ کھولنے میں ہی جاؤں گا۔ تم اندر کے کسی کمرے میں رہنا۔"
خاور نے طویل سانس لی۔ "سرِ تسلیم خم ہے، جو مزاجِ یار میں آئے۔"
"میں جلد از جلد تمہارے گھر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔" وقاص نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔ اب وہ پھر نگار کا نمبر ملا رہا تھا۔ ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اسے اپنے گھر سے نکلنے کے لیے عقبی دروازہ استعمال کرنا چاہیے اور اس میں بھی بہت احتیاط برتنا ہوگی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال جم کر رہ گیا تھا کہ ابدالی اس کے گھر کی نگرانی ضرور کرائے گا۔
نگار سے بات کرنے کے بعد وقاص بہت محتاط انداز میں پچھلے دروازے سے باہر نکلا۔ اس سے قبل اس نے غزالہ کو بتا دیا تھا کہ پچھلے دروازے سے اس کے جانے کا سبب یہ ہے کہ اسے گمبھیر معاملے میں کہیں جانا پڑ رہا ہے جس کے بارے میں وہ اسے بعد میں کسی وقت بتائے گا۔

☆☆☆

پون گھنٹے بعد جب رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے، نگار، خاور کے فلیٹ میں تھی اور اس کے سامنے پریشان بیٹھا وقاص کہہ رہا تھا۔
"یہ آپ کیا کر بیٹھی ہیں میڈم؟"
"تمہارا اشارہ کس بات کی طرف ہے؟" نگار کا لہجہ سپاٹ تھا۔
"ابدالی آیا تھا میرے گھر......" وقاص نے کہا اور پھر ساری بات دہرادی۔ نگار نے تحمل سے سب کچھ سنا۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔
وہ سب کچھ بتانے کے بعد وقاص نے کہا۔ "شرجیل صاحب کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے میری کار استعمال کی گئی تھی...... وہ آپ میرے گھر سے ہی لے گئی تھیں۔ میری دانست میں اس کا امکان نہیں ہے کہ آپ نے میری کار کسی اور کو دی ہو اور اگر دی بھی ہوتی تو دوسرے دن کار کی چابی مجھے لوٹا [illegible] ہوئے آپ مجھ سے یہ بات چھپاتی نہیں۔ اس [illegible] نے آج ہی آپ کا ایل سی ڈی بھی دیکھا ہے۔ وہ یقیناً کسی بڑے ڈبے میں آیا ہوگا۔ شرجیل صاحب کی لاش اس میں ڈالی جاسکتی تھی۔ زلیخا بائی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے وہ ایل سی ڈی اسی دن خریدا تھا جب کار مجھ سے لی تھی۔ پھر ایل سی ڈی کا ڈبا آپ گھر سے لے گئی تھیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ اس میں آپ نے کچھ بیکار سامان بھرا ہے جو کسی غریب کے کام آسکتا ہے اس لیے وہ سب آپ کسی فلاحی ادارے کو دے دیں گی۔"
وقاص چپ ہوگیا۔ نگار کی نظریں اب جھکی ہوئی تھیں۔
"اب بتایئے؟" وقاص کچھ توقف سے پھر بولا۔
"میں ان باتوں سے کیا سمجھوں؟...... آپ کو آپ کے گھر جانے سے میں نے اس لیے روکا تھا کہ ابدالی وہاں آپ کی تاک میں ہوگا۔ جس طرح میری شناخت کرائی گئی، اسی طرح وہ آپ کی شناخت بھی کرالے گا۔ وہ دونوں آدمی یقیناً آپ کو پہچان لیں گے اور ہاں! ایک بات اور...... آج جب میں اور غزالہ آپ کے گھر گئے تھے تو آپ کہیں جارہی تھیں۔ میں نے آپ کے چہرے پر وہ تاثرات نہیں دیکھے جو شوہر کے قتل ہوجانے پر کسی بیوی کے چہرے پر ہوتے ہیں۔"

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

نگار اب بھی خاموش بیٹھی رہی۔
وقاص نے کچھ توقف سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔
''کچھ کہیے میڈم!''
''کیا کہوں؟'' نگار نے اب نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ''ہاں، شرجیل کی ہلاکت میرے ہی ہاتھوں ہوئی تھی لیکن یقین کرو کہ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا۔ بس غصے میں اسے ایک وزنی گل دان مار بیٹھی تھی جس نے اس کے سر پر کوئی ایسی ضرب لگائی کہ وہ جانبر نہیں ہوسکا۔ رہی یہ بات کہ تم نے مجھے افسردہ نہیں دیکھا تو اس کا سبب یہ ہے کہ مجھے اب شرجیل سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا، بلکہ شاید کچھ نفرت ہی ہوگئی تھی۔'' یکایک نگار پر ہذیان سا طاری ہوتا چلا گیا۔ وہ بولتی ہی چلی گئی۔ اس نے شرجیل کے کردار کے بارے میں بھی سب کچھ بتادیا۔ شفیقہ کی بات بھی بتائی اور یہ بھی کہ شرجیل کا وہ کیا جملہ تھا جس نے اسے غصے سے بے حال کردیا اور وہ اسے گل دان مار بیٹھی۔
وقاص دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ نگار اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں خشک کرنے لگیں۔ یکایک وقاص نے سر اٹھا کر پوچھا۔ ''پس پردہ آپ کا مددگار مرد کون تھا میڈم!''
''ایک کار وہاں سے گزری تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر رک گیا تھا۔ اس نے ڈبا پھینکنے میں میری مدد کی تھی۔'' نگار نے جواب دیا، پھر بولی۔ ''تم نے مجھے گھر جانے سے روکا تھا کہ میں وہاں گرفتار کرلی جاؤں گی؟''
''جی میڈم!'' وقاص نے جواب دیا۔ ''نہ جانے کیوں، اتنے کم وقت میں مجھے آپ سے اتنی اپنایت ہوگئی ہے کہ میں آپ کو کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتا۔''
''لیکن اب اس سے مفر نہیں ہے وقاص!'' نگار نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''میں کوئی عادی جرائم پیشہ تو ہوں نہیں۔ اس لیے غلطی پر غلطی کرتی چلی گئی۔ اب قانون کے پاس اتنے شواہد جمع ہوچکے ہیں کہ میں بچ نہیں سکوں گی۔''
''آپ نے یہ سب کچھ صنوبر کی خاطر کیا تھا نا؟''
''ہاں۔''
''اب بھی آپ کو صنوبر ہی کی خاطر کچھ کرنا ہوگا۔''
''میں کیا کرسکتی ہوں وقاص؟''
''شاید میں اس سلسلے میں کچھ کرسکوں۔''
''کیا کرسکو گے تم؟''
وقاص نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''کالج کے زمانے میں میرا ایک دوست تھا۔ کالج چھوڑنے کے بعد مجھے اتفاق سے معلوم ہوگیا کہ وہ جرائم کی راہ پر چل نکلا ہے۔ لوگوں کو یہاں سے کسی دور دراز جگہ منتقل کرنے لگا ہے۔ میں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ میں اس سے دوبارہ ملوں گا۔ اس سے بات کروں گا کہ آپ کو اور صنوبر کو یہاں سے نکال کر کسی دور دراز جگہ پہنچا دے۔ یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ آپ وہاں زندگی کیسے گزاریں گی۔ آپ بینک سے تو اپنا سرمایہ نکلوا نہیں سکتیں۔ ابدالی آپ کے بینک پر بھی نظر رکھے گا لیکن خیر، اس بارے میں بھی کچھ سوچ لیا جائے گا کہ آپ وہاں زندگی کیسے گزاریں گی۔''
نگار نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے پرس سے اپنا موبائل نکالا۔ اسکرین پر سلمان کا نمبر چمک رہا تھا۔ نگار نے فوراً وقاص سے کہا۔
''مجھے تنہائی میں کسی سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔''
''کیا میں کمرے سے چلا جاؤں؟''
''ہاں پلیز۔''
وقاص اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔
نگار نے کال ریسیو کی۔ ''بولو......''
''بہت دیر میں فون کیا ہے میں نے!'' سلمان کی آواز آئی۔ ''دراصل ڈریسنگ کرانے کے بعد بھی ہاتھ میں خاصی دیر تک تکلیف رہی۔ اب کچھ پُرسکون ہوا ہوں تو فون کر رہا ہوں [illegible]''
[illegible]
ایک ہاتھ سے ڈرائیونگ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مشکل ہے کہ میں تم سے ملنے کسی جگہ آؤں۔ تم میرے گھر آجاؤ۔''
''یہ ممکن نہیں۔''
''یہی تو ممکن بنانا ہوگا نگار بیگم!'' سلمان نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''تم سمجھ گئی ہوگی کہ میں تمہیں بلیک میل کرنا چاہتا ہوں اور یقیناً تم نے غلط نہیں سمجھا ہے لیکن مجھے تم سے کسی رقم کا مطالبہ نہیں کرنا ہے۔ دراصل تم مجھے بہت پسند آگئی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کبھی کبھی تنہائی میں میرے ساتھ کچھ وقت گزار لیا کرو۔''
''شٹ اپ!'' نگار بڑے زور سے چیخ پڑتی اگر کوشش کرکے اپنی آواز دبا نہ لیتی۔ اس کے چیخنے پر تو وقاص دوڑا چلا آتا۔ ''اب تم مجھے کبھی فون مت کرنا۔ تمہارا جو دل چاہے، کرو۔ میں اب ذہنی طور پر خود کو گرفتاری کے لیے آمادہ کررہی ہوں۔ یہ میری تو کیا، ہر مجرم کی خام خیالی ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ قانون سے بچا رہے گا۔''
''اوہو!...... اچھا؟...... خیر! گرفتاری دینے سے پہلے تمہیں میرے گھر تو آنا ہی ہوگا۔''
نگار کوئی جواب دیے بغیر فون بند کردینا چاہتی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ پھر فون کرے گا اور وہ کال ریسیو نہیں کرے گی تو وقاص کو تعجب ہوگا۔
''تم مجھے مجبور نہیں کرسکتے۔'' وہ بولی۔
''کرسکتا ہوں۔'' سلمان نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''ابھی تم مجھے جانتی نہیں ہو۔ میری معمولی کار سے میری حیثیت کا اندازہ نہ لگاؤ۔ وہ صرف دکھاوے کے لیے ہے ورنہ میرے پاس بہت کچھ ہے۔ میرے ذرائع آمدنی کئی ہیں۔ میں بردہ فروش بھی ہوں۔ اگر تم نہیں آؤ گی تو میں تمہاری بیٹی کو اغوا کروا لوں گا۔''
وہ جھوٹ بھی بول سکتا تھا لیکن نگار کا سارا جسم سنسنا گیا۔ اس کی بات سچ بھی ہوسکتی تھی۔
سلمان بولتا رہا۔ ''تم اپنی گرفتاری دو یا نہ دو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ ظاہر ہے کہ تمہاری بیٹی تو تمہارے ساتھ جیل نہیں جائے گی۔ شاید اس کی پرورش کی ذمے داری کوئی فلاحی ادارہ کرے گا لیکن میں اسے وہاں سے اٹھوا لوں گا۔ تمہیں جیل میں خبر ملے گی کہ تمہاری بیٹی غائب ہوچکی ہے۔''
''ہرگز نہیں۔'' نگار نے دانت پر دانت جما لیے۔
''کیا [illegible] کرو گے؟''
''[illegible] کیا ہے؟'' سلمان نے [illegible] اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''اگر تم نے اپنی گرفتاری دینے کے ساتھ پولیس کو میرے بارے میں بتا بھی دیا تو اس سے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ابھی تک پولیس کے پاس میرا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ صرف تمہارے اس بیان کی وجہ سے پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''
نگار کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔ یہ اس کے لیے ایک ہولناک تصور تھا کہ اس کی صنوبر کسی بردہ فروش کے ہتھے چڑھ جائے۔
''اب بتاؤ!'' سلمان پھر بولا۔ ''میرے گھر آنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟''
''تم...... تم......'' نگار غصے کی زیادتی کے باعث کچھ نہیں کہہ سکی۔
''اوہ! کھول گئیں تم تو۔'' سلمان پھر ہنسا۔ ''غصے میں آدمی صحیح فیصلہ بھی نہیں کرپاتا۔ تم کوئی غلط فیصلہ کر بیٹھو گی۔ ابھی آٹھ چالیس ہوئے ہیں۔ میں تمہیں دو گھنٹے بعد فون کروں گا۔ خود پر قابو پالو۔ مجھے یقین ہے، تم سب کچھ برداشت کرسکتی ہو، اپنی بیٹی کا اغوا برداشت نہیں کرسکو گی۔''
دوسری طرف سے فوراً ہی رابطہ منقطع کردیا گیا۔
نگار نے فوراً ہی موبائل پر اپنے گھر سے رابطہ کیا۔ ریسیور زلیخا بائی نے اٹھایا تھا۔
''سب ٹھیک ہے نا بائی؟'' نگار نے پوچھا۔
''جی بیگم صاحبہ! بہت دیر ہوگئی آپ کو۔''
''اور دیر بھی ہوسکتی ہے۔ صنوبر نے پریشان تو نہیں کیا؟''
''آپ کو نہ پاکر تھوڑی بہت مچلی تھی۔ تھوڑا سا روئی بھی تھی لیکن میں نے اسے بہلا لیا۔ اب تو وہ بیٹھی کارٹون فلم دیکھ رہی ہے۔''
''مجھے کافی دیر ہوسکتی ہے۔ اسے کچھ کھلا پلا کر سلا دینا کسی طرح...... دوسری بات یہ کہ میری آواز سنے بغیر دروازہ مت کھولنا۔ کوئی بھی گھنٹی بجاتا رہے، پروا مت کرنا۔''
''خیریت تو ہے بیگم صاحبہ؟''
''بس وہی کرنا جو میں نے کہا ہے۔''
نگار نے رابطہ منقطع کردیا۔ اسے اچانک ہی خیال آیا تھا کہ سلمان کہیں پہلے ہی سے صنوبر کو نہ اٹھوا لے اور پھر اس پر دباؤ ڈالے کہ وہ اس کے گھر آئے۔
اس نے آواز دے کر وقاص کو بلا لیا۔
''بات ختم ہوگئی میڈم!'' وقاص نے پوچھا۔
''ہوں۔''
''کیا میں جاؤں؟''
''کہاں؟''
''میں نے آپ کو بتایا تھا نا، آپ اس ملک سے چلی جائیں۔ میں ابھی جا کر اس سے بات کیے لیتا ہوں۔ جب تک کوئی بندوبست نہ ہوجائے، آپ یہیں رہ سکتی ہیں۔ میرے جس دوست کا یہ گھر ہے، میں اس سے بات کرچکا ہوں۔ کسی بہانے سے میں غزالہ کو بھی یہاں بلوا لوں گا تاکہ آپ تنہائی کا شکار نہ ہوں۔''
''بہانے سے بلاؤ گے؟ کیا مطلب؟''
''آج تو ڈیڈی کو گھر آنے میں دیر ہوگئی، لیکن رہتے تو وہ اسی گھر میں ہیں۔ ان سے تو کچھ کہنا پڑے گا کہ میں غزالہ کو کہاں بھیج رہا ہوں۔''
''ہوں......''
یہ باتیں کرتے ہوئے وقاص بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ کھڑا ہوا۔
''ذرا رکو۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔'' نگار نے کہا۔
''اس سے جتنی جلدی مل آؤں، بہتر ہوگا۔''
''بس دو منٹ۔'' وقاص بیٹھ گیا۔

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

☆☆☆

پونے گیارہ بجے تھے جب سلمان کا فون دوبارہ آیا۔

"ٹھیک ہے، میں آرہی ہوں۔" نگار نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"گڈ!...... میرا وزیٹنگ کارڈ تو محفوظ ہوگا تمہارے پاس۔ گھر ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ مجھے امید بھی تھی کہ تم میری بات مان لوگی۔ اپنی بچی یا بچے کی خاطر کوئی بھی عورت کچھ بھی کرسکتی ہے۔"

نگار نے موبائل بند کردیا۔

وقاص دس منٹ پہلے ہی آیا تھا اور اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"کہاں جارہی ہیں آپ میڈم؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ایک ضروری کام ہے وقاص!"

"آپ خطرہ مول لیں گی اس طرح۔" وقاص نے کہا۔ "ابدالی نے کسی طرح یہ تو معلوم کرلیا ہوگا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں۔ وہ معلوم کرنے کی کوشش کررہا ہوگا کہ آپ کہاں ہیں۔ بہتر ہوتا کہ آپ چار دن تک گھر سے نہیں نکلتیں۔ میں بات کرآیا ہوں۔"

"ہاں، ابھی بتایا تو تھا تم نے کہ میں چار دن بعد یہ ملک چھوڑ سکوں گی لیکن ابھی مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔ میرا جانا ضروری ہے وقاص!"

"میں چلوں آپ کے ساتھ؟"

"نہیں، مجھے اکیلے ہی جانا ہوگا۔"

"کتنی دیر لگ سکتی ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"اچھا تو پھر میں بھی گھر جاتا ہوں۔ ڈیڈی سے کوئی بہانہ کرکے غزالہ کو لے آؤں گا۔ مجھے تو ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" نگار کھڑی ہوگئی۔

وقاص اسے چھوڑنے کے لیے اس کی کار تک آیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی تشویش کے آثار تھے۔ وہ اس وقت نگار کے کہیں جانے سے خاصا غیر مطمئن تھا۔

نگار روانہ ہوگئی۔ وقاص کی بات اس کے ذہن میں تھی، اس لیے وہ محتاط بھی رہی۔ آگے پیچھے ہر طرف نظر رکھی۔ گرفتاری سے بچنا تو تھا اسے۔

وہ شدید جذباتی بھی ہورہی تھی۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھوں کی گرفت بار بار غیر معمولی طور پر سخت ہوجاتی تھی۔ بیس منٹ بعد وہ اس علاقے میں تھی جہاں سلمان کا گھر تھا۔ گھر تلاش کرنے میں اسے پانچ منٹ اور لگے۔

نگار کے اندازے کے مطابق وہ گھر پانچ سو گز کے پلاٹ پر تھا۔ اسے کوئی عالیشان بنگلا نہیں کہا جاسکتا تھا۔

کار اس کے سامنے رکی ہی تھی کہ پھاٹک کھل گیا۔ سلمان نے چوکیدار کو ہدایت کردی ہوگی کہ کسی خاتون کی کار آکر رکے تو فوراً پھاٹک کھول دیا جائے۔

پھاٹک کھلتے ہی نگار نے کار آگے بڑھائی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ گاڑی کھڑی کرنے کے لیے جگہ اتنی کم تھی کہ وہاں دو سے زیادہ گاڑیاں کھڑی نہیں کی جاسکتی تھیں۔ سلمان کی کار وہاں پہلے ہی کھڑی تھی۔ نگار نے اپنی کار اس کے پیچھے کھڑی کردی۔ چوکیدار پھاٹک بند کرنے لگا۔

برآمدے کی روشنیاں بند تھیں۔ اندھیرے میں نگار اتنا ہی دیکھ سکی کہ سامنے ہی برآمدے میں کوئی شخص سائے کی طرح نظر آرہا تھا اور وہ سایہ سلمان ہی کا ہوسکتا تھا۔

کار سے اتر کر نگار برآمدے کی طرف بڑھی۔

"خوش آمدید نگار بیگم!" وہ سلمان ہی کی آواز تھی۔

"آؤ......" اس نے بڑی بے تکلفی سے نگار کا ہاتھ تھام لیا۔

نگار کو اس کی یہ حرکت بہت بری لگی لیکن اس نے تحمل سے کام لیا۔

سلمان اسے جس کمرے [illegible]

روم ہی کہا جاسکتا تھا جس کی آرائش کوئی خاص [illegible]

اس کے بعد اسے جس کمرے میں لے جایا گیا، اس کی آرائش دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ پانچ سو گز کے گھر میں ہوگا۔ اسے تو سلمان نے آئینہ خانہ بنا رکھا تھا۔ اس کی آرائش پر بے تحاشا رقم صرف کی گئی تھی۔

"دم بخود سی رہ گئیں تم یہ کمرا دیکھ کر۔" سلمان دھیرے سے ہنسا۔ "بس اسی کو دیکھ کر کسی کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ میں خاصا دولت مند ہوں۔ یہ کمرا ساؤنڈ پروف بھی ہے۔ اس کی تو کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ بس اسے شوق سمجھ لو میرا۔"

"یہ شوق تو میرے لیے بہت سودمند ثابت ہوگا۔"

نگار نے دانت پر دانت جما لیے، پھر وہ تیزی سے بستر کی طرف بڑھی جیسے اس پر لیٹنے کے لیے بے چین ہو لیکن اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ سلمان سے کچھ دور ہوجائے۔

"یہ......" سلمان مسکرایا۔ "تمہارے لیے سودمند کیوں؟"

"اگر یہاں چوکیدار کے علاوہ بھی کوئی ملازم ہیں تو انہیں گولی چلنے کی آواز نہیں سنائی دے گی۔"

Digitized by Google

http://urdutubes.com/

سلمان جیسے سکتے میں رہ گیا جب اس نے نگار کے ہاتھ میں ریوالور دیکھا جو وہ اب تک اپنی ساڑی میں چھپائے رہی تھی۔

"تم۔" نگار نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "جرائم پیشہ ہو لیکن عورت کی فطرت سے واقف نہیں۔ کوئی عورت مجبوراً تمہارے جال میں پھنسے گی تو پھر وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔"

سلمان کھسیائے ہوئے سے انداز میں ہنسا۔ "تم ایک خطرناک مذاق کررہی ہو۔" اس نے نگار کی طرف ایک قدم بڑھایا۔

دوسرا قدم بڑھانے کی اسے مہلت ہی نہیں مل سکی۔ نگار کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور نے گولیاں اگلنا شروع کردی تھیں۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ ریوالور چلایا تھا اس لیے اس کے نشانے خطا بھی ہوئے، گولیاں ادھر ادھر بھی نکلیں لیکن تین گولیاں سلمان کو بھی لگیں اور ایک گولی تو اس کے سر پر بھی لگی جس نے اسے فوراً ہی فرش پر گرادیا۔

نگار بستر پر اس طرح بیٹھی جیسے گر گئی ہو۔ وہ اچانک اتنی نڈھال نظر آنے لگی تھی جیسے کوئی بلندی سر کی ہو۔ اس کی سانس بھی تیزی سے چلنے لگی تھی۔

[illegible]

وہ خود کو سنبھالنے کے لیے کچھ دیر تک بستر پر بیٹھی نفرت سے سلمان کی لاش کی طرف دیکھتی رہی جس کا خون بہت تیزی سے فرش پر ہر طرف پھیل رہا تھا کیونکہ گولیاں اس کے جسم کے کئی حصوں پر لگی تھیں۔

آخر وہ بستر سے اٹھی۔ اس نے ریوالور اپنی ساڑی میں چھپایا۔ یہ ریوالور اسے وقاص کے ذریعے ملا تھا۔ جب وہ اسمگلر سے ملنے جارہا تھا تو نگار نے اس سے کہا تھا۔

"تم جس کے پاس جارہے ہو، اس قسم کے لوگوں کے پاس غیر قانونی ہتھیار بھی ہوتے ہیں۔ اس سے ریوالور بھی مل سکتا ہے۔ تم اس سے ایک ریوالور بھی خرید لینا۔"

"کیوں میڈم؟" وقاص کو حیرت ہوئی تھی۔

"مجھے اس ملک سے نہ جانے کہاں جانا ہو، نہ جانے وہاں کس کس قسم کے لوگ ہوں۔ نہ جانے کب کس سے سابقہ پڑے اس لیے مجھے حفظ ماتقدم کے طور پر کوئی ریوالور یا پستول تو اپنے پاس رکھنا چاہیے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" وقاص نے سر ہلایا تھا۔

اسے ذرا بھی شبہ نہیں ہوسکا ہوگا کہ نگار کے دماغ میں کتنا خطرناک منصوبہ کسی زہریلے سانپ کی طرح پھن کاڑھے ہوئے تھا۔ اسی لیے جب وہ واپس آیا تو ایک ریوالور لے آیا۔

سلمان کی موت اسی ریوالور سے لکھی تھی۔

نگار کمرے سے نکل آئی۔ یہ امکان تو تھا ہی نہیں کہ گولیاں چلنے کی آوازیں کسی نے سنی ہوں گی۔ سلمان نے بتا ہی دیا تھا کہ اس کی خواب گاہ ساؤنڈ پروف تھی۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں سے نکلنا نگار کے لیے آسان نہیں ہوتا لیکن وہ فیصلہ کرکے آئی تھی کہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ سلمان کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ کسی شخص کے بستر کی زینت بن جائے۔

جب اس نے اپنی کار اسٹارٹ کی تو چوکیدار پھاٹک کھولنے لگا۔ وہ اس پر کچھ حیران ضرور ہوگا۔ اس نے پہلے کسی لڑکی یا عورت کو اتنی جلدی واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔

کار باہر نکلی اور سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ اس نے موبائل نکالا اور وقاص سے رابطہ کیا۔

"جی میڈم!" وقاص کی آواز آئی۔ "میں غزالہ کو لے کر آرہا ہوں۔ کیا آپ واپس پہنچ گئیں؟"

"میں اس وقت راستے میں ہوں اور میرا رخ اس [illegible] طرف نہیں، اپنے گھر کی طرف ہے۔"

"کیا!" وقاص حیران رہ گیا تھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟...... وہاں آپ کو ہرگز نہیں جانا چاہیے۔"

"یہ اچھا ہوا کہ غزالہ تمہارے ساتھ ہی ہے ورنہ مجھے کہنا پڑتا کہ غزالہ کو ساتھ لے کر میرے گھر پہنچو۔"

"آخر...... آخر کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"میں یہاں سے اسمگل نہیں ہونا چاہتی وقاص! نہ جانے کہاں جاؤں اور وہاں کس قسم کی زندگی گزارنی پڑے۔ میں تو بھوک پیاس میں بھی زندگی گزار لوں گی لیکن میری صنوبر......" نگار کی آواز بھرا گئی۔ "وہ کسی بھی قسم کی اذیت برداشت نہیں کرسکتی۔"

"آپ نے اچانک فیصلہ بدلا ہے؟" وقاص کی آواز میں وحشت تھی۔

"اچانک؟...... ہاں!...... کہا جاسکتا ہے...... میں اس بارے میں سوچ تو رہی تھی لیکن جب ایک فون کال آئی تو میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔"

"وہ فون کال جب آپ کے اشارے پر میں کمرے سے چلا گیا تھا؟"

"ہاں۔"
"کس کی کال تھی وہ اور......"
"ابھی زیادہ باتیں نہیں وقاص! بعد میں تمھیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔"
"وہاں آپ کی گرفتاری یقینی ہے۔" وقاص نے کہا۔ "میرا مطلب ہے اگر آپ اپنے گھر گئیں۔"
"میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہوچکی ہوں وقاص! میں نے صنوبر کے مستقبل کے بارے میں بھی کچھ سوچ لیا ہے۔ اچھا بس...... تم......"
وقاص نے اس کی بات کاٹی۔ "میں آپ کو گرفتار ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گا میڈم!" وقاص کی آواز بھرا گئی۔
"زندگی میں بہت کچھ ہوتا ہے وقاص!...... انسان بہت کچھ نہیں کرنا چاہتا، بہت کچھ نہیں دیکھنا چاہتا لیکن اسے کرنا بھی پڑتا ہے اور دیکھنا بھی پڑتا ہے۔ تم فوراً میرے گھر پہنچو۔ میں اب فون بند کررہی ہوں۔"
اس نے فون بند کرکے رفتار بڑھائی۔ اس وقت اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا جو ایک عجیب سی بات اس لیے کہی جاسکتی تھی کہ اس کا دل رو رہا تھا۔ وہ اپنی بچی سے بچھڑنے جارہی تھی، اس بچی سے جس کی وجہ سے وہ اب تک بہت کچھ کرچکی تھی۔ اسے تباہی سے بچانے کے لیے اس نے سلمان کا قتل کیا تھا۔
گھر کا دروازہ ملازمہ نے کھولا۔ وہ اپنی آنکھیں مل رہی تھی۔ غالباً کال بیل کی آواز سن کر سوتے سے جاگی ہوگی۔
"میں جاگ رہی ہوں بیگم صاحبہ!" زلیخا بائی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔
"صنوبر سوگئی؟" نگار آگے بڑھتے ہوئے بولی۔
"سلا تو دیا تھا میں نے لیکن وہ سوتے میں بھی مما مما کرتی رہی۔ ایک بار پہلے جاگ چکی ہے اور ابھی کال بیل کی آواز سن کر پھر جاگ گئی ہے۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا، مما آئی ہوں گی۔"
نگار کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا گئے...... وہ اتنی آگے بڑھ گئی تھی کہ اس کے آنسو زلیخا بائی یا ملازمہ نہیں دیکھ سکی ہوں گی۔
"ابھی تم دونوں سونا مت!" نگار نے مڑ کر ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "بہت دیر تک جاگنا ہوگا آج تم دونوں کو۔ ابھی غزالہ اور وقاص بھی آرہے ہیں۔ انہیں میرے کمرے ہی میں بھیج دینا۔"
جواب میں زلیخا بائی نے کچھ کہا تھا لیکن نگار نے ٹھیک سے نہیں سنا۔ اس وقت اس کی ذہنی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔
جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو صنوبر دروازے کی طرف آرہی تھی۔ وہ "مما مما" کرتی ہوئی نگار کی ٹانگوں سے لپٹ گئی لیکن نگار نے اسے فوراً اپنی گود میں اٹھالیا اور اسے بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ یہ احساس اس کے لیے بڑا جاں گسل تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو شاید آخری بار پیار کررہی تھی۔
"کیا ہوا مما!" صنوبر کو اس کے آنسو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔
"کچھ نہیں میری جان!" نگار نے ہنسنے کی کوشش کی۔ "آنکھوں میں کچھ پڑگیا ہے۔" وہ ساڑی کے آنچل سے ہی اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔
اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گئی کہ آنے والے غزالہ اور وقاص ہوں گے۔
صنوبر کو گود میں لیے وہ بستر پر بیٹھ گئی اور موبائل پر ابدالی کا نمبر ملایا۔
دوسری طرف سے کال فوراً ریسیو کی گئی۔ "آپ!"
"جی۔" نگار نے کہا۔ "میں اپنے گھر آگئی ہوں۔"
"تشریف [illegible] آپ یقیناً [illegible]"
"آپ [illegible] کیسے [illegible] کیا [illegible] تلاش [illegible] ہوں گا؟"
"مجھے سب کچھ معلوم ہے ابدالی صاحب! اب معلوم ہوگیا ہے۔ کیا آپ اس سے انکار کریں گے کہ آپ کو میری تلاش تھی۔"
"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ مجھے اطلاع بھی مل چکی ہے کہ آپ گھر پہنچ چکی ہیں۔ میں فوراً آتا لیکن مجھے اپنے ساتھ کسی اور کو بھی لانا ہے۔ اسی میں کچھ دیر ہورہی ہے۔"
اسی وقت غزالہ اور وقاص کمرے میں داخل ہوئے۔ وقاص کے علاوہ غزالہ کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ غالباً وقاص نے راستے میں اسے سب کچھ بتادیا ہوگا۔
نگار نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور فون پر ابدالی سے کہا۔ "اب ان لوگوں کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے آپ میری شناخت کروانا چاہتے ہوں گے نا؟"
ابدالی چپ رہ گیا۔ اسے نگار سے اس جملے کی توقع نہیں ہوگی۔
"اب ضرورت نہیں ہے کسی کو لانے کی۔" نگار نے اپنی بات دہرائی، پھر کہا۔ "میں خود کو قانون کے حوالے کرنے ہی کے لیے گھر آئی ہوں۔" اگلا جملہ اس نے انگریزی میں کہا۔ "شرجیل کی لاش میں نے ہی سمندر میں پھینکی تھی۔ وہ ہلاک بھی مجھ سے ہی ہوا تھا۔" نگار کو انگریزی بولنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ صنوبر کچھ نہ سمجھ سکے۔
دوسری طرف سے بس ایک طویل سانس لینے کی آواز آئی۔
"میں منتظر ہوں آپ کی۔" نگار نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔
"یہ...... یہ آپ......" غزالہ نے کچھ کہنا چاہا۔
"اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے غزالہ۔" نگار نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمھیں وقاص نے سب کچھ بتا ہی دیا ہوگا۔ میں بیرون ملک جاکر کسی گمنام سی جگہ پر کسمپرسی کی زندگی گزار لیتی اگر تنہا ہوتی لیکن صنوبر کو میں کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ تم صنوبر سے بہت پیار کرنے لگی ہو اس لیے میں اسے تمہارے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارے اور وقاص کے حوالے۔ نہ جانے کیوں، مجھے امید ہے کہ تم دونوں یہ ذمے داری لینے کے لیے تیار ہوگے۔"
"یہ تو مجھے بہت پیاری ہے۔" غزالہ نے صنوبر کو اس کی گود سے لے لیا۔ "میں اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز [illegible]"
وقاص خاموش [illegible] تھا، پیشانی [illegible] رہا تھا۔
"ابھی تو اسے تم زلیخا بائی کو دے آؤ۔ مجھے ابدالی کے آنے سے پہلے کچھ مختصر بات کرنی ہے تم دونوں سے۔" پھر اس نے صنوبر سے کہا۔ "ابھی تم ذرا دیر کے لیے زلیخا بائی کے پاس چلی جاؤ۔"
"اچھا مما!" صنوبر نے کہا۔
نگار نے اس کی تربیت ایسی ہی کی تھی کہ وہ اس کی بات عموماً مان لیتی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ کسی بات پر مچلتی ہو......
غزالہ اسے لے کر کمرے سے چلی گئی۔
"تم بہت خاموش ہو وقاص!" نگار بولی۔ "کیا تم اس ذمے داری کو ایک بوجھ سمجھو گے؟"
"کیسی بات کررہی ہیں آپ میڈم!" وقاص روہانسا ہوگیا۔ "آج میں شاید دوسری بار کہوں گا کہ میں آپ کو بالکل اپنا سمجھنے لگا ہوں۔ میں صنوبر کو بوجھ کیسے سمجھ سکتا ہوں۔"
"تمہارے ڈیڈی؟"
"آپ ان سے کبھی ملی نہیں۔ بہت نرم دل انسان ہیں وہ۔"
نگار اٹھی اور الماری سے چیک بک نکال کر لائی۔ اس نے ایک چیک کاٹ کر وقاص کی طرف بڑھایا۔ "بینک میں جتنی بھی رقم تھی، میں نے اس چیک پر لکھ دی ہے۔"
"اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے میڈم!" وقاص نے احتجاج کرنے والے انداز میں کہا۔ "کیا آپ معاوضہ دینا چاہتی ہیں؟"
"غلط نہ سمجھو وقاص!" نگار نے کہا۔ "آخر یہ رقم بینک میں کیوں پڑی رہے؟ اس کا کوئی مصرف تو ہونا چاہیے۔"
غزالہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ صنوبر کو زلیخا بائی کے حوالے کرکے بہت تیزی سے لوٹی تھی۔
"یہ چیک دے رہی ہیں میڈم!" وقاص نے اسے بتایا۔
غزالہ نے بھی اس پر احتجاج کیا لیکن نگار کی یہ دلیل مضبوط تھی کہ وہ رقم بینک میں ضائع کیوں ہوجائے۔
"اچھا!" غزالہ نے طویل سانس لی، پھر وقاص سے کہا۔ "لے لو وقاص، یہ ہم صنوبر ہی کے نام سے بینک میں جمع کرادیں گے۔ جب یہ بڑی ہوجائے گی تو اپنی مرضی سے خرچ کرسکے گی۔"
نگار مطمئن ہوگئی۔ پھر اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ ملازمہ فوراً آئی۔ نگار نے اس سے کہا۔ "ارے ہاں! زلیخا [illegible]"
ملازمہ واپس چلی گئی۔ اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔
"اوہ!" نگار کے منہ سے نکلا۔ "ابدالی ہی ہوگا۔ میں چاہتی تو یہ تھی کہ اس کے آنے سے پہلے سب کام مکمل کرلوں۔ خیر! دیکھتی ہوں۔"
وقاص اور غزالہ کے چہروں کی رنگت اڑی اڑی سی نظر آنے لگی تھی۔
نگار نے اپنے پرس سے ایک اور چیک بک نکالی۔ اس کے دو اکاؤنٹ تھے۔ اس اکاؤنٹ سے وہ کچھ خرچ نہیں کرتی تھی جس کا چیک وقاص کو دیا تھا۔
ملازمہ کچھ رک کر واپس آئی۔ اس کے ساتھ زلیخا بائی بھی تھی۔ ان دونوں ہی کے چہروں سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ انہیں کچھ اندازہ ہوگیا تھا کہ معاملات گڑبڑ ہیں۔
"وہی صاحب آئے ہیں۔" ملازمہ نے دھیمی آواز میں بتایا۔
نگار پہلے ہی کھڑی ہوچکی تھی۔
"سب میرے ساتھ آئیں۔" اس نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ڈرائنگ روم میں ابدالی ٹہل

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

رہا تھا۔ نگار کو دیکھ کر رک گیا۔

"پلیز سٹ ڈاؤن!" نگار نے صنوبر کی وجہ سے انگریزی میں بولنا شروع کیا۔ "میں نے فون پر ہی کہہ دیا تھا کہ میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ مجھے اتنی مہلت دیں گے کہ میں اپنے ان لوگوں کے سامنے بھی وہ سب کچھ بتادوں جو مجھ پر گزری ہے۔"

"کہیے!" ابدالی اسے گھور رہا تھا۔

"بیٹھ تو جائیے۔"

ابدالی بیٹھ گیا۔

زلیخا بائی کو تو تھوڑی بہت انگریزی آتی تھی لیکن ملازمہ ایک ایک کا منہ تکنے لگی۔

"مجھے اعتراف ہے کہ شرجیل کی موت میرے ہاتھوں ہوئی تھی لیکن میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا۔"

"کیا مطلب!" ابدالی نے تیزی سے کہا۔

نگار نے اپنی اور شرجیل کے تعلقات کی خرابی سے بات شروع کی، شفیقہ کے بارے میں بھی بتادیا لیکن شرجیل سے جو جھگڑا ہوا تھا اور جس کے باعث اس نے شرجیل پر گل دان پھینک مارا تھا، اس جھگڑے کی بات میں اس نے وقاص کا نام نہیں لیا۔

"میں نے گل دان اس کے سینے پر [illegible] نے جھک کر خود کو بچانے کی کوشش کی تو گل دان [illegible] کے سر پر لگا اور وہی اس کی موت کا سبب بنا۔ اگر میری بچی چار سال کی نہ ہوتی، یعنی اس قابل ہوتی کہ خود کو سنبھال سکتی تو یقین کیجیے کہ میں خود کو اسی وقت قانون کے حوالے کردیتی۔"

"تو اب صورت حال میں کیا فرق آگیا؟" ابدالی نے پوچھا۔

"میں سب کچھ بتاؤں گی......"

نگار نے انگریزی ہی میں اپنا بیان جاری رکھا۔

"آج مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ میرے بارے میں خاصی معلومات جمع کرچکے ہیں اور اب میری گرفتاری یقینی ہے تو مجھے خیال آیا کہ میں اس ملک سے کہیں اور چلی جاؤں۔ آج تیسرے پہر سے بھی میں اسی سلسلے میں مصروف رہی ہوں۔ یہ تو میرے علم میں تھا کہ بعض گروہ لوگوں کو پیسا لے کر یہاں سے کسی دور دراز ملک میں اسمگل کردیتے ہیں لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں سے رابطہ کس طرح کیا جائے۔ میں اس سلسلے میں مصروف رہی تھی لیکن پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ دور دراز کے کسی ملک میں جا کر مجھے کسمپرسی کی زندگی گزارنی ہوگی جو میری عزیز از جان بچی کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوگی۔ اسی لیے میں نے یہاں سے فرار ہونے کا ارادہ ترک کردیا پھر جب میں اپنے گھر کی طرف آرہی تھی تو مجھے سلمان کی کال ملی۔"

"سلمان کون؟" ابدالی پوچھ بیٹھا۔

"وہی شخص جس نے لاش کا ڈبا پھینکنے میں میری مدد کی تھی۔" نگار نے جواب دیا اور وہ باتیں بھی دہرانے لگی جو سلمان سے متعلق تھیں۔ سب کچھ بیان کرنے کے بعد اس نے اس کی آخری کال کا ذکر کیا۔ وہ اپنے سارے بیان میں وقاص کا نام لینے سے گریز ہی کرتی رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ آخری کال میں سلمان نے اس سے کیا کہا تھا۔

"میں اس کی یہ شرط کسی صورت میں قبول نہیں کرسکتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ جب میں جیل میں ہوں گی، تب بھی سلمان مجھ سے انتقام لینے کے لیے میری بیٹی کو اغوا کرسکتا ہے۔ مجھے جیل میں یہ خبر مل ہی جاتی جو میرے لیے بہت اذیت ناک ہوتی۔ یہی سب سوچ کر میں اس کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔"

"ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ اس کی یہ شرط ماننے کے لیے قطعی تیار نہیں تھیں۔" ابدالی بولا۔

"میں نے صحیح کہا تھا۔" نگار سکون سے بولی۔ "میں [illegible] گئی تھی۔ میں ابھی [illegible] [illegible] ابدالی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہاں سے آپ اس کی لاش اٹھوا سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" ابدالی تیزی سے بولا۔

"میں نے اسے قتل کردیا ہے۔"

اس جواب پر نہ صرف ابدالی بلکہ وقاص اور غزالہ کے چہرے کی رنگت بھی بدل گئی۔ کچھ ایسا ہی تاثر زلیخا بائی کے چہرے پر بھی ابھرا تھا۔

نگار اب بھی سکون سے بولتی رہی۔ "اب وہ میری بیٹی کو اغوا نہیں کرسکتا۔ میں نے اسے جس ریوالور سے ہلاک کیا، اس کا لائسنس میرے پاس نہیں ہے۔ یہ ریوالور میں نے کچھ دن پہلے چور بازار سے اس لیے خریدا تھا کہ حفظ ماتقدم کے طور پر انسان کو اپنے پاس کوئی ہتھیار ضرور رکھنا چاہیے۔ وہ ریوالور اس وقت بھی میرے پاس ہے لیکن وہ میں ابھی صنوبر کے سامنے نہیں نکال سکتی۔ وہ میں آپ کو دے دوں گی۔"

"ہوں۔" ابدالی نے طویل سانس لی۔ "اگر یہ سب کچھ درست ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن قانون کا

دل پتھر کا ہوتا ہے اور میں اس قانون کا سپاہی ہوں۔ اب یہ فیصلہ عدالت ہی کرسکتی ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی نرم برتاؤ کرے یا نہ کرے۔ نیچے پولیس موبائل کھڑی ہے۔ میں کسی اور کو اپنے ساتھ اوپر نہیں لایا تھا۔"

"میں شکریہ ادا کروں گی کہ آپ نے ایسا نہیں کیا۔ میری گرفتاری کا منظر میری بچی کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ میں ابھی خود آپ کے ساتھ چل کر موبائل میں بیٹھ جاؤں گی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ تو میں کہہ چکی لیکن کیا آپ مجھے ایک کام کے لیے دو چار منٹ کی مہلت اور دیں گے؟"

"اب کیا کرنا ہے آپ کو؟"

"جو کچھ بھی کروں گی، وہ آپ کے سامنے ہی کروں گی۔"

نگار نے اپنی دوسری چیک بک نکال کر دو چیک کاٹے۔ ان میں سے ایک چیک اس نے ملازمہ کی طرف بڑھایا۔

جب وہ چیک لکھ رہی تھی تو زلیخا بائی نے مدھم آواز میں ملازمہ سے باتیں کی تھیں۔ غالباً اس نے بتایا ہوگا کہ نگار نے اس وقت کیا کچھ کہا ہے۔

"یہ کوئی بہت بڑی رقم تو نہیں۔" چیک ملازمہ کو دیتے ہوئے نگار نے کہا۔ "لیکن میں کچھ نہ کچھ خیال رکھنا چاہتی ہوں کہ تم نے میرے گھر کی [illegible] خدمت کی ہے۔ اب اس [illegible] [illegible] بڑھایا۔ "ان دونوں چیکس کی رقم اتنی ہے کہ تم دونوں کوئی چھوٹا موٹا گھر خرید کر رہ سکتی ہو۔"

زلیخا خانم کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ یہی کیفیت ملازمہ کی تھی۔

"اب......" نگار نے وقاص اور غزالہ کی طرف دیکھا۔ صنوبر اس وقت غزالہ کے شانے سے لگ کر سوچکی تھی۔ "اب تم دونوں صنوبر کو یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے نہ پاکر یہ بہت مچلے گی لیکن مجھے امید ہے کہ تم اسے سنبھال لو گی۔ اس اپارٹمنٹ میں تالا لگا دینا وقاص!! اگر عدالت نے مجھے کوئی لمبی سزا نہ دی تو میں واپس آکر یہیں رہوں گی اور اگر سزا لمبی ہوجائے تو یہ اپارٹمنٹ بیچ کر صنوبر کی شادی کردینا۔" نگار کی آواز بھرا گئی۔ "اور آخری بات یہ کہ صنوبر کو کبھی معلوم نہ ہو کہ اس کی ماں جیل میں ہے۔ کچھ بھی کہنا اس سے لیکن یہ بات ہرگز نہ کہنا۔ میں جب تک زندہ رہوں گی، تم دونوں کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ بس!...... اب میں چلتی ہوں۔" وہ کھڑی ہوگئی۔

اسی وقت زلیخا بائی تیزی سے آگے بڑھی اور نگار سے لپٹ کر رونے لگی۔ شاید ملازمہ بھی ایسا ہی کرتی لیکن وہ جسارت نہیں کرسکی۔

آنسو غزالہ کی آنکھوں میں بھی تھے اور وقاص کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

ابدالی کے چہرے سے معلوم ہورہا تھا کہ اس ساری صورتِ حال کا اثر اس کے دل پر بھی ہوا تھا۔ وہ پولیس کے عام افسروں سے خاصا مختلف تھا۔

نگار غزالہ کے قریب گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں آخری مرتبہ اپنی بچی کو خوب پیار کرنا چاہتی تھی لیکن یہ سوگئی ہے۔ پیار کرنے سے جاگ جائے گی اور مجھے جاتا دیکھ کر مچلے گی۔ میں یہ صدمہ لے کر جارہی ہوں کہ آخری مرتبہ اسے پیار بھی نہیں کرسکی۔" اس نے غزالہ کی پیشانی چومی، وقاص کا کندھا تھپتھپایا، اس کے بعد ملازمہ اور زلیخا بائی کی طرف الوداعی نظروں سے دیکھا۔ اس دوران میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے تھے۔

نگار تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ "آیئے ابدالی صاحب!"

ان دونوں کے پیچھے وقاص اور غزالہ بھی باہر نکلے۔ نیچے پہنچ کر جب نگار پولیس موبائل میں بیٹھ رہی تھی، اس وقت جذبات کو قابو میں رکھنے والے وقاص کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے۔

☆☆☆

مقدمہ چلا اور عدالت نے نگار کو بارہ سال قید کی سزا سنادی۔ اسے جیل بھیج دیا گیا۔

صنوبر سے بچھڑ جانے کے غم میں وہ بارہ سال نگار کے لیے بارہ صدیاں بن گئے۔ اس دوران میں وقاص کبھی کبھی اس سے ملنے آتا رہا۔ غزالہ بھی آئی لیکن وقاص سے کم۔ نگار کو معلوم ہوتا رہا کہ صنوبر شروع شروع میں خاصے دن تک مچلی تھی، روئی تھی لیکن آخرکار صنوبر نے اسے بھلا لیا تھا۔

نگار کو یہ اطلاع بھی مل گئی کہ غزالہ اور وقاص کی شادی ہوگئی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ پھر ایک اطلاع اسے یہ ملی کہ صنوبر اسے بھول گئی تھی۔ نگار کے دل پر جیسے ایک گھونسا سا لگا لیکن بہتر تو یہی تھا کہ وہ ماں کو بھلادیتی۔

وہ تعلیم حاصل کررہی تھی اور ممتاز پوزیشن حاصل کررہی تھی۔

غزالہ اور وقاص کی اولاد نہیں ہوئی تھی اس لیے قدرتی طور پر صنوبر ہی ان کی بھرپور توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ وہ

http://urdutubes.com/
Digitized by Google

غزالہ کو نہ صرف ''مما'' کہنے لگی تھی بلکہ سمجھنے بھی لگی تھی۔

آخر صنوبر کی سزا پوری ہوئی۔ جب وہ جیل سے نکلی تو وقاص اور غزالہ اسے لینے آئے ہوئے تھے۔ غزالہ اس سے لپٹ کر رونے لگی لیکن اس موقع پر وہ خوشی کے آنسو تھے۔

''اپارٹمنٹ ابھی نہیں بیچا میں نے!'' کار ڈرائیو کرتے ہوئے وقاص نے کہا۔ ''کل اس کی صفائی وغیرہ کروا دی تھی۔ ابھی تو میں آپ کو اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ آپ اپنی بیٹی سے مل لیں۔ اس کے بعد فیصلہ کر لیجیے گا کہ ہمارے ساتھ رہیں گی یا اسی اپارٹمنٹ میں جائیں گی۔ ہاں، ایک بات بتانا بھول رہا ہوں۔ آپ کی ملازمہ کا پچھلے سال انتقال ہو گیا ہے۔ زلیخا بائی زندہ ہے۔ اپارٹمنٹ کی صفائی میں اس نے بہت کام کیا۔''

نگار یہ باتیں اس طرح سن رہی تھی جیسے کچھ نہ سن رہی ہو۔ اس وقت اس کے تصور میں صرف صنوبر تھی جس سے وہ بارہ سال بعد ملتی۔ وہ تصور میں صنوبر کو جوان دیکھ رہی تھی۔

آخر وہ گھر پہنچ گئے۔

''صنوبر!'' غزالہ نے گھر میں قدم رکھتے ہی پکارا۔

''جی مما!'' کسی طرف سے صنوبر کی آواز آئی اور نگار کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اب وہ اپنی بچی کو دیکھنے والی تھی۔

''دیکھو تو کون آیا ہے!'' غزالہ نے کہا۔

کسی طرف سے نوجوان صنوبر سامنے آئی۔ ''[illegible]ن ہے مما؟''

پھر وہ نگار کی طرف دیکھنے لگی۔ ''یہ کون ہیں مما؟'' اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ غزالہ سے پوچھا۔

اس وقت نگار کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ اس کی بیٹی ہی اسے نہیں پہچان سکی تھی۔

''ارے صنوبر! یہ......'' غزالہ نے کہنا چاہا لیکن نگار نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

وقاص اور غزالہ حیران نظر آئے۔

تنہائی میں نگار نے ان دونوں سے کہا۔ ''بارہ سال قید کی سزا!...... میرا خیال تھا کہ میں نے بہت اذیت ناک سزا کاٹی ہے لیکن آج مجھے جو سزا ملی ہے، اس کے آگے قید کی سزا کچھ بھی نہیں۔ میرا دل اس وقت خون کے آنسو رو رہا ہے، لیکن اب میں سوچ رہی ہوں کہ شاید یہ اچھا ہی ہوا۔ صنوبر تم کو اب ماں سمجھنے لگی ہے۔ میرے بارے میں جاننے کے بعد وہ دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ایک طرف میں ہوں گی اور دوسری طرف تم...... نہیں غزالہ! میں اپنی بیٹی کو منقسم نہیں کرنا چاہتی۔ میں زیادہ نفسیات تو نہیں جانتی لیکن میرا خیال ہے کہ جب کسی کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے تو یہ اس کے حق میں بہتر نہیں ہوتا۔ بس اب میں جاؤں گی۔ تم نے بتایا تھا نا کہ اپارٹمنٹ کی صفائی وغیرہ ہو گئی ہے۔''

''جی......'' وقاص کی آواز بہت دھیمی تھی۔

نگار نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''شاید قانون سے بھاگنے کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔ اگر میں شروع ہی میں خود کو قانون کے حوالے کر دیتی تو آج صورتِ حال کچھ مختلف ہو سکتی تھی۔ شرجیل کو میں نے جان بوجھ کر ہلاک نہیں کیا تھا اس لیے عدالت مجھ سے نرمی برت سکتی تھی لیکن سلمان کو تو میں نے دانستہ قتل کیا تھا۔ دراصل اتنی لمبی سزا مجھے اسی لیے ملی...... قانون سے فرار چاہنے والے دوسرے جرائم کے مرتکب ہو جاتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ خیر!'' نگار کھڑی ہو گئی۔

''اب کھانا کھا کر تو جائیے گا۔'' غزالہ بولی۔

''نہیں۔'' نگار نے کہا۔ ''میز پر صنوبر بھی ہو گی۔ وہ مجھے جن اجنبی نظروں سے دیکھے گی، وہ میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔''

''اچھا!'' وقاص نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں نے آپ کی کار کی سروس بھی کروا دی تھی۔ وہ پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہے لیکن ابھی تو میں [illegible]''

''چلو......''

وقاص [illegible] اپارٹمنٹ [illegible]

اپارٹمنٹ میں زلیخا بائی موجود تھی۔ وہ ایک بار پھر نگار سے لپٹ کر رو پڑی، لیکن اس مرتبہ غزالہ کی طرح اس کے آنسو بھی خوشی کے آنسو تھے۔

''میں اب آرام کروں گی بائی!'' نگار نے اس سے کہا۔

''کھانا تیار کر لیا ہے میں نے۔'' زلیخا بائی نے کہا۔

''نہیں۔'' نگار نے جھوٹ بولا۔ ''میں وقاص کے گھر سے کھا کر آئی ہوں۔ میں اگر بہت زیادہ دیر تک سوتی رہی تو بھی مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔''

اور اسے ڈسٹرب نہیں کیا گیا...... کبھی ڈسٹرب نہیں کیا گیا...... ڈسٹرب کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے بہت زیادہ مقدار میں خواب آور دوا کھا کر خودکشی کر لی تھی...... اس کے سرہانے پڑے ہوئے چھوٹے سے پرچے پر لکھا تھا۔

''آخری صدمہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ میں اس صدمے کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔''

http://urdutubes.com/
Digitized by Google